

جلد ۴۸ شمارہ ۴ فون نمبر ۹۰۰۲
منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر نمبر ۵۴/۵۳۵۰۶ - مؤرخہ ۴ د ۱۹۵۴ء
۲۷۷۶۷۹ - ۲ / اکتوبر ۱۹۵۴ء ـــــ بموجب سرکلر نمبر ۴۱۵ - مؤرخہ ۲۲ اپریل

بانی چودھری برکت علی مرحوم

ماہنامہ

ادبِ لطیف لاہور

سالنامہ ۱۹۶۱

مینجنگ ایڈیٹر
افتخار علی چودھری

مرتب
میرزا ادیب

زرِ سالانہ : ۱۰ روپے فی پرچہ Rs. 4/00 nP. غیر ممالک میں : ۱۲ روپے

مکتبۂ ادب لطیف، لاہور

افتخار علی چودھری ناشر نے اُردو پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ادب لطیف سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا

فہرست

پیرایۂ آغاز

یہ سالنامہ ہے اور سالنامے کا پیرایۂ آغاز صرف ان معروضات کے لئے وقف ہونا چاہیئے جن کا براہِ راست واسطہ سالنامے سے ہے مگر ہم اِن صفحات میں ضمناً کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں اس لئے سالنامے کے متعلق اپنی گذارشات فقط دو ایک باتوں تک محدود رکھیں گے —— پہلی بات یہ ہے کہ ادارہ ادبِ لطیف اپنے تمام محترم قلمی معاونین کا بہ دل وجان شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے مخلصانہ تعاون سے کام لے کر سالنامے کی تعبیر و تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ ان قلمی معاونین میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی تخلیقات سالنامے میں اشاعت پذیر نہیں ہو سکیں — گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے یا اس بنا پر کہ وہ دفتر میں تاخیر سے پہنچیں۔ ان کی سپاس گزاری کے ساتھ ساتھ ان سے بطورِ خاص معذرت خواہ بھی ہیں۔ دوسری بات سالنامے کے مقالات کے باب میں ہے۔ مقالات کے حصے میں ایک مضمون تو تنقیدِ جدید کے بنیادی اصول کی وضاحت کرتا ہے اور باقی مضامین — تمام کے تمام — نئے قلم کاروں کا تجزیاتی مطالعہ لئے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ چیز ایک روایت سی بنتی جا رہی ہے کہ اردو کے اکثر و بیشتر نقاد انتقاد کے پیشِ نظر جب بھی قلم اٹھاتے ہیں ان کی نظر کسی نہ کسی کلاسیکی مصنف ہی پہ پڑتی ہے۔ جدید اہلِ قلم کو وہ عموماً نظر انداز کر جاتے ہیں۔ نتیجتہً نئے لکھنے والوں کی نہ تو ہمت افزائی ہوتی ہے اور نہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ذہنی افکار کی صورت میں انہوں نے دنیا کے سامنے جو کچھ پیش کیا ہے ادبی اعتبار سے اس کی حیثیت کیا ہے، اور وہ کس بلندی یا کس مقام تک پہنچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہم نے کلاسیکی شاعروں اور نثر نگاروں سے نظر ہٹالی تو ہم ایک نہایت اہم فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔ مگر اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے کہ نئے لکھنے والوں سے ہماری انتقادی روگردانی، ایک خاص ذمے داری کو عمداً پسِ پشت ڈالنے کے مترادف ہوگی۔ اور ظاہر ہے اس روش کو ہم کسی صورت میں بھی خوشگوار نہیں کہہ سکتے!

یہاں پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے —— کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ لکھ چکے ہیں اور اس دنیا میں اب موجود نہیں ہیں ان کے بارے میں تنقید اپنا فیصلہ بڑی آسانی سے سنا سکتی ہے، بہ نسبت ان اہلِ قلم کے جن کا تخلیقی تسلسل جاری ہے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ آگے چل کر ان کے رجحانات بدل جائیں اور رجحانات کی اس تبدیلی سے وہ بہتر یا کم تر تخلیقات پیش کرنے لگیں — اس لئے جب تک وہ اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اصولاً ان کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا! —— یہ اعتراض اپنی جگہ بالکل درست ہے مگر اس کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ اپنے کلاسیکی مصنفین کے بارے میں ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ ہماری سوچ کا آخری نتیجہ ہے اور اب اس سلسلے میں کچھ اور کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ ہر دور ادوارِ رفتہ کے مصنفین کا نئے سرے سے جائزہ لیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ جائزہ متعینہ انتقادی نتائج سے الگ ہو کر ایک نئی سمت یا نئے رُخ کی نشان دہی کرنے لگے۔ اس صورتِ حال میں اوپر کے اعتراض کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آخری فیصلہ نہ تو کسی کلاسیکی مصنف کے بارے میں دیا جا سکتا ہے اور نہ زمانہ حال کے کسی صاحبِ قلم کے متعلق —— دونوں کے معاملے میں مزید کہنے سننے کی گنجائش باقی رہتی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

۱۹۶۰ء کا سال ہم سے رخصت ہو چکا ہے ـــــ رخصت ہونے والے سال نے ہمیں جو کچھ دیا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے ـــــ کچھ نئی کتابیں، کچھ نئی تحریریں ـــــ اس نوعیت کا یا کسی اور نوعیت کا کوئی اور تخلیقی کام ـــــ مگر یہی سب کچھ نہیں ـــــ کچھ اور بھی ـــــ کچھ ایسے سوالات جن پر ہمیں غور کرنا ہے ـــــ اور جن پر ہمیں غور کرنا چاہیے!

ان تمام سوالات کو اگر ایک ہی سوال بنا دیا جائے تو وہ سوال یہ ہوگا ـــــ آج ہمارے ادب کی کیا حالت ہے؟ ـــــ یہ سوال بہت مختصر ہے مگر جب اس کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے تو اس ایک سوال کے سینے سے کئی اور سوالوں کی شاخیں بھی پھوٹ نکلیں گی ـ تفصیلات کی ایک دنیا ہمارے سامنے آجائے گی اور بات سے بات نکلتی چلی جائے گی۔ لیکن ہمیں تفصیل نگاری سے کام نہیں لینا، اپنے مطالعات مختصراً پیش کرنا ہیں، کیونکہ تفصیلات کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ گنجائش!

ایک خاص چیز جسے ہم اپنے ادب میں بہت بری طرح محسوس کر رہے ہیں وہ ایک رجحان ہے جو کچھ مدت سے برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس رجحان کو سطحیت کہنا چاہیے۔ ہمارے ہاں ادب کی مختلف اصناف میں بالعموم اور تنقید میں بالخصوص یہ رجحان پرورش پا رہا ہے اور آثار بتا رہے ہیں کہ ابھی اس میں اور اضافہ ہوگا۔

یہ سطحی رجحان تنقید میں ایک یکسر سطحی انداز لیے ہوئے آتا ہے ـــــ ورسی انداز میں کچھ باتیں کہہ دیں اور سمجھ لیا کہ تنقید کے تمام مطالبات پورے ہو گئے اور اب کچھ اور کہنے سننے کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ تنقید میں بے جا طوالت ہرگز نہیں ہونی چاہیے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو نہ ہونا چاہیے کہ کچھ عام باتیں ایک عام طریقے پر کہہ دی جائیں اور وہ بھی چند صفحات کے اندر اندر۔ تنقید کا مختصر ہونا اور بات ہے اور اس کا جامع ہونا بالکل الگ چیز۔ مختصر طور پر بھی کئی نئی، فکر انگیز اور نتیجہ خیز باتیں کہی جا سکتی ہیں اور کہی جاتی ہیں ـــــ طوالت معنی خیزی پر دلالت نہیں کرتی اور سطحی رجحان تو طوالت میں بھی نمو حاصل کر لیتا ہے۔ اور اختصار میں بھی سوال طوالت یا اختصار کا نہیں ـــــ سطحی رجحان کا ہے۔

وہ لوگ جو ہمیشہ سوچ سمجھ کر لکھا کرتے تھے اب غالباً زیادہ لکھنے کے شوق میں یا دوسروں کے مطالبات پورے کرنے کی خاطر بے تکلف ایسے مضامین لکھ رہے ہیں جو عموماً ان کے پختہ کارانہ فنی شعور کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں ـــــ اور یوں پڑھنے والوں کی وہ توقعات مجروح ہو جاتی ہیں جو ان بلند پایہ نقادوں کی ذات سے وابستہ ہوتی ہیں اور ہونی چاہئیں۔

تقسیم کے بعد کئی ایسے مقالات لکھے گئے ہیں جو جامع بھی ہیں اور خیال انگیز بھی ـــــ ان مقالات نے ہمارے انتقادی ادب میں کافی اضافہ کیا ہے ـــــ مگر یہ صورت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکی اور آج کل بعض ایسے مضامین منظرِ عام پر آ رہے ہیں جن میں لکھنے والوں نے فکر و تامل کی بجائے محض رواداری سے کام لینا ہی مناسب سمجھا ہے۔

تنقید کا ذکر آیا ہے تو یہ خیال بھی بے چین کیے دیتا ہے کہ ہمارے چند بہت اچھے مقالہ نگاروں نے تو نہ جانے کیوں مستقلاً چپ سادھ لی ہے سید احتشام حسین، آل احمد سرور، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ممتاز حسین اور ڈاکٹر محمد حسن ـــــ یہ وہ لوگ ہیں جن کے افکار شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتے ہیں۔ ـــــ ان سے یہ شکایت تو کی جا سکتی ہے کہ آخر انہوں نے اپنے اوپر جمود کیوں طاری کر لیا ہے۔ مگر اصل شکایت تو ہمیں اپنے ایسے نقادوں سے ہے جنہوں نے اس گہری بصیرت ہی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے جو ایک نقاد کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے اور بہرحال ہونی چاہیے!

دوسری اصنافِ ادب میں اردو کا موجودہ ناول کمرشل ازم کی سب سے واضح اور حقیقی صورت پیش کر رہا ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ اردو میں بہت کم

ناول لکھے گئے ہیں اور آج لکھا جائے گا کہ اردو میں نہایت پست ناول بہت بڑی تعداد میں لکھے گئے ہیں — اگر پہلے اردو ناول کا دامن قریب قریب خالی تھا تو آج اس دامن میں پھولوں کی بجائے کانٹے ہی کانٹے نظر آ رہے ہیں! اس پستی کی ذمہ داری اہلِ قلم پر بھی عائد ہوتی ہے اور ناشرین پر بھی — لیکن اس وقت ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں مصنفوں ہی کو پیشِ نظر رکھ کر کہہ رہے ہیں اس لئے ناشرین سے کوئی تعرض نہیں رکھیں گے۔

اردو کا موجودہ ناول اپنے گوناگوں اثرات کی وجہ سے مجموعی طور پر ادب کو جتنا نقصان پہنچا رہا ہے اس کی تلافی غالباً کئی برس میں بھی نہیں ہو سکے گی — ان ناولوں کے لکھنے والوں نے شرمناک حد تک کمرشل ازم کو اپنا لیا ہے۔ اور دھڑا دھڑ ایسے ناول بازار میں آ رہے ہیں جو ادب کے روئے زیبا پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دو چار اچھے ناول پہلے بھی تھے اور آج ان کی تعداد میں کچھ اضافہ بھی ہو گیا ہے — لیکن ہزار دو ہزار کانٹوں کے ہجوم میں چند پھولوں کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ سطحیت کی ایک اور صورت بھی اُبھر رہی ہے — اور وہ ہے ادب کی منصوبہ بندی — منصوبہ بندی ایک مبہم سی ترکیب ہے — اس سے ہماری مراد ہے حکومت کے بعض منصوبوں کو سامنے رکھ کر منصوبہ بنانے والوں کی منشا کے مطابق نظمیں، افسانے یا ڈرامے لکھنا — پچھلے دنوں ہماری نظروں سے ایک ایسا افسانہ گزرا تھا جسے افسانہ نگار نے خاندانی منصوبہ بندی کے واضح نقوش و خطوط کو سامنے رکھ کر مکمل کیا تھا — یہ افسانہ افسانے کی بجائے صحافتی انداز کا ایک بیان معلوم ہوتا تھا —

فکری تخلیق کے کچھ اصول، کچھ تقاضے اور کچھ مطالبات ہیں — ایک شدید جذبہ جب مصنف کی شخصیت کا حصہ بن کر اس کے ذہن کی گہرائیوں سے ہوتا ہوا کاغذ پر صورت پذیر ہوتا ہے تو اسے فکری تخلیق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے — اور اب اگر کوئی صاحب کسی منصوبے کو اس طرح فکری تخلیق بنا دیں جس طرح ساتویں آٹھویں جماعت کا ایک طالب علم جواب مضمون لکھتا ہے تو اسے فکری تخلیق، کون کہے گا اور اسے فکری تخلیق کہنے اور سمجھنے کی آخر وجہ جواز کیا ہو گی۔

اگر آپ کسی منصوبے پر لکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے اخبارات کے صفحات موجود ہیں آخر اس معاملے میں اپنے ناپختہ افکار کو نظم یا افسانے کی صورت ہی کیوں دی جائے۔ ادب کو تو بیانے کا اگر یہی ڈھنگ ہے تو پھر ادب اور نوبت کچھ ہو سکتا ہے — ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا!

ادبِ لطیف کا فروری نمبر بدستور یکم فروری کو شائع ہو گا۔

(مینجر)

پروفیسر حنیف فوق

تنقیدِ جدید کے بنیادی اصول

ادب انسانی تہذیب کی آواز ہے اور ادبی تخیل کی رسائی ہمیشہ انسانی فکر کے معلوم و نامعلوم گوشوں تک رہی ہے۔ جدید دور میں زندگی اتنی تیزی سے بدل رہی ہے کہ اس کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے مفہوم اور حدود کا تعین کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ تنقید جو اس بارِ گراں کی امانتدار ہے کبھی بھی کائنات کے کسی فلسفیانہ تصور کے بغیر اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہو سکی ہے۔ ادب تخیل ہے یا وجدان، اسے شعوری عمل کہا جا سکتا ہے یا غیر شعوری تخلیق، ادبی کاوشیں خواب کے نور سے روشن ہیں یا بیدار ذہن کا پرتو، ادب سماجی مظہر ہے یا انفرادی اظہار، ادبی تخلیق ہیئت کی جستجو ہے یا موضوع کی فنکارانہ تکمیل، ادب حسن کی پرچھائیں ہے یا مسرت کا نقش، اس میں کشمکشِ وجود کی تلخیاں ملتی ہیں یا قوتِ شفا کی شیرینیاں، اس کے خیر و شر کے تصورات مجموعی انسانی تہذیب سے کیا علاقہ رکھتے ہیں اور کیوں؟ یہ اور اس قسم کا ہر سوال کسی نہ کسی کائناتی تصور کا امین ہے۔ پھر ادب کی ماہیت کے علاوہ اس کے دائرۂ عمل کی بحثیں بھی ادبی تنقید کا خاص موضوع رہی ہیں۔ یہاں ادب اور اخلاق کے باہمی رشتے کا تعین بھی تنقید کا فریضہ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرف تنقید نے ادبی تخلیق کا تجزیہ کر کے ادبی اسالیبِ فکر کے رموز و اسرار کی گرہ کشائی کی ہے۔ اور دوسری طرف خود تخلیقی ذہن کو اپنی خلاقانہ گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ ادب کے جمالیاتی تصورات اور ادبی تخلیق کی فکری بنیادوں کو سمجھنے کی کوشش ہی تنقید کا بنیادی اصول رہا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں انسانی علوم نے اتنی تیزی سے ترقی کی ہے، انسانی نفسیات کے پنہاں گوشے اس طرح ہمارے سامنے آئے ہیں، معاشی محرکات اور انفرادی عمل کے غیر محسوس رابطوں کو اس طور پر روشنی میں لایا گیا ہے، انسانی فکر کی بنیادیں سائنس کی غیر معمولی دریافتوں نے اس انداز سے بدل ڈالی ہیں اور تاریخ کے تسلسل کے واضح تصورات یوں اُبھرے ہیں کہ قدیم تنقید کا فکری سرمایہ، دفترِ پارینہ بن گیا ہے۔ اب مدرسانہ تنقید، رومانی خیال آرائی، لفظی جراحی اور حسنِ ادا کے بندھے ٹکے قاعدے ٹکسال باہر ہیں۔ ادب کے الہامی تصور سے جو بات شروع ہوئی تھی، وہ ہوتے ہوتے زندگی کے تمام مظاہر پر محیط ہو گئی ہے۔ اس لیے تنقیدِ جدید ادب سے تعلق قائم رکھتے ہوئے بھی انسانی علم و آگہی کے ہر مینارۂ نور سے روشنی حاصل کرتی ہے۔

تنقیدِ جدید کا سب سے مشکل کام اقدار کا تعین ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور نے ہمیں انسانی نفسیات، مادی مظاہر، فکری عوامل، طبعی علوم اور فطرت و سماج کے متعلق ایسی واقفیت بخشی ہے جس کا اب سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انسان جو سماجی بندشوں میں گرفتار ہے اور انسان جو چاند تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے وہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں اور اس کے ذہن و اعمال پر اس دو رُخی کشمکش کے اثرات صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ادبی تنقید کے سلسلے میں یہ واقفیت کس حد تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہے؟ کیا ادبی مطالعے میں غیر ادبی علم کی بھی کوئی جگہ ہے؟ اگر تنقید صرف تشریح و تحلیل کا عمل نہیں اور تنقید نگار سے ادبی تخلیق کی قدر و قیمت کے فیصلے کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے تو کیا قدر و قیمت کا سوال صرف ادبی سطح پر نہیں بلکہ پوری انسانی زندگی کے پس منظر میں ادبی تجربے کی معنویت کا سوال نہیں ہے ــ؟

قدیم تنقید اس پھیر میں نہیں پڑتی تھی۔ وہ چند معین لفظوں میں ادبی تخلیقات کے متعلق فیصلہ صادر کر دیتی تھی اور اسے اس فیصلے کے پیچھے چھپی ہوئی کسی نفسیاتی، سماجی، طبقاتی، ذہنی، جغرافیائی، تاریخی، نسلی یا جنسی عمومیت کا گمان نہ ہوتا تھا۔ لیکن آج کے سائنسی طریق کار نے علت و معلول کے وسائل کو ترقی دے کر ہمیں تنقید کے ساتھ ساتھ نظریۂ تنقید کی چھان بین کی طرف بھی مائل کر دیا ہے۔

کیا ان اقدار کو نام بنام گنایا جاسکتا ہے جن کے ذریعے ادب کی پرکھ کا کام لیا جاتا ہے؟ پھر کیا یہ اقدار قائم بالذات اور مطلق وجود رکھتی ہیں یا ان میں بھی عصری حالات کے تحت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ موجودہ علوم نے فن کی تشکیل، فنکار کے ذہن اور اس کے ماحول کے بارے میں ہمیں زیادہ سے زیادہ واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ ان کے ذریعے فنی روایات اور فنی محرکات کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن بذاتِ خود یہ تفہیم اور ذرائع تفہیم کیا ادبی فیصلے کی بنیاد بھی بن سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو انسانی زندگی اور کائنات کے کسی ایک تصور کو دوسرے تصورات کے مقابلے میں کیوں برتر سمجھا جائے؟ اور اگر نفی میں ہے تو ادبی قدر و قیمت کا فیصلہ صرف فنی تکنیک اور ذرائع اثر آفرینی کے پیشِ نظر ہی کیا جاسکتا ہے۔ جن کا حال یہ ہے کہ ہر فن کار کسی نہ کسی انداز سے ان میں اضافہ ہی کرتا رہا ہے۔ نیا مشاہدہ، نیا خیال اور نیا تصور عام طور پر اپنے ساتھ نیا پیرایۂ بیان بھی لے کر آتا ہے چنانچہ اقدار کے تعین کا یہ سوال اس وقت اور بھی الجھ جاتا ہے جب ایسے پیرایۂ بیان، انسانی فکر اور سماجی زندگی سے متعلق کر کے دیکھا جائے۔

یہ اشیاء کے عینی تصور کا نظریہ تھا جس کے پیشِ نظر افلاطون نے شاعری کو نقل کی نقل قرار دیا تھا اور پھر سماجی زندگی کے پیشِ نظر ہی اسے سماج کے لیے مضر بتایا تھا کیونکہ اس کے خیال کے مطابق شاعری جذبات کی تنظیم کے بجائے ان کے فروغ کا باعث ہے۔ اس کے برخلاف ارسطو نے انسانی زندگی پر فن کے اثرات کے پیشِ نظر اپنا تزکیۂ جذبات کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق فن (شاعری یا اس کی ایک قسم) خوف و ترحم کے جذبات کو بروئے کار لا کر جذبے کے اخراج اور ذہن کے سکون کا باعث بنتا ہے۔ سڈنی نے ہوریس کے اس نظریے کو اپناتے ہوئے کہ فن مسرت اور ہدایت دونوں کا باعث ہے یہ خیال پیش کیا ہے کہ فن زیادہ بہتر دنیا کا تصور دیتا ہے کیونکہ فن کی دنیا کے پھول زیادہ معطر، اس کا حسن زیادہ دلکش اور اس کے ہیرو زیادہ بہادر ہوتے ہیں۔ اس کے تنقیدی نظام میں اظہار کی جذباتی قوت ہی فنی اقدار کی بنیاد ہے۔ اس سے پہلے لانجائنس فنی رفعت اور نشاط انگیزی کی صلاحیت کو فن کی امتیازی خصوصیت قرار دے چکا تھا۔ ڈاکٹر جانسن کے خیال میں زندگی کی عمومی نمائندگی اور سچی ترجمانی ہی فن کا منصب ہے۔ ڈرائیڈن نے ہدایت کے تصور کو صرف اخلاقیات ہی تک محدود نہیں رکھا۔ وہ انسانی فطرت کا صحیح اور جیتا جاگتا نقش پیش کرنا فن کا کمال سمجھتا ہے۔ شیکسپیئر فن کو فطرت کا آئینہ بردار سمجھتا ہے اور ورڈز ورتھ کے خیال میں شاعرانہ یا فنکارانہ صداقت بہ یک اثر انداز ہو کر آپ اپنا ثبوت بن جاتی ہے۔ کیٹس فن یا شاعری کو "تقریباً یاد" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ شیلے فن کو تخیل کا اظہار سمجھتے ہوئے فن کار کو قانون ساز، تہذیب کا بانی اور زندگی کے فنون کا ایجاد کنندہ سمجھتا ہے۔ کولرج نے تخیلی ادب پر بحث کرتے ہوئے امتیازات قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے خیال میں ابتدائی تخیل جو بنیادی طور پر تخلیقی ہے۔ روحانی سرگرمی کا باعث بن کر ثانوی تخیل کے ذریعے فن کو معرضِ وجود میں لاتا ہے۔ اس لیے شاعری پر بحث کرتے ہوئے وہ پہلی سرگرمی کو شاعری اور دوسری کو جس سے لفظوں کی مخصوص ترتیب وجود میں آتی ہے نظم کا نام دیتا ہے۔ یہ اور اس نوع کے دیگر تصوراتِ ادب پر غور کرنے والوں کا موضوعِ بحث رہے ہیں۔ اور اپنے اپنے نظامِ فکر کی پابندی کرتے ہیں۔ ادب کا مطالعہ مختلف حیثیتوں سے کیا جاسکتا ہے۔ خود ادب کی ماہیت کے بارے میں غور و فکر کرنا، یہ دیکھنا کہ تخلیقِ ادب کے دوران میں ادیب کے ذہن پر کیا واردات گزرتی ہے، ادبی تشکیل کے مختلف درجوں

کا تجزیہ، کسی مکمل تخلیق کی صورت میں اس کی خصوصیات کا جائزہ، ادب کے قاری کا ردِ عمل، ادب سے لطف اندوزی کے عمل کی چھان بین یا ادب سے حاصل کردہ تاثرات کی بازآفرینی، ان تاثرات کی سمت اور ان کے درجے کا تعین اور پھر سماجی زندگی سے ادب کا تعلق یا سماج پر ادب کے اثرات ۔ ان میں سے ہر مطالعہ اپنی جگہ اہم ہے اور بعض اوقات ادب، ادب پارے اور ادبی سرگرمی کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم کرتا ہے ۔ لیکن ان میں سے تنقید کا کوئی بھی طریقہ مکمل نہیں ۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہر مطالعہ اپنے اندر مطالعہ کرنے والے کے نظامِ فکر کی جھلکیاں بھی رکھتا ہے ۔ اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس فکری کرّے کی گردشوں کا راز بھی سمجھا جائے جس کی کشش سے تنقید کا نظامِ ثابت و سیّار قائم ہے ۔

انسانی فطرت و کائنات کے عدمِ تغیر کا تصور کلاسیکی نظریۂ تنقید کی بنیاد ہے کیونکہ اگر ہم یہ مان لیں کہ کائنات متحرک وجود رکھتی ہے اور اس میں ہر زماں ایک انقلابِ دیگر کی نشو و نما ہو رہی ہے تو پھر ادب کو پرکھنے کے لیے کلاسیکی ادب سے اخذ کئے ہوئے جامد اصول کافی نہیں ۔ ضبط، تنظیم اور توازن کے اصول اس وقت کار آمد نہیں ہوتے جب انقلابی تغیرات رونما ہو رہے ہوں اور کائنات کی معنویت میں تبدیلی کے آثار ہوں ۔ جب انسان کا اپنے ماحول سے رابطہ نئی بنیادوں پر استوار ہو رہا ہو یا اس کی سماجی زندگی کے ڈھانچے میں نمایاں فرق آ رہا ہو اس وقت تخیل، طاقت اور جذبے کے عناصر زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں ۔ رومانی تنقید کا اندازِ نظر ان عناصر کو اہم سمجھتا ہے کیونکہ وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کی جامد یکسانیت سے عدمِ اطمینان کا اظہار ہے ۔ لیکن محض تخیل کے زور سے فطرت اور سماج کے اُن اسباب کو بدلا نہیں جا سکتا جو اس بے اطمینانی کے ذمہ دار ہیں ۔ اس کے لیے خارجی زندگی میں شعوری عمل کی ضرورت ہے ۔ لیکن رومانی تنقید ادیب کی انفرادی خواہش پسندی، آرزو کی طرب انگیزی و کربناکی اور (خارجی زندگی کی حقیقتوں سے استواری حاصل کئے بغیر) امیدوں کی کارفرمائی کے عناصر کو اہمیت دیتی ہے ۔ اس کے برخلاف جدید تنقید کا غائتی میلان اُن اصولوں کی جستجو کرتا ہے جو بیک وقت حقیقت کی فنی تشکیل پر بھی قادر ہوں اور اس کی تشکیل کے نتیجے خیال و عمل کے تضاد کو دور کرنے والی متحرک زندگی کی نمائندگی کے پیمانے بھی قائم کر سکیں ۔

جدید تنقید کے بنیادی اصولوں پر گفتگو کرنے سے پہلے اس غائتی میلان کی وضاحت ضروری ہے ۔ ادب انسانی سرگرمیوں میں ایک اہم تہذیبی سرگرمی ہے ۔ لیکن تہذیب کی بنیادیں سماجی ہیں اسلیے ادب پر جبر و قدر کا کوئی تصور محض اس کی باطنی ساخت کے ذریعہ قائم نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ ادب کے نشیب و فراز انسانی تہذیب کے عروج و زوال کی کہانی سُناتے ہیں ۔ تہذیبی زوال کے دوران میں بھی کوئی عظیم ادب پارہ وجود میں آ سکتا ہے ۔ لیکن اس کی عظمت اس امر میں پنہاں ہوتی ہے کہ وہ اس تہذیب کی زوال آمادگی کو موثر انداز سے پیش کرتا ہے یا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے ۔ ادبی تجربہ اپنے زمان و مکاں میں ان خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جن کی تعبیر تہذیب کے انحطاطی یا ارتقائی رجحانات سے کی جا سکتی ہے اس لیے جدید تنقید کا غائتی میلان اس تجربے کو زیادہ اہم سمجھتا ہے جو تہذیبی ارتقاء کا امانت دار ہے ۔ اس کے علاوہ وہ تجربہ نسبتاً زیادہ معنویت کا حامل ہے جو متضاد و مخالف عناصر کے درمیان انسانیت کے تہذیبی مستقبل کی نوید لیے ہوئے ہے ۔ موت و زیست کی کشمکش میں جدید تنقید کا غائتی میلان زندگی کا ساتھ دیتا ہے خواہ موت نظر فریبی کا کتنا ہی سامان کیوں نہ رکھتی ہو ۔ پھر یہ تہذیبی مستقبل حال کی جد و جہد کے ذریعے ہی بروئے کار آ سکتا ہے ۔ اس لیے جدید تنقید زندگی کے حرکت و عمل کے سرچشموں کی تلاش کرتی اور ادبی بصیرت میں ان کی جھلک دیکھنا چاہتی ہے ۔ اس طرح جدید تنقید کا غائتی میلان خیال و عمل، اور حسن و افادیت کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش ہے ۔ اس لحاظ سے کہ یہ خلیج ایسی تہذیب کی دین ہے جس نے انسانیت کے مجموعی شعور کو پارہ پارہ کر کے خانوں میں بانٹ دیا ہے جدید تنقید کا یہ میلان بذاتِ خود نئی انسانی تہذیب کی سمت خلاقانہ اشارے کی حیثیت رکھتا ہے ۔

ادبی تجربے کی مختلف نہیں ہو سکتی ہیں۔ زندگی بذاتِ خود تجربوں کا سلسلہ ہے لیکن ادبی تجربہ زندگی سے ماخوذ ہوتے ہوئے بھی آزادانہ وجود رکھتا ہے۔ یہ تجربہ حقیقت کی فنی تشکیل کرتے ہوئے بے مقصد اور الگ تھلگ بھی ہو سکتا ہے اور ایک مجموعی تجرباتی نظام کے ذریعے زندگی کی ارتقائی سمت اور اس کے تہذیبی سفر کی نمائندگی بھی کر سکتا ہے۔ ہر ادبی تجربہ جو اس ظاہری کی سطح سے اوپر اٹھ کر تصوراتی شکلیں اختیار کر لیتا ہے لیکن شعوری تصورات اور محسوساتی کیفیات دونوں کا ماخذ ایک ہے۔ اس لیے وہ ادبی تجربہ زیادہ کامیاب کہا جا سکتا ہے جس میں ایک کو دوسرے سے الگ نہ کیا گیا ہو اور دونوں مل کر ادب پارے کی مجموعی وحدت کی تخلیق کرتے ہوں۔ اس کے علاوہ یہ تجربہ نقریباً ذاتی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اور کم و بیش عمومی حیثیت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ادبی تجربہ کی ادیب کے ذہن میں کیمیائی تحلیل و ترکیب ہوتی ہے اور فنی قالب اختیار کرتے کرتے اسے ادیب کی شخصیت کی بھٹی میں تپ کر کندن بننا پڑتا ہے۔ اس لیے اس میں ادیب کی شخصیت کے جلال و جمال، اس کی ذہنی رفعت و نزاکت اور اس کے تہذیبی رچاؤ کے عناصر بھی جگہ پا جاتے ہیں۔ پھر یہ تجربہ معمولی سادہ تجربہ بھی ہو سکتا ہے اور ایسا پیچیدہ تجربہ بھی جو خیال کی صرف ایک شمع روشن نہ کرے بلکہ شمعوں کی قطار روشن کرتا چلا جائے۔ اس تجربہ میں انضمام کی کیفیت بھی ہو سکتی ہے اور ادھورا پن بھی۔ اس میں گہرائی اور شدت بھی ہو سکتی ہے اور انتشار و کم مائیگی بھی۔ اس کے ذریعے زندگی کی ساکن سطح کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کی حرکت کو بھی۔ لیکن جب تک یہ تجربہ اپنے اظہار کے لیے مناسب پیرایۂ بیان اور موزوں آہنگ تلاش نہیں کر لیتا۔ اس کی فنی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔ اظہار کے الفاظ اور اُس کے لہجے دونوں میں ادیب کا ذہنی تجربہ رنگ آمیزی کرتا ہے۔ قدیم تنقید نے خیال و معنی یا موضوع و ہئیت کی ثنویت قائم کر رکھی تھی لیکن تنقیدِ جدید ادبی تجربے کو اظہار سے الگ کر کے نہیں دیکھتی۔ اس تجربے کی معنویت پر کھنے کے لیے ہمیشہ کے لیے معین سانچے بنانا مشکل ہے کیونکہ مسلسل رواں سلسلۂ حادثات ہے۔ البتہ یہ لمحات و حادثات اور مواقع و امکانات ادبی صورت پذیری کے بعد معین شکل ضرور اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ہر گریزاں لمحہ ان ادبی صورتوں کی معنویت کو چیلنج کرتا اور پھر نئے مفہوم میں اسے مستحکم کرتا رہتا ہے۔ اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ ادب کے شاہکار ترشتے ہوئے ہیرے کی طرح روشنی کے نئے نئے زاویوں سے جگمگاتے رہتے ہیں کیونکہ ان میں وقت کے بہنے کا وار سہہ کر بھی اپنے جوہر نمایاں کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ تنقیدِ جدید اس ادبی معنویت کو زندگی کے پس منظر میں دریافت کرتی ہے۔ وہ ادبی تجربہ کی آگ سے گذرتی اور ادب پارے کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ ادبی روایات کے ذخیرہ کو سمیٹے کے ساتھ ساتھ زندگی پر مستحکم گرفت اور اُس کی بلند ترین شعوری سطح سے واقفیت کے بغیر وہ تجربہ اور تجربے میں کوئی فرق نہیں کر سکتی لیکن تنقیدِ جدید ادبی تجربات کی صرف تعبیر ہی نہیں کرتی ان کی قدر و قیمت کے فیصلے بھی کرتی ہے۔ اس لیے ہم اپنی آسانی کے لیے ایک بنیادی اصول یہ وضع کر سکتے ہیں کہ جدید تنقید ادب کو پرکھنے کے لیے اپنے مجموعی شعور کی روشنی میں (جس میں ادبی اور غیر ادبی دونوں ذرائع اکتساب شامل ہیں) ادبی تجربے کی معنویت کا تجزیہ اور تعبیر کرنے کے بعد انسان کی تہذیبی سرگرمی سے اس کا تعلق دریافت کرتی اور پھر اس کے مقام کا تعین کرتی ہے۔

تنقیدِ جدید اپنے غائتی میلان کے زیرِ اثر ادب کے آئینے میں انسانوں کے درمیان بہتر سے بہتر رابطوں کی جستجو کرتی ہے۔ وہ رابطے جو سماج و فطرت کی پیہم کشاکش میں انسان کو زیادہ سے زیادہ آزادی عطا کر سکیں۔ لیکن تنقیدِ جدید میں انسانیت دوستی کا یہ تصور باہر سے عائد کیا ہوا نہیں ہے بلکہ خود زندگی میں اس کی بنیادیں ملتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر آنے والا کل آج سے لازمی طور پر بہتر ہو لیکن مجموعی زندگی کی پیہم حرکت ایک بہتر انسانی مستقبل کی نشان دہی ضرور کرتی ہے۔ آج کا انسان ابتدائی دور کے انسان کے مقابلے میں کئی معنوں میں زیادہ آزاد

حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے ماحول پر کل کی بہ نسبت زیادہ قابو حاصل کر لیا ہے اور فطرت کی بہت سی وحشی طاقتوں کو رام کر کے ان سے انسانیت کی خدمت کا کام لے رہا ہے۔ سائنس زندگی کی حلیف ہے اور اس لیے اسے ادب کا حریف سمجھنا غلط ہے۔ سائنس اور سماجی علوم کے وسائل سے کام لے کر انسان بہتر سماجی تنظیم کی طرف مائل ہے جہاں ہر فرد اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں اور اپنی ذات کے امکانات کو ماحول کی آزادی میں بہتر سے بہتر طور پر بروئے کار لا سکے۔ اس لیے تنقیدِ جدید فطرت کی غلامی کے بجائے فطرت کی تسخیر کا کائناتی تصور رکھتے ہوئے ادب کو حقیقت پسندی کا نیا آہنگ دیتی ہے۔ یہاں انسانی عمل ایک مثبت حقیقت کے طور پر وجود میں آتا ہے اور زندگی کے منفی اثرات بھی اس اثباتی حقیقت کا استحکام کرتے ہیں، اس کی نفی نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی میں بدصورتی، برائی اور جبر کے پہلو نہیں۔ درحقیقت ان پہلوؤں سے انسانیت کی ازلی خوبصورتی نیکی اور آزادی کا تصادم ہی فن کے شہ پاروں کو وجود میں لاتا ہے۔ اس لیے جدید تنقید صرف ادیب کی رائے یا نظریے میں زندگی کی اثباتی حقیقت کی جھلک دیکھنا نہیں چاہتی بلکہ وہ ادبی تجربے کو اس تصادم کا مظہر سمجھتی ہے۔ وہ تنقید جو محض رایوں یا نظریوں کی بنیاد پر ادب کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے حقیقت کا صحیح شعور نہیں رکھتی۔ ادیب کی رائے یا نظریے سے زیادہ اہمیت اُس ادبی تجربے کی ہے جس کا اظہار ادب میں ہوا ہے۔ اس ادبی تجربے میں فنکارانہ انتخاب کا عمل کس طرح بروئے کار آیا ہے، اس میں حادثات کی منطق کس صورت سے رونما ہوئی ہے اور اس کے تصوراتی تانے بانے میں زندگی کا اثبات کس طور سے پایا جاتا ہے، ان امور کی دریافت جدید تنقید کا کام ہے۔ اس طرح تنقیدِ جدید ادب کی تجرباتی حقیقت کو زندگی کے بہتر شعور کی روشنی میں جانچتی، خارجی زندگی سے اس کے رابطوں کی وضاحت کرتی اور اس کی رسائی یا نارسائی کے امکانات کا جائزہ لیتی ہے۔ تنقیدِ جدید ادب کو نہ تو ذہنی مزاج کا قائم مقام سمجھتی ہے اور نہ اسے سہل الحصول نسخۂ ہدایت بنانا چاہتی ہے۔ اس کے برخلاف وہ ادب کو انسانی تجربات کا نچوڑ، متحرک زندگی کا نمائندہ اور تہذیبی ارتقا کا آئینہ دار سمجھتی ہے۔ اس لیے ادبی حقیقت محض واقعیت کی تفصیل کا نام نہیں بلکہ انسانی شعور اور زندگی کے مظاہر کی مسلسل حرکت کے تمام رابطوں کی دریافت کا نام ہے۔ اس لیے جدید تنقید ادب میں حقیقت پسندی کو معیار ٹھہراتے ہوئے حقیقت کا نیا شعور عطا کرتی ہے اور اسے اس کا دوسرا بنیادی اصول کہا جا سکتا ہے۔

ادب خطابت یا پروپیگنڈے سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ ادب کو پروپیگنڈا سمجھنے والے ادب کی صحیح ماہیت سے واقف نہیں۔ ادب استدلالی طریقِ کار کے ذریعے اپنے تصورات کی صداقت منوانے کے بجائے خود جذبات کی سیالانہ ہم آہنگی یا تخیل کی فنکارانہ تخلیق میں اس صداقت کا انکشاف کرتا ہے۔ اس طرح وہ چپکے چپکے انسانی بطون میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے اور اس تبدیلی کے لیے اسے کسی خارجی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ فنی تنظیم کی اندرونی منطق اثر آفرینی کے لیے کافی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس اثر آفرینی کی بنیاد خارجی زندگی کی حقیقتوں پر ہے لیکن شاعری اپنی جذباتی دنیا کا رنگ روپ خارجی دنیا سے مستعار لیتے ہوئے بھی آزادانہ وجود رکھتی ہے۔ جہاں لفظوں کا طلسم ایک جہانِ معنی کی تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح افسانہ، ڈراما یا ناول کے کردار و مواقع خارجی دنیا سے توانائی پاتے ہوئے بھی اپنی علیحدہ زندگی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات افسانہ، ڈراما یا ناول کے کردار و مواقع حقیقی زندگی کے کرداروں اور موقعوں سے زیادہ جاندار یا زیادہ اصلیت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں کوئی فرد ہو بہو کسی فنی کردار کی جھلک پیش نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ ناول یا ڈرامے کے واقعات بھی اپنی اندرونی منطق کی پیروی کرتے ہیں۔ کسی نظریے کو لفظوں کا لباس پہنا کر کردار نہیں بنایا جا سکتا اور نہ حقیقی زندگی کی کسی خام واقعیت کو ادب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب زندگی سے مشابہت بھی رکھتا ہے اور اس سے غیر مشابہ بھی ہے۔ سائنس نے لفظوں کی جامد واقعیت کو اپنایا ہے اور ادب لفظوں کے جادو سے کام لیتا ہے۔ اسی لیے ادب میں خواب کی سی فضا ملتی ہے۔ شاید اسی کے پیشِ نظر اناطول فرانس نے اسے زندگی کی

حیثیت سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن یہ ادب کا صرف ایک پہلو ہے اور اس پہلو پر زور دینے والے یا تو ادب سے فرار کا مطالبہ کرتے ہیں یا اُس کی مذمت کرتے ہیں حالانکہ ادب کی یہ داخلی دنیا خارجی زندگی کا بہتر شعور عطا کرتی ہے اور اس کی خوابناک کیفیت، اس کی رمزیت اور اس کی طلسماتی طاقت زندگی کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کا حوصلہ یا امنگ بخشتی ہے۔ اس کے ذریعے حیوانی جبلتیں شائستگی اختیار کرتی ہیں اور جذباتی قوتیں تہذیبی تار و پود بناتی ہیں۔ قدیم تنقید یا تو ادب کی اس مخصوص داخلی کیفیت سے سروکار رکھتی تھی یا خارجی دنیا کے اصولوں کے پیشِ نظر ادبی تخلیقات کا جائزہ لیتی تھی۔ لیکن یہ دونوں تنقیدی راستے ادبی تخلیق کی صحیح منزل کا سراغ لگانے سے قاصر ہیں کیونکہ ان کی بنیاد جزوی صداقت پر ہے۔ تنقیدِ جدید کا طریقِ کار ان سے مختلف ہے اور صداقت کے مجموعی تصور پر مبنی ہے۔ بلند سے بلند خارجی شعور تنہا ادبی تخلیقات کے پُرپیچ عمل کا صحیح ادراک رکھنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح محض ادب کا داخلی تجزیہ ادبی صداقت کو استحکام نہیں عطا کر سکتا۔ اس لیے تنقیدِ جدید بیک وقت ادب کی داخلی دنیا کا تجزیہ کر کے اندرونی صداقتوں کی دریافت کرتی اور خارجی زندگی کے شعور سے کام لے کر تہذیبی، عصری و سماجی بنیادوں پر ان صداقتوں کا استحکام کرتی ہے۔ اسی لیے تنقیدِ جدید میں سائنسی واقعیت اور ادبی دلآویزی دونوں کے عناصر ملتے ہیں۔

تنقیدِ جدید اس وقت تک کامیاب نہیں کہی جا سکتی جب تک وہ ادبی تجربے کے نازک سے نازک گوشوں کا صحیح ادراک نہیں رکھتی اور یہ ادراک اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ ادب کی داخلی دنیا کے کیف و رنگ سے خود مانوس نہ ہو لے یا ادبی تجربے کے پُرپیچ مرحلوں کے ہفت خواں کو خود نہ طے کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ادبی تجربے کی صداقت قائم بالذات نہیں۔ اس لیے جدید تنقید اس کے استحکام کے لیے ان تمام سماجی اور تہذیبی سرچشموں کا پتہ لگاتی ہے جہاں سے ادبی تجربہ نوانائی حاصل کرتا ہے۔ ادبی تجربے کی سماجی و تہذیبی بنیادیں ہی اس کی صداقت یا عدمِ صداقت کا معیار عطا کر سکتی ہیں۔ اس اعتبار سے کہ فطرت و کائنات کے متعلق تمام علم و آگہی انسانی عمل کا نتیجہ ہے۔ ادب پارے کی داخلی اور خارجی دنیاؤں میں رابطوں کی دریافت کا تخلیقی عمل ہی جدید تنقید کو وہ آگہی بخش سکتا ہے جس سے کام لے کر وہ ادبی تجربہ کی گوناگوں کیفیات، اس کے مدارجِ صحت اور اس کے سلسلۂ تخیلات کا تجزیہ کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے تنقیدِ جدید میں ادب کی خارجی اور داخلی دنیائیں ایک دوسرے کا سامنا کرنے والی دو مختلف دنیائیں نہیں رہتی ہیں بلکہ اس کی جستجو کے تخلیقی عمل کی گرمی سے پگھل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ اس لیے تنقیدِ جدید کا تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ بیک وقت ادب کی داخلی دنیا کے کیف و کم اور اس کے خارجی ماحول کے پیچ و خم سے گذرتے ہوئے اپنی جستجو کے تجزیاتی اور خلاقانہ عمل کے ذریعہ ادبی صداقتوں کو تہذیبی اعتبار عطا کرتی اور ایک نئی ادبی وحدت کی تشکیل کرتی ہے۔

ادبی روایات کا ذخیرہ جذباتی حقیقتوں اور ادائیگی کے وسیلوں کے متعلق ادیب کی بہت کچھ رہنمائی کر سکتا ہے۔ ادب میں کسی جذبے کا اظہار خود اس جذبے کی نازک کیفیتوں سے بہت کچھ شناسائی بخش سکتا ہے۔ اسی طرح علامات و روایات، تشبیہات و استعارات اور اظہار کے اسالیب کا سرمایہ اپنے تجربے کے اظہار کے لیے وسیع میدان فراہم کرتا ہے۔ ادب اور ادب کے قاری کے درمیان روایت کے تسلسل کی مشترک زمین کی ضرورت باقی رہتی ہے کیونکہ ادب کی بنیادی شرط ترجمانی بھی ہے اور جب تک ادیب اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک کامیابی سے پہنچا نہیں سکتا اس وقت تک ہم اس کے ادبی اظہار کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے لازمی طور پر اسے زبان و بیان کے اس سرمایے سے استفادہ کرنا پڑتا ہے جو اجتماعی میراث بن چکا ہے۔ لیکن جہاں ادبی روایات کا ذخیرہ ادیب کے لیے اظہار کا وسیلہ ہو جاتا ہے وہاں [illegible] [illegible] اس کا مطالعۂ فطرت اور سب سے بڑھ کر اس کے ادبی [illegible]

تجرباتی و تصوراتی عمل اپنے پیش روؤں یا ہم عصروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک مختلف ہستی ہے۔ ادب میں کوئی جذبہ یا تصور اپنی تمام ترکیفیتوں، اپنی احساساتی نزاکتوں، اپنی تخیلاتی صورتوں، اپنے مفہوم کی پرچھائیوں اور اپنے تلازماتی سایوں کے اعتبار سے محض بازگشت یا ماضی کی تکرار نہیں کہا جا سکتا۔ ہر ادیب گویا کائناتی صداقتوں کی انفرادی دریافت کرتا ہے۔ اس کی شخصیت اور اس کی ذہنی ترکیب کے عمل سے جذبات و تصورات نئی سے نئی صورتوں میں ڈھل کر نکلتے ہیں۔ ان حالات میں روایات کے سنگِ میل جو ان جذبات و تصورات کے لیے اظہار کی مقررہ گذرگاہیں تجویز کرتے ہیں، تخلیق کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اظہار کے مقررہ اسالیب، بندھے ٹکے استعارات و تشبیہات، فرسودہ علامات اور سنگلاخ روایات (جو اپنی خیال آفرینی کی صلاحیت کھو چکی ہیں) ادبی تجربے سے اس کی آزادی اور تازگی چھین لینے کے درپے ہیں۔ پھر مشکل یہ ہے کہ کسی ادیب کے لیے اپنے عہد تک قائم کی ہوئی ادبی روایات کو نظر انداز کر دینا بھی محال ہے۔ کیونکہ وہی روایات تو ادبی تجربے کو سانس لینے کے لیے زمین عطا کرتی ہیں۔ ہر ادیب اپنے تجربے کو اس کی تمام تر انفرادی خصوصیات کے ساتھ پیش کرنے کے لیے مناسب ترین ہیئت یا موزوں ترین پیرایۂ بیان کی مسلسل جدوجہد کرتا ہے۔ یہ جدوجہد کس حد تک کامیاب ہوئی ہے اس کا فیصلہ کرنا جدید تنقید کا کام ہے۔ کیونکہ تنقیدِ جدید کا ایک بنیادی تصور یہ بھی ہے کہ ہر کامیاب ادبی تجربہ ادب کی قائم شدہ صورتوں سے پیہم ذہنی تصادم کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس تصادم کے دوران میں وہ روایات کی زندہ خصوصیات کو جذب کر لیتا اور ان میں کسی حیثیت سے اضافہ بھی کرتا ہے۔ یہ تصور روایت اور بغاوت کے تضاد کو دور کر کے ادب کو نیا لائحۂ عمل دیتا ہے۔ اس تصور کے تحت ادبی تجربات نہ روایت کو نظر انداز کر سکتے ہیں نہ اس کے سنگین حصار میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق روایات کا تسلسل بھی قائم رہتا ہے اور نئے اسالیبِ فکر کے لیے بھی دروازہ بند نہیں ہو جاتا۔

صرف ادبی تخلیق کے تجزیے ہی میں نہیں اس تخلیق کے ادبی روایت بنانے میں بھی تنقیدِ جدید راہنمائی کرتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے حسن و اثر کو ادبی روایات کے وسیع سلسلے سے منطبق کر کے اسے ہم آہنگی بخشتی ہے۔ پھر جہاں ادبی تجربے کے اظہار میں خامی رہ جاتی ہے۔ تنقیدِ جدید فوراً اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات انفرادی تجربہ اپنے اظہار کے لیے ایسے نئے وسائل تلاش کرتا ہے کہ مستحسن ہوتے ہوئے بھی اس دور کا ادبی مزاج انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ تنقیدِ جدید ان نئے اسالیبِ فکر کے لیے زمین ہموار کرتی اور جہاں خود ان اسالیبِ فکر میں ناہمواری پائی جاتی ہے، اس کی طرف اشارہ کر کے اسے دور کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس طرح تنقیدِ جدید روایت کا تنقیدی تحفظ کرتی اور بغاوت کو روایت کا اعتبار بخشتی ہے۔ چنانچہ تنقیدِ جدید کا چوتھا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ ہر ادبی تجربے کی صورت آفرینی کو ادب کی روایتی صورتوں کے تصادم کا نتیجہ سمجھتے ہوئے انفرادی اظہار کی تازگی و آزادی کو روایت کے تسلسل کے ساتھ قائم رکھنا چاہتی ہے اور اس لیے کسی ادب پارے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ان دونوں خصوصیات کے پیشِ نظر ہی اس کی قدر و قیمت کا تعین اور ادبی روایت کی نئی سطح قائم کرتی ہے۔

اب تک ہم نے ادبی تجربے کو موضوعِ بحث بنایا ہے لیکن کسی ادیب کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین اس کے تجربات کی مجموعی صورتوں سے ہے۔ جب ہم کسی ادیب کا مجموعی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں تو صرف ہر تجربے کی قدر و قیمت کا، مذکورۂ بالا اصولوں کی روشنی میں تعین جمع کر دینا کافی نہیں۔ اس وقت تنقیدِ جدید کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ان تجربات کی وسعت، گہرائی اور ہمہ گیری کا اندازہ لگائے۔ اگر ان میں اکثر تکرار پائی جاتی ہے تو اس کا ذہنی افق زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا۔ اس کے برخلاف اگر ان تجربوں میں تنوع اور

تازگی کا احساس ہوتا رہتا ہے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ ادیب نے زندگی کے کسی دور میں مسلسل جستجو کے نصب العین کو فراموش نہیں کیا۔ اس نے اپنی آنکھیں زندگی کے نظاروں کے لیے کھلی رکھی ہیں اور اس کے کان ہمیشہ زندگی کی آوازوں کی موسیقی جذب کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ادیب کے مجموعی شعور اور زندگی کی طرف اس کے تجرباتی رجحان کا اندازہ زیادہ بہتر طور پر اس کی مجموعی تخلیقات کے مطالعے کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ انسانی تہذیب کے ہلکے اور گہرے رنگوں کی آمیزش نے انسانیت دوستی اور ارتفاعِ جذبات کے نقوش کو کس طرح ابھارا ہے۔ اس کا فیصلہ اس کے تمام ادبی تجربات کے پیشِ نظر آسانی سے کیا جا سکتا ہے مزید برآں اگر ادیب کا ذہن ارتقائی منزلوں سے گذرا ہے تو اس کا فن بھی ایک نقطے پر ٹھہر کر نہیں رہ جاتا اور وہ خوب سے خوب تر کی تلاش برابر جاری رکھتا ہے۔ تخیلات کے نئے سانچوں، اظہار کے نئے اسالیب اور فکر کے نئے موضوعات کی طرف ہمیشہ آگے بڑھنے والے ادیب کا قدم اٹھتا رہا ہے۔ مجموعی طور سے اس کے ادبی تجربوں نے زندگی کی جن سرحدوں کی دریافت کی ہے، اس کی ذہنی قوسِ قزح میں رنگوں کی جو رنگا رنگ کیفیات ملتی ہیں اور اس کے فن نے جن حدود کا احاطہ کیا ہے، اس کا صحیح عرفان بھی تنقیدِ جدید کا کام ہے۔ چنانچہ پانچواں بنیادی اصول ہم یہ بنا سکتے ہیں کہ کسی ادیب کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے جدید تنقید صرف اس کے ادبی تجربات کے فرداً فرداً تجزیے پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کی تمام تخلیقات کے مطالعے سے ادیب کے زندگی کی طرف عام رجحان اور اس کی مجموعی آگہی کا پتہ چلاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تجربوں میں ترقی و تنوع، رفعت و ہمہ گیری اور گہرائی و گیرائی کے عناصر بھی پیشِ نظر رکھتی ہے۔

ماضی کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے تنقیدِ جدید آج کی ادبی اور علمی آگہی سے ضرور فائدہ اٹھاتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے وہ قدیم ادب کی ذہنی لہروں کا زیادہ بہتر طور پر جائزہ لے سکتی ہے۔ لیکن وہ آج کے ادبی معیارات کو کل پر مسلّط نہیں کر دیتی اس کا یہ مطلب نہیں کہ کل کے لیے اس کے پاس کوئی معیار نہیں۔ ہر دور میں ابھرتی ہوئی زندگی کی مٹتی ہوئی زندگی سے آویزش رہی ہے۔ انسانی سماج میں ہمیشہ فکر و خیال کے کچھ سانچے اپنی سماجی افادیت کھو کر زندگی کو جکڑنے کا حیلہ بن جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لیے ابھرتی ہوئی زندگی نئے سانچے پیش کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ قدیم ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے تنقیدِ جدید اس دور کی فکری بنیادوں کا سراغ لگاتی اور پھر ان کی ادبی معنویت کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ بات قدیم ادب کے مطالعے سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے لیکن تنقیدِ جدید میں تاریخ کے مسلسل بہاؤ کا یہ تصور ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔ اس لیے ہم چھٹا اور آخری بنیادی اصول یہ بنا سکتے ہیں کہ تنقیدِ جدید تاریخ کے مسلسل بہاؤ کا تصور رکھتے ہوئے ادب پاروں کا تاریخی شعور کی روشنی میں تجزیہ کرتی ہے۔ یہ اصول دراصل ادبی اضافیت کا اصول ہے۔ کیونکہ تاریخی شعور کے اعتبار سے انسانی فکر اور فنی اظہار کے تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی قدر و قیمت پرکھنے کے لیے فکر کا تاریخی و تہذیبی ارتقا اور ہر دور میں مثبت خیالات کی ارتقائی لہروں کا عمل واضح کرنا ہوگا۔ چنانچہ تنقیدِ جدید ادب پاروں کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے ان کی اضافی خصوصیات بھی پیشِ نظر رکھتی ہے اور مختلف ادوار یا مختلف ماحول کے ادیبوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے مختلف حدود و امکانات کی وضاحت کرتی ہے۔

تنقیدِ جدید نے اپنے دائرہ عمل کا شعور حاصل کرتے کرتے مختلف منزلیں طے کی ہیں۔ قدیم تذکروں سے لے کر حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری تک واضح سلسلۂ ارتقا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد سے آج تک تنقید کئی فکری منزلوں کو عبور کر چکی ہے۔ ان پیچھے چھوڑی ہوئی منزلوں کا اجمالی خاکہ تنقیدِ جدید کا فکری مقام متعین کرنے میں کارآمد ہوگا۔ تحقیق و تصحیح کے عالمانہ مشغلے نے قدیم ادب کے بہت سے قیمتی گوشوں کا صرف تحفظ ہی نہیں کیا بلکہ جدید ذہن کو ماضی کے گراں قدر سرمائے کا وارث بھی بنایا ہے۔ روزمرّہ، محاورہ اور صحتِ زبان کی بحثوں سے معنی و بیان کے بہت سے پہلو

شن ہوتے ہیں۔ سخن شناسی اور خوش ذوقی کے معیار نے ادب کو فصاحت و نفاست کے مخصوص و محدود دائرے میں امتیازی صفات بخشی ہیں۔ بی تحسین نے بعض اوقات تنقید کا غالب اختیار کر کے ادب کی لطافتوں سے آشنا کیا ہے اور نامانوس تجربوں کو مانوس بنایا ہے۔ تقابلی مطالعے نے فن پاروں اور فنکاروں کی امتیازی خصوصیات کی دریافت میں مدد دی ہے۔ کلاسیکی اصولوں کی سخت گیری اور رومانی تخیل کی فراوانی نے تنقید ے کئی اہم موڑوں کو ادبی تاریخ کا سنگِ میل بنا دیا ہے۔ تاثراتی تنقید نے ادب کی لرزتی ہوئی کیفیتوں کو اسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ تذکرہ تاریخ نے ادبی سرمائے کو محفوظ کیا اور بعض اوقات اس کی تنظیم کی ہے۔ موضوعات کے پیشِ نظر ادب کی تقسیم نے ادبی رجحانات کی تفہیم میں آسانی پیدا کی ہے۔ اسی طرح تاریخی ادوار کے قیام اور ادبی تحریکوں کے تاریخی مطالعے نے خطۂ ادب کی آب و ہوا کا پتہ چلانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات تاریخ کے غلط تصور کے پیشِ نظر بعض نقادوں نے یہ من گھڑت نظریہ بھی وضع کر لیا کہ کسی دور کی شاعری کبھی غلط نہیں ہوتی حالانکہ بعض ادوار میں صریحی طور پر فن کے زوال کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف حال کی ضروریات کے پیشِ نظر نئے ادبی مفہوم کا تقاضا کرتے ہوئے بعض نقادوں نے قدیم ادب کے تمام سرمائے کو یکسر سوختنی قرار دے دیا۔ تنقیدِ جدید اس افراط و تفریط سے بچ نکلی ہے۔ اسی طرح ادب اور اخلاق کی وابستگی کے پیشِ نظر بعض نقادوں نے ادب سے مروجہ نظامِ اخلاق کی پابندی کا سختی سے مطالبہ کیا حالانکہ بعض اوقات اخلاق کی مروجہ قدریں بوسیدہ کپڑوں کی طرح ناکارہ ہو جاتی ہیں اور ادب نئے اخلاقی رابطوں کی تلاش میں ان اقدار سے متصادم ہوتا ہے۔ یہاں تک ضرور صحیح ہے کہ ادب میں مروجہ اخلاق کے بجائے وسیع تر انسانی تعلقات کی عالی مشربی پائی جاتی ہے۔ دورِ حاضر میں سوانح نے ادیب کی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں مدد دی ہے لیکن اس کے غیر محتاط استعمال نے ایلیٹ کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ فن شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ اس سے فرار ہے۔ ظاہر ہے کہ ادیب کی زندگی کے وہ پہلو ضرور اہم ہیں جو اس کی تخلیقات سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں لیکن ادب میں شخصیت کا میکانکی اظہار نہیں ہوتا۔ اس لیے ادب میں شخصیت کے میکانکی اظہار اور شخصیت سے فرار کے دونوں نظریے انتہا پسندی پر مبنی ہیں۔ ادب برائے ادب کا نظریہ ایسے سماج سے فرار کے تصور پر مبنی تھا جس نے حسن و توانائی کی قدریں کھو کر تجارتی اقدار کو اپنا لیا تھا لیکن جب زندگی کی حرکت حسن و افادیت کے نئے معیار قائم کرتی اور ابھرتی ہوئی جدوجہد کی صورتوں سے توانائی پاتی ہے۔ اس وقت یہ نظریہ فرار کے ساتھ ساتھ پسماندگی کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ بعض اوقات تنقید نے ادبی تجربے کی سماجی معنویت سے قطع نظر صرف اس تجربے ہی کو اہم سمجھا ہے چنانچہ والٹر پیٹر یہاں تک کہتا ہے کہ تجربے کا ثمر نہیں بلکہ تجربہ بذاتِ خود قیمتی ہے۔ لیکن تجربہ اسی وقت اہمیت اختیار کرتا ہے جب وہ سماجی معنویت کا حامل ہو۔ بعض نقادوں نے تنقید میں گفتگو کا چٹخارہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی تنقید فنی تجزیے سے زیادہ مہذب یا ظریفانہ گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ تنقید کا منصب صرف یہ نہیں ہے۔ بعض نقادوں نے ادبی تجزیے اور ادبی کاریگری کا موضوعِ خاص قرار دیا ہے اور سلسلہ در سلسلہ پھیلی ہوئی زندگی سے ادب کے رابطوں کو فراموش کر دیا ہے۔ اسی طرح ادب کے عمرانی مطالعے نے ادب کے سماجی پس منظر کی وضاحت تو کی ہے لیکن ادبی تجربوں کی انفرادیت کو فراموش کر دیا ہے۔ بعض نقادوں نے ادبی جمالیات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان میں کروچے نے جمالیاتی وجدان کو اظہار سے منسلک کیا ہے۔ اس کے خیال میں فن ذہنی تجربہ ہے اور اس کا اظہار اس تجربے کے نشانات ہیں۔ ان نشانات کے ذریعے ہم جمالیاتی وجدان کی اصل تک پہنچتے ہیں۔ لیکن فن کا جمالیاتی پہلو نہ قائم بالذات ہے اور نہ سماجی عناصر سے قطع نظر کر سکتا ہے۔ جغرافیائی حالات، نسلی اثرات اور انسانیاتی علم کی روشنی میں بھی ادب کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مطالعہ محدود حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ادب اور زندگی کی وابستگی کے تصور یا ادب اور انقلاب کے تعلق کے نظریے کے تحت بھی ادب کا مطالعہ کیا گیا ہے لیکن اس مطالعے میں گہرائی نہیں ہے۔

فطرت پرستی کے تصور نے زندگی کے خام مواد پر حقیقت کی بنیاد رکھی ہے اور ادب میں وجودیت کے گل بوٹوں نے جبریت کا نیا تصور دیا ہے۔ لیکن ان افکار کی فلسفیانہ بنیاد کمزور رہی ہے۔ ادبی تخلیقات کا انفرادی تجزیہ بھی کیا گیا ہے اور اس تجزیے میں علمِ لسان و صوت کی بخشی ہوئی آگہی بھی کام میں لائی گئی ہے۔ زبان پر خصوصی توجہ کرتے ہوئے بعض نقادوں نے معنوں کے معنی دریافت کئے ہیں۔ بعض نے آلۂ ترسیل کی حیثیت سے زبان کے مختلف عناصر مثلاً استعارہ، تشبیہہ، تجسیم، کنایہ، علامات، قولِ محال، طنز، ظرافت اور تلازمات سے لے کر اس کے صوتی اثرات تک سے بحث کی ہے۔ بعض نقادوں نے ادب میں کئی آوازوں اور بعض نے معنوں کی مختلف سطحوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ موجودہ نفسیاتی دبستانوں نے بھی تنقید کو متاثر کیا ہے اور جنسی رمزیت اور نفسیاتی تحلیل کے کتنے ہی داؤں پیچ آزمائے گئے ہیں۔ نفسیاتی مطالعہ لاشعور کی تاریک وادی سے لے کر ذہنی اختلال کے دھندلکے تک اپنے فکری نظام کا جال بچھا رہا ہے۔ انفرادی نفسیات اور سماجی نفسیات کے مختلف اصولوں کے پیشِ نظر ادبی تخلیقات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بعض نے ادب کی توانائی کا سارا راز اجتماعی لاشعور کی وادیٔ ظلمات میں دریافت کیا ہے۔ لیکن نفسیات کی ان ہوائیوں کو ابھی سائنسی روشنی حاصل نہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم ان دبستانوں کی فکری بنیاد کو (جو درحقیقت فلسفیانہ تصور پر مبنی ہے) یا ان کی تصوراتی حیثیت کو تسلیم نہ کریں تو ان کا شیشۂ معاد چکنا چور ہو جاتا ہے۔ تنقید کے یہ سارے نظریات ایک مخصوص یا محدود میدان میں تلاش و جستجو کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں زندگی کی مجموعی آگہی کی جھلک نہیں ملتی ہے۔ یہاں ماہرانہ تخصیص اپنا دائرہ محدود سے محدود تر کرتی جاتی ہے۔ دراصل یہ جدید نظریۂ تنقید ہی ہے جو ادب کی انفرادی خصوصیت سے لے کر آفاقی عمومیت تک ہر پہلو کا زندگی کے مجموعی شعور کی روشنی میں جائزہ لیتا ہے اور جہاں استدلالی ربط اور فکری صداقت کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ ہم آہنگی بھی ملتی ہے۔

پچھلے چند برسوں میں زندگی کی رفتار کچھ اتنی تیز ہو گئی اور نئے اثرات ادب پر اس تیزی سے حاوی ہونے لگے کہ تنقیدی رجحانات میں صرف ان کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ لیکن آج کی تنقید اس نیرنگِ نظر سے اتنی مانوس ہو گئی ہے کہ اب یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ دم لے کر اپنی کارگہِ فکر کا جائزہ لے سکے گی اور اس کے بنیادی اصولوں کا تعین کر سکنے کے قابل ہو گی۔ زندگی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ہم ان سے مطمئن ہوں یا غیر مطمئن بہرحال اب انھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ تبدیلیاں ایسی ہیں جنھوں نے فکر کے تمام سرچشموں پر اثر ڈالا ہے۔ آج ادیب سماجی اور تخلیقی دونوں حیثیتوں سے سیاست و ریاست دونوں کا موضوعِ کشش ہے۔ دونوں طاقتیں کسی نہ کسی طور پر اس کی شہرت اور اس کی صلاحیتوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ ایک طرف فکری آزادی کی پاداش موت، زنداں یا جلا وطنی ہے اور دوسری طرف انعامات، نوازشوں یا سکوں کی جھنکاریں ادبی ضمیر کے لیے سنہرے جال بُن رہی ہیں۔ ادیبوں کی تنظیمیں بن رہی ہیں اور ان کے تہذیبی وفود ترتیب دیے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب خود ادیبوں کے اپنے فکری تقاضوں کے مطابق ہو رہا ہے یا شرائط طے کرنے والے سیاست یا ریاست یا دونوں ہیں؟ ان حالات میں تنقیدِ جدید کا ناگزیر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ادیبوں کے چھپے ہوئے فکری تقاضوں کو بروئے کار لائے اور انھیں تخلیق کی عظمت سے باخبر رکھے۔

آج کی مشینی تہذیب میں جس نے حسن کو غیر ذمہ دار اور ذمہ داری کو غیر حسین بنا دیا ہے ادبی تخلیقات سے بیک وقت حسن اور ذمہ داری دونوں کا مطالبہ بڑا کڑا مطالبہ ہے۔ ڈی ایچ لارنس نے گھبرا کر کہا تھا کہ "انسانی نسل مر رہی ہے۔ یہ ایک اکھڑے ہوئے درخت کے مانند ہے جس کی جڑیں ہوا میں ہیں۔" آج خلوص جذبات پر جھوٹ کا گمان ہوتا ہے اور جھوٹ نے قبائے خلوص پہن رکھی ہے۔ آرنلڈ نے مذہب کی مابعد الطبیعاتی بنیادوں کو سائنس کی زد میں پا کر شاعرانہ تجربے میں اس دور کے ذہنی انتشار کا حل تلاش کیا تھا۔ اسی طرح رچرڈز نے سائنس سے

ادب کے دفاع کا کام لیتے ہوئے اپنے نظامِ تنقید کی نفسیاتی اعمال و اثرات پر بنیاد رکھی تھی۔ لیکن آج ادبی تجربہ خود "ہونے یا نہ ہونے" کی کشمکش میں گرفتار ہے کیونکہ بیرونی دباؤ اتنے بڑھ گئے ہیں کہ اندرونی لگن خطرے میں پڑ گئی ہے۔ صحافتی تحریروں نے ادب کی جگہ لے لی ہے۔ بڑے ناموں کا طلسم ٹوٹ رہا ہے اور زور و شور سے ابھرنے والے نئے نام ادب کے سمندر میں بلبلے کی ثبات لے کر آتے ہیں۔ جب وقت کا طوفان گزر جاتا ہے تو کنارے پر بہت کم نقوش باقی رہ جاتے ہیں۔ مقابلۂ شہرت اور تجارتِ ادب کے تیز جھکڑوں میں ادیب کے ضمیر اور تخلیق کی آزادی کے چراغ اس طرح جھلملا رہے ہیں کہ زمانے کو ادیب سے مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ "چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے؟" شہرتِ عام اور مالی منفعت کا خیال ادب کی تخلیقی صداقت سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ ادب کا کاروبار کرنے والے اس خیال کو ہوا دے رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی میں اس تخلیقی حرکت کی کمی ہے جو ادبی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ فائدے کے لالچ اور شہرت کی ہوس سے ادیبوں کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں اور سامنے کی سچائیاں دور کی جھلملاتی ہوئی روشنیاں بنتی جا رہی ہیں۔
اس لیے تنقیدِ جدید کا کام اس دور میں اور اہم ہو گیا ہے کیونکہ اسے نہ صرف دھڑکتی ہوئی نئی زندگی کا خواہ اس کا جلوہ طوق و سلاسل یا دار و رسن ہی میں کیوں نہ نظر آئے ——— خیر مقدم کرنا ہے بلکہ ادیبوں کو جینے کے نئے آدرش بھی دینا ہے۔ ان کی تخلیقی لگن کو باقی رکھنا ہے اور ان کے مرحلۂ شوق کو تیز تر کرنا ہے۔ حیات کے تازہ کار ولولے انسانی جذبات و اعمال کو نیا سوز و ساز دے رہے ہیں اور ادب کی سونی وادیاں کب سے اس آہنگِ نو کی منتظر ہیں۔ انسانی وجود کی مختلف سطحیں ادبی اظہار کے لیے مچل رہی ہیں۔ انسانی شعور کی گہرائیاں اور بلندیاں تخلیقی کرب سے تڑپ رہی ہیں۔ نئے تصوراتی امکانات فن کو آوازیں دے رہے ہیں۔ اگر تنقیدِ جدید ادب کو زندگی کی ان نئی آوازوں، نئے رنگوں، نئے نظاروں اور نئی تصوراتی صورتوں کا احساس دلانے سے قاصر رہتی ہے تو اسے صحیح معنوں میں جدید کہنا صحیح نہیں ہوگا۔

تنقیدِ جدید کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ صرف نئی باتوں کا جواب نہیں دیتی بلکہ نئے سوالات بھی اٹھاتی ہے۔ اس کی زیریں لہر استفہامی ہے جو کائنات کے عصری تصورات کو تسلیم کر لینے پر مبنی نہیں بلکہ ان تصورات کو بدلتی ہوئی زندگی کے پس منظر میں تجسس و استعجاب کا نشانہ بنا کر نئے حقائق کا جائزہ لیتی ہے۔ ہر دور میں انسان کی متجسس روح جو ہر لحظہ نئی صداقتوں کے انکشاف کے لیے بے چین رہتی ہے، پرانے مسلّمات کو للکارتی رہی ہے۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ کے تمام کارنامے اسی متجسس روح کی داستان سناتے ہیں۔ اس لیے تنقیدِ جدید کو اگر جدید کہا جا سکتا ہے تو اس کی شناخت کا طریقہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس نے انسان کے علم و آگہی میں کیا اضافہ کیا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس نے وہ کون سے اہم سوالات اٹھائے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے؟ ان سوالات کے ذریعہ حقیقت کا کوئی اہم پہلو بے نقاب ہوتا ہے یا نہیں؟ ان سوالات میں اپنے عصر کے ذہنوں کو اسیر کر لینے کی طاقت کس حد تک ہے؟ ان کا جواب دینے کے لئے فکر کے سوتوں کو کھنگالنے کی ضرورت پڑتی ہے یا نہیں؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ سوالات کسی نئی فنی معنویت یا ذہنی دریافت کی کسی فنی جھلک کا نقش پیش کرتے ہیں یا نہیں؟ اس لحاظ سے تنقیدِ جدید اپنے مواد کے اعتبار ہی سے جدید نہیں ہوتی بلکہ اس کا اندازِ فکر بھی روایت کے پرانے سانچوں کے بجائے حقیقت کے نئے زاویوں کو اپنی گذرگاہ قرار دیتا ہے۔

تنقیدِ جدید ادبی تخلیقات کو اپنا موضوع قرار دیتے ہوئے ادبی شعور کے ساتھ ساتھ خود ادب کے مقصد اور اس کی تہذیبی قدر و قیمت کا واضح احساس رکھتی ہے۔ تنقیدِ جدید صرف اچھے اور برے میں امتیاز کرنے ہی کا نام نہیں بلکہ اچھائی اور برائی کے فلسفیانہ تصور کے ساتھ ساتھ

اپنے دور کی مستقبل آفریں دھڑکنوں سے فن کے رابطے کو قائم رکھنے کی تخلیقی کاوش کا نام بھی ہے۔ اشیاء و تصورات کے ہر لحظہ بدلتے رہنے والے تعلق کو فنی مظاہر پیش کرتے ہیں۔ لیکن فنی صورتوں پر ابہامیت کے حجاب پڑے رہتے ہیں۔ تنقیدِ جدید زندگی کی حرکت کو فنی ابہامیت سے متعلق کرکے ادبی صداقتوں کا انکشاف کرتی ہے۔ ایک دور کی تہذیبی اقدار میں کسی ادبی صداقت کی اہمیت اسی وقت واضح ہو سکتی ہے جب نقاد نے ان قوتوں کو پہچانا ہو جو تہذیبی لہروں کی تشکیل کر رہی ہیں۔ یہ تہذیبی لہریں اپنے تموج سے کس طرح فنی تصورات کی اقدار آفرینی کرتی ہیں۔ اس کا پتہ چلانا اور پھر ابہامیت کے حجابات سے گزر کر انھیں بے نقاب کرنا نقاد کا کام ہے۔ اگر تنقیدِ جدید فنی صورتوں میں نئی تہذیبی قدروں کی پیہم اور مسلسل جستجو نہ کرتی رہے تو ایک دن جامد تصورات، مردہ تخیلات اور فرسودہ اسالیب ہی ہمارے ادب کا سرمایہ بن کر رہ جائیں۔ اس لیے تنقیدِ جدید فنی صورتوں میں نئی تہذیبی منزلوں کی بھی مسلسل جستجو کرتی ہے۔ ادب اور تنقید دونوں کا معیار انسان ہے۔ دونوں کا دائرہ عمل ظاہری طور پر مختلف سہی بنیادی طور پر ایک ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے تقویت پاتے اور ایک دوسرے کا جواز ہیں۔ اس لیے ادب اور تنقید دونوں انسانی زندگی کے تہذیبی ستون ہیں۔ تنقیدِ جدید اپنے مخصوص دائرے میں اس فکری عمل سے سروکار رکھنے کے باعث جسے ہم اقدار کی تنقید کہہ سکتے ہیں خود زندگی کو زیادہ ذمہ دار، زیادہ منظم اور زیادہ باشعور بناتی ہے۔

○

"اعلیٰ درجے کی تنقید میں صرف اعلیٰ ترین ذہنوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ تنقید نگار کی ذہنی سطح ایک مفکر، فلسفی، سائنسدان اور ایک آرٹسٹ کی ذہنی سطح کے برابر ہوگی تب ہی اس کی رسائی اس تخلیقی عمل تک ہو سکے گی جس سے گزر کر ایک فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ اس لیے تنقید سے زیادہ جان جوکھوں کا کام اور کوئی نہیں — تنقید لکھنا اپنے آپ کو ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈالنا ہے۔"

(ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی — فکر و فن — معروضات)

ڈاکٹر سید عبداللہ

ایک نظم گو

مجھے مجید امجد کے کلام کی طرف سب سے پہلے ان کے عجز و انکسار نے متوجہ کیا ——— شاعری اور فن کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور ان کے پس منظر میں شاعر کے خصائصِ نفسی جس انداز میں کام کرتے ہیں، ان کی پوری روداد یہاں ممکن نہیں، سب سے بڑا مسئلہ شاعر کی اَنا کا ہے جو ایک صد جلوہ شے ہے جس کی ایک تجلّی "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کے طورِ سینا پہ برق ریز ہو کر شاعر کو بعض اوقات بڑے دعوے کے اعلان پر آمادہ کر دیتی ہے، اس صورت میں اس کی آواز سخت اثباتی، انائی اور ادّعائی ہوتی ہے۔

مگر اسی اَنا کا ایک اور رنگ بھی ہے جس میں خلوص ایک دوسری شان سے نمودار ہوتا ہے، خلوص تو اس ادّعائی آواز میں بھی ہوتا ہے مگر جب یہ خلوص انکسار کی صدا بن جائے اور ادعائے کمال کی بجائے تمنائے کمال اور آرزوئے دوام کی شکل اختیار کر لے تو اس اَنا کی محبوبی و خوبی اور پیارے پن سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔؟

مجید امجد کی تمنائے کمال اور حسرتِ اظہار بظاہر ایک بات ہی ہے اور وہ بھی سرسری سی، مگر حقیقت میں یہ سرسری بات ہے نہیں، یہ تو اس کے اندر کی دنیا کی ایک ایسی کلید ہے جس سے اس کے قلب و نظر کے بہت سے کمال و جمال آشکارا ہو جاتے ہیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ کمالِ فن اور تکمیل کا ایک بڑا راز "نیاز مندی" بر دوام ہے، میں مدتوں تک ابوالفضل کے اس جملے کا مطلب نہ سمجھ سکا تھا اور سمجھنا مشکل بھی تھا مگر آہستہ آہستہ یہ کھلا کہ فن کار اپنے فن سے جس قسم کی تسکین چاہتا ہے اور اپنے تجربے کو جس مکمل انداز میں ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ معمولی کوشش سے بن نہیں آتا۔ وہ چاہتا ہے کہ حسن اور صداقت کی ایسی لفظی تصویر کھینچے جس کے بعد اس میں ناتمامی کا کوئی احساس باقی نہ رہے مگر شاید ملکۂ اظہار کی تقدیر یہی ہے کہ اس کو شانِ تکمیل میسر نہیں آ سکتی۔ لہٰذا شاعر کا قلب اس اظہارِ مکمل کا علی الدوام آرزو مند رہتا ہے، جو اسے اپنی ناتمامی اور کوتاہی کے اعتراف پہ مائل رکھتی ہے۔ اسی اظہارِ ناتمامی سے وہ ذہنی نیاز و عجز اور ذوقِ تکمیل پیدا ہوتا رہتا ہے جسے غمِ اظہار یا حسرتِ اظہار کہہ دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

اس عجز و حسرت کا اظہار بعض شاعروں کے یہاں سطح پر نظر نہیں آتا مگر مجید امجد کے یہاں سطح پر بھی نمایاں ہے۔ اس کی کتاب کا حرفِ اوّل ہی یہی ہے کہ وہ حسن اور حقیقت کی تصویر بقدرِ ذوق نہ کھینچ سکا اور اس کی کہی ہوئی کہانی ایک ادھوری کہانی یا محض اشاروں میں کہی ہوئی رودادِ شوق ہے۔ مجید امجد کا یہ قول کہ "میری داستانِ عجز یہی نظمیں ہیں" ایک دوسرے اعتبار سے اس کی فن کارانہ عبادت گذاری اور متوازن ذوقِ جمیل کا بھی ثبوت ہے۔ اس کے یہ الفاظ اس کے باطن کی پاکیزگی اور اس کی ذوقی غایت پسندی کا ایک واضح نشان ہیں۔ اس نے کہا ہے "سب سے بڑھ کر خلش اس بات کی ہے کہ یہ بیانِ نامکمل، یہ اظہارِ ناتمام جس کی بنیاد محض تسکینِ ذوق تھی، فن کی ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکا، جو میرا مقصودِ نظر تھیں۔"

گرچہ قلم کی نوک سے ٹپکے
کتنے ترانے، کتنے فسانے
لاکھ مسائل

دل میں رہی سب دل کی حکایت
بیس برس کی کاوشِ پیہم،
سوچتے دن اور جاگتی راتیں
ان کا حاصل ——— !
ایک بھی اظہار کی حسرت!

فن سے عشق سبھی فن کاروں کو ہوتا ہے مگر بعض اس کو "پردہ سخن کا" بنا کر سخن اور فن میں تفریق ڈال دیتے ہیں۔ مجید امجد کے یہاں سخن اور فن میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی ——— وہ بظاہر حسنِ بیان پر مرتے ہیں مگر غور کیجئے تو حسنِ بیان کی یہ جستجو بھی حسنِ زندگی کے ادراک اور اس کی آرزوئے تکمیل ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور ادراکِ حسن کی یہ آرزو کہنے کو محض آرزو سہی مگر یہ آرزو بڑی جاں کاہ قربانی کی طلب گار ہے۔ آرزوؤں کا یہ دیس دور، بہت دور واقع ہے جس کی راہ میں "دھوئیں کے پربت" اور "آنکھ کی جھیلیں" حائل ہیں، آرزو کا یہ دیس شہرِ جنوں کی شاہراہ پر ہے جس کی منزل منزل پہ جدائی کا دیو منہ کھولے کھڑا ہے۔ "ارمانوں کی بھیڑ میں سنگت" اور "سسکتی چاہت" کے سوا آرزومند مسافر کے پاس کوئی زادِ راہ نہیں۔ یہ اشکوں اور آہوں کی دنیا ہے جس میں درد کی نوبت بجتی رہتی ہے اور "تجربہ ہائے زیست کے آرے" اور "تلخیٔ صد احساس کے تیشے" برابر چلتے رہتے ہیں، یہ وہ دنیا ہے جس میں امرت بھی زہر کے پیالے میں پیش ہوتا ہے اور جس میں روشنی کی جھلک بھی ہزاروں دھندلکوں میں پوشیدہ ہے۔

یہ ہے وہ دیس جس میں مجید امجد کا قدم لیلائے حسن کا محمل تلاش کرنے نکلا ہے، جس میں اسے ہر گام "دردوں کے کوہِ گراں" عبور کرنے پڑے ہیں۔ اور فرہاد کی مانند بیستونِ عشق میں خارا شگافی کی صعوبت اٹھانی پڑی ہے۔ پھر کہیں حسن کی وہ ناتمام جھلک (سوچ کی حیراں صورت) اُسے نظر آئی ہے۔ جس کے مدھم مدھم دھیمے دھیمے نقش (معنیٔ صورت یا صورتِ معنی) ان نظموں کی صورت میں مرتب ہوئے ہیں جن کو شاعر نے "شبِ رفتہ" کے نام سے موسوم کیا ہے! ——— شاعر کے لیے شبِ رفتہ سہی مگر قاری کے لیے وہ پیشِ امروز ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ اب کلام مجید امجد کے بارے میں پہلی بات یہ ہے کہ وہ شبِ رفتہ کی شاعری نہیں بلکہ ایسی شاعری ہے جو "امروزِ دائم" کی شاعری ہے۔ وہ صبح کی ہر آفتابی کرن نئی تازگی لاتی ہے۔ وہ ماضی اور حال کے پیمانے سے ناپی بھی نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اس شاعری میں انسانی قلب و جذبات کے مستقل تجربے بیان ہوتے ہیں جو کل اور آج کے تجربے نہیں بلکہ وہ تجربے ہیں جو ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ یعنی عام انسانی جذبے، حسن کی گریزپائی اور محبت کا جنونِ شوق۔ یہ تو دوامی چیزیں ہیں۔ ہر دم جواں، ہر دم رواں۔ یہی وہ رنگا رنگ کیفیات ہیں جن کی تصویریں پیش ہوئی ہیں، میں سوچتا رہا۔ مجید امجد کو دکھ کا شاعر کہوں، یا حسن کا یا محبت کا شاعر؟ میں نے فیصلہ کیا کہ مجید امجد دراصل محبت کا شاعر ہے، یوں سبھی شاعر محبت کے مدعی ہوتے ہیں مگر مجید امجد کی محبت کا رنگ نرالا ہے۔ یہ حسن کی بات محبت سے الگ کیسی؟ مگر محبت کی نارسائی کو کیا کیجے کہ وہ حسن کے ایک پرتو کی گرفت کے لیے لاکھوں برس سے سرگرم سعی و طلب ہے مگر اس کے مقدر میں اس کا حد دل تو گویا ان شمع

شعلے میں پروانے کی راکھ بھی تو باقی نہیں رہتی۔ بہرحال حسن و محبت بظاہر ایک ہی حقیقت کے دو رخ سہی مگر میں حسن اور محبت کو دو الگ حقیقتیں مانتا ہوں۔ خیر یہ بحث الگ ہے۔ مجید امجد حسنِ مطلق میں اعتقاد رکھتا ہے۔ جب تک رسائی ممکن نہیں اس کے نزدیک، مادی دنیا کا حسن محض ایک شعاعِ ناتمام ہے، عارضی ہے، ناپائیدار ہے، یا یوں کہئے خارجی حسن اسی لیے حسن ہے کہ وہ عارضی ہے، البتہ حسنِ مطلق ایک حقیقت ہے جس کا راستہ محبت کے جزیرے سے ہو کر نکلتا ہے اور یہ محبت کا جزیرہ دوریوں، تاریکیوں اور اندھیروں میں گھرا ہوا ہے، حسن کی دولت محبت سے حاصل ہوتی ہے، مگر آہ، محبت کی نارسائی!

ظاہر ہے کہ زندگی کا یہ تصور کرب ناک ہی ہو سکتا ہے، جہاں ایک کرن کی چمک اتھاہ اندھیروں میں لپٹی ہوئی ہو، وہاں شاعر کی امید کے لیے کیا چیز وجہِ تسلی بن سکتی ہے، —— یہ تو وہ عالم ہے جہاں زندگی حسن کی نگاہ غلط انداز تک سے محروم ہے، اور انسان اس کی اسی نیم نگاہی پر فریفتہ ہو کر اس کے حسنِ گریزاں کو گرفت میں لانے کے لیے جی اور جان کھپا جاتا ہے۔ میرؔ نے بھی شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا ؎

کب خضر و مسیحا نے جینے کا مزا جانا
لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا

مجید امجد کی نظم پنواڑی میں حسن کی اسی گریز پائی اور زندگی کی اسی ناتمامی کا تذکرہ ہے —— یہ زندگی کیا ہے، ناتمامیوں کا ایک سلسلۂ طویل ہے، یہ نقشِ قدم کے اس سلسلے سے مشابہ ہے جو جتنا بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی مٹتا جاتا ہے گویا بنتا بھی جاتا ہے اور بنتے ہی بگڑتا بھی جاتا ہے۔ مجید امجد ؎

ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو اس کا کمسن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن ٹھن ٹھن چونے والی کٹوری بجتی جائے
ایک پتنگا دیپک پر جل جائے، دوسرا آئے
(پنواڑی)

—— غرض مدھ ماتے لمحوں کے یہ چلتے آرے "چلتے ہی رہتے ہیں۔ چلتے ہی رہتے ہیں۔ زندگی کا حسن اپنی گریز پائی سے مسحور کرتا ہی رہتا ہے۔ اور تیشے بھی چلاتا ہی رہتا ہے۔ اور بالآخر اسی تسلسل سے وہ اوراقِ پریشاں مرتب ہو جاتے ہیں۔ جن کا نام زندگی ہے جس کا سب سے بڑا سرنامہ "احساسِ فرض" ہے جو اس جرم کی سزا ہے جسے جرمِ وجود کہا جاتا ہے۔

مجید امجد زندگی کے خارجی حسن سے مسحور ضرور ہوتا ہے مگر اس کو حقیقتِ خیال نہیں کرتا —— وہ کائنات کے خارجی اطوار سے بیزار ہی نہیں مایوس بھی ہے، اسے تو نیچر کے حسنِ صد رنگ سے بھی مایوسی ہے (نظم آوارگانِ فطرت) ؎

فطرت کی یہ گوناگونی گلشن، بن، وادی، ویرانے

. . . .

جانتا ہوں یہ سب کیا ہیں صہبا سے خالی پیمانے
جگ کی مٹی کو سونپے ہیں دنیا نے اپنے نذرانے
مجھ سے الگ ہیں مجھ سے جدا ہیں میں بیگانہ، وہ بیگانے

اور زندگی سے یہ مایوسی اس کے ذہن کی فضاؤں میں اس حد تک پھیل جاتی ہے کہ اسے عدم تک سے بھی کوئی امید نہیں، اس کا خیال ہے کہ "یاں بھی اندھیرا واں بھی اندھیرا تھا" ـــ! یہاں پہنچ کر مجید امجد کی رجائیت بھی خاصی مشکوک ہو جاتی ہے اور وہ خودکشی تک کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے مگر شکر کا مقام ہے کہ اسے ایک چیز بار بار تھام لیتی ہے۔ ع

جو میکش لڑکھڑاتا ہے وہ بازو تھام لیتے ہیں

یہ تھامنے والی قوت اس کا وہ جذبۂ محبت ہے جو اس کو اقلیم حسن کی جستجو میں لگائے رکھتا ہے اور وہ شاہد آرزو کی تلاش میں دور کی دنیاؤں میں جا نکلتا ہے جہاں وہ دھند اور غبار کے روزنوں کے اندر سے تاک جھانک کے ساتھ اس کی جھلک پا لیتا ہے یا پا لینا چاہتا ہے۔

مجید امجد کا ذہن خوابوں اور خیالوں کی جھلملیوں میں آسودگی پاتا ہے۔ وہ خارجی حقائق سے بھاگ کر اشیا کے باطنی معانی سے اطمینان حاصل کرتا ہے، وہ موجود فی الخارج سے بہت دور، بہت نیچے کی کسی سطح پر بکھرے ہوئے گہرے اسرار و حقائق کا قائل ہے۔ اس کی اصل دنیا اندر کی دنیا ہے، ظاہر کی دنیا تو صرف "المجاز قنطرۃ الحقیقت" ـــ صرف سمت نما ہے۔ ایک علامت، ایک اشارہ ہے جس کے دریچے سے وہ حقیقی دنیا کو دیکھتا ہے یا دیکھنا چاہتا ہے۔

پھر کیا مجید امجد کوئی صوفی ہے؟ مگر اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ایک آواز یہ کہتی ہے، ہاں وہ صوفی ہے کیونکہ حسن مطلق کا جویندہ ہے، جسم مادی کی بے حقیقی کا قائل ہے اور اس کا منتہا و مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے شاہد آرزو کے اندر یوں جذب ہو جائے کہ دوئی کی بو تک بھی باقی نہ رہے، وہ اس میں محو ہو کر یوں گم ہو جائے گویا وہ اور وہ ایک ہی ہیں۔

مجید امجد اس حد تک تو صوفی ہے مگر وہ کوئی عرفی صوفی نہیں، وہ اگر صوفی ہے بھی تو ایک نئے رنگ کا صوفی ہے جس کا من صوفیوں کے حسن مطلق کے تصور سے جدا ہے۔ کیونکہ صوفی کا من محویت کے عالم میں شاد کام ہو جاتا ہے مگر مجید امجد تو موت کے پار کی دنیا سے بھی خوفزدہ ہے۔ اسے عدم میں بھی تنہائی اور وحشت کا ڈر ہے، وہ شاید لاموجود سے بھی دور کسی اور وادی کا مسافر ہے، جہاں عدم اور وجود کے تفرقے سب مٹ جاتے ہیں۔ مجید امجد کی یہ تشکیک اسے دورِ حاضر کے خود وجودی فلسفیوں اور بے خدا صوفیوں کے قریب لے جاتی ہے، مگر وہ "خود وجودی" بھی نہیں۔ خود وجودیوں کے من کی دنیا سراپا تاریکیوں سے لبریز ہے اور امجد کا یہ حال نہیں۔ اس کے من کی فضا میں کبھی کبھی دھوپ بھی کھلتی ہے، اس کے باغوں میں کہیں کہیں سرسوں بھی پھولتی ہے، اس کے بن کی چڑیا جو راگ الاپتی ہے وہ غنا انگیز سہی مگر اس کے من میں وہ سوز بھی ہے جو زندگی کے کسی دور دیس کی خبر لا رہا ہے۔

اسی لیے مجھے اکثر یہ سوجھا ہے کہ مجید امجد کی شاعری میں زیست کا سرمایہ موجود ہے، ہر چند کہ وہ زیست سے ناخوش ہے مگر اس کے ذہن اور فن میں زیست کی آرزو ہے اور اس کی لذت بھی ـــ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کے یہاں ایک خاص قسم کا سماجی شعور بھی ہے جس کے سہارے وہ بے مایہ اور بامایہ طبقوں کے فرق کو سمجھ سکا ہے۔ مجید امجد کے یہاں زیست کا یہ سرمایہ اس احساسِ انبساط سے پیدا ہوا ہے جو اسے کائنات کے اس عجائب کدے کی سیر سے ملتا ہے جو حسن پسند آنکھ کو بے قیمت مل جاتا ہے ـــ اور پھر اس کا دل بھی تو دلِ پُر آرزو ہے ـــ یعنی محبتوں کا طلب گار دل جو سوزِ زندگی کا امین اور ضامن ہوا کرتا ہے۔ مجید امجد کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ راکھ کا ڈھیر جسے دنیا کہتے ہیں اسی محبت سے زندہ ہے مگر محبت سے اس کی مراد وہ محبت نہیں جسے اس کے بعض معاصر شاعروں نے طوائف کدہ بنا رکھا ہے، اس کے یہاں محبت قرب نہیں، آرزوئے قرب ہے ـــ! یہ خیال اس کی نظم "ابھا، اور تنہا سوکھا پتا" میں اچھی

طرح نمایاں ہوا ہے۔ اور اس کی نظم "ہم سفر" اور "پُر نشاط جلوس کے ساتھ" میں بھی یہی آرزوئے ناتمام عشقِ دوام کی صورت اختیار کر رہی ہے۔

معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ مجید امجد کی خواب پرستی اور خیالیت ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ مجید امجد کا کلام اس حواس پرستی اور جنسیت کے خلاف ایک خوبصورت احتجاج ہے جو اس کے معاصر شاعروں کے یہاں کچھ اس طرح غالب آگیا ہے کہ شاعروں کے تربیت یافتہ ذہن اور عوام کے ناتراشیدہ تصورِ زندگی میں کچھ فرق ہی محسوس نہیں ہوتا۔ مجید امجد نے حواس کی تربیت اور لذتوں کی بلند تر صورتوں کا تصور دلایا ہے۔ نظم "ہم سفر" میں دوری اور قرب کی منزلوں کے امتزاج کی جو صورت ملتی ہے اس کی لذت اور اس کا سرور کبھی ختم نہ ہونے والے انبساط سے لبریز ہے:

ابھی ابھی سبز کھیتیوں پر
جو دور تک، مست آرزوؤں کی موج بن کر، لہک رہی ہیں۔
سیاہ بادل جھکے ہوئے تھے
اور اب حسیں دھوپ میں نہاتی فضائیں زلفیں جھٹک رہی ہیں۔
طویل پٹڑی کے ساتھ رقصاں
مہیب پیڑوں کے گونجتے جھنڈ، دراز سایوں سے بجتی راہیں۔
کہ جن کی موہوم سرحدوں پر
نکل کے گاڑی کی کھڑکیوں سے، تری نگاہیں مری نگاہیں
الگ الگ آ کے تھم گئی ہیں۔
اور ایک اندازِ بے کسی میں، مآلِ امروز سوچتی ہیں۔
پلٹ پلٹ کر اُمڈتے بادل۔
سمٹ سمٹ کر سرکتے آنچل
عجیب اک لذتِ طرب ہے۔

وہ تو اسی سادہ دنیا کا آدمی ہے جس کا اوپر کی نظم میں ذکر آیا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو مجید امجد کھوکھلی تہذیب کے سارے مظاہر سے بیزار ہے اس نے نظم آٹوگراف میں تہذیب کی بیٹیوں کی بے آہنگ حرکات کا تصور دلا کر خود کو اس زندگی سے کتنا دور رکھا ہے۔

مجید امجد اس تہذیب کا پرستار نہیں اس کا دل زندگی کی ان معصوم رسموں اور ریتوں میں اطمینان پاتا ہے جو تہذیب کے تکلف انگیز کھوکھلے تکلفات سے دور ہے۔ نظم "بچو لیا" میں مجید امجد نے جس ماحول کو پیش کیا ہے اس کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جنھیں کبھی ان مسرتوں کا تجربہ ہوا ہے، دولت سے حاصل کی ہوئی تہذیب شاید اس رمز سے آگاہ بھی نہیں ہو سکتی۔

یہ زر کی تہذیب ہے۔ یہ وہ تہذیب ہے جس میں حسن، خیر اور شرافت کو روپے کی ترازو میں تولا جاتا ہے، جس میں فضیلتیں نفع و سود کے پیمانے سے ناپی جاتی ہیں، جس میں انسان انسان نہیں محض ریت کے ذرے یا کنکریاں ہیں۔ یہ جذبوں کی دنیا نہیں تجارت اور کمرشلزم کا

مقام ہنگامہ ہے۔

مجید امجد اپنے دور کے شاعروں سے مختلف شخص ہے، اسے اپنے زمانے سے پہلے کا آدمی کہئے یا اپنے زمانے کے بعد کا مگر اس کا تصورِ زندگی اور تصورِ حسن اپنا ہے، محض اپنا گویا اس کے اپنے زمانے کا ہے۔ اس کی داخلیت بھی اپنا ایک رنگِ خاص رکھتی ہے، اور اس کی خارجیت بھی اپنے ہی انداز کی ہے ـــ! یہ کہا جا سکتا ہے کہ امجد اگر وہ کچھ نہیں جو اس کے زمانے کو مطلوب ہے تو پھر اس کے زمانے کو اس سے کیا ملا؛ یہ سوال بجا ہے مگر یہ سوال کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ بعض زمانے ایسے ہوتے ہیں جن کی سطح پر اُترآنا شاعروں کی سب سے بڑی بدنصیبی ہوتی ہے۔ ایسے ادوار میں وہی شاعر مقام شناس ثابت ہوتے ہیں جو زندگی کی اسفل سطح کو مقامِ اعلیٰ نہیں سمجھتے۔ اور اس سے بلند اُڑ کر اپنی شاعری کو غبار آلود نہیں ہونے دیتے ـــ شاعری بہرحال کاروبار، تجارت، اقتصاد، طوائفیت، نعرہ بازی، اور تیر اندازی سے الگ ایک شئے ہے جو ان سب سے بلند ہو کر انسان کی ان آرزوؤں کی ترجمانی اور تسکین کا وسیلہ بنتی ہے جو علم الاقتصاد اور سائنس کے وسیلوں سے ممکن نہیں۔

غلط فہمی رفع کرتا جاؤں رگذشتہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں شاعری میں (یا ادب میں) سماجی احوال یا خارجی مسایل یا مادی عوامل کے اثرات کی نفی کر رہا ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاعری کی زمینی سطح جو بھی ہو اس کی ایک ارفع سطح بھی ہے۔ شاعر کی پرواز کی ابتدا زمینی سطح سے ہوتی ہو لیکن اگر وہ زمینی سطح کے ارد گرد منڈلا کر دیا ہی ایک جائزہ لے کر ختم ہو جائے جیسا کہ سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ حاکم لوگ کیا کرتے ہیں، تو پھر یہ کام تو نثر بھی کر سکتی ہے اور محکمہ انسدادِ سیلاب والے تو بہت اچھا کر سکیں گے۔ شاعر کا یہ کام نہیں اس کا کام ان ماہر پیراکوں کے کام سے مشابہ ہے جو زمینی سطح سے اُٹھ کر دور کی دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے آیا کرتے ہیں۔

میرا مطلب یہ بھی نہیں کہ مجید امجد اس دور کا سب سے بڑا شاعر ہے، میں تو صرف یہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے معاصر شاعروں سے مختلف ہے۔ وہ اصلاً دکھ اور درد کا شاعر ہے، مگر اس کا یہ دکھ درد ذاتی اور شخصی ہونے کے باوجود زمانے کے کرب کا بھی ترجمان ہے بلکہ یوں کہئے کہ وہ انسانی تقدیر کی محرومیوں کا بھی شارح اور مفسر ہے! وہ زمانے سے اونچا ہونے کے باوجود زمانے کے اندر بھی ہے۔

میں جب مجید امجد کی شاعری کا تصور کرتا ہوں تو معاً میرے ذہن میں دو تصویریں اُبھر آتی ہیں۔ مجھے یوں دکھتا ہے گویا تاریک رات میں پھیلے ہوئے درختوں کی سیاہی کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے قمقمے لٹک رہے ہوں، اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اُس پار درد نشیبوں اور اندھیروں کا ایک شہر بس رہا ہے جس کے اندھیرے مہیب ہیں مگر بہتی چراغوں کی روشنی ان کی ہیبت میں خوبصورتی کا پیوند لگا رہی ہے ـــ!

مجھے کچھ ایسا لگتا ہے گویا میں لڑکپن کے اوائل میں چند دوسرے رفقاسمیت، اپنے گاؤں سے اپنے شہر (مانسہرہ) جاتے وقت نصف شب کی بھیانک تاریکیوں میں گھری اور تنہا وادیوں میں سے گزر رہا ہوں جن کی پرخوف فضائیں جگنوؤں کا قبیلہ اپنے چراغ لیے ہوئے کبھی ادھر کبھی اُدھر روشنی کی شعاع پھینکتا جا رہا ہے، کچھ اس طرح کی کیفیت یا تصویر مجید امجد کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے ـــ! اس میں روشنی بھی ہے اور اندھیرا بھی۔

مجید امجد کے یہاں سخت تنہائی کی فضا ہے مگر انہی تنہائیوں میں کسی معشوق کے حسن کی چمک بھی ہے اور محرومیوں کی ہیبت ناک تاریکی بھی ـــ مگر مجموعی طور پر حسنِ گریزاں کہ یک جذب تاب بن کر ان کے دل کے کوہ و دمن کو روشن بھی کر جاتا ہے، وہ بیابانی کیفیتوں کا دلدادہ شاعر ہے مگر انہی بیابانوں کے خارزاروں میں ادھر ادھر غنچہ و گل بھی ابھرے نظر آتے ہیں۔ تاہم ہیبت اور خوف کی کیفیتیں بہت اُبھری ہوئی ہیں۔ ان کی نظم "رات کو" بڑی ہیبت انگیز نظم ہے، شاعر حسن کی 'شارعِ مزاری' کی جستجو میں محبت کے جزیرے میں جا نکلا ہے (جہاں سنّاٹے تنکھ سنوارتے ہیں اور تنہائی اور خوف کے دیو منہ کھولے کھڑے ہیں۔ اور ان کالی، اکیلی راتوں میں شاعر کا دل ڈرتا ہے ـــ، اور اگرچہ خاموشی بھی

بے صدا خاموشی نہیں۔ اور پہرے داروں کی آوازیں کبھی کبھی گونج پیدا کر ہی دیتی ہیں۔ مگر جاں گزا تنہائی کا بھوت غالب ہے ؎

"تنہائی کی سنگین فصیلوں کے گنبد سے پہرے دار پکارتے ہیں

کیا کرتا ہے ۔؟

دل ڈرتا ہے۔

ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے ۔

ان تاریکی اور روشنی کا یہ امتزاج مجید امجد کی ایک خاص ذہنی کیفیت ہے جو پڑھنے والے کے دل میں گہری ہیبت بھی پیدا کرتی ہے اور اس کو [illegible] دوسرے راستے سے محظوظ و مسرور بھی کر جاتی ہے ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مجید امجد کائنات کے ان خوں ریز سرابوں کی حقیقتِ تلخ کا ترجمان ہے فطرت کے حسن کی لذت بہرحال اُسے حاصل ہے ۔ اور بعض اوقات تو اس پہ سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ اور وہ بیخودی کے عالم میں نغمے الاپنے لگتا ہے اور نظم "ہری بھری فصلو" میں تو اس پر نشاط کے عجب لالہ و گل کھلے ہیں ؎

ہری بھری فصلو جگ جگ جیو ہنسو

. . . .

دامن دامن پلو پلو جھولی جھولی ہنسو

جگ جگ جیو ہنسو

میرا احساس یہ کہتا ہے کہ مجید امجد کا سارا فن تضادوں کے امتزاج سے بنا ہے، وہ زندگی کو ابتدائے احساس میں دو سطحوں سے دیکھتا ہے اور اگرچہ بعض نظموں میں اس کی یہ دو سطحی نظر آخر تک قائم نہیں رہتی مگر اکثر اوقات یہ دونوں سطحیں آخر کار کسی خیالی نقطے پر جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ ذہناً جدائی سے متاثر ہے (اور جدائی ایک تلخ واقعہ ہے بھی جس سے انکار نہیں ہو سکتا) تاہم جدائی کے باوجود ذہنِ انسانی کو وصل اور انجذاب کے خیال سے بھی کچھ تسکین ہو جاتی ہے ۔ مجید امجد کا ذہن بھی اس خیالی امتزاج یا وصل تک کسی نہ کسی صورت میں جا ہی پہنچتا ہے ۔ نظم "ہم سفر" اس کی نمایاں مثال ہے، شاعر اور اس کا دوست، دونوں ایک ہی مقام پہ ہیں اور ان کی منزل بھی ایک ہے مگر وہ ریل کے جدا جدا کمروں میں بیٹھے ہیں اور دونوں کھڑکی سے باہر کی دنیائے فطرت کو بیک وقت دیکھ رہے ہیں مگر جدا جدا ۔۔۔ تاہم شاعر نے نگاہوں کا ایک نقطۂ وصل تلاش کر ہی لیا ہے ۔۔۔ یعنی دور کی وہ حد جہاں دونوں نگاہوں کا نقطۂ انعکاس باہم بغل گیر ہو جاتا ہے ۔ یہ "وصل خیالی" مجید امجد کی آرزوؤں کا آخری نقطۂ تکمیل ہے ۔۔۔ اور جن لوگوں کے پاس ناموسِ عشق کا تجربہ ہے انھیں معلوم ہے کہ محرومیوں کے اس مرگستان میں شرافتِ عشق کے لیے یہی وہ مقام ہے جسے جشنِ نشاطِ آرزو کہا جا سکتا ہے ۔ کہ ؎

عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مجید امجد کی نظم "پُنبدا" میں اور "سوکھا تنہا پتا" میں بھی یہی جشنِ نشاطِ محرومی، ہنگامہ آمیزی کر رہا ہے ۔۔۔ آپ چاہیں تو اسے ملن کی آرزو کہہ سکتے ہیں مگر مجید امجد اسی عیدِ نشاطِ آرزو کو زندگی کا مقدر جانتا ہے اور ایک پُر نشاط جلوس کے ساتھ بھی اسی تصور کی تصویر ہے جس میں جدائی اور دوری کا تخیل از سرتاپا غالب ہے مگر ذہنی قرب کا ایک ہلکا سا بہانہ بھی نکل آیا ہے ۔

مجید امجد کی اس ذہنی ساخت کا اثر ان کی نظمیہ تعمیر پہ، ان کی امیجری پہ اور ان کی لفظیات پہ بھی پڑا ہے۔ ان کی نظمیں خیال کی دو

الگ الگ سطحوں سے اُبھر کر آخر میں کہیں پہنچ کر کچھ نازک سا رشتہ ربط بھی پیدا کر لیتی ہیں اور نظم "سیر سرا" اور "کنواں" میں تو یہ رشتہ اور بھی کمزور ہو گیا ہے ـــ ، اور بعض نظموں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا کوئی ایک مربوط خیال ہی نہیں بلکہ کئی خیال ہیں جو اِدھر اُدھر ہائے آوارہ کی طرح کبھی اِدھر کبھی اُدھر چلے جا رہے ہیں مگر یہ بات سب نظموں میں نہیں ـــ ان کی دو سطحی نظمیں اکثر ایک نقطۂ وصل پر پہنچ کر لذت بخش ہو جاتی ہیں۔

"تنہائی، جدائی، اور آرزو" کے اس شاعر کی زبان بھی اسی طرح کی ہے۔ شاعری کی نئی زبان (یا آزاد نظم کی زبان) کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے مگر نئی زبان فرمائشوں اور منصوبوں سے نہیں بنا کرتی، وہ تو اجتماعی روابط یا ذہنی ضرورتوں کے تابع اپنے آپ کو خود بدل لیتی ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ آج کل نئی زبان کا مطالبہ کرنے والے اکثر "غیر ذوقی" محرکات سے متاثر ہو کر یعنی سیاسی نظریات کے تابع یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پرانی زبان کو بدل دینا چاہیے۔ یہ سب سیاسی عقائد کے تحت کہا جاتا ہے۔ زبان شاعر کے ذوق اور تجربے سے متاثر ہوتی ہے اور اس میں اسے مخاطبوں کے ذوق کا بھی خیال ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنی بات اکثر ایسے طریقے سے کہتا ہے کہ اس کے مخاطب اس کو آسانی سے سمجھ لیں۔ شاعر کا تجربہ اپنے اظہار کے لیے جو زبان تلاش کرتا ہے وہ اگر ذوقِ عام کے مطابق نہ ہوگی تو شاعر کو گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل کی اُلجھن کا سامنا کرنا ناگزیر ہے۔ زبان نئی اور پرانی نہیں ہوتی، یہ تو شاعر کے تجربے کا اپنے فیصلے کی بات ہے کہ اس کے اظہار کی تسکین کس زبان میں ہوتی ہے۔ اور اسی کے تابع زبان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔

مجید امجد (بعض دوسرے نظم گو شاعروں کے برعکس) اس اُلجھن سے بچے ہیں، ان کی زبان نئی ہونے پر بھی ناقابلِ فہم نہیں، بلکہ قومی کہوں گا ذوقِ عام و خاص کے لیے یکساں قابلِ قبول ہے، یعنی ان کی زبان زمانے کی بھی زبان ہے، اُردو میں نظم کے شعرا کے یہاں ایک خاص قسم کی اجنبیت مروج ہے، مگر بعض شاعر جب اس خیال اور زبان کو ہم آہنگ بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر اپنی بے قدری کا شکوہ کرنے لگتے ہیں۔

شاعر کو جب اپنی مصوری کے لیے صفات کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ عموماً موصوف کی حالت بیان کرنے کے لیے یا تو صاف اور سیدھا استعارہ استعمال کرتا ہے مگر بعض اوقات سیدھے اور صاف استعارے سے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ دور کی مشابہتوں، مغائرتوں اور مناسبتوں کو ڈھونڈھتا ہے اور ان پر معنی کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس طرح اس حالت کا تصور زیادہ خیال انگیز ہو جاتا ہے، جو شاعر کے بیان کو مطلوب ہے۔ مگر ہمارے بعض شاعر صفت اور موصوف کے رابطے کو بالکل معدوم کر دیتے ہیں۔ اس لیے مرکبِ توصیفی بے ربط و بے آہنگ ہو جاتا ہے اور ترکیب بے معنی ہو جاتی ہے۔ کہیں نئی شاعری نے راست قسم کی مشابہتوں کو ترک کر کے مناسبتوں اور مغائرتوں پر استعارے کی بنیاد رکھی ہے اور حقیقت سے بہت دور جا پہنچی ہے۔ بعض اوقات مجرد حالتوں کو مجسم مان کر، ان کے ذی حیات تصور کی کسی خصوصیت کو بطور صفت استعمال کر لیا جاتا ہے مگر رشتہ واضح نہیں ہوتا۔

محض مغائرتوں پر مضمون کی عمارت کھڑی کرنا معمولی اکتساب کا کام نہیں۔ اس میں بھی خیال کے روابط کا گہرا احساس ضروری ہے۔ ورنہ صفت اور موصوف کے درمیان سخت مغائرت پیدا ہو جائے گی اور کلام ناقابلِ فہم ہو جائے گا۔ اور یہیں بہت سے شاعر ابلاغ سے قاصر رہ جاتے ہیں ـــ مگر مجید امجد ان ابہامات سے بالکل پاک ہیں۔

مجید امجد کی استعاریت بعض جگہ دوسرے نئے شاعروں کے ساتھ مشترک ہے مگر اکثر موقعوں پر اس کا ڈھنگ مخصوص ہے جس کے تین امتیازات ہیں۔

(۱) استعاریت میں صفت اور موصوف کے مابین رشتے کا تصور واضح ہے اس لیے موصوف کی مطلوبہ حالت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

(۲) ان کی استعاریت ذوقی تقاضوں کے لیے ناگوار نہیں۔
(۳) شعری تجربے اور اس کے خاص آہنگ سے صوتی اور معنوی لحاظ سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں صفات ملاحظہ ہوں:-

یہ کچھ تھرتھراتے اجالوں کا رومان، یہ کچھ سنسناتے اندھیروں کا قصہ

(امروز)

ناچتے پاؤں، تھرکتی باہیں، محوِ نغمہ ہونٹ (جالوس)
زخم۔ جس کی ٹپکتی تہ سے کبھی
رس پڑے دکھتے گھونگھٹ اٹھا کے
کسی چہرے کے سیکڑوں خاکے

یہ مثالیں مجید امجد کی صفات کی پوری تفصیل بیان نہیں کر سکتیں مگر یہ مسلّم کہ مجید امجد کی صفات قاری کے لیے قابلِ فہم ہوتی ہیں، اسے محظوظ بھی کرتی ہیں اور تخیل اور موسیقی دونوں کی معاونت بھی کرتی ہیں۔

میں مجید امجد کو کامیاب مصوّر شاعر مانتا ہوں کیونکہ وہ مجرد حالتوں اور ٹھوس مظاہر کا یکساں طور سے کامیاب نقشہ کھینچ کر ذہنِ قاری کو اپنا رفیق بنا لیتا ہے، اس کی تصویر کشی ٹھوس اور متحرک اشیا اور کوائف سے مرتب ہو کر، بعض تخیلی اشاروں کی مدد سے، قاری کو بہت دُور لے جاتی ہے۔ اس کی امیجری عموماً خارج سے باطن کی طرف چلتی ہے —— وہ چونکہ خوابوں کے جزیرے کا شاعر ہے اس لیے اس کی امیجری کا اثر بھی خواب آور فضا کی جزئیات خارج ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ مجید امجد کی تراکیب یا عام لفظیات روایتی نہیں مگر بے آہنگ بھی نہیں وہ نئی زبان استعمال کرتا ہے مگر ڈھب کی!

میں مجید امجد کی اس استعداد سے متاثر ہوا ہوں کہ اس کی بعض نظمیں آب و رنگ کی مصوری کی قائم مقامی کرتی ہیں مثلاً اس کی نظم "ایک کوہستانی سفر کے دوران میں" فنِ تصویر کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتی ہے، اس میں صرف جزئیات کی ترتیب اپنا کام کر رہی ہے تخیلی مواد کے انگ معنی، موضوع اور جزئیات سب نے مل کر ایک عمدہ تصویر بنا دی ہے ؎

تنگ پگڈنڈی، سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے، دونوں سمت، گہرے غار منہ کھولے ہوئے
آگے ڈھلوانوں کے پار، اک تیز موڑ —— اور اس جگہ۔
اک فرشتے کی طرح نورانی پَر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آ کے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو، گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے
ایک بوسیدہ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ

سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امین

آہ — اُن گردن فرازانِ جہاں کی زندگی،
اِک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں — !!

مجید امجد کی نظموں میں صوت کی تاثیر بھی بڑا کام کرتی ہے اور بعض نظمیں تو تکرارِ صوت کے دلآویز اثرات کا خاص مظہر ہیں۔ مثلاً نظم "بہ فرشِ خاک" کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں :

آنکھیں میچوں، دھیان کروں تو صورت تیری، مورت تیری،
من کے ہنستے بستے دیس کے رستے رستے پر مسکائے —
تیری باہیں — گلگوں راہیں — میری جانب بڑھتی آئیں —
تیری انکھیاں — جیون سکھیاں — دل کے تٹ پر راس رچائیں
چاروں کھونٹ گلابی ہونٹ نگہ کو رس کے گھونٹ پلائیں
لیکن جب میں ہات بڑھاؤں، تیرا دامن ہات نہ آئے

اکثر اکثر سوچتے سوچتے، یوں محسوس ہوا ہے مجھ کو !
جیسے اک طوفان میں گھر کر، گر کر پھول کی پتی ابھرے،
لہر لہر کے ڈولتے شہر میں دھندلے دھندلے دیئے لہرائیں،
سکھ کی ساگری سے نگری نگری کے آنگن بھر جائیں۔
گجرے لہکیں، بیجیں مہکیں، گھلتی سانس کے جھونکے آئیں۔
لیکن جب تجھ کو پکاروں، دور اک گونج کی میت گزرے۔

اس نظم میں الفاظ اور اصوات کی تکرار بہت ہے —— اسے آرزوئے وصل کہیئے یا خیالِ وصل۔ مگر امجد کے ذہن میں کسی دوسرے کا خیال بھی پختہ طور سے جما ہوا ہے، مگر یہ دوسرا کون ہے ؟ یہ کوئی ایسا ہے جس سے دوئی کے باوجود یگانگت کی آرزو تکرارِ حرف و صوت کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ ہاں کبھی کبھی اس تکرارِ صوت کے متعلق مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی ذہنی اختجاج کی کوئی شکل ہے۔ جو اس دوسرے کے تصور کی خلش کو مٹنے نہیں دیتی۔ دیکھیئے بہ فرشِ خاک کا آخری مصرعہ کس درد بھری آرزو سے لبریز ہے۔

اس مٹی کے گھروندے میں بھی اک دن بیٹھ کے ہنستے ہنستے
اپنے ہاتھ سے میری چائے کی پیالی میں چینی گھولو !

اب دو مصرعہ اول میں "بھی" کے لفظ نے —— تو اختجاج کو نمایاں ہی کر دیا ہے۔

اس معمولی سے التفات کی آرزو کتنی غم انگیز ہے۔ اشتیاق کی دنیا کا یہ حادثہ بھی کتنا قیامت خیز ہے کہ شاعر دوست کے اس معمولی سے التفات سے بھی محروم ہے جس کی ارزانی مسلّم ہے — کسی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی کا مل جانا۔ کتنا ارزاں ہے، کتنا معمولی واقعہ ہے مگر شاعر؟ ؎

دل کے بے آواز جزیرے میں چپ چپ کے، چپکے چپکے۔
آنے والو! کیوں چھپتے ہو، گھونگھٹ کھولو ہنس ہنس بولو۔
اب تک ہم نے سنوارے نکھارے منزل منزل، رستے رستے
خوابوں کے مسحور خرابوں میں ارمانوں کے گل دستے۔

خوابوں کے مسحور خرابے! بس مسحور خرابوں کی ترکیب میں ہی سب کچھ آ گیا۔ شارع عام میں بکتا ہوا التفاتِ عام اس مٹی کے گھروندے کی قسمت میں نہیں جس میں آرزوؤں کا خواب محل ویراں پڑا ہے۔

صوت کی مدد سے جذبے کے رنگ کی نشان دہی بعض اوقات غلط نتیجے پر پہنچا سکتی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مجید امجد کے معاملے میں میرا یہ قیاس غلط نہیں کہ اس کی شاعری کا حرف و صوت اس کے تجربات کی مصوری میں پورا حصہ لے رہا ہے۔ اور اس کے جذبات کے اظہار میں معاونت بھی کر رہا ہے۔

مجید امجد اپنے کمال کے اعتبار سے نظم کا شاعر ہے، اس لیے میں اس کی غزل کا تجزیہ نہیں کرتا مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس کی غزل کے بہت سے پیرائے نظمیہ ہیں یا گیتوں کا انداز رکھتے ہیں جن میں تغزل کی کنائیت اور بیان کی وہ برجستگی نہیں پائی جاتی جو غزل کے مفرد اشعار کو لطف اور تاثیر سے معمور کر دیتی ہے، البتہ بعض غزلوں میں قافیے والے حصہ شعر میں آواز کی تکرار سے کچھ رس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ؎

ایک ایک جھروکا خندہ بلب، ایک ایک گلی کہرام
ہم لب سے لگا کر جام ہوئے بدنام، بڑے بدنام
رت بدلی کہ صدیاں لوٹ آئیں اُف یاد کسی کی یاد
پھر سیلِ زماں پر تیر گیا اک نام کسی کا نام
روندیں تو یہ کلیاں نیشِ بلا، چومیں تو یہ شعلے پھول
یہ غم یہ کسی کی دین بھی ہے، انعام عجب انعام

کبھی لمبی ردیف سے یہی کام لیا ہے مثلاً غزل ؎

کیا سوچتے ہو پھولوں کی رت بیت گئی، رت بیت گئی

یہ غزلِ ذیل تو اپنی آواز اور سوچ کے اعتبار سے نظم ہی کا نقش ہے ؎

کس کی گھات میں گم صم ہو، خوابوں کے شکاری جاگو بھی
اب آکاش سے پورب کا چرواہا ریوڑ ہانک چکا ہے

تاہم غزل کے یہ اشعار، غزل کا تیور رکھتے ہیں :-

دل نے ایک ایک دکھ سہا تنہا۔
انجمن انجمن رہا تنہا —
ڈھلتے سایوں میں تیرے کوچے سے
کوئی گذرا ہے بارہا تنہا —
تری پلکوں کی جنبش سے جو ٹپکا
اسی اک پل کے افسانے زمانے

غرض، غزل ہو یا نظم۔ مجید امجد شاعری کے ہر رنگ میں اپنا خاص انداز رکھتا ہے۔ اس کی نوا میں دل شکستگی اور ناتمامی کی خلش ہر جگہ ہے۔ وہ تنہائیوں اور "بیابانی" کیفیتوں کا مصوّر ہے مگر کائنات کی ظاہری سطح سے ذرا نیچے جو جو عجائب و غرائب اور طلسمات موجود ہیں ان کا تخیلی انکشاف اسی کے لیے فرحت بخش بھی ہے — اس کی شاعری تمدن کے بازاروں سے دُور اس زندگی کی رازدار ہے جو بہت سادہ و معصوم ہے — اور ہر چند کہ وہ اس شاہراہ سے مشابہ ہے جو طویل مسافتوں پر پھیلی ہوئی ہو اور اس کے ماحول میں تنہائیوں اور خاموشیوں کے باوجود صد رنگ پھول بھی ابھر ابھر کر سامنے آتے جاتے ہوں۔ پھر بھی میں نے بہت کم شاعر ایسے دیکھے ہیں جن کے یہاں زندگی کی ہولناک سنجیدگی اور مقدر کی ستم آرائی کے ایسے دردناک تصورات موجود ہوں گے جیسے مجید امجد کے یہاں ہیں۔ پھر بھی اُس کے قاری کا مجموعی تاثر، مسرت و انبساط میں اتنا ڈوب کر باہر آتا ہے اور مطمئن بھی کرتا ہے تو یہ ان کے کلام کا جادو نہیں تو اور کیا ہے؟ — مجید امجد زندگی کو بس بھرا رس کہتا ہے مگر اس کے کلام میں رس اتنا رچا ہوا ہے کہ بس کی تاثیر منفی ہو جاتی ہے —!

○

میں تڑپا کیے اور گیسوئے ناز
سنورتے گئے، دن گزرتے گئے

اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں
لیکن یہ ایک میٹھا میٹھا سا درد کہ ہی گیا

ان سنگین حصاروں میں دل کا یہ سفینہ
گونجیں جس میں ٹھٹکتے قدموں کی پرچھائیں

چراغ بجھ چکے، پتنگے جل چکے، سحر ہوئی
مگر ابھی مری جدائیوں کی رات، رات ہے

شبِ رفتہ (مجید امجد کا مجموعہ کلام)

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ایک غزل گو

ناصر کاظمی نئی نسل کے نوجوان غزل گو شعراء کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ اُردو غزل کی روایت میں اُن کی آواز بالکل اچھوتی اور نئی ہے۔ انھوں نے نئی نسل کے نئے مزاج کو غزل کے سانچے میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے، اور اس طرح نئے ذہن کی حقیقت میں بڑی ہی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ نئی نسل کا نوجوان جن حالات سے دوچار ہے۔ جن معاملات و مسائل کا اُس کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان کے نتیجے میں جو کچھ اُس پر بیت رہی ہے، اُس کا پرتو ناصر کاظمی کی غزل میں نظر آتا ہے۔ اُن کے یہاں نئی زندگی کا احساس ہے۔ نئے حالات کا شعور ہے، نئے حقائق کا ادراک ہے، اور ان سب کے مجموعی امتزاج نے اُن کی غزل کو ایک نئی لے سے آشنا کیا ہے۔ اُن پر غزل کی روایت کے اثرات ہیں لیکن انھوں نے روایتی انداز میں غزلیں نہیں کہی ہیں۔ اُن کی غزلیں تو اُن کے نئے تجربات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک نیا لب ولہجہ پایا جاتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اُن کے جذباتی اور ذہنی تجربات اسی غزل کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ لیکن غزل اُن کے یہاں محض قافیہ پیمائی کا نام نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے قافیے سے بڑے بڑے کام لیے ہیں، اور اس طرح قافیے کے استعمال کو بھی ایک فن بنا دیا ہے۔ نئے احساس و شعور نے اُن کے ذہنی اور جذباتی تجربات میں جدّت کی ایک لہر سی دوڑا دی ہے۔ اسی نسبت سے اُن کی غزل میں بھی ایک اچھوتا پن پیدا ہوا ہے۔ اُن کی تخئیل نئی ہے، اور اس نئی تخئیل نے نئے احساس و شعور کے زیرِ اثر ان گنت ایسے نئے پیکر تراشے ہیں، جن کی بدولت اُن کی غزل ایک اچھا خاصا نگار خانہ بن گئی ہے۔ اس نگار خانے میں جو تصویریں ہیں۔ اُن میں بڑی زندگی اور جولانی نظر آتی ہے۔ یہ احساس خود ناصر کاظمی کو بھی ہے۔ چنانچہ اپنے مجموعۂ کلام "برگِ نے" کی پہلی ہی غزل میں انھوں نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ نئی نسل نے صحیح معنوں میں ملکِ سخن کو آباد کیا ہے، ورنہ اس سے قبل تو اس میں ایک سنسان سا سماں نظر آتا تھا، اور وہ گہما گہمی نہیں تھی جو آج نظر آرہی ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں سہ

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن کیسا سنسان سماں تھا پہلے
ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں درد مجبورِ فغاں تھا پہلے
ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے
ہم نے روشن کیا معمورۂ غم ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے
ہم نے محفوظ کیا حُسنِ بہار عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے

یہاں ملکِ سخن کو آباد کرنے، خموشی کو زبان بخشنے، تیشۂ عشق کو ایجاد کرنے، معمورۂ غم کو روشنی دینے اور حسنِ بہار کو محفوظ کرنے کے پردے میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس میں بڑی خود اعتمادی کا احساس ہوتا ہے، اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شاعر محض لکیر کا فقیر ہی نہیں ہے۔

بلکہ اُس نے نئی راہیں بھی نکالی ہیں۔ اپنی ذہنی پرواز کے لیے نئے افق بھی تلاش کئے ہیں اور اپنے نئے جنوں کے لیے نئے ویرانوں کا سراغ بھی لگایا ہے۔ ناصر کاظمی کی غزلوں میں یہ نئے افق ملتے ہیں۔ اور اُن کے ایک ایک شعر میں نئی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نئے انداز میں پیش کرنے کا میلان نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے یہاں ایسے مضامین اور موضوعات کی فراوانی ہے۔ جن کی طرف اس سے قبل بہت کم توجہ دی گئی تھی کیونکہ وہ زندگی میں موجود ہی نہیں تھے۔ اُن کو تو نئی زندگی نے پیدا کیا ہے۔ ناصر کاظمی اسی نئی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اسی نئی زندگی کے سائے میں آنکھ کھولی ہے اور اس کے اثرات قبول کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نئی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو انھوں نے غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے، اور ایسا کرنے میں انھیں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی ہے — بلکہ یہ سب کچھ فطری طور پر ہوا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ عشق غزل کا بنیادی موضوع ہے، اور ہمارے شعراء اپنی غزلوں میں اسی عشق کے مختلف روپ دکھاتے رہے ہیں۔ ناصر کاظمی کی غزلوں میں بھی عشقیہ مضامین موجود ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت دوسرے غزل گو شعراء کے پیش کئے ہوئے مضامین سے مختلف ہے۔ ان میں وہ روایتی رنگ و آہنگ نہیں ہے جو عام طور پر غزل گو شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان مضامین میں تو نئی نسل کا وہ مزاج ہے جو عشق میں صرف محبوب کی پرستش ہی نہیں کرتا، جس کو اُس کے نام سے کبھی کبھی وحشت بھی ہوتی ہے، جو توفیقِ اضطراب کی راحت سے مالامال ہوتا ہے اور جو اس کو کبھی کبھی ہی نصیب ہوتی ہے، جس کا دل الم حسن آفریں کے کرم سے دوست کی خلوت بن جاتا ہے۔ جس کے یہاں جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ اشکوں میں محبوب کی صورت بھی ڈھل جاتی ہے۔ جس پر کبھی کبھی یہ قیامت بھی گزرتی ہے کہ اُس کا دل محبوب سے قریب رہ کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ جس کی شبِ فرقت کبھی کبھی یوں گزرتی ہے کہ اس کو نہ تو اپنا ہی ہوش رہتا ہے نہ محبوب کا خیال ہی آتا ہے اور جس کو ترکِ محبت کے باوجود بھی کبھی کبھی محبوب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی نے کیسے اچھوتے اور نئے انداز سے نئی زندگی کے ان پہلوؤں کو دیکھا ہے ؎

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی　　برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
اے دل کِسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب　　ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی
تیرے کرم سے اے الم حُسن آفریں　　دل بن گیا ہے دوست کی خلوت کبھی کبھی
جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ　　اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی
تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا　　گذری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی
کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا　　یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

یہ اشعار عشقیہ کیفیات اور واردات کو پیش کرتے ہیں لیکن یہاں ان واردات و کیفیات کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ ان میں ایک نیا رنگ و آہنگ ہے۔ ان اشعار میں نئے احساسات ہیں، نئے جذبات ہیں۔ ان میں ایک نیا شعور بھی نظر آتا ہے — اور ان سب نے مل کر انھیں نئی نسل کے دل سے نکلی ہوئی ایک آواز بنا دیا ہے — اس آواز میں خود اعتمادی ہے۔ نیازِ عشق کی اہمیت کا احساس ہے۔ بے باکی اور قطعیت ہے۔ یہ آواز زخمی ضرور ہے لیکن اس میں خودی اور خودداری، خود پرستی اور خود شناسی کی وہ لے ہے جو نئی نسل کے مزاج کی

نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

یوں ناصر کاظمی کی عشقیہ شاعری میں محبوب اور اُس کے حُسن کا بھی ایک واضح تصور نظر آتا ہے۔ وہ اس محبوب کی اہمیت سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ اُن کی خودداری اُس کے حُسن کو نظر انداز نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں محبوب کی شخصیت بھی خاصی نمایاں ہے۔ انھوں نے مختلف زاویوں سے اُس کی اہمیت واضح کی ہے۔ وہ اس کے حُسن کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اُس کی سیرت کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ لیکن ان باتوں میں بھی اُن کے یہاں ایک نیا انداز ملتا ہے۔ وہ محبوب کو روحِ خیال اور جانِ مضمون کہتے ہیں۔ اور اُن کا دل اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اُس کی آنکھیں انھیں دو چھلکتے ساغر نظر آتی ہیں اور وہ اُس کے عارض میں شراب کی تھرتھراہٹ دیکھتے ہیں۔ اس کی مہکی ہوئی سانس اور نرم گفتاری ہر روش پر جو نئے نئے گل کھلاتی ہے، اُس کو وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ اُس کا آنچل میں حیا سے منہ چھپانا اور راہوں پہ ادا ادا سے رقص کرنا اُن کے دل کو لبھاتا ہے۔ اس کی اڑتی ہوئی زلف انھیں یوں پریشاں نظر آتی ہے جیسے کوئی راستہ بھول جاتا ہے، اور ان کو آنکھیں زمین پہ کچھ پھول سے برستے اور ہوا میں کچھ گیت سے لہلہاتے ہوئے دکھتی ہیں۔ ان اشاروں اور کنایوں تشبیہوں اور استعاروں میں ناصر نے محبوب کی کیسی رنگین اور پُرکار تصویر کھینچی ہے ؎

اُس پیکرِ ناز کا فسانہ — دل ہوش میں آئے تو سنائے
وہ روحِ خیال و جانِ مضمون — دل اُس کو کہاں سے ڈھونڈ لائے
آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر — عارض کہ شراب تھرتھرائے
مہکی ہوئی سانس نرم گفتار — ہر ایک روش پہ گُل کھلائے
راہوں پہ ادا ادا سے رقصاں — آنچل میں حیا سے منہ چھپائے
اُڑتی ہوئی زلف یوں پریشاں — جیسے کوئی راہ بھول جائے
کچھ پھول برس پڑے زمیں پر — کچھ گیت ہوا میں لہلہائے

اردو غزل کی روایت میں یہ سراپا نگاری اور محبوب کی سیرت کی تصویر کشی ایک نیا اور اچھوتا انداز رکھتی ہے۔ اس میں شاعر کے نئے احساس اور نئے شعور کا پرتو بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ ان اشعار میں مشاہدے سے زیادہ محسوسات کا پہلو غالب ہے، اور اس صورتِ حال نے اُن میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ ان میں صرف شاعر کی خارجیت پسندی ہی کا ہاتھ نہیں ہے، اُس کی شدید حسیاتی کیفیات اور داخلیت پسندی کا اثر بھی نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حُسن کے اس بیان میں ایک حسیاتی (SENSUOUS) رنگ و آہنگ ایک رچی ہوئی صورت میں ملتا ہے، اور یہی نئے نسل کے مزاج کی بنیادی خصوصیت ہے ـــــ نئی نسل کا شاعر صرف دیکھتا ہی نہیں، صرف مشاہدہ ہی نہیں کرتا، محسوس بھی کرتا ہے، اور اُس کے یہی محسوسات اُسے ایک ایسی منزل پر پہنچا دیتے ہیں جہاں خارجیت اور داخلیت آپس میں گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ناصر کاظمی کا مزاج چونکہ نئی نسل کا مزاج ہے۔ اس لیے اُن کے اِن اشعار میں بھی یہی خصوصیات نمایاں ہیں۔

حُسنِ محبوب کی اس تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ناصر کی غزلوں میں عشق کی واردات و کیفیات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ اور اس سلسلے میں اُن کے یہاں مضامین و موضوعات کا خاصا تنوع نظر آتا ہے۔ نئے انسان کی داخلی اور جذباتی زندگی کے مخصوص معاملات اور اُن کے محرکات کی ترجمانی انھوں نے ایسے اشعار میں کی ہے جو بظاہر تو عشقیہ اشعار معلوم ہوتے ہیں لیکن ان عشقیہ موضوعات کے پردے میں انھوں نے نئی زندگی کے ان گنت حقائق

کو پیش کیا ہے۔ اور اُن کی شاعری کے اس پہلو کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نئی زندگی کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس زندگی کو صحیح زاویے سے دیکھا ہے۔ اُس کے معاملات و مسائل کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ نئی زندگی کو بدلتے ہوئے ماحول نے جن مخصوص حالات سے آشنا کیا ہے، اُس کا احساس بھی اُن کے یہاں نظر آتا ہے۔ وہ عشق اور اُس کے مختلف پہلوؤں کو محض جذباتی زاویۂ نظر ہی سے نہیں دیکھتے۔ اُن کا شعور بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے اُن کے مضامین میں جدّت نظر آتی ہے اور جن جذبات اور معاملات کی ترجمانی وہ کرتے ہیں۔ ان میں ایک اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں عشق اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ اُن کے درمیان خط نہیں کھینچا جا سکتا۔

اس زمانے میں حالات نے نئی نسل کا ایک مخصوص مزاج بنا دیا ہے۔ گرفتہ دلی اس مزاج کی بنیاد ہے لیکن نئی نسل کا نوجوان یہ نہیں چاہتا کہ اس گرفتہ دلی کی حقیقت ہر ایک پر ظاہر ہو جائے۔ وہ تو صرف اُس شخص پر اس کیفیت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے جس سے اُس کو تعلقِ خاطر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محبوب سے زیادہ اس کا کوئی اہل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے جب وہ اپنی اس گرفتہ دلی کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اُس کے سامنے اپنے محبوب کی شخصیت آتی ہے اور وہ اس کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے

ناصرؔ نے یہاں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس گرفتہ دلی، کے ان گنت عوامل اور محرکات ہیں۔ ان محرکات کو صرف محبوب ہی سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ بہرحال تعلقِ خاطر کی وجہ سے اُس نوجوان کی مزاج داں کا شعور رکھتا ہے جس پر یہ کیفیت طاری ہے۔ اس میں غمِ عشق اور غمِ دوراں دونوں شامل ہیں۔ اور ان دونوں نے مل کر جو صورتِ حال پیدا کی ہے اُس کو محبوب سے زیادہ کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔

ناصرؔ نے اسی غزل کے ایک اور شعر میں محبوب سے ملنے کی تمنا ظاہر کی ہے۔ اس لیے نہیں کہ اُس کے انتظار میں اُس کا دل بیقرار ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اس سے مل کر اپنے دل کی کیفیت اس پر ظاہر کرنا چاہتا ہے "تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ اس کی زندگی ناسازگار حالات سے دوچار ہونے کی وجہ سے ایک ویرانے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ان ویرانوں کو وہ سلگتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ ان کی اصل کیفیت کسی پر ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ محبوب کی ضرورت محسوس کرتا ہے ؎

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے

یہ ویرانی کا تصور نئی نسل کے نوجوان کے یہاں بہت عام ہے۔ کیونکہ اُس کی زندگی شاداب اور شگفتہ نہیں ہے۔ خارجی ماحول کی ناسازگار کیفیت نے اس کو کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ وہ زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں سے دوچار ہے اور اس صورتِ حال نے اس کے دل کو ویرانے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس ویرانے میں سلگنے والی کیفیت ہے۔ حسن و عشق تک اس سلگنے والی کیفیت کا مداوا نہیں کر سکتے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اُس کے شگفتہ اور شاداب ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ محبوب کے آنے سے ہر سلگنے والی کیفیت کسی حد تک کم ہو سکتی ہے اور وہ اس سے مل کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی خیال آتا ہے کہ امیدِ پرسشِ غم بے سود ہے۔ اُس کے غم کی اندرونی کیفیت کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس میں غمِ عشق

اور غمِ روزگار نے مل کر کچھ ایسی صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ اس کا سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے ؎

امیدِ پرسشِ غم کس سے کیجئے ناصر
جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

نئی نسل کے نوجوان کے دل پر جو کیفیت گزرتی ہے وہ بڑی نرم و نازک ہے۔ اس کے ان گنت عوامل اور محرکات ہیں۔ ان عوامل اور محرکات کا اندازہ صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جس پر یہ کیفیت گزر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی سے پرسشِ غم کی امید نہیں رکھتا۔

یہ نوجوان محبت تو کرتا ہے لیکن اس محبت میں اس کو کامیابی اور کامرانی ذرا کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا محبوب اس سے کوسوں دور ہے۔ اور زندگی کی بھاری رات اس کے بغیر کٹ نہیں سکتی۔ اسی لیے وہ اس کی فرقت میں اپنی بستی کے لوگوں سے چھپ کر رات کے پچھلے پہر آنسو بہاتا ہے ؎

یار کی نگری کوسوں دُور   کیسے کٹے گی بھاری رات
بستی والوں سے چھپ کر   رو لیتے ہیں پچھلی رات

اور یہ عجیب و غریب کیفیت اس پر اس لیے طاری ہوتی ہے کہ اس کے عشق کی راہوں میں زندگی کے ناسازگار حالات نے ایسے پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں جن کی وجہ سے وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ زندگی اس کو ایک بھاری رات معلوم ہونے لگتی ہے جو کاٹے نہیں کٹتی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کی اس کیفیت کا کسی کو علم ہو۔ اسی لیے وہ کھل کر رو بھی نہیں سکتا۔ عشق اور زندگی دونوں کی پاسداری اس کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے وہ کھلم کھلا اظہارِ غم بھی نہیں کرتا۔ روتا بھی ہے تو بستی والوں سے چھپ کر ——— اور وہ بھی رات کے پچھلے پہر تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

اس کے خیال میں محبت کا دستور ہی یہی ہے کہ محبت کرنے والے ایک دوسرے سے دُور رہیں۔ ان کو آپس میں ملنا نصیب نہ ہو۔ ان کے دل ویران اور آنکھیں بے نور ہو جائیں اور وہ اس غم میں تنہا تنہا اِدھر اُدھر پھرتے رہیں ؎

دیکھ محبت کا دستور   تو مجھ سے میں تجھ سے دور
تنہا تنہا پھرتے ہیں   دل ویراں آنکھیں بے نور

جدید دور کی زندگی نئی نسل کے نوجوان کو انھیں حالات سے دوچار کرتی ہے۔ اس محبت میں محبت کرنے والا اور محبوب دونوں گھائل ہوتے ہیں۔ کیونکہ حالات انھیں ایک دوسرے سے دُور رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں کی زندگی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی تنہائی میں گزرتی ہے ——— اور اس کے نتیجے میں دونوں کے دل بجھ جاتے ہیں۔ ان دلوں میں ویرانی بسیرا کرنے لگتی ہے۔ اور نہ صرف ان کی نگاہوں میں سارا عالم تاریک ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ تاریکی خود ان کی آنکھوں کو بے نور کر دیتی ہے۔

نئی نسل کا یہ نوجوان محبت میں پیدا ہونے والے غم کی اس کیفیت کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ غم اس کے لیے زندہ رہنے کا بہت بڑا سہارا ہے۔ وہ اس کو سینے سے لگائے پھرتا ہے اور اسی کے سہارے زندگی کی ہر منزل سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ اس غم کے سہارے زندگی کی یہ کٹھن منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ناصر نے اس شعر میں اسی کیفیت کو پیش کیا ہے ؎

ہر منزل سے گزرے ہیں   تیرے غم کے سہارے ہم

یہ غم اس کے لیے سہارا اس وجہ سے بنتا ہے کہ اس کے ساتھ بہت سی حسین اور دل آویز یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ ان یادوں کی بدولت اس کے دل میں زندگی اور جولانی پیدا ہوتی ہے۔ یہ غم اُس کو اُداس کرنے کی بجائے اُس کی زندگی میں ولولوں اور حوصلوں کی شمعیں سی فروزاں کرتا ہے۔

بات یہ ہے کہ نئی نسل کا محبت کرنے والا محبت اور محبوب دونوں سے بیزار نہیں ہوتا۔ وہ ان دونوں کو عزیز رکھتا ہے۔ اسی لیے وہ خیالِ خاطرِ دوست کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ چاہے ایسا کرنے میں اُسے جیتی ہوئی بازی ہی کیوں نہ ہارنی پڑے۔ محبوب اُس کے نزدیک سب کچھ ہوتا ہے اور وہ اس کی صورت کو اپنی آنکھوں میں لیے پھرتا ہے۔ اس طرح بہت سے غم غلط ہو جاتے ہیں اور اُس کو تنہائی میں تارے گننے کا مرحلہ پیش نہیں آتا۔ ناصر نے اس صورتِ حالات کو کیسی خوبی سے اِن اشعار میں پیش کیا ہے ؎

دیکھ خیالِ خاطرِ دوست　　بازی جیت کے ہارے ہم
آنکھ کا تارہ آنکھ میں ہے　　اب نہ گنیں گے تارے ہم

ان اشعار میں صاف ظاہر ہے کہ محبوب کا خیال اس کو بہت عزیز ہے۔ اگر محبوب نہ ملے تو وہ اس کے خیال ہی سے محبت کر سکتا ہے۔ اور یہ خیال اُس کے لیے کسی قسم کی آزمائش اور تکلیف کا باعث نہیں بنتا۔ بلکہ اس خیال سے تو اُس کی دنیا رنگین رہتی ہے اور اُس کو دور دور تک پھول سے کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناصر کاظمی کا ایک شعر ہے ؎

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

اس شعر میں شب کے وقت خواب و خیال کی اُس کیفیت کو جس کا محرک محبوب ہے، منہ اندھیرے کھلنے والے پھولوں سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے خواب و خیال کی وہ دلکشی ظاہر ہوتی ہے جس کو صرف نئی نسل کا نوجوان ہی محسوس کر سکتا ہے۔ کیونکہ محبت اُس کے نزدیک ہوس پرستی اور تعیش پسندی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی ایک نہایت ہی لطیف کیفیت ہے۔

اس نوجوان کو آسودگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی لیے یہ آسودگی اُسے راس نہیں آتی۔ وہ اُداس رہنا چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ اُداسی محبت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا ماحول پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محبوب کی قربت سے بھی ڈرتا ہے۔ اُس کے جلو میں بھی اُس کا دل کانپ کانپ اٹھتا ہے کیونکہ آسودگی سے وہ ذہنی طور پر مطابقت پیدا نہیں کر سکتا۔ اس عالم میں یہ خلش بھی اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کہیں اُداسی کا فقدان محبوب کی آرزو ہی کو ختم نہ کر دے۔ ناصر کی ایک غزل کے یہ دو شعر اسی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں ؎

ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے　　مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں
مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے　　بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

بظاہر یہ عجیب و غریب کیفیات ہیں لیکن نئی نسل کے مخصوص مزاج کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کیفیات حقیقت و واقعیت سے قریب معلوم ہوتی ہیں۔

نئی نسل کا نوجوان محبوب کے ساتھ محبت تو کرتا ہے لیکن اس محبت میں وہ کھل کھیل نہیں سکتا۔ محبوب سے اگر اُس کی بات بھی لبوں پر بڑی مشکل سے آتی ہے، ورنہ وہ چپ ہی رہتا ہے۔ ناصر کہتے ہیں ؎

یہ بھی کیا شامِ ملاقات آئی　　لب پہ مشکل سے تری بات آئی

اور محبوب سے اُس کی یہ ملاقات محض وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے۔ وہ تو ہجر کے عالم ہی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ کیونکہ یہی ہجر اُس کا مقدر رہے — یہ ہجر کی کیفیت اُسے چپ رکھتی ہے — وہ اس ہجر کے عالم میں ہنگامہ برپا نہیں کرتا۔ صرف یہ سوچتا ہے کہ اس ہجر میں رات کے وقت اس پر کیا گزرے گی ؂

صبح سے چپ ہیں ترے ہجر نصیب　　　ہائے کیا ہوگا اگر رات آئی

اس سے یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہجر کی رات کا کاٹنا اُس کے لیے آسان نہیں۔ لیکن وہ اس کو جانتے ہوئے بھی گریۂ وزاری اور نالہ وفغاں نہیں کرتا۔ یہی۔ نئی نسل کا مزاج ہے، اور ناصر کاظمی نے اس شعر میں اسی مزاج کی ترجمانی کی ہے۔ یہ ہجر کا بیان نہیں ہے — نئے مزاج کی مخصوص ذہنی کیفیت کی تصویر کشی ہے۔

یہ ہجر نصیبی نئی نسل کا مقدر بن چکی ہے۔ حالات نے اس کو زندگی کی شادمانیوں سے بڑی حد تک محروم کر دیا ہے۔ زمانے نے اُس کے دل پر اتنے زخم لگائے ہیں کہ زندگی اُس کے لیے خود ایک زخم بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے افراد عیش ونشاط کی بات نہیں کرتے۔ رنگینیوں کا ذکر اُن کے یہاں نہیں ہوتا۔ محبوب اُن کے نزدیک لذت اندوزی اور عیش کوشی کا ذریعہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اگر کہیں اُن میں سے کسی کو مل بھی جاتا ہے تو وہ اُس کی طرف خود متوجہ نہیں ہوتا بلکہ محبوب کی توجہ اُس کی طرف ہوتی ہے۔ محبوب اُس کا حال پوچھتا ہے۔ اس عالم میں اُس کی آنکھ بھر آتی ہے اور یہی اس کا جواب ہے — ناصر کاظمی کے اس شعر میں اسی صورتِ حال کو پیش کیا گیا ہے ؂

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال جو پوچھا تو آنکھ بھر آئی

اس نے آنکھ بھر آنے کی کیفیت کو بیان کر کے یہاں شاعر نے نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار کے لگائے ہوئے نہ جانے کتنے زخم ہیں جو اس کو اس صورتِ حال سے دوچار کرتے ہیں — ناصر نے اسی حقیقت کو محسوس کر کے اس شعر میں اس نئے خیال کو پیش کیا ہے۔

اُس کے نزدیک محبت کے بے شمار مرحلے ہیں۔ اس راہ میں انسان کو ایسے ان گنت معاملات پیش آتے ہیں۔ جو اس کو امید وبیم کی جنت اور جہنم سے دوچار کر کے اُس کو مضطرب اور بے کل رکھتے ہیں۔ بیتے دنوں کی یاد میں اُس کے دل میں داغ بن جاتی ہیں اور وہ جب بھی محبوب کی کمی کو محسوس کرتا ہے تو ان بیتے دنوں کی یاد اس کو ستانے لگتی ہے — ناصر کاظمی نے اس صورتِ حال کو محسوس کر کے یہ اشعار کہے ہیں ؂

یاد ہیں مرحلے محبت کے　　　ہائے اس بے کلی میں کیا کچھ تھا
کتنے بیتے دنوں کی یاد آئی　　　آج تیری کمی میں کیا کچھ تھا

یہاں گزرے ہوئے لمحوں کی یاد اور محبوب کی کمی کا احساس زیادہ نمایاں ہے۔ کیونکہ محبت میں نئی نسل کے نوجوان کو انھیں حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس محبت میں بعض اوقات ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب دل میں وہ بے قراری باقی نہیں رہتی جو عشق کے لیے ضروری ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبت کرنے والے کو محبوب کا انتظار تک نہیں ہوتا ؂

نصیبِ عشق دلِ بے قرار بھی تو نہیں　　　بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں

بظاہر یہ بات بہت عجیب ہے۔ کیونکہ محبت کرنے والے کو محبوب ہی سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور وہ ہر حال میں اُس کا انتظار کرتا رہتا ہے لیکن آج کل حالات کچھ ایسے ہیں کہ بعض اوقات محبت کرنے والا محبوب تک کو فراموش کر دیتا ہے۔ اسی لیے اُس کو اس محبوب کا انتظار باقی نہیں رہتا۔ ناصر کاظمی نے اس شعر میں اسی صورتِ حال کی ہے۔

ناصر کے یہاں محبت کے غم کا احساس بہت شدید ہے اور محبت کا جو تصوّر انھوں نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے وہ اسی غم سے عبارت ہے۔ لیکن ان کے خیال میں اس غم کی نوعیت مختلف ہے۔ اس غم کی پرسش ناممکن ہے۔ کیونکہ اس غم کے اتنے پہلو ہوتے ہیں کہ اُن میں سے بیشتر کی تو لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں ؎

زمانہ پرسشِ غم بھی کرے تو کیا حاصل
کہ تیرا غم غمِ لیل و نہار بھی تو نہیں

ظاہر ہے کہ غمِ لیل و نہار کی تو پرسش ہو سکتی ہے لیکن محبت کے غم کی پرسش آسان کام نہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ لوگ اس غم کی تہ در تہ کیفیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ محبت کرنے والا اس غم کو دوسروں پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا۔

محبت کے بعض رومانی پہلوؤں کی ترجمانی بھی ناصر کاظمی کی غزلوں میں ملتی ہے۔ لیکن ان رومانی پہلوؤں کے بیان میں بھی غم کی ایک کیفیت اُن کے یہاں نظر آتی ہے۔ کیونکہ رومانی زندگی کا تصوّر اُن کے یہاں یادوں کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ زندگی کے صرف ایسے رومانی لمحوں کی تصویر کشی کرتے ہیں جو بیت چکے ہیں۔ یہ چند اشعار اسی کیفیت کے ترجمان اور عکاس ہیں ؎

یاد آتا ہے روز و شب کوئی — ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی
لب جو چھاؤں میں درختوں کی — وہ ملاقات تھی عجب کوئی
جب تجھے پہلی بار دیکھا تھا — وہ بھی تھا موسمِ طرب کوئی
نہ غمِ زندگی، نہ دردِ فراق — دل میں یوں ہی سی ہے طلب کوئی
یاد آتی ہیں دور کی باتیں — پیار سے دیکھتا ہے جب کوئی

ناصر کاظمی کے اِن اشعار میں زندگی کے رومانی پہلوؤں کی ترجمانی ضرور ہے لیکن ان میں رنگینی پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک کسک کا احساس ہوتا ہے جس کو انسانی زندگی کی محرومیاں پیدا کرتی ہیں۔ نئی نسل کے نوجوان کا شدید احساس اُس کو اس صورتِ حال سے آشنا کرتا ہے۔ ناصر کاظمی چونکہ خود نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے زندگی کے یہ پہلو اُن کے سامنے آتے ہیں اور انھیں اپنے اشعار میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

ناصر کے یہاں محبوب کی قربت سے پیدا ہونے والی لذت کا احساس ضرور ہے لیکن اس کو بھی وہ صرف یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ لذت کے لمحے گزر چکے ہیں اور اُن لمحوں کی رنگینیوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ صرف اُن کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ ان اشعار میں انھوں نے اسی کیفیت کو پیش کیا ہے ؎

اوّلیں قرب کی سرشاری میں — کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں
دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی — تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں
وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول — ایک صورت تھی عجب یاد نہیں
رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال — اُس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یہاں اوہیں قرب کی سرشاری اور اُس کے ارمانوں کا ذکر ہے ۔ دل میں جو چبھن اور طلب رہتی تھی اُس کا بیان ہے ۔ ستارہ، شبنم اور پھول سے
ملتی ہوئی اس عجیب صورت کا تذکرہ ہے جو بھلائی جا چکی ہے ــــ اس کا خیال کبھی شاعر کے لیے رشتۂ جان تھا لیکن اب حالات نے ان سب کی
بنیادیں ہلا دی ہیں اور یہ سب کے سب اُس کے دل میں داغ بن گئے ہیں ۔

ان تمام باتوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ناصر کاظمی بنیادی طور پر یادوں کے شاعر ہیں ۔ اور اُن کی عشقیہ شاعری میں انھیں
یادوں کا عنصر غالب ہے ۔ وہ محبوب اور محبت دونوں کو یاد کرتے ہیں اور انھیں یادوں میں اُنھیں مزہ ملتا ہے ــ ہجر و فراق تک کی
یادوں کے لیے لطف کا باعث بنتی ہے کیونکہ اس کا بھی بہرحال محبت سے ایک رشتہ ہے ــ کیا عجیب شعر انھوں نے کہا ہے ؎

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیںگی
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ظاہر ہے کہ جب وہ فراق کی راتوں کو نہیں بھولتے تو پھر محبوب کو کس طرح فراموش کر سکتے ہیں ۔ اُس کی یاد میں بھی اُن کا دل بیقرار رہتا ہے ؎

پھر اُس کی یاد میں دل بیقرار ہے ناصر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

غرض ناصر کاظمی کی عشقیہ شاعری یادوں کی شاعری ہے ــ ان یادوں میں ناکامی اور محرومی کا احساس ہے ۔ اور اس ناکامی اور
محرومی کے احساس کو حالات کی ناسازگاری اور نظام اقدار کی ناہمواری نے پیدا کیا ہے ۔ اسی لیے اُن کے یہاں اُس کسک کا احساس
ہوتا ہے ۔ جو اس زمانے کی زندگی میں بہت عام ہے ۔ ناصر نے اپنے عشقیہ اشعار میں جن واردات و کیفیات اور مسائل و معاملات کی ترجمانی
کی ہے اُن میں محرومی اور ناکامی کا احساس نمایاں ہے ، اسی لیے وہ کسک بھی اُن میں نظر آتی ہے جس کو زندگی میں اس ناکامی اور محرومی کے
احساس نے پیدا کیا ہے ۔

اور اسی صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہے کہ ناصر نے اپنی غزلوں میں عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی جو تفصیلات پیش کی ہیں ، اُن کی
نوعیت تمام تر جذباتی نہیں ہے ۔ اُن کا تعلق تو انسانی زندگی کے بنیادی حقائق سے ہے ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ جن معاملات اور واردات
و کیفیات کو انھوں نے پیش کیا ہے ، اُن میں زندگی کی بعض اہم اور بنیادی حقیقتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ ناصر نے عشق کے جذبے کو
موجودہ دور کے ایک عام انسان کی حرکات و سکنات کا روپ دے دیا ہے ۔ یہ حرکات و سکنات ، ظاہر ہے کہ خارجی حالات کی پابند
ہوتی ہیں ۔ اُن پر سماجی حالات کا اثر ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کے لطیف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انھیں غم کا خیال بھی آتا ہے ــ
زمانے کا غم انھیں گھیرے رہتا ہے اور وہ حسن و عشق کے لطیف اور رنگین معاملات
اُداس رہنے میں بھی ایک لذت سی محسوس ہوتی ہے ۔
کو بھی اس سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے ۔ اسی لیے اُن کے یہاں عشقیہ واردات کے ساتھ ساتھ زمانے کے غم کا احساس اتنا شدید ملتا
ہے ۔ اپنی غزلوں کے اشعار میں کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ طور پر وہ اس کا اظہار کرتے ہیں ؎

رہِ خیال میں کچھ مرحلے تو دیکھ لیے — یہ اور بات تری آرزو نہ راس آئی
پہنچے گور کنارے ہم — بس غمِ دوراں ہار رہے ہم
یہاں تک بڑھ گئے آلامِ ہستی — کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں

تلافیٔ ستمِ روزگار کون کرے　　تو ہم سخن بھی نہیں، رازدار بھی تو نہیں

پھر شامِ وصالِ یار آئی　　بہلا غمِ روزگار کچھ دیر

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا　　بلا رہا ہے کوئی بام سے اُتر کے مجھے

کڑے کوسوں کے سنّاٹے ہیں لیکن　　تری آواز اب تک آ رہی ہے

ایسا اُلجھا ہوں غمِ دنیا میں　　ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال　　اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

تمہیں دل گرفتہ نہیں دوستو!　　ہمیں بھی زمانے سے ہیں کچھ گلے

دن بھی اُداس اور مری رات بھی اُداس　　ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی

تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا　　تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا

ان اشعار میں کم و بیش وہی خیالات ہیں جن کی جھلک جدید دور کے بعض دوسرے شعراء کے یہاں ملتی ہے لیکن انھوں نے اِن خیالات کو اتنی شدّت کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے۔ ناصر کے یہاں عشق کے ساتھ زمانے کے اس غم کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ خالص رومانی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بھی اُن کی طرف اشارے کر جاتے ہیں اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غم اُن کے مزاج کا جزو بن چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ ناصر نے زمانے کے اُس آشوبِ قیامت کو دیکھا ہے، اور وہ خود اس غم کے سائے میں پلے بڑھے ہیں۔ اس غم کے بیان میں اس قدر شدّت کا بنیادی سبب یہی ہے۔ اسی طرح ناصر اُس نئی نسل کے مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں جس کو عشق میں رنگینیوں اور رعنائیوں سے زیادہ اس غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی عشقیہ شاعری میں رومانیت کے بجائے واقعیت اور حقیقت پسندی کا رجحان اس قدر نمایاں ہے۔

یہ واقعیت اور حقیقت پسندی ناصر کے مزاج کا بنیادی جزو ہے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اُن کی شاعری عشق اور عشقیہ معاملات ہی تک محدود نہیں ہے۔ وہ زندگی کی عام حقیقتوں کی ترجمان اور عکاس ہے۔ ناصر اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں۔ انھوں نے اِن حالات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی ہیں۔ اُن کے نشیب و فراز کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، اور ان کی وجہ سے زندگی میں جو صورتِ حال پیدا ہوتی ہے، اُس سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس تاثر ہی کے مختلف روپ اُن کی غزلوں میں موجود ہیں۔ زندگی میں انفرادی اور اجتماعی طور پر جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں وہ جس طرح تبدیلیوں سے ہمکنار ہوتی ہے اس کا اثر افراد کے ذہنوں پر ہوتا ہے۔ اس اثر سے وہ ذہنی اور جذباتی طور پر جن حالات سے دوچار ہوتے ہیں، اُس کی تفصیل ناصر کاظمی نے اپنی غزلوں میں پیش کی ہے۔ اُن کی غزلوں میں ماحول اور گرد و پیش کی حقیقت سے بھرپور تصویریں نظر آتی ہیں اور اُن کے اشعار زمانے اور زندگی کے صحیح مرقع معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی نئی نسل کے عام نوجوان کی طرح بلا کے حساس ہیں لیکن غضب کے باشعور ہیں۔ وہ معمولی باتوں کو بھی شدّت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے اُن پر اِن باتوں کا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ اُن کے بارے میں سوچنے اور غور کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں اسی صورتِ حال کا پرتو نظر آتا ہے۔

ناصر کاظمی کی شاعری کی نشو و نما ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے زمانے میں ہوئی ہے، اور اس زمانے میں اُن کے ماحول کو جس آشوبِ قیامت سے دوچار ہونا پڑا ہے، اُس کی انھوں نے حقیقت میں بڑی ہی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ زندگی پر جس طرح موت مسلط ہوئی ہے، رونقوں کا جس طرح خاتمہ ہوا ہے، بہاروں پر جس طرح خزاں آئی ہے، آشیاں جس طرح برباد ہوئے ہیں، اُس کو ناصر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ　　لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
اب کی فصلِ بہار سے پہلے　　رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں تم سے اب خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

اور آشیاں کے جلنے کے بعد زندگی کو جس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کی ترجمانی انھوں نے ایک غزل میں اس طرح کی ہے۔

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں ہم　　وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں
یہاں تک بڑھ گئے آلامِ ہستی　　کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں
کہاں تک تاب لائے ناتواں دل　　کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں
نگاہِ یاس کو نیند آ رہی ہے　　مژہ پر اشک بوجھل ہو گئے ہیں
انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ　　یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

ایک اور غزل میں شہروں کو جلا کر جشنِ طرب منانے کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

شہر در شہر گھر جلائے گئے　　یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی　　اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب　　اک طرف جشنِ جم منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سرِ بازار　　عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے
آہ وہ خلوتوں کے سرمائے　　مجمعِ عام میں لٹائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر
خار و خس کی طرح بہائے گئے

اور ہجرت کے سفر کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے　　غمِ صد کارواں دیکھا نہ جائے
کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار　　بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے

غرض ناصر نے اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے حالات و واقعات کے گہرے اثرات قبول کئے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات

کو پیش کرنا اُن کی غزل کا ایک اہم رجحان ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان تفصیلات کو پیش کرتے ہوئے ناصر کا زاویۂ نظر تمام تر خارجی ہی نہیں رہا ہے اور انھوں نے اس سلسلے میں صرف اپنے مشاہدات ہی کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، داخلی پہلو بھی اُن کے پیشِ نظر رہے ہیں؛ اور انھوں نے حالات و واقعات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے تاریخی واقعات نے جس طرح نئی نسل کے ذہن کو متاثر کیا ہے، اور جذباتی اعتبار سے اس پر جو کچھ بیتی ہے، اس کی صحیح عکاسی ناصر کاظمی کی غزلوں میں نظر آتی ہے۔

لیکن ناصر کی شاعری صرف عصری میلانات کی ترجمانی ہی تک محدود نہیں ہے۔ اُس کا میدان بہت وسیع ہے۔ اُس میں بڑی ہمہ گیری ہے۔ وہ درحقیقت انسانی زندگی کے تنوع کے شاعر ہیں، اور انھوں نے زندگی کے انھی متنوع پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ زمانے کے حالات، گرد و پیش کے واقعات اور زندگی کے عصری میلانات کی ترجمانی تو اُن کی غزل کا ایک پہلو ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے ان گنت پہلوؤں کو بھی انھوں نے غزل میں داخل کیا ہے۔ مثلاً ناسازگار سماجی ماحول اور ایک غلط نظامِ اقدار میں زندگی جن حالات سے دوچار ہوتی ہے، اس کی تفصیل بھی انھوں نے اپنی غزلوں میں پیش کی ہے ـــــ اس نظام نے زندگی کو اُجاڑ کر رکھ دیا ہے، جن کی وجہ سے اُن کی نظر میں گھر گھر سوگ کو پھیلا ہوا دیکھتی ہیں۔ لوگ اُنھیں دن دن بھر گلیوں میں بیکار پھرتے اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ راگی اور فنکار انھیں اس ماحول میں سہمے سہمے دکھائی دیتے ہیں۔ اِن اشعار سے اس ماحول کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ؎

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ　　دِلّی اب کے ایسی اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بیکار　　راتوں اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ
سہمے سہمے بیٹھے ہیں راگی اور فنکار　　بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ

اور نہ صرف یہ بلکہ اس ماحول میں ساری زندگی انھیں سنسان نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ شہروں میں سناٹا ہے۔ آبادیوں میں ویرانی ہے جھونپڑوں میں تاریکیاں ہیں۔ میلوں تک صحرا ہی صحرا پھیلے ہوئے ہیں، اور ان میں خاک اُڑ رہی ہے۔ دور دور تک کوئی لطیف اور شیریں آواز سنائی نہیں دیتی۔ حدِ نظر تک جنگل ہی جنگل ہے، اور یہ جنگل زاغ و زغن کی چیخوں سے گونجا ہوا ہے۔ سورج کی گرمی نے روزِ جزا کی یاد تازہ کر دی ہے۔ دھرتی جل رہی ہے۔ بہتے دریا سوکھ گئے ہیں۔ فصلیں جل کر راکھ ہو گئی ہیں اور نگری نگری کال پڑا ہوا ہے ـــــ ان حالات کا اُن پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ خدا کو مخاطب کر کے چیخ اُٹھتے ہیں ؎

او میرے مصروف خدا　　اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے　　شہروں میں ہے سناٹا
جھونپڑی والوں کی تقدیر　　بجھا بجھا سا ایک دیا
خاک اُڑاتے ہیں دن رات　　میلوں پھیل گئے صحرا
سورج سر پہ آپہنچا　　گرمی ہے یا روزِ جزا
پیاسی دھرتی جلتی ہے　　سوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں　　نگری نگری کال پڑا

اومیرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا

لیکن وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ زندگی ہمیشہ اس صورتِ حال سے دوچار نہیں رہ سکتی۔ انھیں اس کا نقشہ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کی نگاہیں اس تبدیلی کو دیکھتی ہیں جو زندگی میں اندر ہی اندر جاری ہے۔ چنانچہ وہ زندگی کے مسافر کو جاگنے اور اس اندھیاری نگری سے باہر نکلنے کا پیام دیتے ہیں ؎

مایوس نہ ہو اُداس راہی — پھر آئے گا دورِ صبح گاہی
اے منتظرِ طلوعِ فردا — بدلے گا جہانِ مرغ و ماہی
پھر خاک نشیں اٹھائیں گے سر — مٹنے کو ہے نازِ کج کلاہی
انصاف کا دن قریب تر ہے — پھر داد طلب ہے بے گناہی
پھر اہلِ وفا کا دور ہوگا — ٹوٹے گا طلسمِ کم نگاہی

آئینِ جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کے یہاں سماجی حالات کا کتنا گہرا شعور ہے، اور وہ اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز اور معاشی معاشرتی حالات کے مد و جزر کو کیسی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ناصر کے یہاں ان مواقع پر انقلابی شاعری کا آہنگ پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ وہ دھیمے مزاج کے شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں ہیجان انگیز اور اعصاب شکن شاعری نہیں ہے۔ مزاج کی اسی کیفیت نے انھیں غزل سے قریب کیا ہے۔ وہ ان خیالات کو اسی صنف کے سانچے میں ڈھالتے ہیں لیکن ان خیالات نے ظرفِ تنگنائے غزل کو بقدرِ ذوق بنا دیا ہے اور اس میں وسعتیں پیدا کر دی ہیں۔ لیکن عام غزل گو شعراء کی طرح ناصر کے یہاں انفعالیت پسندی نہیں ہے۔ وہ اُداس ضرور ہوتے ہیں۔ اُن کے یہاں زندگی کا غم بھی بہت شدید ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک رجائی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ انھیں تاریکیوں میں بھٹکنا نہیں آتا۔ وہ تو ان تاریکیوں میں امنگوں اور ولولوں کے چراغ روشن کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں زندگی کے افق سے آندھی اٹھتی ہوئی ضرور نظر آتی ہے لیکن اس کو دیکھ کر گھبرانے اور پریشان ہونے کے بجائے طنابِ خیمۂ گل کو تھامنے کا خیال اُن کے یہاں پیدا ہوتا ہے ؎

طنابِ خیمۂ گل تھام ناصر
کوئی آندھی اُفق سے آ رہی ہے

اسی لیے وہ ذوقِ آوارگی اور فرصتِ سیر و تماشائے بہاراں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے خیال میں اسی طرح خاک سے کرن پھوٹنے اور پردۂ گل سے آواز آنے کا امکان ہے ؎

کیا خبر خاک ہی سے کوئی کرن پھوٹ پڑے — ذوقِ آوارگیٔ دشت و بیاباں ہی سہی
پردۂ گل ہی سے شاید کوئی آواز آئے — فرصتِ سیر و تماشائے بہاراں ہی سہی

یہ اشعار واضح طور پر رجائیت پسندی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ رجائیت پسندی ناصر کے مزاج کی بڑی اہم خصوصیت ہے اور زندگی اور زمانے

کے غم کے باوجود اُن کی غزل میں رجائیت کی یہ چاندنی کھلی رہتی ہے۔

اس رجائیت پسندی نے اُن کے یہاں زندگی کو بسر کرنے کا احساس پیدا کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں سے دلچسپی کو بڑھایا ہے۔ چنانچہ وہ زندگی سے بیزار ہونا نہیں جانتے۔ بلکہ اس کے ہر پہلو سے لطف اندوز ہونے کا مزاج رکھتے ہیں۔ اور اس کی جھلک ان کی غزلوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ان غزلوں میں بھی زندگی کا احساس بہت شدید ہے، اور اسی احساس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ اس زندگی کے مختلف پہلوؤں سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اُس کی ایک ایک بات میں انھیں حُسن نظر آتا ہے اور ہر حال میں وہ اس حسن سے لطف اُٹھاتے اور لذّت حاصل کرتے ہیں۔ اس لطف اور لذّت کی نوعیت حواسی یا حسیاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں بعض ایسی باتوں کا تذکرہ ملتا ہے جو اُن پر سرخوشی بن کر چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو گوشت پوست کے انسان سے دلچسپی اور اس کے حُسن سے لطف اندوز ہونے کا خیال اُن کے یہاں نمایاں ہوتا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کیسے کیسے حسین اور دلآویز اشعار کی تخلیق کی ہے ؎

آنکھ کا تارہ آنکھ میں ہے — اب نہ گنیں گے تارے ہم
زلفوں کے دھیان میں لگی آنکھ — پُر کیف ہوا میں سو گئے ہم

پر شب یہ خیال و خواب تیرے — کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
دل میں تیری یادوں نے — کیسے کیسے رنگ بھرے

سایۂ زلفِ بتاں میں ناصرؔ — ایک سے ایک نئی رات آئی

کم فرصتیٔ خوابِ طرب یاد رہے گی — گزری جو ترے ساتھ وہ شب یاد رہے گی

اولیں قرب کی سرشاری میں — کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں
وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول — ایک صورت تھی عجب یاد نہیں
کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال — جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

یاد آتا ہے بے سبب کوئی — ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی
لبِ جُو، چھاؤں میں درختوں کی — وہ ملاقات تھی عجب کوئی
جب تجھے پہلی بار دیکھا تھا — وہ بھی تھا موسمِ طرب کوئی

اولیں چاند نے کیا بات سجھائی مجھ کو — یاد آئی تری انگشتِ حنائی مجھ کو

جب سے دیکھا ہے ترے ہاتھ کا چاند — میں نے دیکھا ہی نہیں رات کا چاند

کبھی دیکھی تھی اُس کی ایک جھلک — رنگ سا جم رہا ہے آنکھوں میں

ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے — جسم ہے یا چاندنی کا شہر ہے

آنچ آتی ہے ترے جسم کی عریانی سے — پیرہن ہے کہ سلگتی ہوئی شب ہے کوئی

ترے خیال سے لَو دے اٹھی ہے تنہائی — شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز — بلا رہی ہے ابھی تک وہ دل نشیں آواز

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی — مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے
جسے میں نے رخصت کیا صبح دم — وہ جگنو تھا برسات کی رات کا

یہ اشعار جمالیاتی شاعری کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ اِن کا اثر براہِ راست حواس پر ہوتا ہے۔ ان میں حُسن کا احساس اور احساس کا حُسن دونوں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں — ناصر نے یہاں خارجیت کے حُسن اور حُسن کی خارجیت ہی کو پیش نہیں کیا ہے، داخلیت کے حُسن اور حُسن کی داخلیت کی تصویر کشی بھی کی ہے —— اور یہ سب کچھ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ حُسن کو ہر زاویے سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ حُسن زندگی کا حُسن ہے، اور زندگی ناصر کو بہت عزیز ہے۔ وہ اس سے اُکتاتے نہیں۔ اسے بسر کرنے اور برتنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اُن کے مزاج کی اسی کیفیت نے اُن سے اس قسم کے اشعار کی تخلیق کرائی ہے۔

لیکن ناصر کاظمی کو زندگی کے صرف انھیں پہلوؤں سے لگاؤ نہیں ہے۔ انھوں نے انسان اور انسانی حُسن اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مختلف محسوسات کے ساتھ فطرت کے مناظر سے بھی دلچسپی لی ہے۔ موسموں سے بھی لُطف حاصل کیا ہے۔ انسان کے جذباتی اور جسمانی تسکین کے خیالات سے بھی مزے لیے ہیں۔ اور زندگی سے ان تمام پہلوؤں کی ترجمانی نے اُن کی غزلوں میں تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ رنگینی اور پُرکاری پیدا کی ہے۔ درحقیقت یہ مشاہدات و تجربات کا تنوع اور خیالات و احساسات کی رنگینی ہے جو ان زاویوں سے اُن کے اشعار میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ اِن اشعار میں زندگی اور اُس کے مختلف روپ کو دیکھنے اور اُن سے لطف اندوز ہونے کا احساس کتنا شدید ہے ؎

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن — کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن
دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان — شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سُن
چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان — ڈوبتے دن کی ندا غور سے سُن
کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام — روح کے تار ہلا غور سے سُن
یاس کی چھاؤں میں سونے والے — جاگ اور شورِ درا غور سے سُن

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے — میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں ہم — وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں

دیتے ہیں سراغ فصلِ گُل کا — شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو — بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

کتنے مانوس لوگ یاد آئے — صبح کی چاندنی میں کیا کچھ تھا

دورِ فلک جب دہراتا ہے موسمِ گُل کی راتوں کو — کنجِ قفس میں سُن لیتے ہیں بھولی بسری باتوں کو
ریگِ رواں کی نرم تہوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا — سُونے صحرا چیخ اُٹھتے ہیں آدھی آدھی راتوں کو

پھر کئی لوگ نظر سے گزرے — پھر کوئی شہرِ طرب یاد آیا
بیٹھ کر سایۂ گُل میں ناصر — ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

رنگ صبحوں کے راگ شاموں کے		جیسے سپنا کوئی اُداس اُداس
کیا سنسان ہے سحر کا سماں		پتیاں محوِ یاس گھاس اُداس
صبح ہونے کو ہے اٹھو ناصر		گھر میں بیٹھے ہو کیوں اُداس اُداس

پھر چاند کو لے گئیں ہوائیں		پھر بانسری چھیڑ دی ہوا نے

رستوں میں اُداس خوشبوؤں نے		پھولوں کے لٹا دیئے خزانے

اولیں شبِ گلشن کس قدر سہانی تھی		اجلی مہک پا کر ہم نکل پڑے گھر سے

رین اندھیری ہے اور کنارہ دُور		چاند نکلے تو پار اُتر جائیں

آئیں ساون کی اندھیری راتیں		کہیں تارہ کہیں جگنو نکلا

ذرّے پھر مائلِ رم ہیں ناصر		پھر انھیں سیرِ فلک یاد آئی

یہ اشعار اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ناصر کاظمی صحیح معنوں میں انسانی زندگی کے شاعر ہیں۔ اس زندگی کے مختلف پہلوؤں سے انھوں نے دلچسپی لی ہے۔ انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان پر غور کیا ہے۔ اور اس طرح وہ زندگی کی تہہ تک پہنچے ہیں اور اس کی بعض اہم اور بنیادی حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے — اس سلسلے میں وہ محسوسات کے راستے پر گامزن ہوئے ہیں۔ اُن کے یہاں فکری پہلو غالب نہیں ہے — وہ فلسفی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی سے اُن کی دلچسپی ذہنی اور فکری ہونے کی بجائے محسوساتی اور عملی زیادہ ہے۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ اُس کو دیکھنے، سمجھنے، برتنے اور بسر کرنے کے خیالات اُن کی غزلوں میں زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے اُن میں زندگی اور جولانی کا پتہ چلتا ہے، اور تنوع اور رنگارنگی، وسعت اور ہمہ گیری کی خصوصیات اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔

یہ موضوعات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ناصر کاظمی نے غزل کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے۔ اُن کی غزل نئی زندگی کے نئے معاملات و مسائل اور نئی نسل کے متنوع مشاہدات و تجربات کی صحیح آئینہ داری کرتی ہے۔ اسی لیے اُس میں ایک نیا مزاج ملتا ہے، اور نہ صرف یہ اعتبارِ مضامین جدّت اور تازگی نظر آتی ہے بلکہ فنی لحاظ سے بھی اُس میں ایک اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں غزل کا روایتی اسلوب نہیں ہے۔ کیونکہ مخصوص الفاظ کے استعمال اور اُن کی متناسب دروبست سے انھوں نے ایک نئے وزن و آہنگ کی تخلیق کی ہے۔ نئی علامتوں اور نئے اشاروں نے اُن کی غزل کو ایک نئی فضا سے آشنا کیا ہے۔ انھوں نے نئی نسل کی مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیت کے اظہار کے لیے اَن گنت نئے پیکر تراشے ہیں — اسی لیے اُن کی غزلوں کی امیجری بالکل نئی اور اچھوتی لیکن مانوس معلوم ہوتی ہے۔ احساس کی شدت اور تخیّل کی جولانی نے اُن کی تشبیہات و استعارات میں کچھ ایسا رنگ دیا ہے جس سے زندگی پھوٹی پڑتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک سادہ اور پُرخلوص انسان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ خلوص اور صداقت اُس کا جوہر ہے۔ سادگی اور صفائی اُس کی جان ہے — اِن خصوصیات کی جھلکیاں اُن کے اس مخصوص اسلوب میں بھی نظر آتی ہیں جو اُن کی غزل کی بنیاد ہے۔ برجستگی اور بے ساختگی، شگفتگی اور شادابی، توازن اور ہم آہنگی، تسلسل اور تازگی اور سادگی سے ملی جلی رنگینی اور پُرکاری اس اسلوب کی نمایاں ترین خصوصیات ہیں — یوں تو ناصر کے ہر شعر میں اس مخصوص اسلوب کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن اِن اشعار میں تو اس کا شباب نظر آتا ہے ؂

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں		یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

دلِ ویراں میں دوستوں کی یاد جیسے جگنو ہوں داغ میں گُل کے
پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
مرا دلِ خوگرِ طوفاں ہے ورنہ یہ کشتی بارہا ساحل سے گزری
خموشی انگلیاں چٹخا رہی ہے تری آواز اب تک آرہی ہے
دلِ وحشی لیے جاتا ہے لیکن ہوا زنجیر سی پہنا رہی ہے
میٹھی بولی میں پپیہے بولے گنگناتا ہوا جب تو نکلا
جسے میں نے رخصت کیا صبح دم وہ جگنو تھا برسات کی رات کا
یوں پریشاں ہوئیں تری یادیں جیسے اوراقِ گُل بکھر جائیں
پھول سے ناچتے ہیں ہونٹوں پر جیسے سچ مچ کسی کو چوم لیا
جی بہلتا ہی نہیں جب سے ناصر شہر لگتا ہے بیاباں مجھے
دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے
دل تو میرا اُداس ہے ناصر شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

یہاں آنکھوں میں بجھے ہوئے سویروں کو چھپائے ہوئے پھرنے، دلِ ویراں میں دوستوں کی یاد کے ساتھ جگنوؤں کے چمکنے، پرانی صحبتوں کیساتھ چراغوں کے دھوئیں کو دیکھنے، دل کی کشتی کے بارہا ساحل سے گزرنے، خموشی کے انگلیاں چٹخانے، ہوا کے زنجیر سی پہنانے، گنگناتے کے ساتھ پپیہے کے میٹھی بولی بولنے، کسی کی یاد کے پریشان ہونے کے ساتھ اوراقِ گل کے بکھرنے، کسی کو چومنے کے ساتھ ہونٹوں پہ پھول سے ناچتے، شہر کے بیاباں لگنے، دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر پاؤں دھرنے، دل کی اداسی کے ساتھ شہر کے سائیں سائیں کرنے کے جو خیالات پیدا ہوئے ہیں، اُن میں غزل کا ایک ایسا نیا اور اچھوتا انداز اور اسلوب نظر آتا ہے جس سے غزل کی روایت اب تک ناآشنا تھی۔
اس اسلوب کو نئی نسل کے نئے مزاج نے پیدا کیا ہے۔ ناصر کاظمی کی غزل اس مزاج کی صحیح آئینہ داری کرتی ہے اور اس نئی زندگی کے دل کی دھڑکنیں اس میں صاف سنائی دیتی ہیں جن کی نغمگی نے اُسے وقت کی آواز بنا دیا ہے۔ (تما)

○

یہ شور روزنِ زنداں سے صاف سنتا ہوں کوئی کہے نہ کہے یہ بہار کے دن ہیں
نہ پوچھ آج شبِ ہجر کس قدر ہے اُداس کہیں کہیں کوئی تارا ہے اور کچھ بھی نہیں
بھٹک رہا ہے جہاں قافلہ بگولوں کا کبھی ہجوم تھا ان راستوں میں پھولوں کا
رین اندھیری ہے اور کنارہ دُور چاند نکلے تو پار اُتر جائیں

برگِ نے (ناصر کاظمی کا مجموعہ کلام)

سید وقار عظیم

ایک ناول نگار

کوئی دورِ جدید کے اردو ناول کی ابتدا اور اس کے ارتقا کی کہانی سنانا شروع کرے تو پریم چند سے قرۃ العین حیدر تک کئی نام سامنے آتے ہیں جنہیں اس لئے رہبری کا مقام حاصل ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی کسی نہ کسی تخلیق سے ناول نگاروں کو فن کی ایک نئی راہ دکھائی ہے اور یوں ان کی تخلیقات کو (گو ان کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں) فن کی مختلف راہوں پر سنگِ میل کا درجہ ملا ہے۔ "میدانِ عمل"، "ٹیڑھی لکیر"، "لندن کی ایک رات"، "گریز" اور "سفینۂ غمِ دل" یہ گنے چنے سنگِ میل ہیں۔ لیکن ان چند شاہکاروں میں سے "میدانِ عمل" کے سوا شاید کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے متعلق متضاد رائیں ظاہر نہ کی گئی ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کو "بہت اچھا" کہنے والوں کی کمی بھی نہیں اور "بہت برا" بھی۔ اور جن لوگوں نے ان ناولوں کو بہت برا کہا ہے ان کا اعتراض ان سب پر یہ ہے کہ یہ کہانیاں نہیں ہیں اور پلاٹ کے اس فنی تصور سے خالی ہیں جس کا مقصد کہانی میں دلچسپی اور کہانی پڑھنے والے کے دل میں مد و جزر، اتار چڑھاؤ اور سکون و اضطراب کی ان موجوں اور کیفیتوں کا پیدا کرنا ہے۔ جو شوق کی صورت اختیار کرتی اور پڑھنے والے کو آگے پڑھنے پر مائل اور مجبور کرتی ہیں۔ یہ اعتراض ان لکھنے والوں پر زیادہ کیا گیا ہے جنہوں نے نئے تجربے کی ضرورت اور اہمیت کو مسلّم جان کر بات ایک نئی طرح کہنے کی جرأت کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سب و ستم کا نشانہ پہلے عصمت کو بنایا گیا اور پھر انہیں بھلا کر قرۃ العین حیدر کو۔ "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غمِ دل" پڑھنے والوں کے ایک حلقے میں یقیناً پسند کئے گئے لیکن دوسرے حلقے نے انہیں سرے سے ناول ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ اس حلقے کے قاری کے نزدیک ایک خاص طرح کے ہیرو، ہیروئن اور ایک خاص طرح کے ماحول اور فضا کے بغیر کہانی کہانی نہیں بنتی اور ناول کے کردار اپنی گفتار و رفتار میں زندگی کے عام انسانوں سے ملتے جلتے ہوں تو ان کی صحبت میں جی نہیں لگتا۔ اس کے باوجود جو قاری انگریزی سے واقفیت کی بنا پر یہ سمجھنے کے عادی ہو چکے تھے کہ ناول ایک واضح فنی وحدت اور ہیئت کا حامل ہونے کے بجائے بے ہیئت ہو کر بھی اعلیٰ قسم کی فنی تخلیق ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ان ناولوں کو قدر کی نظر سے دیکھا اور ان میں جا بجا مشاہدے کی باریکی، فکر کی گہرائی، تخیل کی شوخی، احساس کی شدت اور جذبے کے خلوص کے علاوہ بیان کی جو جدّت تھی اسے سراہا۔ ان دو گروہوں کے علاوہ مبصّروں کا ایک بہ وہ گروہ ایسا تھا جس نے ان ناولوں میں (خصوصاً "سفینۂ غمِ دل" میں) مغربی ناول کے فنی تجربوں کی کئی ایسی جھلکیاں دیکھیں جو اس سے پہلے کسی اردو ناول میں نظر نہیں آئی تھیں ("سفینۂ غمِ دل" میں کرداروں کے عمل اور زمانے کے تیزی سے بدلتے ہوئے رنگ میں ہر جگہ "وقت" کارفرما نظر آتا ہے) قرۃ العین حیدر کے ان دونوں ناولوں کو بے ہیئت (FORM LESS) ناول نگاری کے اس دور میں اس لحاظ سے فن کا کامیاب مظہر سمجھا اور بتایا گیا تھا کہ ان میں اس دور کے بعض مغربی شاہکاروں کے فنی تجربوں کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کی گئی تھی (پروست کا ناول IN SEARCH OF LOST TIME ہکسلے کا TIME MUST HAVE A STOP: FASTER, FASTER ورجینا وولف کے ناول MER DALLOWAY، THE WAVES اور جیولیس رومین کا MEN OF GOOD WILL

YEARS وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں) گو یہ گرفت یہاں اتنی مضبوط کہیں نہیں ہو سکی کہ وہ واقعی اس کی اپنی گرفت معلوم ہوتی۔ تقلید کا سایہ اس پر بہرحال چھایا نظر آتا ہے ـــــ لیکن تجربوں کے اس "عبوری" دور میں سے گزرنے کے بعد قرۃ العین حیدر نے ایک اور ناول لکھا ہے جو "بے ہیئت" ہونے کے باوجود ("بے ہیئت" کے اس استعمال میں کسی طرح کے جذبے کو قطعی دخل نہیں) فن کے مکمل رچاؤ کا بڑا موثر نمونہ ہے۔ "آگ کا دریا" رسمی مفہوم میں کہانی نہیں کہانی سے زیادہ مزے دار ہے۔ وہ فلسفہ نہیں لیکن فکر کی گہرائی سے بھرپور ہے۔ وہ تاریخ نہیں لیکن اس کا ہر صفحہ تاریخی صداقت کے نور سے معمور ہے۔

"آگ کا دریا" کسی ایک طبقے یا گروہ کی زندگی یا کسی ماحول میں رہنے والے انسانوں کی کہانی نہیں بلکہ "انسان" کی کہانی ہے۔ اس انسان کی جسے ہر دور میں ایک نئی قیامت کا سامنا کرنا پڑا ہے، جو ہر دور میں ایک نئی کشمکش میں مبتلا رہا ہے۔ جس پر ہر دور میں خوف کے بھیانک سائے منڈلاتے رہے ہیں۔ جسے ہمیشہ تنہائی کے احساس نے ستایا اور رلایا ہے اور جو ہر لمحے وقت کے ایک طلسم میں گرفتار رہا ہے ـــــ البتہ اس قیامت کی صورت، اس کشمکش کی اور خوف کی نوعیت، اس احساسِ تنہائی کی کیفیت بدلتی رہی ہے۔ اور وقت نت نئے روپ میں ظاہر ہو کر ان میں سے ہر ایک میں اپنا مخصوص رنگ شامل کرتا رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے انسان اور وقت کی اس باہمی کشمکش اور بے کار کی کہانی کا آغاز اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے کی زندگی سے کیا ہے ـــــ جب "گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹک کر پیچھے دیکھا" ہے۔ کہانی کے اس آغاز سے پہلے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی جس نظم کو ۲۵ صدیوں کی اس بھرپور داستان کا پیش لفظ بنایا گیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

خاتمہ کہیں نہیں ہے ـــــ صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھسٹتا ہوا تسلسل

ـــــــــ

ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا
یہ لمحے مستقل ہیں، جس طرح وقت مستقل ہے

ـــــــــ

وقت جو تباہ کن ہے، جس طرح وقت مستقل ہے

ـــــــــ

اور اے مسافرو!
مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو!
آگے بڑھو!

ـــــــــ

اس پیش لفظ کے بعد گوتم نیلمبر کی داستان شروع ہوتی ہے ـــــ اس طرح:

"گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہو چکی تھی، اگر اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھائی پڑ رہے تھے۔ اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی

پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائیگی — گوتم کو خیال آیا۔

یہی گوتم ڈھائی ہزار برس کے ہزاروں اونچ نیچ سے گزر کر، چٹانیں، اولانش، گلیشیر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ، ان سب میں سے گزرتا، مُردوں کی لہروں پہ بہتا، گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا۔ چوٹی پر وہ دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے، دور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا اَزلی اور ابدی انسان — تھکا ہوا، شکست خوردہ، بشاش، پُرامید — انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔ وہ مسکرا کر نیچے اترا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ منڈیر پر سے اُترا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا بستی کی طرف واپس چلا گیا۔"

ناول کا دوسرا بڑا کردار کمال ہے۔ جو ناول کے ابتدائی حصوں میں ابوالمنصور کمال الدین کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور آگے چل کر اسے غدر کے بعد والے لکھنؤ اور کلکتہ میں نواب کمال رضا عرف نواب کمّن صاحب اور اس سے بہت آگے چل کر موجودہ نسل کے نمائندے کا کردار ادا کرنا ہے — موجودہ نسل کا نمائندہ لڑکا "ذہن پرست، با اصول، ایماندار، شدید طور پر خلوص، تصور پرست")

"ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد کے درخت کے نیچے باندھا اور چاروں اور نظر ڈالی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو یہ جگہ بڑی سہانی معلوم ہوتی۔ سامنے ندی بہہ رہی تھی۔ دو جھونپڑے بنے تھے۔ شوالوں میں سے گھنٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ گاؤں کی عورتیں گھونگھٹ کاڑھے آتیں اور مزار پر پھول چڑھا کر آگے چل جاتیں۔ اس نے جھک کر پانی میں انگلیاں ڈبوئیں اور پانی کی خنکی اسے بہت اچھی لگی۔ پتھروں کے نیچے جہاں لہروں کا بھنور سا بنا تھا اس میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا اور ایک لمحے کے لئے وہ متعجب سا ہو گیا۔ وہ آخر یہاں کیا کر رہا ہے!"

"کمال اس ملک میں تازہ وارد تھا۔ اسے جونپور میں رہتے صرف چند سال گزرے تھے۔ بائیس سال کی عمر تک اس نے بغداد کے مدرسے میں بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ بہت سے نظریوں پر غور و فکر کیا تھا۔ وہ بخارا کے ابن سینا، الفارابی اور ایران کے فخرالدین رازی اور اُندلس کے ابن رُشد اور ابن العربی کا مفصل مطالعہ کر چکا تھا۔ ابن خلدون کو وہ اپنا گرو سمجھتا تھا اور وہ ارادہ کر رہا تھا کہ عرب اقوام کی تاریخ لکھنا شروع کرے۔ ابن خلدون کے مکتب سے تعلق رکھنے والے چند مفکروں سے ملنے کی غرض سے وہ مغرب کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ جب قاہرہ سے اسے اطلاع ملی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ واپس لوٹا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔ نیشاپور میں اس نے اپنے ایک دوست سے سُنا کہ اہلِ بیعت کے ساتھ ساتھ اہلِ علم بھی اب ایک نئے ملک کا رُخ کر رہے ہیں، جس کا نام ہند ہے۔ کمال نے اپنی محبوب کتابیں اپنے ساتھ لیں اور وسطِ ایشیا، کشمیر اور لاہور سے ہوتا ہوا تغلق آباد پہنچا۔"

اس کمال کو یاد تھا کہ :-

"تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب بے چارے انسان پر کوئی نہ کوئی قیامت نہ گزری ہو۔ پچھلی صدیوں

میں تاتاریوں کی یلغار نے ملکوں کو تہ و بالا کر دیا۔ عیسائی نسطوریوں اور ایران کے آتش پرستوں اور اندلس کے یہودیوں اور عرب کے مسلمانوں نے مل جُل کر علم کا جو دھوم دھام سے چراغاں منایا تھا وہ صحرائے گوبی سے اٹھنے والی زرد آندھیوں نے سارے کا سارا بجھا کر رکھ دیا۔ بنو امیہ کا دمشق، عبدالرحمٰن کا اشبیلیہ ــــ آنکھوں کے سامنے کیسی کیسی تصویریں کھنچتی تھیں۔ اس قیامت کے بعد بچا کھچا علم جو باقی رہا وہ مسلمان اقوام کی آپس کی تفرقہ اندازیوں اور تنازعوں کی نذر ہوا۔ خیالات کا ایتھنز جسے دوبارہ آباد کیا گیا تھا، بغداد کے ساتھ ساتھ اُجڑا۔ اسکندریہ کی خانقاہیں سنسان ہوئیں۔ صرف ایک خیال باقی رہا ـــ دنیا ناپائیدار ہے، دنیا فانی ہے۔ دنیا قابلِ نفرت ہے . . . ۔"

عربوں کا ذہن، ایرانیوں کے فنونِ لطیفہ، تاتاریوں کے حملے سے سب کا خاتمہ بالخیر ہو چکا تھا مگر اس کے ایک سو سال بعد سمرقند اور ہرات میں پھر روشنی ہوئی۔ مصوری میں چین اور ایران کے نقوش ہم آہنگ ہوئے۔ یہ تخریب پسند تاتاری، مغرب میں مسلمان ہوئے۔ مشرق میں انہوں نے بدھ مذہب اختیار کیا۔ سبکتگین کے دور میں کابل کے ہندو ترکی شاہیہ بادشاہ مسلمان ترکوں میں تبدیل ہوئے۔

گو انسان کو اب بھی چین نصیب نہیں تھا۔ محمود کے متعلق البیرونی نے کہا کہ ہندو اس کے حملے سے ریت کے ذرّوں کی طرح بکھر گئے۔ ان کی کہانی داستانِ پارینہ میں شامل ہو چکی ہے۔ جو باقی ہیں وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جس طرح بغداد اور اسکندریہ تباہ ہوا تھا۔ اسی طرح متھرا اُجڑا اور نالندہ، قنوج اور اُجین، یہ سب انسانوں کی بستیاں تھیں جن میں عام مرد اور عورتیں رہتے تھے اور جنہوں نے ان کو ختم کیا وہ بھی عام انسان تھے۔

مگر اس افراتفری، اس قتل و غارت، ان جنگوں اور سڑکوں کے گرد و غبار کے پیچھے علم کے چراغ ٹمٹماتے رہے۔ کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ درس تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت کا چراغ کبھی نہ بجھ سکا۔

اور اسی خون ریز دور میں جنوب کے پُرسکون ساحلوں پر خوبصورت کلیسا تعمیر کئے جا رہے تھے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی شاداب بستیوں میں پیڑوں کے تہوار منائے جاتے تھے اور عرب تاجروں کی آبادیوں میں رات کے وقت قانون، عود، نے اور نفیری کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور شاہی پورم کے مندروں میں رقص ہوتا تھا۔"

اور غریب الوطن کمال نے آنکھ کھول کر دیکھا تو اسے ایک کسان نظر آیا جو انگوچھا سر سے لپیٹے زور زور سے بارہ ماسا الاپتا بستی کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ اس کسان کے پس منظر میں سارا عبرانی تمدن تھا اور کلدانیوں اور فینیقیوں اور اسوریہ والوں کی روایات اور یونان تھا اور روم ــــ اور عجم کے گلستان اور نیل کے ساحل اور مغرب کے لامحدود پہاڑی سلسلے اور پھر اس کی اپنی کائنات جس میں جوگی ہوا میں اڑتے تھے، ساحرائیں آدمیوں کو بکرا بنا دیتی تھیں۔

ہندوستان کے گوتم اور پاکستان کے کمال کے جسم، ذہن اور روح میں ہزاروں برس میں پھیلی ہوئی یہ زندگی سمائی ہوئی تھی ــــ زندگی جس میں ۵ہ طول طویل اور مسلسل صدیوں کی سیاست، فلسفہ، مذہب، تہذیب، معاشرت اور ان میں سے ہر ایک کے رسوم، آداب اور رومانس ــــ ان سب سے بڑھ کر مختلف ملکوں اور قوموں کی سیاستوں، فلسفوں، مذہبوں، تہذیبوں اور معاشرتوں کا باہمی تصادم اور اس تصادم سے پیدا ہونے والے

گوناگوں اثرات جو نت نئے روپ اور رنگ اختیار کرتے اور زندگی کے ظاہر اور باطن کو اس طرح بدلتے رہتے ہیں کہ آج کی زندگی اور کل کی زندگی میں کوئی مشابہت نظر نہیں آتی اور یہ سب کچھ کبھی کبھی اس طرح گڈمڈ ہو جاتا ہے کہ آدمی کا دماغ "بھان متی کا پٹارا" بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا چاہتا ہے اور انہیں الگ الگ دیکھ کر پھر ان کے درمیان ایک ربط اور رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے لیکن خیال کے رشتے الجھ جاتے ہیں اور کسی کا سرا ہاتھ نہیں آتا۔ "آگ کا دریا" ۲۵ صدیوں میں اسی طول طویل اور مسلسل زندگی کے جسم اور روح کو اوراق کے قید خانے میں اسیر اور لفظوں کے طلسم میں گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کوشش اتنی کامیاب ہوئی ہے کہ اردو ناول کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ۲۵ صدیوں کی مکمل زندگی کے اس طلسم کو اتنی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لینے کے لئے کہ اس کے رشتوں میں کہیں الجھن نہ پیدا ہو۔ ناول نگار کو کتنا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا ——— تاریخ، فلسفے، آرٹ اور ادب کے کتنے ماخذوں کو چھاننا پڑا ہوگا، کتنے افکار کی گہرائیوں میں غوطے لگا کر گوہر مقصود نکالنے پڑے ہوں گے اور کتنے مشاہدات اور تجربات کو یکجا کر کے ان کی لڑیاں گوندھنی پڑی ہوں گی۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے آٹھ سو صفحے کے اس ضخیم ناول کا کوئی صفحہ کھول لیجئے، وہاں آپ کو وسیع مطالعے، عمیق فکر، ہمہ گیر تخیل، باریک مشاہدے اور ان سب کے بڑے گہرے امتزاج کا عکس نظر آجائے گا۔ ۲۸

"آگ کا دریا" میں جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا تاریخ کے ہزاروں صفحوں کا نچوڑ، فلسفے کے بے شمار نظریات کی روح، ادب و شعر کے بے اندازہ رنگوں کا امتزاج اور تہذیبوں، معاشرتوں، مذہبوں، رسموں اور رواجوں کے امتیازی خط و خال کی مصوری ہے، اور یہ اس ناول کا ایسا امتیاز ہے جو اردو ناول نگاری کی تاریخ میں صرف اسی کے لئے خاص ہے ——— لیکن اس کا دوسرا بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے مورخ، فلسفی، مفکر، سیاسی مبصر اور نقاد کے منصب ادا کرتے وقت یہ بات کبھی نہیں بھلائی کہ زندگی کے اس پھیلاؤ کو سمیٹنے کے لئے اس کے پاس ناول کا سانچا اور پیمانہ ہے اور اس سانچے اور پیمانے کے کچھ خطوط اور نقش ہیں کہ جنہیں نظر میں نہ رکھا جائے تو فنی تخلیق میں نہ نزاکت باقی رہتی ہے نہ حسن، اور اسی لئے نہ تاثیر نہ دل نشینی۔

۲۸ قرۃ العین حیدر کو اپنے کام کی عظمت اور نزاکت دونوں کا احساس ہے اور اس کا پتہ جہاں ایک طرف ناول کی مجموعی وضع (PAT ERN) سے چلتا ہے وہاں کہیں کہیں ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اپنی فنی ذمہ داری کو کتنی اہمیت دی ہے۔ اس کے ان کرداروں کے منہ سے نکلی ہوئی بعض باتیں سنئے جو مختلف عہدوں میں اس کے خیال کے ترجمان بن کر ہمارے سامنے آئے ہیں،

"اب میں من میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ جس طرح، جس تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی کہانی دہرانا چاہتا ہوں اس میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں ——— ان سب چیزوں کی میرے لئے بے اندازہ اہمیت ہے۔ تم کو یہ تفصیلات بے معنی اور شاید مضحکہ خیز بھی معلوم ہوں گی، جبھی تو کہانی سنانا کوئی آسان کام نہیں۔ پلاٹ کا توازن، مکالمات کی برجستگی، غیر ضروری جزئیات سے احتراز ——— یہی سب تو فن افسانہ نگاری کی تکنیک کہلاتا ہے ......"

"میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا طریقہ ہو کہ جس سے فضا، اس ماحول اور اس وقت کا سارا تاثر، ساری خواب آگیں کیفیت دوبارہ لوٹ آئے، کسی طرح تمہارے ذہن میں منتقل ہو جائے۔ یہ کمیونی کیشن ——— (COMMUNICATION) کہلاتا ہے اور بڑی مشکل چیز ہے"

اس مشکل چیز کو قرۃ العین حیدر نے کتنا آسان بنایا ہے اور کس طرح فضا، ماحول اور وقت کے سارے تاثر اور ساری خواب آگیں کیفیت دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اس کا تجزیہ کرنے کے لئے زیادہ کرید کی ضرورت نہیں۔ قرۃ العین حیدر کے پاس کئی فنی حربے ہیں اور ان حربوں کے استعمال انہیں اتنی قدرت ہے کہ ان میں سے ہر حربہ ان کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔ منظر کشی، واقعہ نگاری اور مکالمہ نگاری کو "آگ کے دریا" میں مفہوم کی ایک نئی وسعت، نئی نزاکت، نئی لطافت اور نئی گہرائی بھی ملی ہے اور تاثیر کی ایک نئی چبھن اور تڑپ بھی۔

کتاب کی ابتدا ایک منظر سے ہوتی ہے اور پھر کتاب کے آخر تک سیکڑوں منظر ہیں جو کبھی چند صفحوں کے بعد اور کبھی چند سطروں کے بعد آتے ہیں اور جب آتے ہیں تو ان میں تازگی اور شگفتگی بھی ہوتی ہے، اور اس ظاہری کیفیت کے علاوہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد بھی ہوتا ہے۔ ـــــ کبھی مناظر کو واقعات کی علامت بنایا جاتا ہے، کبھی ان سے واقعات کی رو کو زیادہ موثر بنانے کا کام لیا جاتا ہے، کبھی وہ کردار کی ذہنی کیفیت یا موڈ کی ترجمانی کرتے ہیں، کبھی وہ ایک ذہنی تصور کا عکس ہوتے ہیں اور کبھی پڑھنے والے کے ذہن کے لئے سکون و راحت کا ایک وسیلہ۔ منظر، فضا اور ماحول کے نقش کو ابھارنے اور مکمل کرنے میں بھی حصہ لیتا ہے۔ "آگ کا دریا" میں منظر زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ حقیقت میں انسان کے جذبے کی ایک شاعرانہ صورت ہے۔ مناظر کو ناول نگار نے مشاہدے میں تخیل کی لطیف رنگ آمیزی، زندگی کا ایک ایسا نقش بنایا ہے جس میں رومان کی رنگینی بسی ہے اور سحر کی کشش اور جاذبیت بھی ـــــ اور لطف یہ کہ ہر منظر کا ایک الگ رنگ اور رس ہے، ایک منفرد کیفیت ہے۔ دو ایک چھوٹے چھوٹے منظر دیکھئے:

"کھیتوں پر بادل جھکے کھڑے تھے۔ لڑکیوں کی چنریاں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔۔۔۔ اس نے چپکے سے اپنی پلکوں کو خشک کیا۔ پھر آسمان کی اور دیکھا۔ بادلوں میں سے ایک قطرہ پٹ سے اس کی پلکوں میں آن گرا ـــــ جس طرح سیپی میں بہار کی بوندیں ٹپک جاتی ہیں۔"

موسم کا یہ سحر، جس میں ہر منظر کے ساتھ ایک نیا رنگ اور نیا راگ شامل تھا، ایسا نہیں کہ کوئی اس سے بچ کر نکل سکے۔ کمال ہندوستان کے پردیس میں اسی سحر میں ڈوب جاتا ہے اور پھر اس پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ:

"وہ چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو، ان عجیب سادھوؤں کو، ان موروں اور گلہریوں کو، ان چرواہوں کو جو جلدی جلدی قدم اٹھاتے گزر رہے تھے، ان سب کو گلے سے لگالے۔ خوب چلا چلا کر ساون گائے۔ دنیا کتنی پرسکون، کتنی آرام دہ تھی۔ وہ طوطے، یہ سادھو، وہ کسان جو مینہ سے پناہ لینے کے لئے بھاگے بھاگے چھپر کی اور آرہے تھے، یہ سب اس کے دوست تھے، اس کے بھائی تھے ـــــ" "جے رام جی کی" اس نے آہستہ سے کہا۔

سادھو نے مسکرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں "جے رام جی کی" اس نے جواب دیا "کہو سپاہی ـــــ کہاں سے آنا ہوا؟"

"میں سپاہی نہیں ہوں ـــــ"

"سلطان کے آدمی تو ہو ـــــ"

"ہاں! مگر میں کتابیں لکھتا ہوں۔"

"اچھا ـــــ" سادھو نے اسی اطمینان سے جواب دیا اور جپا اٹھا کر رام نام کا ورد شروع کر دیا۔ گویا کمال کے ساتھ اس کا یہ مکالمہ بالکل حتمی تھا۔

"آگ کا دریا" میں یہ مکالمے اسی طرح ایکا ایکی ضمنی طور پر یوں سامنے آجاتے ہیں جیسے وہ کسی منظر کا جزو ہیں۔ ایک ہی ہار کی دو لڑیاں، ایک ہی لڑی کے دو موتی لیکن وہ یوں کسی منظر یا کسی واقعے کے ساتھ چپاں اور اس میں جذب ہو جانے کے باوجود ایک واضح حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ مکالمے کہیں طویل نہیں ہوتے اور مختصر ہونے کے باوجود جچے تلے، فکر اور جذبے میں ڈوبے ہوئے، فکر انگیز، خیال افروز، نرم، شیریں اور زندگی سے بھرپور۔ مکالمے ناول میں کسی ایک جگہ بھی بھرتی کے لئے نہیں آتے۔ وہ کہانی کے مختلف حصوں میں گزرے ہوئے اور آنے والے واقعات کے درمیان رابطہ بھی قائم کرتے ہیں۔ ایک ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کرتے ہیں اور کبھی قاری کے ذہن اور قلب کو جھنجھوڑ کر یک بارگی ختم ہو جاتے ہیں۔ ہر مکالمہ کرداروں کے ذہن اور طبیعت کا گہرا عکس بھی ہوتا ہے، اور ایک خاص معاشرے اور اس سے بھی زیادہ ایک خاص عہد کے مزاج کا ترجمان بھی ـــــ مکالمے بہ یک وقت تاریخی حقائق، فلسفیانہ نکات اور جذباتی کیفیات کے مظہر ہونے کے علاوہ ناول کی مجموعی فضا کو ہر جگہ افسانوی رنگ دینے کی اہم خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ ناول نگار نے انہیں واقعات اور مناظر کے ساتھ اس طرح گھلا ملا دیا ہے کہ یہ تینوں چیزیں پوری طرح شیر و شکر اور ہم آہنگ جان ہو گئی ہیں۔ اور یوں ناول کے موضوع کی فکری سنجیدگی اور علمی بلندی بھی قائم رہتی ہے اور اس کی افسانویت میں بھی کمی نہیں آتی۔ منظر اور مکالمہ مل جل کر کیا کام کرتے ہیں، اس کے لئے "آگ کا دریا" کے دو دو چار چار ورق الٹتے جائیے، ہر جگہ وہی سب باتیں ملیں گی، جن کا ذکر میں اب تک مکالموں (اور منظروں) کے سلسلے میں کرتا رہا ہوں۔ یہ منظر کتاب کے بالکل شروع کا (صفحہ ۱۴) ہے اور ہندوستان کے ڈھائی ہزار برس کے پہلے کے افکار اور احساسات میں ڈوبا ہوا ہونے کے باوجود تازہ، توانا اور پُرحیات ہے:

> کچی پکی دال بھات کھانے کے بعد وہ مندر کی دیوار پر پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ سامنے دریا پر تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ چاند بہت مدھم تھا اور کہیں بادلوں میں چھپا تھا۔ ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک تھی۔ سارا جنگل اندھیارے میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر اسے سفر جاری رکھنا ہے۔ اس نے سوچا۔ اسی وقت دفعتاً [illegible] سے پیروں کی آہٹ اور کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے منتظر رہنے کے بعد وہ سرک کر فرش پر لیٹ رہا۔ نیچے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر مندر کی دیوار پر سے کسی نے جھانکا۔ اندھیرے میں گوتم کو اس کی صورت نظر نہیں آئی ـــــ
>
> "تم کون ہو بھائی؟" نیچے سے کسی نے پوچھا۔
>
> "میں ہوں!" گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔
>
> "تمہارا کیا نام ہے؟"
>
> "جس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔"
>
> "تعریف کے لئے نام ضروری ہے۔"
>
> "شراوستی کے جن پنڈتوں کے گھرانے میں پیدا ہوا ہوں وہاں دوسرے پنڈتوں سے پوچھ کر میرا نام گوتم رکھا گیا تھا۔"

"بھائی گوتم! نیچے آجاؤ۔"

"تم خود اوپر کیوں نہیں آتے؟"

"اونچائی اور نیچائی محض ذہنوں کے فرق سے ہوتی ہے۔"

"ہوں!"

"تم کو کیا معلوم جسے تم اونچائی سمجھ رہے ہو وہ پاتال سے بھی گہری ہو۔"

"بھائی!" گوتم نے اسی طرح دیوار سے نیچے جھانکے بغیر سوال کیا "کیا تم بھگوت ہو؟"

"نہیں — مگر تم منڈیر سے نیچے نہیں اُترو گے؟"

"نیچے سانپ ہوں گے اور کیڑے مکوڑے۔ اور کیڑے مکوڑوں سے دوستی کرنا میں نے ابھی شروع نہیں کیا۔" اتنا کہہ کر گوتم دل میں ہنسا۔

عہد بدل گیا ہے مگر تم نیلمبر کچھ سرکاری کاغذات لے کر نوابوں کے لکھنؤ میں آیا ہے اور یہاں آکر لکھنؤ کے سحر میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس سحر کا ایک ٹکڑا چمپا بائی ہے۔ لکھنؤ سے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے:

کوار کا مہینہ لگ چکا تھا اور الٰہ آباد میں جہاز کلکتے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ کاغذات کا پلندہ سنبھال کر وہ واپس لوٹنے کے لئے تیار ہوا۔

جب وہ ناکے کی طرف جا رہا تھا۔ یکایک اس نے گاڑیبان سے پوچھا "یہ سڑک کس طرف جاتی ہے؟"

"نخاس — خداوند!"

"ادھر گاڑی موڑ لو۔"

"بہت خوب — خداوند!"

تانگہ چمپا کے مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر گیا۔ چمپا چھپر کھٹ میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کی آواز سن کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"تم آگئے؟"

"نہیں میں جا رہا ہوں۔"

"دو گھڑی رُک جاؤ۔ دودھ کھاؤ گے۔ شربت منگوا دوں؟" اس کا تامل دیکھ کر اس نے کہا "برہمن کی دکان سے جل پان منگوا دوں۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں!"

"میں — میں صرف تم کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔"

"خدا حافظ!"

وہ دروازے میں ٹھٹھکا رہا۔

"ہمارے شہر کا دستور ہے، دعا دیتے وقت کہتے ہیں، سوا غمِ حسینؑ کے خدا کوئی غم نہ دے۔ یہ دعا میں تم کو نہیں دے سکتی۔ تم حسینؑ کا غم بھی نہیں جانتے۔ تم تو جانتے ہی نہیں غم کسے کہتے ہیں۔"

"سنو، چمپا!" نیلمبر نے آسان سے کہا "تمہاری زندگی اتنی رنگین ہے کہ بہت جلد تم مجھے بھول جاؤ گی۔ کس چکر میں پڑ گئیں۔ میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے!"

وہ خاموشی سے روتی رہی

"ہاں۔ میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے بھلا! تم نے آج تک مجھے اپنا ہاتھ بھی نہیں چھونے دیا۔ ہمارے یہاں کے ہندو تو اتنی چھوت چھات نہیں کرتے۔"

"سنو!" اس نے چمپا کو پھر سمجھانے کی سعی کی "تم کو میں اس لئے پسند ہوں کہ اُن سب لوگوں سے مختلف ہوں جو تمہارے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انوکھی چیز ہر ایک کو بھاتی ہے۔"

"کیا تمہارے دیس میں لڑکیاں نہیں ہوتیں؟" اس نے سادگی سے سوال کیا۔

نیلمبر کو ہنسی آگئی "ہوتی کیوں نہیں، مگر تمہاری جیسی نہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

ایک منظر اور ایک مکالمہ ——— لیکن اپنے تاثر کے اعتبار سے ایک مکمل ڈراما اور اپنی مجموعی فضا کے اعتبار سے ایک خاص عہد کے داخلی اور خارجی مزاج کا بھرپور ترجمان۔

اب ایک منظر اور ایک مکالمہ اور نئے زمانے کے لوگوں کا ——— نئے عہد کے گوتم اور چمپا:

سڑک پر مولسری کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ہواؤں کے راگ بہت سریلے تھے۔ وہ دفعتاً پھاٹک کی جگہ کے پاس ٹھٹھک گئی "سنو گوتم! میں کمال سے خفا نہیں ہوں۔ مجھے کسی سے بھی خفا ہونے کا حق نہیں پہنچتا ———"

"آپ درجۂ شہادت حاصل کرنے والی ہیں۔ یہ مظلوموں والا لہجہ کیوں؟"

"تم ——— تم لوگ بڑے کمینے ہو۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"ہم لوگ محض بے حد پُرخلوص ہیں ——— مگر شاید خلوص کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے، اور وہ بھیا صاحب کے پاس موجود ہے۔"

"تم ——— تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو ——— مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ایک طویل شفاف گیلری میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے سے ایک کے بعد ایک فراٹے سے پردے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ پردے جن پر خوبصورت تصویریں بنی ہیں اور مناظر۔ اب آخر میں صرف ایک سیاہ پردہ باقی رہ گیا ہے ———"

"چمپا باجی! آپ کا پرابلم بے حد ذاتی ہے۔ آپ کو بھیا صاحب سے بہت محبت ہے۔ بس ساری بات یہ ہے۔ باقی سب فروعات ہیں۔ اور آپ کا دوسرا پرابلم الفاظ ہیں۔" گوتم نے حسبِ معمول پہنچے ہوئے بدھ کی طرح اُکتا کر کہا۔

نفرت سے چپلنے اسے دیکھا" الفاظ!"

"ہاں! صریحاً، میں نے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔"

"اور جو کچھ ہے وہ بے معنی ہے؟"

"کوئی چیز بے معنی نہیں۔ خود اس لفظ بے معنی کے بھی معنی موجود ہیں۔"

"طلعت ٹھیک کہتی تھی۔ تم بھی پوز کرتے ہو۔ تم سے باتیں کرو تو لگتا ہے خلیل جبران کے المصطفیٰ سے گفتگو کی جا رہی ہے۔"

"اچھا باجی!" وہ گھبرا گیا "للہ خفا نہ ہوجیئے۔ چلیئے مجھے اپنے گھر لے جا کر کافی پلایئے۔ وہاں ہم ان مسائل پہ مزید روشنی ڈالیں گے اور للہ افسردہ نہ ہوجیئے۔ انسان صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اگلے جنم کی کسے خبر ہے —— آیئے!"

مکالمہ کرداروں کے دل کا حال بتاتا ہے، وہ ماضی کے حالات پہ روشنی ڈالتا ہے اور کہانی کو سفر کے ایک نئے رُخ پر ڈالتا ہے اور قاری دو آدمیوں کی باتیں سُن کر سوچتا ہے، سوچتا ہے اور اس کا تصور نہ جانے کتنی تصویریں بناتا ہے اور ان تصویروں کے بنانے میں، تصور کے پیکر تراشنے میں کرداروں کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ اسے سہارا دیتے ہیں، اس کی رہنمائی کرتے ہیں —— ان لفظوں میں سے ایک پرابلم ہے اور دوسرا پوز (POSE) اور یہ ان بے شمار لفظوں میں سے صرف دو ہیں جن سے ذہنی فضا تعمیر کی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن یہ اس بات کی داد دینے کے لئے کہ ان الفاظ سے ناول نگار نے فضا کی تشکیل و تعمیر میں جو مدد لی ہے اس سے عبارت کی روانی اور بے تکلفی میں فرق نہیں آتا بلکہ الفاظ ایک بنے بنائے سانچے میں ڈھل کر فضا قائم کرنے کے لئے عبارت کے آہنگ اور معنویت میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

'پرابلم' اور 'پوز' کے ساتھ فہرست میں ذیل کے الفاظ کا اضافہ کر لیجئے:۔

آٹو میٹک۔ فیوڈل (طبقہ)۔ پروسس۔ اِڈلٹ (سطح پر، آؤ اڈلٹ پر اس مسئلے کو دیکھیں)۔ انٹلیکچوئل (قوم پرست)۔ بلو اسٹوکنگ (آپ کو تو سخت بلو اسٹوکنگ نکلیں)۔ ایکٹ (یہ دوسروں کی پرابلمز کا تجزیہ کرنا بھی بڑا زبردست ایکٹ ہے)۔ میزم۔ رومینٹک۔ تھیوری۔ ایلمنٹری۔ ایکسپوزڈ ہر انسان بے حد EXPOSED ہے)۔ بورژوا (رومانیت)۔ ڈفلس یس۔ امیچور (آپ ایسی بھی امیچور نہیں) فراڈ۔ بلینک (سفید بلینک چہرے) ان ایکسٹری۔ موربڈ۔ انالیسس۔ ہارمنی۔ راں دے ڈو۔ ڈی کیڈنٹ۔ کلٹی ویٹ (ان کو کلٹی ویٹ کرو)۔ گوسپ۔ ٹنس (یہ لوگ روشنی کی طرح TENSE نہیں تھیں)۔ بلڈ اپ (رہیں تم کو بلڈ اپ کروں گا)۔ اسکوپ۔ فیڈ (یہ تو آپ کا FAD ہے)۔ اوریجنل۔ ایکٹویٹی۔ سرکولیشن (گوتم ابن تک سرکولیشن میں ہے)۔ پرو پوزر۔ وژن۔ مشنری (پروپیگنڈے کی مشنری)۔ سے سے بریٹی (وہ اب بہت بڑا سے لے بریٹی ہے)۔ مسٹک ایک غیر مرئی MYSTIC رشتہ)۔ افیشل (افیشل طور پر)۔ برُولس۔ سچولیشن۔ اسٹورج۔ ریفرنس۔ فراڈ۔ پوزر اور غیر پوزر (تم پوزر اور غیر پوزر میں فرق کیسے معلوم کر لیتے ہو)۔ پیٹرن (وقت کے PATTERN میں)۔ ڈی مورلائز (کیوں ہو گئے)۔ ٹرانس پلانٹ (کر لیا)۔ فرسٹریشن۔ اسٹریو ٹائپ۔ سیورٹی (کی تلاش)۔ کیمپ ٹیشن۔ سلیکٹ۔ رزسٹ (RESIST کرنا چاہتے ہیں)۔ ڈاؤن نال میٹر آف فیکٹ (انداز میں)۔ بیک ورڈ (ملک)۔ بیٹ (مسلمان کو ریبٹ کرنے کے لئے)۔ ڈرمز (کی آواز نیم تاریکی میں ڈھمدن کرتی رہی)۔ آئیڈیلز۔

ان لفظوں میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو ان کرداروں کی زبان سے، گفتگو کے دوران میں نکلے ہیں۔ جن کے ذہنوں کی پرورش مغربی فکر و فلسفے

کی آغوش میں ہوئی ہے اور اس لیے بعض خاص طرح کے معاشرتی اور فکری تصورات کے اظہار کے لیے وہ وہی لفظ استعمال کرتے ہیں جن کے مخصوص معنوی تعلقات و تصورات ہیں اور اس طرح یہ لفظ ایک خاص معاشرے اور اس معاشرے سے تعلق پیدا کرنے والے مزاج کے ترجمان اور مظہر بھی بنتے ہیں اور افسانوی فضا کو حقیقی اور جاندار بنانے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ لیکن کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جنھیں ناول نگار نے اپنے بیان کا جزو بنایا ہے اور ایسے موقعوں پر اُن کے لیے کوئی فنی جواز پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ اُن میں آورد کی ایک نمایاں کیفیت ہے اور یہ کیفیت عموماً بیان کے مجموعی تاثر کو کم کرتی ہے ـــــ قرۃ العین حیدر کے اسلوب پر اس سے پہلے بھی یہ اعتراض ہوتا رہا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ کتاب کے ابتدائی اور درمیانی حصوں میں انھوں نے اپنے بیانات کو اس داغ سے محفوظ رکھا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کے ابتدائی حصوں میں، جہاں انھیں ہند و عہد کے ذہن اور طلب کا صحیح نقش پیش کرنا ہے انھوں نے سنسکرت کے الفاظ اس بے تکلفی اور بے ساختگی سے استعمال کیے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ نتیجہ نکالنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا کہ بہ حیثیت فن کار کے انھیں الفاظ اور معاشرے یا الفاظ اور ماحول کے باہمی تعلق کی اہمیت کا پورا احساس اور اندازہ ہے اور احساس اور اندازے کو عملی صورت دینے پر پوری قدرت حاصل ہے اور اس لیے روپ وان، گریہ اگنی، سدعانت، آپتی (بمعنی ہرج)، شمشٹی، پری لجا نشا، اُپدیش، بہ اکرنک گن جیسے لفظ (یہ چند لفظ ابتدائی ۲ صفحوں میں آئے ہیں) عبارت میں اس طرح گھلے ملے ہیں کہ اُن کی اجنبیت اور غرابت ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی ـــــ بلکہ اس کے برخلاف اُن کے صوتی اور معنوی آہنگ سے ایسی فضا تیار ہوتی ہے۔ جو حقیقت کا مکمل ترجمان بھی ہے اور افسانوی دلکشی کی مظہر بھی۔

کسی ناول نگار کو جب ڈھائی برس کی زندگی کی تاریخ، تہذیب اور تاریخ و تہذیب کے اور کار رہ حوادث کی تفصیلات بیان کرنے کے علاوہ اس طویل مدت سے تعلق رکھنے والے مختلف ادوار کے انسان کے عمل اور ردِ عمل، اُس کے ذہن کی اُلجھنوں اور دل کی دھڑکنوں کی کیفیتوں کی صحیح تصویریں کھینچنی اور اُن کے نقش کو قاری کے قلب و ذہن پر مرتسم کرنا ہو تو اُسے منظر کشی، واقعہ نگاری اور سیرت کشی کے گوناگوں فنی وسیلوں اور الفاظ کے صوتی آہنگ اور معنوی قدروں سے پورا فائدہ اٹھانے کے علاوہ بھی خیال کے اظہار اور ابلاغ کے نئے نئے انداز سوچنے پڑتے ہیں۔ "آگ کا دریا" میں جو انداز کی بعض ایسی خصوصیتیں (جو کسی نہ کسی حد تک قرۃ العین حیدر کے پچھلے ناولوں میں بھی موجود ہیں، گو اس رچے بچے ماہرانہ انداز میں نہیں) موجود ہیں، ان میں ایک قوسین کا وہ استعمال ہے جہاں بات کی حیثیت ایک جملہ معترضہ کی سی ہوتی ہے، لیکن ایسا جملہ معترضہ جو بات کو واضح کرتا ہے، کلام کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے، کہانی کے مختلف دور افتادہ حصوں میں ذہنی ربط قائم کرتا ہے اور قاری کو بات کہنے والے کے کسی مخصوص جذبے خیالی اور فکری تصور سے ہم آہنگ بھی کرتا ہے۔ اِن قوسین میں کبھی کبھی ناول نگار کے نظریہ حیات کے کسی پہلو کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی ہوتا ہے۔ چند مثالوں پر نظر ڈالیے:

یہ کوٹھی اس کے مکینوں کے لیے مرکزِ کائنات تھی (ہر گھر اپنے مکینوں کے لیے مرکزِ کائنات ہوتا ہے)۔

اُسی وقت ادجیت کا فون آیا۔ ہلو سنو! وہ دہاڑ رہا تھا "دیکھو! یہ ٹیگور، ٹیگور کا ہر وقت بنگالی شور مچاتے ہیں۔ اب اقبال ایونگ ہونا ضروری ہے" (ادجیت خود بنگالی تھا۔ اُسے ایک لفظ اُردو کا نہ آتا تھا۔ پر اگیں اُس نے انجینئرنگ پڑھی تھی)

زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے اب اتنا بڑا انحطاط آیا تھا کہ گلفشاں واعوں کے یہاں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے چلتی تھی (بہت بہت انقلاب انقلاب کرتے تھے، تو بوڑھے باپ کو بکے پر بیٹھا دیکھ کر اب تو خوش ہو لو" نواب صاحب بہادر نے کہا)

اسلام ۔ اس لفظ کی جو گت بنی ہے (کرکٹ میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگے تو سمجھو اسلام خطرے میں ہے)

ادیبوں کے پاس لکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا (گو بے شمار رسالے نکل رہے ہیں ۔)

مسلمان بچے اسکولوں میں ہندی پڑھ رہے ہیں (جب کہ ان کے باپوں کی نسل کے ہندو طلبہ اسکولوں میں اُردو پڑھتے تھے)

طنز و مزاح بھی دو ایسے حربے ہیں جن سے قرۃ العین حیدر نے اس ضخیم ناول میں طرح طرح کے کام لیے ہیں ۔ مزاح سے کم اور طنز سے زیادہ، لیکن ان دونوں چیزوں کے استعمال کا فنی پہلو یہ ہے کہ اُن میں مشکل ہی سے کسی جگہ تکلف، تصنع اور آورد کا رنگ نظر آتا ہے ۔ ان دونوں چیزوں سے ناول کے مختلف حصوں میں، حسبِ محل، کبھی فضا میں دلچسپی کا رنگ بھرنے کے لیے، کبھی انسانی اخلاق اور انسانی اداروں (تہذیبی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی) اور ان دونوں چیزوں کے ظاہر اور باطن کے تضاد کو نمایاں کرنے کے لیے، کبھی زندگی کی کسی قدر کے متعلق اپنے خیال اور جذبے کے اظہار کے لیے توازن اور اعتدال کے ساتھ (یہ توازن اور اعتدال فن کار کا مخصوص توازن اور اعتدال ہے) کام لیا گیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ اکثر موقعوں پر مؤثر بھی ہے اور اپنے مقصد کو بوجوہ احسن پورا بھی کرتا ہے ۔ کبھی کبھی طنز ایک خاص طرح کی تلخی بھی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تلخی سرتاسر جذبات کی پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں سوچا سمجھا اور بے لوث تجزیہ کام کر رہا ہے اور یہ بے لوث تجزیہ اس خلوص کا نتیجہ ہے جس سے ناول نگار نے زندگی کے گوناگوں مسائل اور حقائق پر نظر ڈالی ہے ۔

طنز کی یہ تیزی (جو کبھی کبھی تلخی بن جاتی ہے) ناول کے اس حصّے میں زیادہ نمایاں ہے، جس کا موضوع آزادی کے حصول اور قیام پاکستان کے بعد کے واقعات ہیں ۔ لیکن یہ تیزی یا تلخی، محض جذباتی ہرگز نہیں ۔ اس دَور کے شخصی اور اجتماعی کردار اور جماعتوں اور اداروں کے طرزِ عمل و روش کے علاوہ خیالات، جذبات اور احساسات کو گہری نظر سے دیکھ کر اور اُس کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد ناول نگار نے جو نتیجے نکالے ہیں اُن سے اختلاف کی گنجائش تو جا بجا پیدا ہوتی ہے (اور یہ بات فطری ہے) لیکن بہ حیثیتِ مجموعی جو چیز فنی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے یہ ہے کہ خلوص اور صداقت کی کمی کہیں نہیں معلوم ہوتی ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کے اس حصے میں وہ خلوص اور بھی نمایاں ہے جو کتاب کے ہر حصے پر پوری طرح چھایا ہوا ہے ۔ فن کار خلوص، قصّہ گو سے (یا اس جگہ یوں سمجھئے کہ ناول نگار سے) پہلا تقاضا یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے موضوع سے پوری واقفیت حاصل کرے ۔ ناول کے ابتدائی اور درمیانی حصوں میں یہ تقاضا اُس نے جس طرح پورا کیا ہے، اُس کی مثال ہماری ناول نگاری کی پوری تاریخ میں موجود نہیں ۔ کسی تاریخی عہد سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی سیاسی تاریخ کے ساتھ تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے خصائص، افکار اور طرزِ فکر اور ان سب چیزوں سے پیدا ہونے والے جذباتی پہلوؤں کی پوری تصویر نظر کے سامنے ہو اور اس تصویر سے ایک گہرا شخصی تعلق پیدا کر کے اُسے اپنے فکر، تخیل اور احساس (اور اس طرح جذبے) پر یوں طاری کیا جائے کہ وہ جذب اور حل ہو کر فن کار کی شخصیت کی رگ رگ میں سما جائے ۔ یہ بات پریم چند کے بعض ناولوں میں ملتی ہے لیکن اُن میں سے کسی کا

زمانی پس منظر اور کینوس اتنا وسیع نہیں جتنا "آگ کا دریا" کا ہے۔ اس کے باوجود پورے فن کارانہ خلوص سے اس وسیع پس منظر پر حاوی ہونے کی جو کوشش اس ناول میں ملی ہے اُسی کی بنا پر میں نے اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایسے امتیازی اور منفرد حیثیت دی ہے۔ "آزادی کے بعد" کی زندگی پر ناول بھی لکھے گئے ہیں اور افسانے بھی، لیکن ان میں سے کسی میں مطالعے، مشاہدے، غور و فکر اور تجربے کی وہ رچی ہوئی کیفیت نہیں جو اس ناول میں ہے (گو اس قصے میں کہیں کہیں یہ کھٹک ضرور محسوس ہوتی ہے کہ بعض تفصیلات کو اور خصوصاً مشرقی پاکستان کی زندگی کی تفصیلات کو ترک کر دیا جاتا تو تاثر کی گہرائی اور نمایاں ہو جاتی)۔ آزادی کے بعد کی زندگی کی جو تصویر اس کتاب سے ابھرتی ہے اس میں ایک نقش کو اس نئی مملکت اور نئے ملک کی مکمل زندگی کا ہے اور دوسرا نقش اس ملک میں رہنے بسنے والے لوگوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا ہے اور تیسرا نقش ڈھائی ہزار سال کی اس پھیلی ہوئی زندگی کا ہے جس کا ایک قصہ ہمارا موجودہ زندگی ہے، جس کے صحیح معنی و مفہوم سے آشنا ہونے، بلکہ اس کا راز داں ہونے کے لیے ڈھائی ہزار برس کے ماضی سے اس کا رشتہ جوڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس رشتے کا احساس لوگوں نے کیا تو اس سے پہلے بھی تھا لیکن اُسے ایک مربوط اور مسلسل صورت دینے کے لیے جس فنی کاوش کی ضرورت تھی۔ اُس کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرنا بڑی ہمت اور مردانگی کی بات اور یہ بات قرۃ العین حیدر نے یہ ناول لکھ کر دکھائی ہے ـــ جس میں انسان ایک بار پھر ایک بہت بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا ہے اور اس آزمائش میں جو چیز اُسے سہارا دیتی اور برابر آگے بڑھتے رہنے پر اُکساتی ہے وہ اپنی نئی زندگی کے ساتھ اس کا سچا والہانہ تعلق اور روشن مستقبل کا یقین محکم ہے۔ "آگ کا دریا" کا ایک کردار جب بڑے جوش کے ساتھ یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ

> "اب ماضی پہ رونا اور ماضی کی غلطیوں پہ پچھتانا مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے ـــ اس ملک نے مجھے اپنی حفاظت میں لیا ہے، مجھے پناہ دی ہے۔ اس کو بنانا یا بگاڑنا اب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جو عمر بھر تخریب کے بجائے تعمیر کے خواب دیکھے ہیں، کیا تمہارا خیال ہے کہ یہاں کے ذہن پرستوں کے خلاء میں داخل ہو کر میں اپنے آپ کو کھو دوں گا؟ نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا ـــــ میں تعمیر کروں گا۔"

تو وہ امید اور یقین وہ آواز بلند کرتا ہے جو ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔

عابد حسن منٹو

ایک افسانہ نگار

اُردو کے جدید افسانہ نگاروں میں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ نگار ہو جس پر ترقی پسند تحریک کے براہِ راست یا بالواسطہ اثرات موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ ترقی پسند نظریات کا اظہار جس شدت اور وضاحت سے اردو شاعری میں ہوا ہے۔ افسانہ اس کے مقابلے میں بہت پیچھے رہا ہے۔ اس کی ایک (اور میرے خیال میں سب سے اہم) وجہ تو یہ ہے۔ کہ جہاں شاعری میں مجرّد جذبات اور خود مجرّد فکر براہِ راست جگہ پاتا ہے وہاں افسانے میں فکر اور جذبات دونوں کے اظہار کے لئے کردار یا مواقع کی تخلیق ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ افسانہ نگار کو اپنے تخیل اور نظریے کو ان کے قالب میں ڈھالنے کے لئے تجربے سے محسوس اور وحدت سے کثرت کی طرف آنا پڑتا ہے۔ اس کام کے لئے جو کردار، واقعات یا مواقع وہ حقیقی زندگی سے تلاش کرتا یا اپنے جذبات اور خیالات کی مدد سے حقیقی زندگی میں پیدا کرتا ہے۔ انہی سے اس کے افسانے کی فنی خوبیاں متعین ہوتی ہیں۔ اور اس کی تخلیق کی اثر انگیزی کا انحصار ہوتا ہے۔ اردو افسانوں میں اول تو نظریاتی معاملات کا براہِ راست اظہار شاعری کی نسبت سے ویسے بھی کم ہوا ہے، لیکن جہاں کہیں بھی ہوا ہے اس اظہار میں عائد کردہ جذباتیت کا عنصر نظری اظہار سے زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ اردو افسانہ عام طور سے ان نظریات کے اثر سے آزاد نہیں ہے۔ جو ترقی پسند تحریک، زندگی کے بارے میں اپنے جلو میں لئے ہوئے آئی تھی۔

اردو افسانے کے خالق کی طرح اس کے موضوعات بھی عام طور سے درمیانہ طبقے کے مسائل سے وابستہ رہے ہیں۔ ان مسائل میں درمیانہ طبقے کا اخلاقی کھوکھلا پن، اس کے افراد کی جنسی اور معاشرتی زندگی کا بحران اور اس کھوکھلا پن اور بحران کے پس پردہ کام کرنے والی معاشی ناہمواری ہمارے ادب کا سب سے اہم موضوع رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں افسانہ کے اہم کردار بہت مدت تک بوہیمین افراد رہے ہیں۔ یہ کردار مروجہ اقدار سے بدظن تھے، ان کے خلاف بغاوت بھی کرتے تھے۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی کردار ایسا ہو گا۔ جو نئی اور جاندار قدروں کا پیغامبر بن کے سامنے آیا ہو۔

اردو افسانے کی ایک اور قابلِ ذکر بات اس کے اظہار اور موضوع کے (TREATMENT) سے متعلق ہے۔ اردو کے اکثر افسانہ نگار تخلیقِ فن میں شاعر کے طریقِ کار کو اپناتے ہیں۔ ان کا تخیل زندگی کے حقائق میں پیوست ہو کر بہت کم پیش ہوا ہے۔ اکثر یوں ہوا ہے۔ کہ افسانہ نگار اپنے تخیل کے داخلی عمل سے نکل کر زندگی میں داخل ہی نہیں ہوتے۔ اور افسانہ کے کردار اور واقعات محض کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئے۔ اس سے ایک تو حقیقت نگاری کو دھچکا پہنچا، اور خیالات اور جذبات کرداروں پر مٹھو نسے ہوئے معلوم ہوتے۔ اور دوسرے اسلوبِ بیان میں داخلیت کا وہ گہرا عنصر جو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اپنا لیا گیا۔ اور دونوں صورتوں میں افسانہ کی نثری خوبصورتی (جو افسانے میں اس کے افسانہ اور نثر ہونے کے باعث موجود ہونی چاہیئے۔ نہ کہ شاعرانہ اظہار کی وجہ سے) کو شدید نقصان پہنچا۔ اردو افسانے کے آغاز میں پریم چند نے کہانی بیان کرنے اور کردار اور موضوع پیش کرنے کا جو ڈھنگ اپنایا تھا، وہ شاعری سے الگ خود نثر کا رنگ تھا۔ اور اس اسلوب کو آگے بڑھانے میں اردو افسانہ نگار کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہے ——— اس اعتبار سے سعادت حسن منٹو اردو کا غالباً سب سے کامیاب افسانہ نگار ہے۔ کہ اس کا افسانہ اپنی نثر کی وجہ سے اسی قدر دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہے جس طرح خوبصورت

شعری تخلیق حالانکہ اس کا اظہار بیان شاعری سے کوسوں دور بلکہ اس کے برعکس ہے ۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے۔ اردو افسانہ عام طور سے درمیانہ طبقے کی زندگی کے گرد گھومتا ہے ۔ ہماری سماجی زندگی کی بنیاد دیہات پر ہے ۔ اگر ہمارا کوئی کلچر کبھی تشکیل پا سکا ۔ تو وہ پنجاب' سندھ اور سرحد کی دیہی ثقافتوں سے آزاد ہو کر لاہور' اور کراچی کی شاہراہوں پر ہر دم بدلتے بدیسی کلچر کی بنیادوں پر نہیں ہوگا ۔ ہمارے ہاں ایک کلچر تشکیل پائے یا ایک سے زیادہ ۔ اس کی بنیاد ان کروڑوں انسانوں کی زندگیوں پر ہی ہوگی جو شہروں میں نہیں رہتے ، اور اسی اعتبار سے ہماری سماج کا اہم ترین حصہ یہ دیہات ہیں اردو افسانہ نگار شہری زندگی سے باہر بہت ہی کم نکلا ہے ——— اس کے وجوہ سے مجھے یہاں بحث نہیں ہے —— البتہ اس کے اثرات کا اظہار یہاں ضروری ہے ۔ اس کا اثر ہمارے ادب کو محدود کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ۔ ہمارے ادب کا مطالعہ ہند و پاک کا نقشہ ذہن میں پیش نہیں کرتا ۔ وہ صرف بمبئی ، دہلی ، لاہور ، کراچی کی تصویریں دکھاتا ہے ۔ اور بمبئی اور کراچی اور دنیا کے دوسرے ممالک کے شہروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے ۔ ——— غرضکہ سماجی زندگی کے پہلو سے جدید اردو افسانہ وسیع تر ہونے کی بجائے محدود ہو کر رہ گیا ہے ۔

شروع میں میں نے کہا تھا کہ اردو افسانہ پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کا بہت اثر ہے ۔ اور پھر میں نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں ---------- جو منفی رجحانات کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔ مثبت پہلوؤں کی طرف نہیں ۔ اور ترقی پسندی تو مثبت پہلو ہے ۔ ——— ترقی پسند تحریک کے اثرات میں اہم ترین اثر تو ادب کو خالص داخلیت (شاعری میں) اور رومانوی ماورائیت (افسانے اور داستان میں) سے آزاد کر کے زندگی اور اس کے مسائل سے قریب تر لانے میں پوشیدہ ہے ۔ زندگی سے قریب لانے کے اسی عمل کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ فن کار زندگی کے مسائل سے دوچار ہوتا ، چنانچہ محدود طور پر اور (اکثر) نیم شاعرانہ انداز ہی میں سہی ، ہمارے افسانوی ادب میں بیکاری ، بھوک ، اخلاق پستی ، مروجہ سماجی اقدار کا کھوکھلا پن اور جنسی زندگی کے بحران کے موضوعات اس ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہی جگہ پا سکے ہیں ——— پھر ان سب رجحانات اور موضوعات و مسائل سے بڑا رجحان اور مسئلہ انسان کی عظمت کا مسئلہ ہے ۔ ترقی پسند تحریک نے ہمیشہ انسان کی بنیادی خصوصیت اس کی انسانیت کو سمجھا ہے ۔ نہ کہ بعض دوسرے نظریات کی طرح کم تر جذبات کو ۔ اردو کے کلاسیکی ادب میں بھی یہ رجحان انسان دوستی کی صورت میں نمودار ہوتا رہا ہے ۔ لیکن سماجی زندگی کے بحرانی حالات کے پس منظر میں انسان کی عظمت کا احساس رکھنا اور اس کو پیش کرنا اس دور جدید کے ادب ہی کا خاصہ ہے اور یہ ترقی پسند تحریک ہی کا اثر ہے انسان کی عظمت کا احساس ہی دراصل یاس و ناامیدی کو ختم کرتا اور رجائیت کو جنم دیتا ہے ۔ اور ہمارے ادب میں امید کا جہاں بھی احساس ملتا ہے ۔ وہ اسی رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

اُردو کے کسی بھی افسانہ نگار کے فن کے بارے میں کچھ کہنے سے پیشتر اس تمہید کی اشد ضرورت تھی' کہ اس کے بغیر کسی بھی فن کار کا درجہ متعین کرنا یہ کہ حقیقت ... اس کی اہمیت بتانا ایسے کار ہے بھی ہے اور مشکل بھی ———

بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے خاتمے سے ہوتا ہے ۔ ادب کی ترقی پسند تحریک کی ہمہ گیری کا بھی یہی دور تھا ۔ اور اسی وجہ سے بلونت سنگھ نے ادب کی اس تحریک کے زیر اثر ہی تخلیق ادب کا کام شروع کیا ۔ ترقی پسند تحریک کا ادب جن تضادات کا شکار تھا اور جن حدود میں پابند تھا ان میں سے بہت سے تضادات اور حدود کا اثر بلونت سنگھ کے افسانوں میں بھی ملتا ہے ۔ ۱۹۴۷ء سے پیشتر کے افسانوں میں یہ اثرات زیادہ نمایاں ہیں اس وقت کے افسانوں میں بلونت سنگھ کی انفرادی خصوصیت بحیثیت ایک افسانہ نگار کے ۔ (جو اس کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کا تذکرہ میں آگے چل کر کروں گا) ظاہر نہیں ہوئی تھی ۔ ان افسانوں میں ایک آدھ افسانہ آزادی کے نیم رومانوی احساس سے متعلق ہے ۔

ہندستان ہمارا) اور دوسرے افسانے نچلے درمیانہ طبقے کی معاشی اور اخلاقی اقدار کے تضاد، ان کی زندگی کے کھوکھلاپن اور ان کی بے معنی اور بے مزہ رومانیت
سے تعلق رکھتے ہیں۔ (مثلاً ٹیک سنگھ، چھر چھری، آزاد فاتح وغیرہ وغیرہ) ——— "ہندستان ہمارا" ایک نوجوان ہندستانی کے احساس آزادی اور انگریز
سامراج سے نفرت کی کہانی ہے۔ کہانی کا اختتام قاری کے ذہن کو فوری طور پر سعادت حسن منٹو کی مشہور کہانی "نیا قانون" کی طرف لے جاتا ہے۔ "ہندستان ہمارا"
کا نوجوان ہیرو ریل کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہونا چاہتا ہے اور ایک "ٹامی" کی بے جا مداخلت کا جواب اسے بزورِ بازو دیتا ہے۔ "نیا قانون" کا
ہیرو بھی ٹامی کے ناجائز رویے کے خلاف عملاً احتجاج کرتا اور اس کا بدلہ لیتا ہے ——— دونوں کہانیوں میں مماثلت کا پہلو محض یہی ہے
ورنہ نیا قانون، ہندستان ہمارا سے کئی درجہ اعلیٰ افسانہ ہے ——— منٹو کی کہانی سے بلونت سنگھ کی کہانی کی مماثلت کا تذکرہ میں نے اس
لئے کیا ہے کہ میرے خیال میں بلونت سنگھ کی بعد کی اکثر کہانیوں میں منٹو کے اسلوب کا براہِ راست اثر موجود ہے۔ اس بات کی تفصیل میں آگے چل
کر پیش کروں گا

تقسیم سے پہلے کی یہ کہانیاں بہت حد تک STEREOTYPED اور ROUTINE کہانیاں ہیں۔ ان میں کردار ابھرتے ہوئے
نظر نہیں آتے فنکار کے اپنے خیالات کی بازگشت ہر جگہ براہِ راست نظر آجاتی ہے خود خیالات کا احساس نہیں دلاتے بلکہ جذباتیت کی طرف
اشارہ کرتے ہیں، بایں ہمہ یہ کہانیاں افسانہ نگار کے رجحانِ طبع کا اندازہ لگانے کے لئے قطعی طور پر کافی ہیں۔ بلونت سنگھ ان کہانیوں میں بڑا افسانہ نگار کی
صورت میں ضرور ابھرتا ہے۔ جو زندگی کے مسائل کو اپنے فن میں جگہ دیتا ہے، جو ان مسائل کی تہ میں کارفرما نیم غلامانہ معیشت کے اثرات کا کچھ نہ کچھ شعور
ضرور رکھتا ہے ——— اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلوبِ نگارش میں شاعرانہ اندازِ بیان سے ہٹ کر حقیقت نگاری کے طریقِ کار کو اپنانے کا رجحان نہایت
ہی واضح طور پر موجود ہے ——— تقسیم سے پہلے کی یہ کہانیاں بلونت سنگھ کی ابتدائی کہانیوں میں سے ہیں اور اس اعتبار سے فنکار کی
نابختگی کا شکوہ کچھ ایسا قبیح نہیں سمجھنا چاہیئے۔

بلونت سنگھ کے افسانوں کے تجزیے کے لئے میں اپنی آسانی کے لئے بحث کو دو حصوں میں تقسیم کر لیتا ہوں اولاً تو بلونت سنگھ کی کہانیوں
کے موضوعات کا جائزہ لوں گا اور پھر میں اس کے اسلوبِ نگارش کے متعلق کچھ خیالات پیش کروں گا ——— نقطۂ نظر کی بات میں نے دو وجہ
سے نہیں کی کہ اوّل تو شروع ہی میں یہ خیال میں نے ظاہر کر دیا تھا کہ بلونت سنگھ پر ترقی پسند تحریک کے اثرات ہیں اور دوسرے اس لئے کہ خود موضوعات
اور اسلوب کا تعین بھی فن کار کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس اعتبار سے ان دو پہلوؤں سے بلونت سنگھ کی کہانیوں کو جانچتے ہوئے
نقطۂ نظر کی بات خود بخود زیرِ بحث آ جائے گی۔

موضوعات کے اعتبار سے اور کرداروں کی تخلیق کے اعتبار سے بلونت سنگھ اردو کے اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ہے جن کا کینوس انتہائی
وسیع ہے۔ پنجاب کے دیہات، پنجاب کے شہر، کسان، کلرک، ہندو، سکھ، مسلمان، درمیانہ اور نچلا درمیانہ طبقہ، طوائف، چور، آزادی، فسادات، بھوک
بیکاری، رومان ——— یہ سب باتیں اس کے افسانوں میں موجود ہیں۔ اس کے حدود پنجاب کی سرحدوں نے متعین کئے ہیں ——— پنجاب
صنعتی علاقہ نہیں تھا، چنانچہ بلونت سنگھ کی کہانیاں مزدور اور صنعتی سرمایہ داروں کا ذکر تک نہیں کرتیں ——— پنجاب کا شہر ہو یا دیہات
ایک خاص لب و لہجہ ایک مخصوص ٹھیٹ پن ہے اور یہ لب و لہجہ اور ٹھیٹ پن بلونت سنگھ کی تمام اچھی کہانیوں کی خصوصیت ہے ———
کی زندگی کی بنیاد اس کے دیہات ہیں اور دیہات کی جاگیردارانہ معیشت میں زراعت اور اُس کے پسماندہ طریقوں کی بدولت ایک
کا آہستہ پن، ایک عجیب سا ٹھیراؤ، اور آہستہ پن اور ٹھیراؤ کے ساتھ بیباکی، دلبری اور جرأت (جو) اپنے ہاتھ سے محنت کرنے اور

اورمنہ اندھیرے کھلی فضاؤں میں نکل آنے اورسنسان اندھیروں میں سفر کرنے اوراپنی حفاظت خود کرنے کا لازمی نتیجہ ہے) ——— پنجابی کسان کی زندگی کا خاصہ ہے۔ دلیری جب کمزور معیشت میں پرورش پاتے تو جرائم بھی جنم لیتے ہیں، چنانچہ پنجاب کا دیہات جرائم کے اعتبار سے بھی کم مشہور نہیں ہے ——— بلونت سنگھ کے ان افسانوں میں جو دیہات سے تعلق رکھتے ہیں، یہ آہستہ پن اور یہ ٹھہراؤ بھی موجود ہے اور بہادری اور بہادری سے منسلکہ جرائم کی داستانیں بھی جگہ پاتی ہیں ——— "تین چور"، "کالی تیتری"، "بابا مہنگا سنگھ"، "گرنتھی"، "پنجاب کا البیلا" وغیرہ سب کہانیاں پنجاب کے دیہات کی فضاؤں سے تخلیق ہوئی ہیں ——— ان تمام کہانیوں کے کردار سکھ ہیں اس لئے کہ پنجاب کی زرعی معیشت کا تعلق یا مسلمانوں کے ساتھ تھا یا سکھوں کے ساتھ، اور بلونت سنگھ کو اپنے لوگوں سے جو گہری واقفیت ہے اس کے مدِنظر شاید سکھ کرداروں کی تخلیق ہی اس کے لئے آسان اور مناسب تھی، ——— ان میں سے ہر ایک کہانی ہمیں بلونت سنگھ کو پہچانتے کی بجائے پنجاب کو جاننے میں مدد دیتی ہے۔ ہر کردار، ہر موقعہ ایسا ہے جو اپنے حقیقی اور فطری ہونے کا یقین دلاتا ہے ——— فنکار کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل تو یہی ہے کہ وہ تخلیق کے افسانوی تخلیق ہونے کا احساس مٹا دے۔

"تین چور" ——— پنجاب کے دیہات کے نوجوانوں کی (AdVENTures) کی کہانی ہے۔ تینوں چور ——— پیشے کے اعتبار سے چور سہی، لیکن اپنی سوچ اور خیالات کے اعتبار سے چور نہیں ہیں ——— بنیادی طور پر وہ بہادر ہیں اور یہی بہادری انہیں ڈاکے ڈالنے کی طرف بھی لیجاتی ہے۔ ڈاکہ زنی اور چوری کے باوجود تینوں چوروں کی اپنی اقدار ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم قدر بہادری کی قدر و قیمت کا احساس ہے ——— وہ کسی ایسے شخص پر ہاتھ صاف کرنا پسند نہیں کرتے جو خود بہادری اور دلیری کا مجسمہ ہے ——— اسی کہانی میں بنیادی انسانی اقدار کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے انسان کتنے پیشے کے باوجود اچھے اور برے کی تمیز کے لئے کچھ نہ کچھ اصول کوئی نہ کوئی قدر تخلیق کرلیتا ہے۔

لیکن اقدار اور اخلاق کا مسئلہ تو خالص سماجی مسئلہ ہے، خدا کو ماننے نہ ماننے، گوردوارے اور مسجد کے چکر لگانے نہ لگانے سے اس کا کم ہی تعلق ہے انسانی فطرت کی تشکیل اس کے زندگی گذارنے کے ڈھنگ سے ہوتی ہے اور زندگی سماجی دشمنوں سے افراد کے تعلق سے بنتی ہے نہ کہ "واہگورو کی بھگتی" کا لبادہ اوڑھنے سے ——— "بابا مہنگا سنگھ" کی کہانی اسی موضوع کی کہانی ہے ——— بابا مہنگا جو اپنی جوانی کا زمانہ ڈاکہ زنی میں گزار چکا ہے ——— ڈاکہ زنی اب اس کے بس کا روگ نہیں ہے وہ ہر مسئلے سے اب اخلاقی نتیجہ برآمد کرتا رہتا ہے، تاہم جب وہ اپنی جوانی کی وہ کہانی بیان کرتا ہے جس میں وہ سنسان اندھیری رات میں ایک نوجوان عورت کو جنگل میں آگ جلا کر برہنہ کھڑے دیکھتا ہے، تو اس میں اسے افسوس اس بات کا باقی رہ جاتا ہے کہ ایسی صورت اسکی زندگی میں کبھی پیدا نہ ہوئی کہ وہ اکیلی عورت کا زیور اس آسانی سے ہتھیا لے ——— گویا "واہگورو کی بھگتی" تو محض وقت کا جبر ہے ورنہ زندگی سے اس کا تعلق اب بھی ڈاکہ زنی والا ہی ہے۔

ان کہانیوں کی فضا جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا ہمارے دیہات کی حقیقی فضا ہے۔ اس میں رومان کا عنصر ہے لیکن اسی رومان کا جو اس فضا در اصل موجود ہے نہ کہ اس رومان کا جو عام طور پر ہمارے افسانہ نگار کے ذہن کی تخلیق ہوتا ہے ——— اُردو کے ان افسانہ نگاروں میں نے پنجاب کے دیہات کو کہانیوں کا موضوع بنایا ہے بلونت سنگھ کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کا نام بڑا اہم رہا ہے ——— قاسمی اور بلونت سنگھ [illegible]

[illegible]

[illegible] آپ کا سا انداز طبیعت کی وجہ سے [illegible]

کی کہانیوں کے خالق کی حیثیت سے یاد رہے گا ــــــــ بلونت سنگھ پنجاب کے رومان سے بھی واقف ہے لیکن وہ اس رومان کی فضا کو اپنی کہانیوں پر چھا جانے کی اجازت نہیں دیتا کہ اس سے اس کے کرداروں کی حقیقی تصویریں نہیں ابھر سکتیں۔ وہ حسن کا اظہار تو کرتا ہے لیکن حقیقت نگار کی نظر سے رومانوی نگاہ سے نہیں ــــــــ پنجاب کی دیہاتی دوشیزہ میں جتنی ملائمت ہے اتنا ہی کھردرا پن یہاں کے جوان کی زندگی میں ہے۔ ــــــــ بلونت سنگھ اس کھردرے پن کی کہانیاں سناتا ہے اجبکہ قاسمی اس ملائمت کی ــــــــ

دیہات کی کہانیوں کی تعداد بلونت سنگھ کے افسانوں میں دس بارہ سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ناقدین نے عام طور پر یہی کہا ہے کہ بلونت سنگھ محض پنجاب کے دیہات کا ترجمان ہے ــــــــ حقیقت یہ ہے کہ بلونت سنگھ محض دیہات کا نہیں بلکہ پورے پنجاب کا فسانہ خوان ہے۔ اس کے کرداروں اور فضا کا تعلق پنجاب سے ہے چاہے دیہات کا پس منظر ہو یا شہر کا ــــــــ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا پنجاب کا ایک خاص مزاج ہے ایک خاص لب ولہجہ اور انداز ہے۔ یہ لب ولہجہ اور انداز بلونت سنگھ کے افسانوں کی جان ہے اور اسی سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ وہ محض دیہات کا ترجمان ہے کیونکہ عام طور پر پنجابیت محض دیہات سے مختص کی گئی ہے شہر کی کہانیوں میں پنجابی ٹھیٹ پن کا اظہار یوں تو کئی افسانوں میں ہوتا ہے لیکن یہاں میں صرف "پہلا پتھر" سے ہی دو ایک اقتباسات پیش کروں گا:۔

"بلے بلے" باجے کو اپنے کان میں آواز سنائی دی۔ دیکھا پونگا بھی اسے کارخانے میں نہ پاکر وہاں آن پہنچا تھا اور پھر رال ٹپکاتے ہوئے بولا "جا یگھکی کی کمر تو دیکھو۔ کیسی پتلی کیسی لچکدار ہے۔ آنکھ نہیں ٹکتی اس پر۔۔۔۔۔۔"

اوئے میں جٹی پنجاب دی

میرا ریشم ورگا لک"

تبھا باجے نے پونگے کو کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھ اوئے جل ککڑ!!"

"سردار جی کے لڑکے بھی" چل کبڈی تارا سلطان بیگ مارا" کہتے ہوئے ساتھ چلے آرہے تھے اور ان کے پیچھے وہ نوجوان تھا جو وہاں کوئی امتحان دینے کے لئے نیا نیا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی باجے نے پوچھا "اوئے ماں دیا منڈا! ایہہ کون ہے"

"اوئے جیہہ بھی اپنا منڈا ہے۔ تواں دا کمل ہویا ہے عسک دے مدرسے دے بچ"

"اچھا اچھا۔ ایہہ تاں پرسوں ہی آیا ہے۔"

"آہو جی لونڈوں کی باتیں چھوڑو۔ اب ناریوں کی باتیں کرو۔"

"پہلا پتھر" کا ذکر ہوا ہے تو بلونت سنگھ کی کہانیوں کے ایک اور موضوع کا تذکرہ بھی یہیں ہو جانا چاہیئے۔ یہ انسانی ہمدردی یا انسان دوستی کا موضوع ہے اردو کے اکثر افسانہ نگاروں نے یہ موضوع اپنایا ہے اور میں نے عرض کیا تھا کہ یہ موضوع بھی ترقی پسند تحریک کے لائے ہوئے شعور کا ہی نتیجہ ہے ــــــــ لیکن انسان دوستی کا تصور بڑا مبہم سا معاملہ ہے۔ یہ شعور کی ترقی بھی ہے اور اس کی معذوری بھی ظاہر کرتا ہے۔ ترقی تو ان معنوں میں ہے کہ فنکار بنیادی انسانی اقدار کا شعور رکھتا ہے لیکن معذوری ان معنوں میں ہے کہ وہ انسانی جذبات کی اس اٹھان، اور انسانی زندگی

کی بہتری کی اس جد و جہد سے وابستہ نہیں نظر آتا جو انفرادی مثالوں سے بڑھ کر وسیع تر سماجی زندگی کی جد و جہد بن کر سامنے آتے ہیں۔ وہ طبقاتی کشمکش میں طبقاتی نفرت اور محبت کے جذبات اور ان سے پیدا ہونے والی عالمگیر انسانیت، اخوت اور ہمدردی کی اقدار کی جگہ (Isolated) کوششوں تک اپنی نظر کو محدود کر لیتا ہے۔ اردو کا کوئی بھی افسانہ نگار ابھی تک اس وسیع تر جد و جہد کی عکاسی نہیں کر سکا جو انسانی اقدار کی عظمت قائم کرنے کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ یہی بات بلونت سنگھ کے ان افسانوں میں ہے جو انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کمزوری کے باوجود یہ غنیمت ہے کہ بلونت سنگھ ایسے کردار تخلیق کرتا ہے جو انسان کو انسان سمجھتے ہیں، جو اس کی خامیوں کو سماجی تنزل کا نتیجہ جانتے ہیں اور جو خود تنزل کے گہرے غار میں گرے ہونے کے باوجود انسانیت کی لَو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں ——— بلونت سنگھ کے ایسے افسانوں میں "تعمیر" "پہلا پتھر" "لکیریں" "جگا" "کالے کوس" وغیرہ شامل ہیں۔

"پہلا پتھر" ان سب کہانیوں میں نمایاں ہے۔ اس کا ہر کردار اُبھر کر یوں سامنے آ گیا ہے گویا قاری خود باجے سنگھ کے "شاہی اصطبل" کے برابر کی "Rear Window" میں سے جھانک کر سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے ——— اور باجے سنگھ کا کردار تو بے مثال ہے۔ شہری نچلے طبقے کی سماجی زندگی کا اس سے بہتر نمائندہ آسانی سے تخلیق نہیں ہو سکتا۔ نچلے طبقہ کی معاشی اور اخلاقی زندگی کے تضادات کا نتیجہ اس میں ایک خاص قسم کی بے حجابی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس کیفیت کو انگریزی میں INHIBITIONS کی غیر موجودگی کہتے ہیں۔ یہ بے حجابی باجے سنگھ کی بھی خصوصیت ہے لیکن اس بے حجابی، اور لڑکیوں سے آزادانہ چھیڑ چھاڑ کے باوجود باجے سنگھ انسانی دل رکھتا ہے اور اندھی سانولی جب اپنے محبوب کے خیالی وعدوں کا تذکرہ باجے سنگھ اور اس کے ساتھیوں سے کرتی ہے تو:۔

"باجے نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔ سب چپ تھے، وہ بھی چپ رہ گیا۔ سب کو خاموش پا کر سانولی نے اپنا سوال دہرایا۔ "آپ سب کو اُ کین نہیں آتا؟" باجے کی آنکھوں کے گوشے پُر آب ہو گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سانولی کے سر پر رکھ دیا اور پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "ہمیں اُکین ہے ——— اور دیکھو تمہیں بے بخت گھر سے باہر نہیں رکھنا چاہیے۔ اور پھر سردی پڑنے لگی ہے۔ کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ"

سانولی نے اس کی مضبوط کلائی کو اپنی کمزور انگلیوں سے چھو کر پوچھا۔

"پر باجے چاچا۔ آپ سب لوگ بے وقت کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم؟" باجے نے پدرانہ پیار سے لرزتے ہوئے اس کے گال کو چھوتے ہوئے جواب دیا ——— "سانولی بیٹی! ہم اس کھوشی میں برفی کھانے جا رہے ہیں بیٹی۔"

میں نے شروع میں کہا تھا کہ اردو افسانہ درمیانہ طبقہ کے مسائل سے ابھی تک آزاد نہیں ہو پایا۔ جہاں تک شہری زندگی کے افسانوں کا تعلق ہے۔ بلونت سنگھ بھی انہی حدود میں مقید ہے اس کا موضوع درمیانہ اور خاص کر نچلے درمیانہ طبقہ کے مسائل ہی رہے ہیں۔

درمیانہ طبقہ بھی ایک عجیب مخالفت چیز ہے۔ اس کی تمام تر زندگی تضادات کا شکار ہے۔ ایک طرف اقتصادی مسائل ہیں، بیکاری ہے ان سے تنگ آ کر سماجی اقدار سے بغاوت کا جذبہ ہے ——— دوسری طرف تعلیم سے حاصل کی ہوئی ترقی کی خواہشات ہے ——— ان سے کہیں ظاہر داری میں چھپائی ہوئی بے ایمانی جنم لیتی ہے۔ کہیں داخلی بے اطمینانی نمودار ہوتی ہے ——— کوئی شخص جنسی گھٹن کا شکار ہے

نیسی بے راہروی کا کوئی انسانی اقدار کو پیسے پر قربان کر دیتا ہے اور کوئی خیالوں کی دنیا آباد کر کے اس میں گم ہو جانے ہی میں عافیت سمجھتا ہے —— اور بعض اوقات تضاد روایتی قدروں اور نئی اقدار کے ٹکراؤ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے —— یہ سب تضاوات اور مسائل بلونت سنگھ کے افسانوں کے موضوع ہیں۔ "بابو مانک لعل جی" "کٹھن ڈگریا"۔ "سمجھوتہ" "اعتراف"۔ "کلی کی فریاد"۔ "بازگشت"۔ "لمحے" اور "دیمک"۔ وغیرہ ان افسانوں میں سے چند ہیں۔

"کٹھن ڈگریا"۔ "دیمک" اور "اعتراف" اپنے ڈھانچے، اور مواد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ لیکن سب میں بنیادی مسئلہ درمیانہ طبقہ کے ازدواجی رشتوں کا کھوکھلا پن ہے —— "سمجھوتہ" درمیانہ طبقہ کی زندگی کے محدود ہونے کا اظہار ہے۔ "کلی کی فریاد" ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنی بیٹی کی خواہشات کو پیسے پر قربان کر دیتا ہے۔ "بازگشت" بوڑھے اخلاق اور جوانی کے تقاضوں کے تضاد کو پیش کرتی ہے۔ "بابو مانک لعل جی" نچلے درمیانہ طبقہ کے ایک کلرک کی غلامانہ ذہنیت کی پیشکش ہے —— اور "لمحے" —— اس کہانی کے بارے میں میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں۔

"لمحے" بیک وقت دو موضوعات کو چھیڑتی ہے اس کا بنیادی کردار ایک ایسے نوجوان کا ہے جو درمیانہ طبقہ کی آوارہ خیالی کی نمائندگی کرتا ہے جونہی وہ بس میں داخل ہوتا ہے اور ایک حسین عورت کو دیکھتا ہے اس کا ذہن ایک خاص سمت سفر کرنے لگتا ہے، اور وہ اس حسین عورت سے قرب کی مختلف ترکیبیں سوچنے لگتا ہے —— اور پھر جب قرب حاصل ہو جاتا ہے تو یکایک اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ حسین عورت کی ایک ٹانگ خراب ہے اور یہ نتیجہ ہے فسادات کا —— عورت مسلمان تھی اور کہانی کا نوجوان ہندو —— یہیں سے نوجوان کے خیالات کا رُخ بدل جاتا ہے اور فسادات کے خلاف جذبات ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں —— اپنی سادگیٔ بیان کے باوجود "لمحے" ایک بہت پُر تاثیر کہانی ہے۔

فسادات کا موضوع اُردو کے اکثر افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں موجود ہے، اور اس کی موجودگی فسادات کے اثرات کے پیشِ نظر کچھ ایسی عجیب بات بھی نہیں بلونت سنگھ کے ہاں یہ موضوع آزادانہ اور بحیثیت موجود نہیں ہے اس کے وہ افسانے جو فسادات سے متعلق ہیں اکثر دوسرے اہم مسائل سے جڑے ہوئے ہیں "لمحے" کا تذکرہ میں نے ابھی کیا ہے۔ اور "کالے کوس" کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ "دیپلے ۴۸" بھی فسادات کے مابعد اثرات کی کہانی ہے لیکن یہ کہانی فسادات کے علاوہ چند اور اہم باتوں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ جن کا تذکرہ میں یہاں ضرور کرنا چاہتا ہوں۔

"دیپلے ۴۸" ایک طرف تو پارسائی کے پردے میں عام لوگوں کا خون چوسنے والے ایک کردار کو ننگا کرنے کی کوشش ہے اور دوسری طرف ایک خالص طبقاتی شعور رکھنے والے کردار کی بغاوت کی کہانی ہے —— سردار بدھ سنگھ پہلا کردار ہے، اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے،

"صبح و شام پاٹھ کرتے، مالا جپتے، یوں تو مالا ہر وقت کلائی سے لپٹی رہتی لیکن علی الصبح جب وہ سکھ منی صاحب کا طویل پاٹھ کرنے لگتے تھے۔ تو گھر کے افراد کی نیند اکھڑ جاتی۔ آپ گوردوارے میں بھی پاٹھ کرواتے رہتے تھے۔ دوسروں کو پاٹھ کی تلقین کرتے تھے۔"

"ادھر جب پانسہ پلٹا تو انہوں نے خوف کے مارے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی ہزاروں کی جائدادیں کوڑیوں کے مول خرید لیں اور پھر دولت مند شرنارتھیوں کے ہاتھ زیادہ سے زیادہ داموں بیچ کر دل کھول کر منافع کمایا۔ پاٹھوں کی شدت اور بڑھی اور اُن کا چہرہ نورِ معرفت سے دمک اٹھا۔

اور دوسرا کردار لکھا سنگھ کا ہے جس نے اپنی زندگی کے تجربات سے طبقاتی شعور حاصل کیا ہے اس کے اس شعور کا اظہار اس کے ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

"صبح سے شام تک اپنی پیشانی سے ایڑی تک پسینہ بہانے والا کوئی شخص بھی میرا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اب مذہب صرف دو رہ گئے ہیں ایک دوسروں کا خون چوسنے اور انہیں لوٹنے والوں کا مذہب اور دوسرا اپنا خون دینے والوں اور لوٹے جانے والوں کا مذہب اس کے علاوہ اور کوئی مذہب نہیں ہے۔ آپ سمجھے......... آپ نہ معلوم کون سے گیان دھیان کی باتیں کرتے ہیں......... وہ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں...... شاید اس لئے کہ میں بھوکا ہوں، میرے بچے بھوکے ہیں۔ میری بیوی بھوکی ہے......... میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کیلئے ترستا ہوں..."

طبقاتی شعور کا اظہار بلونت سنگھ کے اس کردار کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ بظاہر یہ بلونت سنگھ کا موضوع نہیں ہے، یا شاید بلونت سنگھ خود اس شعور میں پختہ نہیں ہے۔ بہرحال اس معاملہ میں بلونت سنگھ کا وہی حال ہے جو اُردو کے دوسرے ہم عصر افسانہ نگاروں کا ہے ——— اور یہی بات دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح بلونت سنگھ کے فن کو بھی ترقی پسند حقیقت نگاری کے صحیح مفہوم تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہے۔

موضوعات ہی کے سلسلہ میں ایک آخری بات کہہ لوں تو پھر اسلوب اور ہیئت کی طرف رجوع کروں گا ——— رومان ہمارے افسانوں کا ایک بہت بڑا موضوع رہا ہے ——— اور ہے۔ بلونت سنگھ رومانوی افسانہ نگار نہیں ہے، اس کا طرزِ اظہار حقیقت نگار کا ہے اور اس کا مواد زندگی کے بوجھل مسائل سے حاصل کیا ہوا ہے نہ کہ رومان کے ہلکے پھلکے معاملات سے۔ اس کے باوجود اس کی چند کہانیاں رومانی ہیں ——— ان کہانیوں میں اس کا طرزِ تحریر بھی خالص رومانوی ہے اور موضوع بھی "چکوری"۔ "آشیانہ" اور "ایک معمولی لڑکی" اس کے اس انداز کی کہانیوں کی کچھ مثالیں ہیں ——— ان کہانیوں پر کچھ زیادہ کہنا میں اس لئے ضروری نہیں سمجھتا کہ یہ بلونت سنگھ کی نمائندگی نہیں کرتیں، ان کا تذکرہ تو صرف اس بات کے ضمن میں آ گیا ہے جو میں نے موضوعات کے تنوع کے بارے میں ابتداءً کہی تھی۔

میں نے بار بار کہا کہ بلونت سنگھ حقیقت نگار ہے ——— لیکن اردو افسانہ نگاری کے ضمن میں حقیقت نگاری کی اصطلاح بھی مختلف طریقوں سے استعمال کی گئی ہے۔ کرشن چندر بھی حقیقت نگار ہے اور منٹو بھی۔ کرشن کی حقیقت نگاری محض موضوع کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، ورنہ اندازِ تحریر کے اعتبار سے وہ ہمیشہ ہی رومانوی رہا ہے۔ اس کے برعکس منٹو اپنے موضوع اور اسلوبِ نگارش دونوں کے اعتبار سے حقیقت نگار ہے بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کرشن چندر کی حقیقت پرستی نہیں بلکہ منٹو کی حقیقت نگاری سے قریب تر ہے۔ بلونت سنگھ براہِ راست بات کہنے کا عادی نہیں ہے۔ اس کے اظہار میں وہی بیباکی اور وہی بے رحمی کا سا انداز پایا جاتا ہے جو سعادت حسن کے اسلوب کی خوبی سمجھا گیا ہے۔ دونوں فنکاروں کا بنیادی فرق ان کے افسانوں کے مواد کی وجہ سے ہے۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا مواد عجیب و غریب کرداروں کے جنسی معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ بلونت سنگھ اپنی کہانیوں کا مواد خالص جنسی مسائل کی بجائے ان مسائل کے سماجی اثرات سے حاصل کرتا ہے۔ خود جنسی معاملات کے اظہار میں بھی بلونت سنگھ جنس سے زیادہ معاملے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اسلئے منٹو سے مختلف ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ طریقِ تحریر میں وہ منٹو سے صد درجہ قریب ہے۔ اس لئے بعض ایسی تحریروں میں وہ بالکل ہی منٹو معلوم ہوتا ہے جن میں موضوع بھی منٹو والا ہی ہو۔ "پہلا پتھر" کے بہت سے حصّے اس کی بڑی اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔

"ادھر یہ ہڑبڑا کر اٹھا، ادھر بڑی سردارنی حسبِ معمول بھوری بھینس کی طرح کدو کدو پھر چھاتیاں تھلتھلاتی اسینہ زوریاں دکھلاتی آگ جلانے کے لئے برادہ لینے کے لئے چھاج ہاتھ میں پکڑے اس کی جانب بڑھی۔

بڑی سرزارتی کے جسم کا عضو اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ چکا تھا یعنی جو چیز جتنی موٹی، جتنی بھدی، جتنی کشادہ ہو سکتی تھی، ہو چکی تھی، چلتی تو یوں معلوم پڑتا۔ جیسے تنور ڈھانپنے والے چارپے کو پاؤں لگ گئے ہوں۔

ایسی ڈبل ڈوز سرزارتی بھی سروارجی کے لئے ناکافی ثابت ہوئی .... " اسی طرح "تعمیر" کا سارا سارا انداز سعادت حسن کی کہانیوں کا سا ہے

بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کی چند خوبصورت مثالوں میں سے اسکی کہانیاں "سنہرا دیس" اور "کٹھن ڈگریا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "کٹھن ڈگریا" تو بعض جگہ منٹو سے قریب بھی ہو گئی ہے لیکن "سنہرا دیس" خالصًا بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کی نمائندہ ہے

"نقوپ سنگھ ریاست ٹہری کے ایک غیر معروف گاؤں میں پیدا ہوا۔ بچپن کے بعد لڑکپن بھی اسی جگہ گذر رہا تھا۔

جب اس کی عمر چودہ برس کی ہوئی تو اسکی شادی کر دی گئی۔ جب اس کی دلہن گھر میں آئی تو وہ اُسے دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ وہ دور ہی دور سے بیوی کو دیکھ لیا کرتا۔ اسے اس بات کا کچھ علم نہیں تھا کہ بیوی کس کام آتی ہے۔

سرمئی رنگ اور تیکھے نقوش والی بیوی سر نیہوڑائے زمین کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ اور نقوپ سنگھ اپنی ماں کی آڑ میں گھور گھور کر اس کی طرف دیکھا کرتا ـــــ "

"ـــــــ لیکن اس وقت جب اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو زمین کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بہت مرعوب نظر آئی تھی۔ اسے تحکمانہ انداز میں پوچھا "کیوں آئی ہو؟"

بیوی نے آنچل سے روٹیاں اور دال نکال کر اس کے آگے رکھ دی اور پھر اُس کی منت کرنے لگی کہ وہ روٹی کھا لے۔ وہ بڑی مشکل سے رضامند ہوا۔ نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے بیوی کو پانی لانے کے لئے کہا۔

وہ فوراً اٹھی اور کٹورا لے کر بڑی پھرتی سے ندی کی طرف چل دی۔ اس دن اسے بیوی کی اہمیت کا کچھ احساس ہوا ...... "

حقیقت نگاری اور پنجابی کلچر جب دونوں اکٹھے ہو جائیں تو زبان پر بھی اس کا گہرا اثر ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ بلونت سنگھ کے افسانوں میں پنجابی الفاظ و محاورات کا آزادانہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ پورے افسانے میں اس طرح پیوست ہو کر اور رچ بس کر آتے ہیں کہ ان کے استعمال سے افسانے کے بیان کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کی جگہ تقویت پہنچی ہے ـــــــ بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو کی طرح نئے نئے الفاظ تراشنے میں بھی بڑی مہارت رکھتا ہے مثلاً "ڈبل ڈوز سرزارنی"، "دورمار توپ" وغیرہ۔

حقیقت نگاری اور پنجابی ٹھیٹھ پن کو اپنے اسلوب نگارش کی بنیاد بنانے کی وجہ سے بلونت سنگھ اردو افسانے کی ایک ایسی کمزوری سے آزاد ہو گیا ہے جس کا اظہار میں نے ابتدا میں کیا تھا۔ وہ کمزوری نثر میں شاعری کرنے کے طریق کی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ نثر خود اپنی خوبصورتی کے باعث دلچسپ اور حسین معلوم ہونی چاہیئے۔ نہ کہ اس وجہ سے کہ وہ شاعری سے قریب تر ہو گئی ہے۔ اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اردو میں جدید افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو اس اعتبار سے سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ اور اب میں یہ کہتا ہوں کہ منٹو کے بعد غیر شاعرانہ حسین نثر لکھنے والا افسانہ نگار صرف بلونت سنگھ ہی ہے جس کے افسانے کی خوبصورتی اس کے طرزِ تحریر کے باعث ہے اس کے اس اندازِ نگارش کے باعث جو شاعری سے دور دور کا واسطہ نہیں رکھتا۔

اگرچہ بلونت سنگھ کے اسلوب کی بنیادی خوبی وہی ہے جو میں اوپر کہہ آیا ہوں لیکن اس کے باوجود یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی بلونت سنگھ نے خالص رومانوی کہانی لکھی ہے، وہ اپنے اسلوب میں بھی خالصتاً رومانوی ہو گیا ہے اور اس انداز میں بھی وہ خاصہ کامیاب رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی کہانیاں "ایک معمولی لڑکی" "شہناز" اور "جگ ری" پیش کی جا سکتی ہیں۔ (لیکن چونکہ اس کی نمائندہ کہانیوں کے مقابلے میں مجھے ان رومانوی کہانیوں کی اہمیت بہت کم معلوم ہوتی ہے اس لئے میں اس پہلو کا اظہار کرنے میں کسی قسم کے جوشش کا اظہار نہیں کر رہا ہوں۔)

بلونت سنگھ کی کہانیوں کے کردار عام زندگی کے کردار ہونے کے باوجود اپنی خصوصیات رکھنے میں اور کبھی "بابا مہنگا سنگھ" اور کبھی "بابو مانک لعل جی" اور "نہال چند" خیال کے پردوں میں سے رہ رہ کر ابھرتے ہیں۔ ان کرداروں کی یہ خصوصیات بلونت سنگھ کی چابکدستانہ کردار نگاری کی مرہونِ منت ہیں ـــــــــ ان میں سے ہر ایک کردار خود اپنے عمل سے اپنا تعارف کرواتا ہے نہ کہ فنکار کے بیان کے ذریعے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زندہ کردار بن گیا ہے۔ یہ تھا بلونت سنگھ کے فن کا ہیئت اور مواد کے اعتبار ایک سرسری سا جائزہ۔ بلونت سنگھ جدید اردو افسانہ نگاری کی روایات کی تخلیق کردہ نظریاتی حدود کو پھلانگ کر آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کا شعور درمیانہ طبقہ یا زیادہ سے زیادہ دیہات کے بیباق اور (Chivilarous) نوجوانوں کے مسائل ان کی انسان دوستی، ان کے نیم باغیانہ تصورات اور ان کے تضادات سے آگے نہیں بڑھا۔ اس نے ابھی تک سماجی زندگی کے ان مسائل کے پسِ پردہ کام کرنے والی طاقتوں کو بھرپور طریقے سے بے نقاب کر کے جد وجہد کرتے ہوئے کرداروں کی تخلیق نہیں کی۔ یہ یقینی امر ہے کہ بلونت سنگھ سماج کی موجودہ صورت سے مطمئن نہیں ہے یہ بھی یقینی ہے کہ وہ سماج کو متحرک مانتا ہے ـــــــــ تو کیا پھر اُس سے آج تک کوئی کردار ایسا نظر نہیں آیا جو روایاتی اقدار کی شکست و ریخت کے علاوہ نئی اقدار کا پیغام بھی ہو۔

اگر بلونت سنگھ شعور کی ان حدود تک پہنچ گیا تو وہ ایک بے مثال فنکار بن جائے گا کہ اس کے ہاتھ میں حقیقت نگاری کا ایک ایسا باکمال قلم ہے جو گوشت پوست کے کردار تخلیق کرنے میں جواب نہیں رکھتا ـــــــــ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوا تو بھی بلونت سنگھ اپنی حسین نثر، اپنی حقیقت نگاری اپنی پنجابیت، اپنی انسان دوستی اور تنزل پذیر اقدار سے نفرت کے باعث ہمیشہ یاد رہے گا۔

"بلونت سنگھ نے ہمیں بہت سی نئی چیزیں دی ہیں ـــــــ بظاہر وہ دیہات کے ترجمان ہیں لیکن وہ اس ترجمانی سے آگے بڑھ کر دیہاتی زندگی میں جو حسن اور توانائی ہے اس کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد نے انہیں "پنجاب نگار" کہا ہے میں انہیں حیات نگار کہتا ہوں وہ پنجاب پر اس لئے نہیں لکھتے کہ پنجابی ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں پنجاب میں زندگی نظر آتی ہے۔ اس زندگی میں جو حسن اور توانائی ہے اس نے بلونت سنگھ کو متاثر کیا ہے ـــــــ وہ اس زندگی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں ـــــــ ان میں اس زندگی سے ایک والہانہ دلچسپی ہے۔"

(ڈاکٹر عبادت بریلوی ـ ادبی تبصرہ ـ نقوش افسانہ نمبر جلد دوم)

ڈاکٹر وزیر آغا

ایک مزاح نگار

اردو نثر میں ظرافت کی کہانی دراصل طنز کی کہانی ہے۔ خالص مزاح کے فروغ و ارتقا کی داستان ایک تشنہ اور نامکمل حالت میں رہ گئی ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں سب سے اہم ترین وجہ یہ ہے کہ خالص مزاح کا فروغ، سکون و عافیت کی فضا کے تابع ہوتا ہے اور اردو نثر کے فروغ و ارتقا کا دور ایک طویل سیاسی مجلسی اور ذہنی کش مکش اور تصادم کا دور ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور نے طنز کی نمو کے لئے تو ایک سازگار فضا قائم کی ہے۔ لیکن خالص مزاح کے فروغ کو اس سے صدمہ پہنچا ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے۔ کہ خالص مزاح کی نمو کے لئے عالی حوصلگی، ہمدردانہ اندازِ نظر، زندگی سے اُنس اور زندگی کی ناہمواریوں اور صعوبتوں کا تبسم کے ساتھ خیر مقدم کرنے کا جو رجحان ضروری ہے، اردو ادب کے ہاں عام طور سے ناپید رہا ہے۔ ایک طرف تو مشرقی فلسفے کی مخصوص ماورائی کیفیات کے زیرِ اثر زندگی کی نفی کا رجحان عام تھا، اور دوسری طرف مغربی افکار کے تحت تصادم اور کش مکش کو تحریک ملی ہے اور یہ دونوں باتیں خالص مزاح کے لئے مُضر ہیں۔ خالص مزاح کے فروغ کے لئے زندگی اور اس کی ناہمواریوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرنا اور روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کو کائنات کے وسیع تر نظام میں ایک موزوں جگہ تفویض کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر میں خالص مزاح کا وجود کسی رجحان یا رو کا رہینِ منت نہیں بلکہ صرف چند اذہان کی پیداوار ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں خالص مزاح کسی تدریجی ارتقا کا نمونہ پیش نہیں کرتا بلکہ فنکار کی مخصوص ذہنی کیفیت اور زندگی کے بارے میں اُس کے مخصوص ردِ عمل سے ابھرا ہے۔ مثلاً غالب کے خطوط میں خالص مزاح کے نقوش نہ صرف غالب کی عالی حوصلگی اور ہمدردانہ اندازِ نظر کے غمّاز ہیں بلکہ اس بات کا نتیجہ بھی ہیں۔ کہ غالب نے زندگی سے فرار حاصل کرنے کی بجائے۔ اس کی طرف پیش قدمی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور زندگی کی مختلف کیفیات سے مسرت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کو اپنا مسلک بنایا ہے۔ غالب کو زندگی سے اُنس ہے اور وہ اپنی ذات کو وسیع تر کائنات میں کوئی اہم مقام دینے کو بھی تیار نہیں۔ چنانچہ اُسے نہ صرف خارجی زندگی سے محظوظ ہونے کی صلاحیت حاصل ہے۔ بلکہ وہ اپنی ذات کے مخصوص جذباتی نقائص پر بھی ہنس سکتا ہے — یہی حال پطرس کا ہے کہ اپنے زمانے کی شدید بحرانی کیفیات اور تصادم، کش مکش اور آویزش کے رجحانات کے باوجود اُس نے زندگی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا، اور اپنی کشادہ دلی اور ایک وسیع تر اندازِ نظر کے تحت، زندگی کی ناہمواریوں سے محظوظ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ پطرس نے خالص مزاح کا جو معیار قائم کیا۔ وہ کسی روایتی رجحان کی کڑی نہیں تھا۔ بلکہ فنکار کے ایک مخصوص میلانِ طبع کی پیداوار تھا۔ اسی لئے پطرس کے خالص مزاح کا معیار مثالی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ابھی ایک طویل مدت تک کسی حریف کا خطرہ نہیں۔

یوں شاید یہ کہا جائے کہ ہر خالص مزاح نگار کے فن میں اُس کا "میلانِ طبع" ہی کار فرما ہوتا ہے۔ پھر پطرس کی انفرادیت کس بات میں ہے؟ دراصل سارا فرق میلانِ طبع کی نوعیت کا ہے۔ مزاح کی دنیا میں ذوقِ مزاح کے علاوہ ماحول کی طرف ایک ہمدردانہ پیش قدمی بھی اشد ضروری ہے۔ جہاں تک ذوقِ مزاح کا تعلق ہے، اس کی تشکیل میں تعلیم، خاندانی روایات، طبعی حالات، ذہنی معیار، کردار کی نوعیت اور جسمانی کمزوری یا توانائی — ان سب کا ہاتھ ہوتا ہے۔ تاہم دیکھنے کی بات محض یہی نہیں کہ مزاح نگار کن باتوں پر ہنستا ہے یا اور کس طرح ہنستا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ آیا اُس کی ہنسی تخریب، تشریب اور ایذا رسانی کے

جذبے سے تحریک پاتی ہے۔ یا ہمدردانہ اندازِ نظر کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان کے ایسے مزاح نگار بھی ہیں جن کے ہاں مزاح نگاری کی ساری صلاحیتیں محض لفظی قلابازیوں یا عملی مذاق تک محدود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ لوگ اُس مزاح کے قائل ہیں جو جسم تک محدود ہے۔ اور جسے ذہن سے کوئی خاص علاقہ نہیں یوں بھی لفظی قلابازیوں یا عملی مذاق سے پیدا ہونے والا مزاح تخریبی عمل ہی کی ایک صورت ہے۔ کیونکہ یہ مزاح کردار یا عقد کا حلیہ بگاڑ تے اسے بدشکل کرنے اور اس کی حیثیت کذائی پر ایک جذبہ افتخار کے تحت قہقہہ لگانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس مزاح میں مُسبک روی کشادگی ہمدردی اور اغماض و درگزر کی وہ اعلیٰ وارفع کیفیات موجود نہیں ہوتیں۔ جو مزاح کے جدید تصور کے لئے ضروری ہیں۔ پطرس کے مزاح کا ایک امتیازی وصف یہ ہے۔ کہ اس میں فنکار نے زندگی کے مضحک پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے وقت یا کردار کی بوالعجبیوں یا صورتِ واقعہ کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک ہمدردانہ اندازِ نظر کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی لئے اسے عملی مذاق کی صورت پیش نہیں آئی۔ عملی مذاق سے فائدہ نہ اٹھانے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ کہ پطرس کا ذوقِ مزاح نہایت بلند ہے۔ وہ مزاح کے اس رنگ کا گرویدہ ہے۔ جو تخریب، تشتریت، عملی مذاق اور لفظی قلابازیوں سے ملوث نہیں ہوتا۔ بلکہ وسیع القلبی اور ذہنی کشادگی سے تحریک پاتا ہے۔ مختصراً اس کے مزاح میں ایک صحت مندانہ کیفیت ہے۔ وہ ایک ایسے طبقے اور ایک ایسی سرزمین کا نمائندہ ہے جس کے باسی خونِ گرم سے اپنے جذبات کی نمو کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اور جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند ہونے کے باعث حریف کو کچوکے دے دے کر نہیں ہنستے بلکہ اسے گلے سے لپٹا کر مسرت اور طمانیت کے قہقہے لگاتے ہیں۔ پطرس کی مزاح نگاری کی یہی خصوصیت دامن کش دل ہے۔ کہ اس میں خلوص توانائی اور کشادہ دلی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ماحول اور اس کے کرداروں سے پیار کرتا ہے۔ اور اسی لئے اُسے ناہمواریاں اور بوالعجبیاں عزیز ہیں۔ بلکہ وہ خود پر ہنستے ہوئے بھی کوئی تحقیر آمیز رویہ اختیار نہیں کرتا۔ یہ بڑی بات ہے، گویا پطرس کا مزاح، تخریب، تحقیر، انتقام اور تشتریت سے اس درجہ محفوظ ہے کہ وہ خود پر ہنستے ہوئے بھی توازن، اعتدال اور شخصی وقار کا خاص خیال رکھتا ہے۔ یوں بھی خود پر ہنسنے کے لئے وسیع القلبی کی ضرورت ہے۔ ایک عام شخص جو زندگی کی ہماہمی اور شوریدہ سری میں انتہائی سنجیدگی سے سرگرمِ عمل ہو خود پر ہنسنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ کام مزاح نگار ہی کر سکتا ہے تاہم یہاں بھی ذوقِ مزاح اور شخصی ردِعمل کے اثرات مختلف نتائج پیدا کرتے ہیں۔ خود پر ہنستے وقت انسانی عظمت اور وقار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گویا وہ کائنات کی اس بہت بڑی ناہمواری پر ہنس رہے ہوں۔ اور بعض لوگ جن کا مطمحِ نظر وسیع نہیں ہوتا۔ خود پر یوں ہنستے ہیں گویا اپنی ذلت حماقت اور اوچھے پن سے دوسروں کو ہنسانے کی سعی میں ہوں۔ پطرس مقدم الذکر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں عملی مذاق کی بجائے صورتِ واقعہ سے مزاح پیدا ہوا ہے۔ عملی مذاق ایک شعوری عمل ہے اس میں کوشش اور آورد کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ اور اس کے خالق کی حیثیت اس مسخرے کی سی ہوتی ہے۔ جو دوسروں کو ہنسانے کی شعوری کوشش میں مبتلا ہو۔ بدقسمتی سے اردو مزاح کی روایت مسخرہ پن اور عملی مذاق کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسی لئے جدید دور میں بھی بعض مزاح نگاروں نے مزاح کی اس روایت سے کوئی قدم آگے نہیں بڑھایا پطرس نے مزاح نگاری کی اس روش سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی پگڈنڈی دریافت کی ہے۔ اور اپنی مزاح نگاری کو صورتِ واقعہ پر استوار کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پطرس کی مزاح نگاری کو مزاحیہ تقابل (COMIC COMPARISON) مزاحیہ کردار اور اسٹائیل کی خندہ آور کیفیات سے بھی تقویت ملی ہے۔ تاہم دراصل اُسی کی مزاح نگاری کا طرۂ امتیاز وہ مضحک کیفیات ہیں، جو صورتِ واقعہ سے پیدا ہوئی ہیں پطرس کو صورتِ واقعہ کی تعمیر کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ وہ واقعہ کی مختلف کڑیوں کو اس انداز سے مربوط کرتا ہے۔ کہ مضحک کیفیات کی نمو کسی شعوری کاوش کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ از خود حالات و واقعات کی ایک مخصوص نہج سے ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہی اصل بات ہے ورنہ عملی مذاق سے جو صورتِ واقعہ معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس کے پسِ پشت تخریبی عمل اور ایذارسانی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں ہنسانے کی شعوری کاوش موجود ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں مزاح کے صحیح مزاج سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ بلکہ مزاح کی خود روائی کو نقصان پہنچاتی ہیں ـــ صورتِ واقعہ سے مزاح کی نمو ایک فنکارانہ گرفت کی بھی

غالب ہوتی ہے اور پطرس نے اس کا متعدد بار مظاہرہ کیا ہے۔ وہ یوں کہ صورتِ واقعہ کی تعمیر میں پطرس نے توقعات کو بڑی خوبی سے ابھارا اور پھر فسخ کیا ہے مثلاً "مرید پور کا پیر" میں پطرس نے ایک ابھرتے ہوئے لیڈر کے کردار کو پیش کیا ہے۔ یہ کردار جب تک عملی زندگی سے دُور رہتا ہے، ایک متوازن نقطۂ نظر کی ترویج میں بڑا کامیاب نظر آتا ہے، اور ناظر کو اس کے آئندہ اقدامات سے توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب اُسے عملی طور پر سیاست دان بننے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ جب حالات و واقعات اُسے یکلخت عمل کے میدان میں جھونک دیتے ہیں اور اُسے سیاسی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے تجربہ، لچک اور توانائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو صورتِ حال بدل جاتی ہے۔ تخیل کے رنگ محل اور عمل کی سنگلاخ میں حقیقت میں بڑا فرق ہے چنانچہ یہ کردار بعض ناہمواریوں کے باعث جو محض بے چینی اور گھبراہٹ کی پیداوار ہیں، سیاست کے بعض اہم تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ اور لڑکھڑا جاتا ہے اس کی توقعات فسخ ہوتی ہیں، اور ایک کامیاب صورتِ واقعہ معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔ اس صورتِ واقعہ کی نمود میں پطرس نے فنکارانہ گرفت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، اور کہیں اس بات کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ صورتِ واقعہ کسی شعوری کاوش کا نتیجہ ہے۔

کچھ یہی کیفیت پطرس کے مشہور مضمون "مرحوم کی یاد میں" بھی ابھری ہے۔ مرزا صاحب اگر مصنف کو اپنی ٹوٹی پھوٹی بائیسکل پر سوار کر کے اس کی ہئیت کذائی پر قہقہے لگاتے تو یہ صورتِ واقعہ عملی مذاق کے تحت آکر جاذبیت اور خود روانی سے محروم ہو جاتی اور اس کے کردار ایذا رسانی یا حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناظر اور مصنف دونوں کی ہمدردی گنوا بیٹھتے۔ چنانچہ جو ہنسی معرضِ وجود میں آتی اس میں جذبۂ افتخار اور تخریب پسندی کے عناصر سب سے نمایاں ہوتے۔ یہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ مرزا صاحب اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ خرید و فروخت کے معاملے میں اپنی روایتی منافع پرستی کے رجحان کو بروئے کار لائیں۔ اور "میں" کے پردے میں چھپا ہوا کردار اپنی معصومیت کے حصار میں اس درجہ قید ہے۔ کہ دوسروں کی باتوں پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لے آنا اس کی عادت بن چکی ہے۔ چنانچہ یہ کردار عام انسانی لچک سے محروم ہونے کے باعث کسی نئی صورتِ حال سے یکایک ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ اور ایک سیدھی لکیر پر بے تحاشا بڑھا چلا جاتا ہے۔ پس جو صورتِ واقعہ وجود میں آتی ہے۔ نہ تو مرزا صاحب کے کسی عملی مذاق کا نتیجہ ہے اور نہ "میں" کے مسخرہ پن کا۔ اس کا باعث محض مزاحیہ کردار کی مخصوص ناہمواریاں ہیں۔ اور چونکہ فطری ناہمواریاں کسی تحریک یا کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتیں بلکہ از خود ابھرتی ہیں۔ لہٰذا ان سے پیدا ہونے والی صورتِ واقعہ میں بھی روانی اور بہاؤ کی کیفیات قائم رہتی ہیں۔ اور ناظر کی ہنسی کو تحریک دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں چنانچہ اس مضمون میں بائیسکل کا سارا واقعہ مزاحیہ کردار کی ناہمواریوں کے باعث مزاحیہ صورتِ واقعہ کو ابھارتا چلا گیا ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

پطرس نے اپنے مضامین میں کوئی ایسا بھرپور مزاحیہ کردار پیش نہیں کیا جو اپنی فطری ناہمواریوں سے محفل کو زعفران زار بناتا چلا جاتا تاہم اُس نے "میں" کے پردے میں مصنف کے ہمزاد کا ایک ایسا کردار ضرور پیش کر دیا ہے۔ جو مزاحیہ کردار سے قریبی مماثلت رکھتا ہے۔ اسے ہم ایک مکمل مزاحیہ کردار تو نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں کچھ ایسی ناہمواریاں ضرور ہیں۔ جو مزاحیہ صورتِ واقعہ کو تحریک دیتی چلی جاتی ہیں۔ بالعموم ایک بھرپور مزاحیہ کردار اس قدر جاندار ہوتا ہے۔ کہ اس کی دلچسپ ناہمواریوں کے بیان میں صورتِ واقعہ کی مضحک کیفیات دب کر رہ جاتی ہیں۔ یا کم سے کم ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں لیکن پطرس کے ہاں مزاحیہ کردار ابھرا ہوا نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف مزاحیہ صورتِ واقعہ ہی پطرس کی مزاح نگاری کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی"، "میں ایک میاں ہوں" "مرید پور کا پیر" "مرحوم کی یاد میں" اور دوسرے بیشتر مضامین میں مصنف کے ہمزاد کی ناہمواریاں دراصل صورتِ واقعہ کی مضحک کیفیات کو ابھارنے میں ایک حربے کا کام دیتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

پطرس، اردو نثر میں خالص مزاح کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم کے بعد اُس نے دو تین مضامین ایسے بھی لکھے جن میں مزاح کی بجائے طنز کے عناصر موجود تھے۔ تاہم دراصل پطرس نے خالص مزاح کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ہی نام پیدا کیا ہے بعض اہلِ نظر

نے پطرس کے خالص مزاحیہ مضامین میں طنز کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ دراصل چونکہ اردو نثر میں زیادہ فروغ طنز کو حاصل ہوا ہے۔ اس لئے یہ ایک رسم سی بن گئی ہے۔ کہ کسی ادیب کی ظرافت کا تجزیہ کرتے وقت اُس کی طنزیہ صلاحیتوں کا ذکر بھی ضرور ہو۔ پطرس کے ہاں طنز کے عناصر کا تذکرہ اس وجہ سے بھی عام ہے کہ ہمارے یہاں اہلِ نظر نے طنز اور مزاح کے فرق کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا۔ طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے۔ طنز نگار جس چیز پہ ہنستا ہے، اس سے نفرت کرتا اور اسے تبدیل کر دینے کا خواہاں ہوتا ہے اس کے برعکس مزاح، زندگی اور ماحول سے اُنس اور مفاہمت کی پیداوار ہے۔ مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے۔ اس سے محبت کرتا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ طنز نگار توڑتا ہے۔ اور توڑنے کے دوران میں ایک فاتحانہ قہقہہ لگاتا ہے۔ چنانچہ طنز میں جذبۂ افتخار کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ دوسری طرف مزاح نگار اپنی ہنسی سے ٹوٹتے ہوئے تار کو جوڑتا ہے۔ اور بڑے پیار سے ناہمواریوں کو تھپکنے لگتا ہے چنانچہ مزاح میں غالب عنصر ہمدردی کا ہوتا ہے۔ طنز اور مزاح کے اس فرق کو پوری طرح گرفت میں لینے کے لئے راقم الحروف نے ایک ضرب المثل مرتب کی ہے۔ جو اگرچہ اپنی کرختگی اور ناپختگی کے باعث تفریحِ طبع کا سامان بھی بہم پہنچا سکتی ہے تاہم جس سے طنز اور مزاح کا فرق پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ ضرب المثل ہے ——

"قبل از طعام طنز، بعد از طعام مزاح" تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب معدہ خالی ہو اور بھوک اپنے پورے جوبن پر ہو تو انسانی مزاج میں برہمی اور چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے جیاتین کی عارضی کمی ماحول کی طرف اس کے سارے ردِ عمل کو متاثر کرتی ہے اور وہ عام طور سے بدمزاجی، تخریب اور چڑچڑے پن کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسے میں اُس کی ہنسی میں بھی نشتریت، تخریب اور نفرت کے عناصر کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر طنز اور زہر خند کو تحریک ملتی ہے۔ دوسری طرف کھانے کے بعد انسانی ردِ عمل ایک نیا روپ اختیار کرتا ہے۔ سیرابی کے احساس کے ساتھ ساتھ ماحول سے یگانگت بڑھ جاتی ہے اور ساری زندگی کانٹوں کی بجائے پھولوں کی ایک سیج دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں اگر ہنسی کو تحریک ملے تو اس میں مفاہمت، اُنس اور ہمدردی کے عناصر ابھر آتے ہیں۔ شاید اسی لئے دعوت کے بعد ہلکے پھلکے لطائف کا رواج عام ہے —— اسی نکتے کو اگر پھیلائیں تو یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جب معاشرہ بھوکا ہو تو اس میں طنز کو فروغ ملتا ہے۔ اور تخریب، نشتریت اور برہمی کے عناصر ابھر آتے ہیں۔ دوسری طرف فارغ البالی کے دور میں ماحول سے یگانگت اور انس بڑھ جاتا ہے اور اسی لئے خالص مزاح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے انگریزی ادب میں خالص مزاح کا فروغ اور جدید اردو ادب میں طنز کا رواج اس نکتے کی روشنی میں واضح ہوتا ہے۔ اردو ادب میں طنز کے اس دور میں پطرس کی حیثیت محض ایک "نخلستان" کی سی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی طنز اور مزاح کا فرق، طنز نگار اور مزاح نگار کے ردِ عمل کی نوعیت ہی سے واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ ماحول اور زندگی کی طرف طنز نگار کا ردِ عمل قدرے درشت، تخریب آمیز اور احساسِ برتری کا حامل ہوگا۔ لیکن مزاح نگار کا ردِ عمل اُنس، ہمدردی اور مفاہمت کا غماز ہوگا۔ اس فرق کو ملحوظ رکھیں تو ہمیں تو پطرس کے ہاں طنز کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ مثلاً پطرس کے مضمون "کتے" کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشاعرے کو کتوں کے ہنگامے سے تشبیہ دے کر پطرس نے مشاعرے پر طنز کی ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ اول تو پطرس کا سارا لہجہ ہی ہمدردی اور توازن سے مملو ہے دوسرے اس میں نشتریت کا عنصر ناپید ہے تیسرے طنز کا طرۂ امتیاز کہ طنز نگار خود کو اُس ناہمواری سے بلند و بالا تصوّر کرتا ہے جسے وہ نشانۂ طنز بناتا ہے اس تشبیہ میں موجود نہیں۔ پطرس کا یہ کہنا کہ "ہم نے کھڑکی میں سے کئی بار آرڈر! آرڈر! پکارا لیکن ایسے موقعوں پر کوئی دھیان کی بھی کوئی نہیں سنتا" اس بات پر دال ہے کہ مصنف نے اس موازنے کے دامن میں اپنی ذات کو شامل کر کے نشتریت کے کناروں کو پوری طرح کند کر دیا ہے اور اس کا یہ "موازنہ" طنز کی بجائے مزاحیہ تقابل (COMIC COMPARISON) کا نمونہ بن گیا ہے —— یہی حال پطرس کے دوسرے مضامین کا ہے چونکہ زندگی اور ماحول کی طرف مصنف کا سارا رجحان انس اور محبت کا رجحان ہے، اس لئے اس نے اپنی ظرافت کو بھی مسرت اور حظ میں اضافے کے لئے استعمال کیا ہے، تخریب یا اصلاح کے لئے استعمال نہیں کیا۔

خاتمے سے قبل اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ پطرس کی مزاح نگاری اس کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ جدید نفسیاتی تحقیقات کے مطابق ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس سے ہنسنے والے کے کردار پر سب سے زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ یہ بات کہ ہنسنے والا کن باتوں پر ہنستا ہے۔ اور کس انداز سے ہنستا ہے اس کے کردار کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ پطرس کے مضامین کا مطالعہ کریں تو ان کے مصنف کا کردار کسی "ناصح" برہم' روتے بسورتے انسان کا کردار نظر نہیں آتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی چند لمحوں کے لئے ایک صحت مند با مذاق اور ہمدرد انسان کی صحبت میں بیٹھا رہا ہو۔ اس کے علاوہ زندگی اور ماحول کی طرف پطرس کا مخصوص ردعمل' ناظر کے کردار میں بھی وزن' ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے ۔۔ وہ یوں کہ پطرس ایک گہری نظر سے انسانی کردار کی اُن ناہمواریوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے جو انسان کی عظمت کا باعث ہیں نہ کہ ایسی ناہمواریوں کو جو انسانی کردار کے لئے ایک بدنما دھبّہ ہیں نتیجۃً ناظر کے ردِعمل میں بھی ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ بھی ناہمواریوں کو "خندۂ استہزا" میں اڑانے کی بجائے ان سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ اس سے خود ناظر کے کردار میں بلندی' وزن اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں پطرس کا ردِعمل ایک صحت مند انسان کا ردِعمل ہے۔ وہ ایک کشادہ دلی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اور جہاں سے گزرتا ہے مسرت اور شادمانی کی مٹھیاں بھر بھر کے بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ اسی میں پطرس کی جیت ہے اور یہی بات پطرس کو مزاح نگاروں کی صفِ اول میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

"بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہر بات میں انہوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے۔ جیسے صحرا کو مسکرا کر گلستان بنا دیا ہو۔۔ بخاری کی ظرافت عام طور پر منفرد ہوتی ہے ـــــ بخاری ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں اس سے ہر مشکل حل اور ہر مقصد حاصل کر لیتے ہیں ان کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے۔

آیا تھا جبوں کی تدبیر میں گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صبا نے چمن میں

رشید احمد صدیقی ۔

("نقوش" پطرس نمبر)

پروفیسر سجّاد حارث

ایک تمثیل نگار

اُردو زبان میں فنِ تمثیل نگاری کی تاریخ انتہائی مختصر ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک صدی تک پھیلایا جاسکتا ہے اس کے برعکس روم، یونان، انگلستان، فرانس یا جرمنی وغیرہ ممالک سینکڑوں بلکہ اکثر حالتوں میں ہزاروں برس تک فنِ تمثیل نگاری کے اہم مراکز اور گہوارے رہے ہیں۔ ان ملکوں میں وقتاً فوقتاً ایسے نامور ڈرامہ نگار پیدا ہوئے ہیں جن کے ڈرامے صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی نوعِ انسان کو دعوتِ فکر دیتے ہیں، ذہنی مسرت وطمانیت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اور ایک عام قاری اور ناظر کی دلچسپی کو بدستور برقرار رکھتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان میں ابھی تک اس پایہ کا ڈرامہ نگار نہیں پیدا ہو سکا جو دنیا کے بہترین اور صفِ اوّل کے ڈرامہ نگاروں میں امتیازی مقام حاصل کرسکے اور جسے جہانِ تمثیل کا مایہ ناز سپوت قرار دیا جاسکے لیکن اس کم مائیگی کا ہمارے پاس انتہائی معقول تاریخی جواز موجود ہے اس ضمن میں کم مائیگی کو بلا شبہ تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن یہ کم مائیگی بے مائیگی کے مترادف ہرگز نہیں کہی جاسکتی، موجودہ دور میں تو اردو زبان کے بعض ایکانکی ڈرامے یورپ کے بہترین ایکانکی ڈراموں کے مقابل بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ جن لوگوں نے قابلِ ذکر موضوع نیز تکنیک کے لحاظ سے بہترین طبع زاد ایکانکی ڈرامے لکھے ہیں، ان میں سعادت حسن منٹو، میرزا ادیب، راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جاسکتے ہیں۔ غور کیجئے کہ "اندر سبھا" کی تمثیل جسے اردو ڈرامے کا سنگِ بنیاد کہا جاتا ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے چند برس پیشتر ہی معرضِ تحریر میں آئی تھی۔ اس تمثیل کو اردو ڈرامہ نگاری کا نقطۂ آغاز کہا جاتا ہے، اردو کے اس پہلے ڈرامے اور موجودہ عہد کے کسی ڈرامے کے مابین لگ بھگ ایک صدی ہی کا وقفہ ہے لیکن ان ملکوں کو دیکھتے ہوئے جو صدیوں سے ڈرامے کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ یہ ایک صدی کا وقفہ انتہائی مختصر اور بے معنی وقت نظر آتا ہے اس حقیقت کے باوجود اردو زبان میں فنِ تمثیل نگاری نے جو ترقی کی ہے، وہ خواہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو لیکن خوش آئند اور امید افزا ضرور ہے اردو زبان کے کسی ڈرامہ نگار پر قلم اٹھاتے وقت ہم کو محض ایک صدی کے اس مختصر وقفہ کو (جس میں فنِ تمثیل نگاری کی محدود روایات کی بناپر اس فن کا ارتقاء بھی محدود نظر آتا ہے) ہی مدِّنظر نہیں رکھنا ہوگا۔ بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اس ملک کے ان مخصوص سیاسی، سماجی اور مجلسی حالات نیز فنونِ لطیفہ کی ترقی و دلچسپی اور ان قومی رجحانات پر بھی غور کرنا ہوگا جنھوں نے اس فن کے آغاز اور ارتقاء پر دوررس اثرات مرتب کئے ہیں

ڈرامہ نگاری کا مسئلہ شاعری، افسانہ نگاری یا ناول نگاری سے قطعی مختلف ہے۔ ڈرامہ سٹیج کی چیز ہے اور بعض اوقات بہترین ڈرامے ناظرین کی سردمہری اور ذہنی ہمدردی کے فقدان سے بُری طرح ناکام ہوتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ ڈرامے فکر و فن کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے نمونے ہوتے ہیں۔ انہیں سٹیج کی فنی اور دیگر لوازم کا پورا پورا دھیان رکھتے ہوئے پیش کیا جاتا ہے۔ اداکار بھی اپنے پارٹ خاصی محنت سے کرتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ناظرین کی عدم دلچسپی ڈرامے کی ناکامی کا موجب بن جاتی ہے۔ پاکستان میں اردو ڈرامہ نگاروں کے لئے قومی یا بالفاظِ دیگر عوامی تھیئٹر کا عدم وجود کم حوصلہ شکن بات نہیں ہے لاہور میں آرٹ کونسل، راولپنڈی میں سول تھیئٹر گروپ جیسی شوقیہ تنظیموں کی مساعی متوسط طبقہ کے محض ایک محدود حلقے کی ذہنی اور تفریحی ضروریات کو پورا ضرور کرتی ہیں لیکن اس فن کے ڈانڈے جب تک اس ملک کے عوام الناس کی زندگی اور دلچسپیوں سے جا کر نہیں ملتے اردو زبان میں فنِ تمثیل

نگاری کے وسیع امکانات کا تصور محال نظر آتا ہے

میرزا ادیب کے یک بابی ڈراموں کی تخلیقی وقعت کا صحیح اندازہ فنکار کے تاریخی، معاشرتی اور روایتی حقائق کے پس منظر سے ہی کیا جا سکتا ہے دوسرے لفظوں میں میرزا ادیب کے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت ہمیں یونانی المیہ کی طرح اصول و وحدتِ ثلاثہ سے ہی کام لینا پڑے گا۔ تمثیلی تخلیق کا عمل بھی انسانی زندگی کی طرح اور نظری حادثوں کی طرح وقت، مقام اور عمل کی وحدت سے آزاد یا ماورا نہیں ہوتا جو لوگ ادبی اور فنی تنقید میں جدلی اور تاریخی مادیت کے اصولوں سے کسبِ فیض کرتے ہیں کم سے کم وہ لوگ اصولِ تنقید میں وحدتِ ثلاثہ کی آمیزش پر نہیں چونکیں گے۔ ابتدا سے لے کر آج تک ڈرامہ کے فن نے جس قدر متنوع روپ دھارے ہیں۔ ویس دیس پہنچ کر جتنے نئے نئے بھیس بدلے ہیں ان تمام تر تبدیلیوں، تنوع اور موضوع و معروضی تغیرات کو سمجھنے میں اس اصول کا ـــــ لیکن تاریخ کے سائنٹیفک مفہوم میں ـــــ اطلاق ادراکِ حقیقت کی راہ میں کافی حد تک مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

میرزا ادیب کے یک بابی ڈرامے عظیم ترین انسانی اور فکری مسائل کے موضوعات سے علاقہ نہیں رکھتے۔ یہ موجودہ عہد کے معاصر معاشرے کی زندگی اور زندہ انسانوں کی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل کی سیدھی سادی لیکن دلچسپ اور فکر انگیز تمثیلیں ہیں۔ میرزا ادیب کے ڈرامائی فن پر گفتگو کرتے وقت ہمیں یہ بات کسی مرحلے پر بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ میرزا ادیب اب تک بنیادی طور پر یک بابی ڈراموں کے خالق کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اس مخصوص تمثیلی فن کی جو حدود و قیود ہیں اگر ان حدود و قیود سے نکل کر ہم نے میرزا ادیب کے فکر و فن پر غور کرنے کی کوشش کی۔ تو شاید اس صورت میں نہ صرف یہ کہ ہم انتقادی تنگ نظری کا شکار ہو جائیں گے بلکہ یہ تنگ نظری ہمیں اس مقام پر بھی پہنچا دے گی جہاں یقیناً ہم ڈرامہ نگار کے فن اور اس کی شخصیت سے بھی پورا پورا انصاف نہیں کر سکیں گے میرزا ادیب نے انسانی زندگی کی داخلی اور خارجی سطح کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے۔ گہری انسانیت دوستی، واقفیت اور منضبط روحانیت ان کے فکر و فن کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں خارجیت داخلیت سے اور داخلیت خارجیت سے کسی طرح بھی علیحدہ نظر نہیں آتی اور ان کے ڈرامے محض مجرد تخیل کے کارنامے بن کر نہیں رہ جاتے ان ڈراموں کا معاصر زندگی اور ہمعصر انسانوں سے گہرا رشتہ ہے ان میں واضح سماجی اور فکری معنویت اور مقصدیت ہے۔ فنی پختگی بھی ان ڈراموں سے پوری طرح جھلکتی ہے ان میں انسانی اقدار کی آمیزش بھی ہے اور آویزش بھی اور بعض مقامات پر تو ان میں عظیم ترین انسانی مسائل کی جانب بلیغ اشارے بھی ہیں بشرطیکہ ان مسائل کو مابعد الطبعیاتی اور مجرد و مطلق افکار و نظریات کے دبیز اور گہرآلود شیشوں سے دیکھنے کی سعی نہ کی جائے میرزا ادیب کے یہاں زندگی کا ایک سیدھا سادا سا تصور ہے ان کے نظریات میں انیسویں اور بیسویں صدی کے متعدد یورپی ڈرامہ نگاروں کی طرح زندگی نشاط زندگی اور زندگی کے اثباتِ نشاط کے وہ فکری اور تخئیلی گورکھ دھندے نہیں ملتے جو زندگی کے اثباتی شعور میں مزید الجھنیں پیدا کر کے حیات و کائنات کو مجذوب کی بڑ اور دیوانے کا خواب بنا دیتے ہیں ان کا نظریۂ ادب اور نظریۂ حیات عام فہم ہے اس میں کوئی پیچیدگی نہیں کوئی تہ در تہ بات نہیں ان کے ڈراموں کا موضوع روزانہ زندگی کے وہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جو مجھ کو، آپ کو، عمر کو، زید کو، بکر کو ہمارے معاشرے میں رہنے والے ہر فرد کو پیش آتے رہتے ہیں ان کے ڈراموں کا ماحول اور اس ماحول میں چلتے پھرتے گفتگو کرتے ہوئے کردار اجنبی نہیں محسوس ہوتے، ان کرداروں میں اکثر اوقات ہمیں اپنی شخصیت کا عکس، اپنی عادتوں کا سراغ اور اپنی خوبیوں اور انسانی کمزوریوں کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی، اپنی گفتگو اور بول چال کی گونج بھی سنائی دے گی۔ میرزا ادیب زندگی کی اس پر اسرار سادگی کو ہی اپنے ڈراموں کا موضوع بناتے ہیں اور حقیقت کی رُو سے دیکھا جائے تو زندگی کی اس عمومیت میں ہی انسانی زندگی کی عظمت اور عظیم ترین حقائق کے اسرار و رموز پنہاں ہیں۔

میترلنک نے ایک جگہ لکھا ہے: "بنی نوع انسان کے دکھوں اور مسرتوں کا فیصلہ میز کے گرد ایک چھوٹے سے کمرے میں ہی ہوتا ہے۔ جہاں قریب ہی آگ بھی جلتی رہتی ہے۔"

میترلنک نے درحقیقت ان الفاظ میں زندگی کی اس عمومیت اور اس کی اہمیت کی جانب اشارہ کیا ہے جسے مجرد فکر و فلسفہ کے عادی دانشور درخور اعتناء نہیں سمجھتے۔ ابسن نے ایک بار خود اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ جو کچھ وہ لکھتا ہے۔ وہ حقیقی زندگی اور ذہن سے مستعار لیتا ہے، خواہ کوئی موضوع کتنا ہی دلکش اور عظیم کیوں نہ ہو۔ اگر اس کی بنیاد حقیقی زندگی میں نہیں ہے تو وہ اس موضوع پر قلم نہیں اٹھاتا۔

اب میرزا ادیب کا ڈرامہ "لہو اور قالین" ہی کو لے لیجئے۔ اس ڈرامے میں ہمعصر معاشرہ کی ان اندرونی تہوں پر سے نقاب اٹھایا گیا ہے جہاں انسانیت شرافت اور اخلاق کے نام پر درپردہ انسان کا استحصال کیا جاتا ہے جہاں ہر شے تجارتی ہے بلند ترین مقاصد بھی تجارتی اشیاء کی طرح استعمال کئے جاتے ہیں انسانی ہمدردی، دردمندی اور جذبۂ انسانیت ایک تجارتی ذہن کی اضافی اصطلاحیں ہیں تمام انسانی رشتے معاشی اور تجارتی رشتے ہیں۔ سردار تجمل حسین فنکاروں کے بے لوث و بے غرض سرپرست نہیں ہیں بلکہ وہ مفلوک الحال آرٹسٹ اختر کو مادی آسائشیں اس غرض سے مہیا کرتا ہے تاکہ وہ اس فنکار کے فن اور اپنے جذبۂ سرپرستی کے اظہار سے اپنی عزت و شہرت کا بیوپار چمکا سکے اور خود کو ایک صاحب ذوق، اور دردمند انسان ثابت کر سکے۔ ہمارے سماج میں ایسے متمول افراد کی کمی نہیں ہے جو غالب کا دیوان شیکسپیئر کے ڈرامے چغتائی کی تصویریں اور ڈاکٹر اقبال کی کتابیں محض اس نیت سے خریدتے ہیں کہ انہیں ڈرائنگ روم میں خوبصورت فرنیچر کی طرح سجایا جا سکے۔ نمود و نمائش سے زیادہ ان کی نظریں ان تصویروں اور کتابوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی تجمل حسین بھی سماج کے ان ہزاروں متمول انسانوں کی ذہنیت کا ایک ادنیٰ نمائندہ ہے اختر ملمع ساز فن کار نہیں ہے وہ ایک سچا فن کار ہے اس کا ذہن اور ضمیر محل کے اس محبس میں بھی زندہ رہتا ہے ہر سچے فنکار کی طرح اس کی نظر میں دنیا کی عظیم ترین اور پرعظمت حقیقت صرف فن کار کا فن ہے۔ مادی آسائشوں کو وہ اپنے فن کے آگے ہیچ اور بے مایہ سمجھتا ہے اور تجمل حسین سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیتا ہے: "جس اختر کو آپ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی سے نکال کر اپنے محل میں لائے تھے۔ وہ مصور اختر مر چکا ہے۔ اور جو شخص آپ کے سامنے کھڑا ہے اور جس کے لئے یہ شاندار سٹوڈیو بنا دیا گیا ہے وہ اس کی چلتی پھرتی لاش ہے۔" اختر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ انتہائی اخلاقی، نیز فنکارانہ جرأت مندی کے ساتھ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ

"گذشتہ ڈیڑھ برس میں جتنی تصویریں میرے نام کے ساتھ اس شاندار محل سے باہر گئی ہیں، ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔"

اور جب اختر اپنے اس ہم پیشہ دوست نیازی کا ذکر کرتا ہے جس نے یہ تصویریں اس شرط پر بنا کر دی تھیں کہ "تمہارے لئے میں تصویریں بناتا رہونگا تم مجھے اپنے پیسے دے دیا کرو تاکہ میں اور میرا خاندان عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہ سکیں"۔ تو یہ فقرہ آج کی اس مہاجنی تہذیب اور سماجی نظام پر گہرا طنز بن جاتا ہے جس میں بقول اختر اس کے ہزاروں ہم پیشہ بھائی دن رات غربت کی چکی میں پسے رہتے ہیں۔ ڈرامہ کے آخر میں نیازی کی خودکشی ایک گہری سماجی معنویت کی حامل ہے اور آخر تک پہنچتے پہنچتے ناظرین کے لئے اس تاریک قوت کو سمجھنا دشوار نہیں رہ جاتا۔ جس نے پہلے فنکار نیازی کی ایگو (F ۹۸) کا قتل کیا اور پھر نیازی کو موت کی خندق میں لے جا کر پھینک دیا۔

اس ڈرامہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی وساطت سے ڈرامہ نگار کا زاویہ حیات اور نظریۂ فن بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ڈرامے کے حقیقی کردار تین ہیں انسان، فن کار اور روپیہ۔ پورا ڈراما ان تین اقدار کی کشاکش کے محور پر گھومتا ہے نہ اس میں کسی قسم میلو ڈراماتی کشمکش ہے نہ مخالف مواقع پیدا کرنے کی تکنیک سے دلچسپی قائم رکھنے کی ترکیب۔ ڈرامانگار نے موجودہ نظام زندگی کے سنگین اور دلخراش حقائق کو زندہ اور حقیقی کرداروں کے روپ میں ڈھال کر متضاد قدروں کی کشاکش دکھلانے کی سعی کی ہے یہاں پر اختر محض ایک فرد نہیں ہے۔ بذات خود ایک طبقہ ہے اور ان ہزاروں ہم پیشہ

بھائیوں کا نمائندہ ہے جو اس سرمایہ دارانہ نظام زندگی میں (جس کا نمائندہ سردار تجمل حسین ہے) دن رات غربت کی چکی میں پستے رہتے ہیں، یہ ڈراما ایک خاص مفہوم میں پورے ایک طبقہ کے مسائل حیات سے اسی طرح تعلق رکھتا ہے۔ جیسے جرہاٹ ہاپٹمن کا ڈرامہ (The weavers) جو ایولیج برگ کے مفلوک الحال جولاہوں کے جذبات اور قوت عمل کا مرقع ہے۔ یہاں میرا مطلب ان دونوں ڈراموں کے موضوعات سے ہے تکنیک، دائرہ عمل اور مرکزی خیال کی اکائی سے نہیں، دونوں ڈراموں میں ہم پیشہ افراد کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ افراد مل کر (پیشہ کے لحاظ سے) ایک مخصوص برادری یا طبقہ کی تشکیل کرتے ہیں جس طرح ہاپٹمن کے ڈرامے کے آخر میں (Hilse) کی موت دکھائی گئی ہے، بعینہ لہو اور قالین سے نیازی کی خودکشی کی خبر ملتی ہے۔ دونوں ڈراموں میں موت کے ان واقعات کے علاوہ نہ پلاٹ کی پیچیدگیاں ہیں نہ ہی میلوڈرامائی کیفیت اور کشمکش، غربت کا ماحول اور اس کا پیدا کردہ جذباتی تلاطم دونوں ڈراموں کا مشترک عنصر ہے اور وحدتِ تاثر کے لحاظ سے دونوں ڈرامے اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

ایک ڈرامے میں اگر مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہوئے دو افراد اختر اور تجمل حسین آپس میں متصادم ہوتے ہیں تو دوسرے ڈرامہ میں ایک پورا طبقہ علم بغاوت بلند کرکے میدان عمل میں کود پڑتا ہے۔ اختر، نیازی اور میرزا ادیب کے ایک دوسرے ڈرامہ "فنکار" کا مصور سرفراز مفلوک الحال فنکاروں کے اس طبقہ کی ہی نمائندگی کرتے ہیں۔ "فنکار" میں اس طبقہ کے گھریلو زندگی اور روزانہ زندگی کے مسائل کا بے کم و کاست نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ سرفراز اور اس کی بیوی عصمت کے مابین گہرا خلوص، احساس رفاقت اور محبت ہے لیکن معاشی بدحالی اکثر و بیشتر ان کے پرخلوص ازدواجی رشتہ میں تلخی، جھلاہٹ اور بیزاری پیدا کر دیتی ہے۔ روپیہ انسانی تعلقات پر کیونکر اثر انداز ہوتا ہے یہ حقیقت اس ڈرامے میں انتہائی واضح خطوط میں لیکن بہت سلیقہ اور چابک دستی کے ساتھ پیش کی گئی ہے، روپیہ ملنے سے پیشتر عصمت کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، معدہ خراب تھا، اور کھانسی بھی شدید تھی لیکن روپیہ ملتے ہی وہ چاق و چوبند نظر آنے لگتی ہے اور اس کے چہرے پر چمک بھی آ جاتی ہے، شوہر کی جانب اس کے رویے میں بھی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دونوں شوہر بیوی مل کر روپیہ کو خرچ کرنے کا پروگرام بناتے ہیں، اس وقت انکی معاشی زندگی کی ناہمواریاں، محرومیاں اور ساتھ ہی انکی آرزوؤں کے خلاء صاف نظر آنے لگتے ہیں جب یہ سادہ لوح فن کار اپنے فن کے احساس کے تقاضوں کے تحت خفیہ پولیس کے آدمیوں کو ساری حقیقت بے کم و کاست بتلا کر یہ مفت کی رقم لوٹا دیتا ہے۔ تو گھر دوبارہ جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

میرزا ادیب کے ڈراموں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی عصری زندگی کی عمومیت ہے وہ اپنے کردار عیش پرست، جنگجو، خود غرض شہنشاہوں میں سے نہیں چنتے، ان کے ڈراموں میں عاشق مزاج اور تند خو شہزادے اور پائیں باغ میں عاشقوں کی منتظر شہزادیاں بھی نظر نہیں آتیں۔ نہ ہی ان میں تخت و تاج کے لئے سازشوں کے جال بچھائے جاتے ہیں، نہ ہی زہر بھرے جام فریب دے کر پلائے جاتے ہیں۔ نہ ہی کسی کا اغوا ہوتا ہے نہ ہی زنا بالجبر کا کوئی واقعہ۔ انکے ڈراموں کے کردار بالعموم معمولی انسان ہوتے ہیں اور واقعات کی ترتیب بھی روزانہ زندگی کے معمولی حادثات سے ہی کی جاتی ہے۔ کرداروں کی گفتگو بھی روزمرہ کی عام فہم زبان میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرزا ادیب کے ڈرامے اصلی اور حقیقی زندگی کے عکاس ہوتے ہیں جو ہمارے دل و دماغ پر بڑے خوشگوار طریقہ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

میرزا ادیب دراصل اپنے زمانے کے مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے فن کار کی تحریروں میں روح عصر کی کارفرمائی رہی ہے۔ والٹیر کی مثال لیجئے اس نے بھی اپنے زمانے کی مذہبی عصبیت، تنگ نظری، توہم پرستی کے خلاف لکھا ہے۔ یہ مسائل اس کے زمانے میں زندہ اور توجہ طلب تھے۔ وکٹر ہیوگو کا قول ہے "والٹیر کا نام لینا گویا اٹھارھویں صدی کی خصوصیات بیان کرنا ہے" اٹلی کی تحریک احیائے علوم، جرمنی کی تحریک اصلاح اور فرانس میں والٹیر اور مولیئر —— یہ قوتیں دراصل معاشرہ کی بگڑی ہوئی شکلوں کو خوبصورت بنانا چاہتی تھیں۔ اس نوع کی تمام تحریکات اور والٹیر جیسے افراد کی نگارشات میں عصری الجھنوں اور مسائل کی پوری پوری عکاسی ملتی ہے۔ بالزک کی کتاب (Comeaie Humaine.) میں تو فرانسیسی معاشرہ کی اس قدر سچی تصویر کشی کی گئی ہے کہ

یہ مفکرین اور مؤرخین کے لئے ایک اہم تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔ کارل مارکس نے تو بالزک کی نگارشات کے بارے میں ایک جگہ یہاں تک لکھا ہے کہ اس نے بالزک کے عہد کے فرانسیسی معاشرہ کو جتنا بالزک کی تحریروں سے سمجھا ہے بڑے سے بڑے مؤرخ، ماہرِ معاشیات وشماریات کی کتابیں بھی وہ تاریخی اور معاشی مواد مہیا نہیں کرسکتیں۔ بعینہٖ گوئٹے نے "فاؤسٹ" میں (پارٹ اوّل، پہلا ایکٹ، چوتھا سین) اور ولیم شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے (Timon of Athens.) میں اپنے زمانہ کی "سیاہ قوت" یعنی "قوتِ زر" کو انسانی رشتوں اور انسانی معاشرہ کی مختلف النوع اکائیوں اور بنیادوں پر جس انداز سے اثر انداز ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ یہ مسائل ہمارے لئے آج بھی اتنے ہی فکر انگیز اور توجہ طلب ہیں۔ یوریپیڈیز نے لگ بھگ بچھتر ڈرامے لکھے ہیں۔ جن میں صرف اٹھارہ محفوظ ہیں۔ یہ ڈرامے پڑھ کر ہزاروں برس پیشتر کے یونانی معاشرہ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان ڈراموں کے کردار دیوتاؤں اور سماج کے بے پناہ مظالم کے شکار دکھائی دیتے ہیں۔ یوریپیڈیز کی طرح اسکائی لس اور سفاکلیز بھی اپنے زمانے کے مروج فکر و فلسفہ اور انسانی اقدار کو اپنے ڈراموں کی بنیاد بناتے ہیں۔ ان ڈراموں میں دیوتاؤں کی پُراسرار قوت، انسان پر مظالم توڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہر ڈرامہ قضا و قدر کی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا نظر آتا ہے۔

جرمنی کے معروفِ زمانہ ڈرامہ نگار شلر نے بھی سوسائٹی کی مروجہ اقدار اور شیطنت کے خلاف مقدس جہاد کیا ہے جیسے وہ اپنے ڈرامہ "قزاق" میں بقول ایک نقاد کے "مجرم سوسائٹی کے مقابلہ میں افراد کے اضطراری جرائم کو جائز قرار دینے کی کوشش کرتا ہے"۔ میرزا ادیب کا ڈرامہ "سحر سے پہلے" پڑھئے اس ڈرامہ کا بنیادی موضوع بھی شلر کے ڈرامہ "قزاق" کا ہی بنیادی موضوع ہے۔ شلر کی طرح ہنرک ابسن بھی سماج کی پر فریب اور جھوٹی اقدار کا دشمن ہے وہ چاہتا ہے کہ دنیا کا ہر فرد فنی مسائل کی اہمیت اور نزاکت سے پوری طرح باخبر ہو جائے۔ وہ اس سماجی نظام کو درہم برہم کرنے کے درپے ہے جس کے مظالم ہم پست ہمتی کی وجہ سے قرن ہا قرن سے خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے چلے آرہے ہیں۔ بیسویں صدی کے ممتاز ترین ڈرامہ نگاروں میں بیشتر تعداد ان کی ہے جو ابسن کے پیرو ہیں، انگلستان میں برنارڈ شا، گالزوردی اور سمرسٹ ماہم جرمنی میں جرہارٹ ہاپ مین، آسٹریا میں شنلر، اطالیہ میں پیرانڈیلو۔ امریکہ میں یوجین اونیل اور بلجیم میں میٹرلنک وغیرہ ابسن کے مقلد ہیں، بلکہ جدید دور کے ڈرامہ نگار تو فنی مسائل کے بیان کرنے میں ابسن سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔ میرزا ادیب کے ڈراموں میں بھی عصری الجھنیں اور اس ملک و معاشرہ کے مخصوص مسائل کی دلکش تصویریں اور جذباتی تعبیریں ہیں جنہیں ایک مخصوص تعمیری اور اصلاحی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمام ڈرامے ڈرامہ نگار کے ایک مخصوص نظریہ حیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اگرچہ میرزا ادیب نے تمثیلی فن میں اپنی کوششوں کو محض یک بابی ڈراموں تک ہی محدود کر رکھا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان ڈراموں میں زندگی ایک وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی نہیں ملتی۔ ہر ڈرامہ زندگی کا محض ایک گوشہ یا ایک زاویہ ہی پیش کرتا ہے لیکن یہ گوشہ یا زاویہ ہماری زندگی یا معاشرہ کا اہم ترین پہلو کا حامل ضرور ہوتا ہے۔ ہر بڑے اور سچے فنکار کی قوتِ احساس معاشرہ کے عام آدمیوں کی قوتِ احساس سے زیادہ تیز اور شدید ہوتی ہے اور اندازِ فکر زیادہ دور رس اور بالغ ہوتا ہے اس لئے ایک فن کار کی نظریں زندگی کے ان دور دراز گوشوں تک بہ آسانی پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں ایک عام آدمی کے ذہن یا نگاہ کا پہنچنا بھی محال ہوتا ہے بالخصوص ڈرامہ نگار کا فن زندگی اور انسانی رشتوں سے بہت گہرے مطالعہ اور مشاہدہ کا متقاضی ہوتا ہے۔ میرزا ادیب ایک سچے فنکار کی طرح زندگی کا بڑا گہرا اور پرخلوص مشاہدہ و مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ انسانی اذیتوں کے اسباب و علل معلوم کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور پھر اپنے مشاہدات کو حیرت انگیز توازن و اعتدال کے ساتھ ڈرامائی پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈرامے نہ تو پر جوش خطابت اور صحافت کے نمونے ہیں۔ نہ ہی تجریدی آرٹ کے تمثیلی مرقع ہیں۔ نہ ہی مابعد الطبعاتی گورکھ دھندوں کے زائچے ہیں۔ بلکہ ہر ڈرامہ زندگی کی انتہائی سچی اور پرخلوص تصویر ہے۔ یہ تمام ڈرامے ان کی گہری انسانی دردمندی، جذبۂ انسانیت اور ایک واضح نظریہ حیات کے پروردہ اور پیدا کردہ ہیں۔ ان کا ڈرامہ "بیگار" ہی پڑھئے۔ اس ڈرامے میں انسانی نفسیاتی اور معاشی مسائل ایک دوسرے میں اس طرح پیوست نظر آتے ہیں کہ ان کو الگ الگ کر کے نہیں سوچا جا سکتا۔ یہاں ہر انسانی مسئلہ ایک معاشی مسئلہ ہے اور ہر معاشی مسئلہ ایک

نفسیاتی مسئلہ بھی ہے یہاں انسانی نفسیات اور انسانی جذبات کے معاشی اور مادی حقائق سے گہرے رشتے اور روابط قائم نظر آتے ہیں زندگی کی حقیقی تصویر کا مطالعہ دراصل اس طریقۂ کار سے ہی ممکن ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں زندگی کی تصویر سطحی، ادھوری اور فریب کن بن جاتی ہے۔ میرزا ادیب ایک کردار کو محض انسان کی تجریدی شکل میں ہمارے سامنے پیش نہیں کرتے بلکہ اس انسان کی سماجی حیثیت، معاشی حالت اور تہذیبی پستی و بلندی کے خد و خال واضح خطوط میں ابھار کر اصل موضوع کی جانب اشارہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں ہر طبقہ کا فرد ملتا ہے۔ ہر طبقہ کے اپنے مخصوص ذہنی، جذباتی، نفسیاتی اور معاشی مسائل ہیں، اپنا منفرد انداز فکر ہے اور ڈرامہ نگار ان تمام متنازعہ فیہ مسائل اور الجھنوں کو ایک خاص انداز سے اپنے مخصوص نظریۂ حیات کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے" نند کمار اور مادرِ قوم" جیسے ڈرامے جن کا بظاہر معاصر زندگی اور معاشرہ سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ آپ تاریخی ڈرامے کہہ سکتے ہیں، لیکن ان ڈراموں میں بھی ڈرامہ نگار کے نظریۂ حیات کی کارفرمائی موجود ہے واقعات کو ڈراموں میں ایک خاص نہج اور ایک خاص زاویہ سے پیش کیا گیا ہے ماضی کے واقعات سے حال کی تعبیر کی گئی ہے۔

(Hoppla ; such is life) کے مصنف مشہور ڈرامہ نگار آرنسٹ ٹالر (Ernest toller.) نے اپنے ڈراموں کے مجموعے "سات کھیل" کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"یہ تمام سماجی ڈرامے اور المئے انسانی اذیتوں اور ان اذیتوں کو ختم کر دینے کی بہترین لیکن فضول کوششوں کے مظہر ہیں صرف وہ انسانی اذیتیں ختم کی جا سکتی ہیں جن کو غیر ضروری کہا جا سکتا ہے یعنی وہ اذیتیں جن کو انسان کی نامعقولیت جنم دیتی ہے اور جو ایک نامناسب سماجی نظام کی پیدا کردہ ہوتی ہیں اگر یہ غیر ضروری اذیتیں ختم بھی کر دی جائیں پھر بھی انسان کے لئے چند ضروری اور ناگزیر اذیتیں باقی رہ جاتی ہیں اور یہ اذیتیں بنی نوع انسان کے لیے زندگی اور موت کے مسائل کی اذیتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہی دراصل زندگی اور فن کا المیہ و المناک عنصر ہے۔"

میرزا ادیب خصوصیت کے ساتھ ٹالر کی بیان کردہ اول الذکر انسانی اذیتوں کے ترجمان ڈرامہ نگار ہیں یعنی ان کے بیشتر ڈراموں میں ان اذیتوں کے اسباب و علل کی تلاش کی گئی ہے۔ جن کو انسان کی نامعقولیت جنم دیتی ہے اور جو ایک نامناسب سماجی اور معاشی نظام کی پیدا کردہ اور پروردہ ہوتی ہیں اگرچہ اُن کے یہاں ایسے ڈرامے بھی موجود ہیں جن میں گہرا نفسیاتی ادراک ہے اور جن میں انسانی فطرت کی کشمکش اور انسانی جذبات کی حیرت انگیز گہرائیاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا ڈرامہ "سمندر کا دل" لے لیجئے اس ڈرامے کا پورا فلسفہ مندرجہ ذیل کے مکالمے میں مضمر ہے۔

ایلی: سوچ رہی ہوں کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے کیسے کیسے سہارے مل جاتے ہیں ایک سہارا ٹوٹ جاتا ہے تو دوسرا سہارا مل جاتا ہے بیٹا نہ سہی پوتا ہی سہی پر صدمہ تو سہنا ہی پڑتا ہے۔

حسناں: رکھو! ماں کا دل تو ایک سمندر ہوتا ہے ایک اتھاہ سمندر جس میں دکھوں اور غموں کے ہزاروں پہاڑ چپ چاپ سما جاتے ہیں دیکھنے والوں کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس سمندر کی تہہ میں کیا کچھ ڈوب چکا ہے ماں تو دکھ سہنے اور صبر کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہے، رکھو!

یہ ڈرامہ پڑھ کر مجھے (J.M. synge) کا ڈرامہ ——— (Riders To The sea.) یاد آ گیا سمندر اور انسان کے مابین ازلی کشمکش اور اس کشمکش میں انسان کی ناگزیر شکست اس ڈرامے کا موضوع ہے۔ اس ڈرامہ کا سب سے اہم اور ہیبت ناک کردار "سمندر ہے جو ازل سے اپنی تند و تیز موجوں میں انسان کو گرفتار کر کے پیغامِ اجل دیتا چلا آ رہا ہے اس ڈرامے کی موریا حسناں ہی کی طرح اپنے بچوں کی موت پر دلگیر اور الم زدہ ہے اس کے دل میں بھی حسناں ہی کی طرح دکھوں اور غموں کے ہزاروں پہاڑ چپ چاپ سما گئے ہیں اور میرزا ادیب کے مکالمہ کا یہ ٹکڑا کہ "دیکھنے والوں کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس سمندر کی تہہ میں کیا کچھ ڈوب چکا ہے، ماں تو دکھ سہنے اور صبر کرنے کے لئے ہی پیدا ہوتی ہے۔" سنج (synge)

کے ڈرامہ میں حقائق کی رُو سے موریا پر حیرت انگیز طور پر صادق آ سکتا ہے۔ جب موریا کا آخری بیٹا بھی سمندر کی تہ میں ابدی نیند سو جاتا ہے تو اس سانحہ کے بعد اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ماؤں کے ان گہرے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جو بلاتخصیص مذہب و ملت ہر ماں کے سینے میں موجزن رہتے ہیں جنہاں کے دل میں بھی، مہراں کے سینہ میں بھی اور جیراں کے دل کی گہرائیوں میں بھی اور یہ حقیقت کہ "صدمہ تو سہنا ہی پڑتا ہے" موریا بھی اپنی زندگی میں موت کی اس تلخ حقیقت کو اتنی ہی اچھی طرح جانتی ہے جتنی کہ رکھی یا حسناں اسی لئے موریا آخر میں یہی کہتی ہے کہ کوئی انسان دنیا میں ہمیشہ زندہ نہیں رہتا ہمیں صبر کرنا ہی چاہیے۔ میرزا ادیب اپنے اس ڈرامے میں جذبہ ماتا سے بھی زیادہ سروکار رکھتے ہیں۔ موت کی ستم آرائیوں کا تذکرہ کر کے کلبیتؔ یا یاسی نہ رمیت خوردگی سکے کسی لایعنی فلسفہ کی ایجاد نہیں کرتے قضا و قدر کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالنے کی سعی نہیں کرتے انسان کا سائنسی علم فطرت سے نبرد آزما ہے وہ جلد یا بدیر فلسفہ موت کے مسئلہ لاینحل کی گتھیاں سلجھالے گا۔ ڈرامہ نگار کا کام سائنس دان کی ذہنی الجھن نہیں ہوتی اس کا کام انسانی جذبات و محسوسات کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی اور انسانی رشتوں کی ناہموار یاں بیان کرنا ہے۔ ان خارجی حقائق پر سے نقاب اٹھانا ہے جن کی موجودگی انسانی رشتوں میں گرہ ڈالتی ہے انسانی نفسیات کے ان دور دراز گوشوں کا پتہ چلانا ہے جن کا ادراک اور شعوری احساس انسانی زندگی کے المیہ کو ختم کرنے کا ایک دن موجب بن سکتا ہے۔

ابسن اپنی تمام تر حقیقت نگاری کے باوجود جب فکر و فلسفہ کی سرحدوں میں داخل ہوتا ہے تو حقیقت اور حقیقی دنیا کے راستہ سے بھٹک کر خلا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس حقیقت کا شعور مجرد فکر کے تضادات کا اس بری طرح شکار ہو جاتا ہے جہاں BJORNSON کے الفاظ میں یہ کہنا پڑ جاتا ہے کہ "ابسن انسان نہیں محض ایک قلم کا نام ہے۔"

MAIA - IRENL - RUBEK اور Ulfheim انسانی کردار نظر نہیں آتے محض ایک شاعرانہ وژن کے اشارے معلوم ہونے لگتے ہیں محض ایک علامتی مخلوق جس کا وجود انسانی شعور اور تخییل میں تو ڈھونڈا جا سکتا ہے حقیقی دنیا میں ان کی تلاش بے سود ہو گی ابسن کی شہرت بالعموم دو ڈراموں کی وجہ سے ہے ایک "گڑیا کا گھر" اور دوسرا "بھوت" پہلا ڈرامہ جو اس قدر معجزاتی دکھائی دیتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں حقیقی صورت حال میں حقیقی کردار نظر آتے ہیں اس کے برعکس برانڈ میں انسان اور انسانیت کو ایک تجریدی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ (PEERGYNT) محض ایک رومانی فنطاسیا (PHANTASY.) ہے۔ ابسن خود بھی اسے واہمہ (CAPRICE) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے برعکس میرزا ادیب کے ڈرامہ "قندیل" کے کردار شالی آغا پر غور کیجئے۔ شالی آغا بھی ایک واہمہ کا شکار ہے یہاں بھی ایک آئیڈیل کی تلاش ہے اگرچہ اس آئیڈیل میں سارے جہاں کا درد شامل نہیں ہے محض ایک فرد کی ذاتی زندگی اور آرزوؤں کا سوال ہے لیکن شالی آغا شروع سے اخیر تک ایک گوشت پوست کی مخلوق ہی نظر آتا ہے۔ اس کی کمزوریاں انسانی کمزوریاں ہیں اس کا آئیڈیل ایک حقیقی اور انسانی آئیڈیل ہے۔ شالی آغا کسی جگہ بھی زندگی سے الگ تھلگ نظر نہیں آتا لیکن حقیقت نگار ابسن کے ڈرامہ "برانڈ" میں انگریزی زبان کے ایک نقاد کے بقول تمام اہم کردار انسان نہیں ہیں بلکہ محض شاعرانہ تخییل کے اشارے ہیں۔ ہر کردار محض ایک انسان کے ایک رویہ (ATTITUDE) دکھائی دیتا ہے ممکن ہے ابسن نے اپنے ڈراموں میں انسانی زندگی کے اہم ترین بنیادی اور عظیم مسائل پیش کرنے کی کوشش کی ہو لیکن (EMPEROR AND GALILEAN.) میں جب جولین الیگزینڈر کے خواب دیکھتا ہے اور ہم اس کی ماورائی باتیں سنتے ہیں تو بیامحسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے ایک انسان خلاء میں پھنس کر چیخ رہا ہو۔ وہ ایک نئے "انکشاف" یا "الہام" کا منتظر ہے کیونکہ قدیم حسن اب حسن نہیں اور جدید سچائی اب سچائی نہیں وہ "حسین زمین" اور "سورج کا شہر" کا متلاشی ہے۔ ابسن کے مجرد افکار و خیالات جولین کو مزاجی تضادات کا مرکب بنا دیتے ہیں، میرزا ادیب کے یہاں آئیڈیل کی تلاش بھی ہے اور آئیڈیل کے متلاشی کردار بھی لیکن یہ خالص ارضی کردار ہیں۔ میرزا ادیب کی ڈرامہ نگاری میں مغرب کے "جدید تصوف" کی مطلق آمیزش نہیں عام فہم صورت حال میں حقیقی کرداروں کی زندگی، جدوجہد آرزوئیں آورشیں چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور خالص انسانی خواہشات کا ذکر ہے۔ دراصل یہی وہ صحت مند بنیادیں اور روایات ہیں جن پر مستقبل میں اردو زبان کے عظیم ترین ڈراموں کی بنیادیں استوار کی جائیں گی۔

مجید امجد

سایوں کا سندیس

نکھری نکھری، نتھری نتھری۔ روشنیوں کا دن:
رستے رستے پر بے برگ درختوں کے سائے،
دھوپ کے پیلے آنچل پر شرمیلے گل بوٹے
دنیا ان کو روند گئی، یہ خاکے مٹ نہ سکے!

میٹھی میٹھی ٹھنڈک، اجلا اجلا دن — اور میں
بھیگے رستوں سے یہ سائے چننے آیا ہوں
میرے من میں ہیں جو جھمیلے ان سے کیوں الجھوں
اپنی جھولی آج ان مسلے پھولوں سے بھر لوں

شیتل شیتل دھوپ میں بہتے سایوں کا یہ کھیل
اک ڈالی کی ڈولتی چھایا، لاکھ امٹ ارماں
تھر تھر کانپیں سوکھے پتے، جھم جھم جھمکیں دھیان
یہی بہت ہے پت جھڑ کی اس سہمی رت کا دان

حمایت علی شاعر

رات

اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے سرمایۂ ہوش
رات اک چور کی مانند گزرتی ہے خموش

اتنا گہرا ہے اندھیرا کہ جدھر آنکھ اُٹھے
اپنی ہی کور نگاہی کا گماں ہوتا ہے
دور و نزدیک مسلط ہے وہ پُرہول سکوت
جو کسی قبرِ شکستہ میں نہاں ہوتا ہے

آسماں کوئی مجاور ہے کہ بیٹھا ہے خموش
کوئی اندیشۂ فردا ہے نہ فکرِ غمِ دوش

کوئی بجلی، کوئی تارا، کوئی جگنو، کوئی شمع
کوئی ایسا نہیں جو نور کا عنواں بن جائے
کوئی خورشید بھی اس شب کے تعاقب میں نہیں
کون اس مقبرۂ زیست کی تقدیر جگائے

رات اک چور کی مانند گزرتی ہے خموش
اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے سرمایۂ ہوش

○

ادبِ حقیقت

مخدوم محی الدین

یہ احساس کی رات

(موجودہ دنیا کے حالات کے پس منظر میں جب کہ انسانیت
کی تمام اعلیٰ قدریں خطروں کی زد میں ہیں —!)

مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات
نرغے طوفانِ حوادث کے، ہوس کی یلغار
یہ دھماکے، یہ بگولے سرِ راہ
جسم کے، جان کے پیمانِ وفا کا کیا ہو؟
تیرا کیا ہوگا، مرے تارِ نفس؟
تیرا کیا ہوگا، اے مضرابِ جنوں؟
یہ دہکتے ہوئے رخسار،
مہکتے ہوئے لب،
یہ دھڑکتا ہوا دل
شفقِ زیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ
کیا ہوگا؟

اُڑ نہ جائے کہیں یہ رنگِ جبیں
مٹ نہ جائے کہیں یہ نقشِ وفا
چُپ نہ ہو جائے یہ بجتا ہوا ساز
شمعیں اب کون جلائے گا، سرِ شام گذرگاہوں میں
دہر میں لطف و عطا، کچھ بھی نہیں؟
دہر میں مہر و وفا، کچھ بھی نہیں؟
سجدہ کچھ بھی نہیں؟ نقشِ کفِ پا کچھ بھی نہیں؟
میرے دل!
اور دھڑک — اور دھڑک
شاخِ گل!
اور مہک — اور مہک — اور مہک

○

خاطر غزنوی

شہر کی رات

رات پھر آئی رقیبِ سر و ساماں بن کر
مرے لمحوں
مری نیندوں
مرے خوابوں کو کرے گی زخمی
اپنی جھولی میں اٹھائے ہوئے کنکر تارے
مجھ پہ برسائے گی ظالم سارے
چاند کی کرنوں کی چبھتی ہوئی پیہم آواز
تا سحر
مجھ کو کچوکے دے گی

صبحدم
شہر کے جاگ اٹھتے ہی
رات کی تیرہ شبی سے جو ستایا ہوا
زخموں سے نڈھال
دن کے اٹھتے ہوئے بڑھتے ہوئے ہنگاموں کی خاموشی میں
نیند آ جائے گی
سو جاؤں گا!

شاذ تمکنت

خلوت

وا کرو کاسنی گُل پوش دریچے جاناں
چاپ کرنوں کی چلی آتی ہے دھیرے دھیرے
تم بھی پردہ نہ کرو، میں بھی تکلّف نہ کروں
چاند چپ چاپ چلا آئے گا، آجانے دو
جانے کیا کہتا ہے دیکھیں تو سفیرِ شب تاب
کیسے کھِل اُٹھتے ہیں اس کے لب و عارض کے گلاب
کیا دُعا دیتا ہے اِک دولتِ یک جائی پر!

○

شاد امرتسری

تفاوت

آسماں پر کالے بادل ہیں، سڑک تاریک ہے
بادلوں کی اوڑھنی سے جھانکتا ہے زرد چاند
پاس بہتی آبِ جُو کی نرم لہروں کا خروش
جیسے کوئی خواب میں گائے کوئی پُر سوز گیت
ایسی تاریکی میں تیرے جگمگاتے سُرخ لب
میرے دِل کی دھڑکنوں کو کر رہے ہیں تیز تر!

آبِ جُو کے بہتے پانی کی نشیلی مست بُو
جیسے کھڑکی کھولتی برسات کی گیلی ہوا
جیسے گندم کے پکے خوشوں سے اٹھتی گرم باس
جی میں آتا ہے کہ میں ماچس جلا کر دیکھ لوں
تیرے چہرے پر دُکھوں کے پھیلتے سائے کہ جو
تیرے دل کی دھڑکنوں کو کر رہے ہیں تیز تر

○

جلیل حشمی

برف گری تو ——

کنول کے پھول نہیں یہ آنکھیں، کانچ چھوٹے
برف گری تو سو جائیں گے، سنّاٹے کا پتھر ٹوٹے
ریت بہے تو ریت ہے پھر بھی، جھرنا پھوٹے

جھونک آئے ہو کہاں خوشبو کو یوں لو، یوں لو
گرم ہوا کے جھونکو ٹھہرو! ٹھنڈے ٹھنڈے واپس ہو لو
دروازوں کو بھیڑو اور دریچے کھولو

پیڑ ہری دیواروں ایسے جھومے جھومے
میں چلتی گاڑی میں ہوں کیا؟ ہری دوب کے دھبّے گھومے
گجرے کی دھاری کو آنسو ہی کیوں چومے

سانپ زمیں کے دل میں نکال رہا ہے سُرنگیں
فاختہ اور چکور چلے ہیں چاند نگر میں ہوں گی جنگیں
سُنتے ہو تم چیخ رہی ہیں کھنکتی ونگیں

ہانپتے پتّے لے کر آئے دور کی خبریں
گاؤں کے باہر پیلے پیلے ٹیلے ہیں گیتوں کی قبریں
دھول میں پھر کفنائی گئیں کلیوں کی سدھریں

رُت کی چیز ہے روتی ہوئی شبنم بھی بابا
رات ہے لمبی، دل ہی تو ہے رکھتا ہے کچھ غم بھی بابا
برف گری تو سو جائیں گے ہم بھی بابا!

سید وحید اختر

ازل تا ابد

آج کی رات اک دوست سے دیر تک تیری باتیں رہیں
بزمِ جام و سبو کے ہر اک قطرۂ مے میں تیرے ہی غم کی مدارات تھی
گریۂ نیم شب میں ترا عکس تھا، شاعری میں تری ہی مناجات تھی
اُلجھے فقرے، بہکتے ہوئے لفظ، بے ربط یادوں کا سیلاب تھا
سب جہاں ہنس رہے تھے وہاں زیرِ غم سینۂ ضبط کی حد میں بے تاب تھا
نشۂ مے نے سرگوشیوں میں کہا، پی چکے، اب اُٹھو
غم غلط ہو سکا ہے نہ ہوگا کبھی، شب ڈھلی، اب چلو
سختیِ گردشِ دہر کے حادثے ہم کو معلوم ہیں
وقت کی دوریاں، فاصلوں کی حدیں حرفِ معدوم ہیں

میکدہ ذہن کا قتل، جذبات کی خود کُشی
میکدہ زرد چہروں پہ آئی ہوئی تازگی
میکدہ مسخ روحوں کی بے وجہ افسردگی
میکدہ کھوکھلے قہقہوں کے تلے حبس کی اک خلا
میکدہ بے لباس اور آوارہ معنوں سے بوجھل فضا
میکدہ بے دیا اجنبی، بے کفن زندگی کی چتا

اس فضا میں ترے غم نے آنکھوں سے بہہ کر کہا
"بزمِ جام و سبو کی ہر اک بوند میں تم نے میرے ہی غم کی مدارات کی
ہم سخن دوست سمجھے نہ سمجھے، اشاروں میں تم نے مری بات کی
اب اُٹھو، اب چلو، یہ فضا سخت مسموم ہے
یہ بہکتی ہوئی کاٹھ کی پتلیاں، ان کا ہر فعل معصوم ہے،
ان کی بے جاں ہنسی، بے سبب سعیِ عشرت بھی مغموم ہے
میکدہ وقت کی سیلِ بے انتہا میں وہ چھوٹا سا نقطہ جو معدوم ہے"!

پاس بیٹھے ہوئے لوگ ہنستے رہے، بات کرتے رہے
ایک نے دوسرے سے کہا کیا، کسی نے بھی سمجھا نہیں
جام سے جام ٹکرائے، آنکھوں سے آنکھیں ملیں
پر دلوں کے جہنم میں اک بوند تک بھی تو پہنچی نہیں
دشتِ غم میں کسی بھی نظر سے کوئی آرزو، پھول بن کر تو مہکی نہیں
کاگ اُڑتے رہے، کھنکھناتی رہی ساغروں کی ہنسی
بیخودی ہوش کی سرحدوں سے پرے گیت گاتی رہی، رقص کرتی رہی

شکلیں پہلے تو مدغم ہوئیں، امتیازات کی سرحدیں مٹ گئیں
ایک دیوار نے دوسری کو چھوا، میز سے میز ٹکرا گئی
کرسیاں چھت سے اونچی ہوئیں اور ان کے مکیں ویز تک ——
—— وہ ویز تک یوں معلق رہے۔
جیسے مرغولے اٹھتے رہیں اور آہستہ آہستہ شکل اپنی کھوتے رہیں
پھر جہاں میں تھا، کوئی نہ تھا
ہم سخن تھا کوئی اور نہ تھا رازداں
صرف تو، تیری یادیں، تری بات تھی
رف میں تھا میرے ساتھ پیکر ترا، اپنی اک اک ادا
ڈھونڈ کر دشتِ ماضی سے میرے لئے لے کے آیا ہوا
نشۂ مے نے سرگوشیوں میں کہا، اب اٹھو
یہ رفاقت کے لمحات ہی از ازل تا ابد وقت کا ماحصل
یہ رفاقت کی یادیں ہی جاودیہ ہیں
اور زمان و مکاں میں ہے جو کچھ بھی، سب جھوٹ ہے
دوریاں، فاصلے، ہجر، غم، جو بھی ہے حرفِ موہوم ہے
میکدہ وقت کے سیلِ بے انتہا میں وہ چھوٹا سا نقطہ جو معدوم ہے!

میکدہ ایک چھلکے ہوئے درد کی بے کراں روشنی
میکدہ اپنے گم گشتہ فردوس کی مختصر زندگی
میکدہ روحِ عریاں کے زخموں کے گلشن کی پائندگی
میکدہ ذہن کی تازگی اور جذبات کی خودسری
میکدہ ہوش کی بازیافت اور پروازِ عقل و خرد کی حدِ آخری
میکدہ ظلمتوں کے سمندر میں مینارۂ نور کی رہبری
میکدہ شہرِ خوابِ طلسمات میں جاگتے غم کی پیغمبری
تیری قربت کے احساس نے نشۂ مے سے ہنس کر کہا
"یہ زماں بے کراں ہی سہی، یہ مکاں بے حد و انتہا ہی سہی
تم مرے نشۂ قرب سے اب بھی سرشار ہو
از ازل تا ابد اک صداقت ہے یہ
میکدہ کچھ نہیں، زندگی کچھ نہیں، یہ زمان و مکاں کچھ نہیں،
آج تک، آج کے بعد جتنی بھی ہے زندگی
صرف میری رفاقت ہے وہ
از ازل تا ابد اک حقیقت ہے وہ!"

مصطفیٰ زیدی

کاروبار

دماغ شل ہے، دل ایک اک آرزو کا مدفن بنا ہوا ہے
اک ایسا مندر جو کب سے چمگادڑوں کا مسکن بنا ہوا ہے
نشیب میں جیسے بارشوں کا کھڑا ہوا بے کنار پانی
بغیر مقصد کی بحث، اخلاقیات کی بے اثر کہانی
سحر سے بے زار، رات سے بے نیاز، لمحات سے گریزاں
نہ فکرِ فردا، نہ حال و ماضی، نہ صبحِ خنداں، نہ شامِ گریاں

پکارتا ہے کوئی تو کہتا ہوں اس کو سن کر بھی کیا کرو گے
اُدھر گذر کر بھی کیا ملے گا، اُدھر نہ جا کر بھی کیا کرو گے
شفق نظر کا فریب ہے، تتلیوں کی رنگت میں کچھ نہیں ہے
فراق میں کیا طلسم ہوگا جب اُس کی قربت میں کچھ نہیں ہے
لہو کی گرمی ہے کم سِنی کی دلیل، اس سے نجات پاؤ
یہ نظم تکمیل پا کے بھی کیا کرے گی : دفتر کے کیس لاؤ

○

ساقی فاروقی

اس کے داغ اس کے زخم

وہ سامنے رکھے شیشۂ مے
جو لڑکا چُپ چُپ بیٹھا ہے
یاد آتی ہیں باتیں اُس کی
اک دور تھا ہم لوگوں میں تھی
اس کے فقروں کی دھوم بہت
اب رہتا ہے مغموم بہت
حیران ہیں سارے دوست اس کے
وہ ہنس مکھ لڑکا کچھ دن سے
ہر جانب تکتا رہتا ہے
اور تنہا بیٹھا رہتا ہے
بے دل، بے کل، بے چین، اداس
ہر غم کا علاج ہے اس کے پاس
مشہور تھا جس کے بارے میں
اک بے فکری باتوں میں تھی
اک سحر تھا جس کے لہجے میں

تھیں جس کی آنکھیں قوسِ قزح
پھرتا ہے کسی سائے کی طرح
وہ اُٹھ کے ڈراؤنی راتوں میں
اِن کوچوں میں، اِن گلیوں میں
دل کڑھتا ہے اس وحشت سے
میں سوچ رہا ہوں مدّت سے
جب اُس سے ملنے جاؤں گا
باتوں باتوں میں پوچھوں گا
اے اچھے لڑکے کچھ تو بتا
اُس ظالم پتھر دل کا پتا
جو آس بھرا دل توڑ گئی
اور یادوں کا رُخ موڑ گئی

○

وارث کرمانی

ندیمِ تنہائی

اے صبا! اے ندیمِ تنہائی! ایک مدت کی رازداں تو ہے
ان پریشانیوں کے عالم میں ہم غریبوں پہ مہرباں تو ہے

تیرے گیتوں کی نرم موسیقی بارہا رنج و غم میں کام آئی
بارہا آرزو کے گلشن میں تو نویدِ شگفتگی لائی

جس کی خوشبو سے عطر بیز ہے تو اس مسیحا نفس کا نام تو لے
شہرِ بلقیس کی حسیں قاصد دلِ پُر شوق کا سلام تو لے

یاد ہوگا تجھے وہ عہدِ حسیں جب بہاروں سے ہم کنار تھے ہم
وہ محبت کا گلفشاں موسم جس کے سائے میں نغمہ بار تھے ہم

وہ نگاہوں کی شرمسار ادا وہ جھکتی ہوئی ملاقاتیں
وہ تبسم کی جلوہ ریزی سے جگمگائی ہوئی حسیں راتیں

کیوں وہ پہلی سی روشنی نہ رہی، ماہ و خورشید کے خزانے میں
خوش نگاہی کے پُر فریب صنم سو گئے کس نگار خانے میں

اے صبا! اے ندیمِ تنہائی! آج جی بھر کے تجھ کو پیار کریں
نغمۂ دل سُنا سُنا کے تجھے خاطرِ یار غم گسار کریں

رضی اختر شوق

آرزو کی سپاہ

مجھے ہے فخر کہ سقراط بھی مسیحا بھی
مرے شریک ہیں اس دردِ نارسائی میں
مرے رفیق ہیں الزامِ بے گناہی میں
مجھے یہ فخر ہے حاصل کہ میں نہیں تنہا
وفا و مہر و صداقت کی اس لڑائی میں

مرے شفیق، مرے غمگسار اور بھی ہیں
جو اپنے اپنے مقدّس عظیم قدموں سے
نوازتے ہیں مجھے میرے پاس آتے ہیں
مری شکست کو دیتے ہیں حوصلہ کا لہو
مرے نحیف ارادوں کا دل بڑھاتے ہیں

انھی کا دم ہے کہ تازہ ہے آرزو کی سپاہ
انھی کا دم ہے کہ قدموں میں استواری ہے
انھی کا دم ہے کہ اک جنگِ نور و ظلمت میں
ہزار سال سے بے طبل و چوب جاری ہے

○

شہریار

مآل

ٹمٹماتے نقش، دھندلے راستے
وحشتِ تنہائی میں یادوں کا غبار
گھر میں ڈوبی چراغوں کی قطار
ڈوبتا دن، آتی شب وعدوں کی جاگ
گنگناتی ریت کی سانسوں کی تھاپ
دُور سے آتے ہوئے قدموں کی چاپ
ایک نغمہ، ایک شعلہ، ایک راگ
گہ خموشی، گہ سکوں، گہ اضطراب
رینگتے روشن جبیں سائے سراب
آنکھ پُرنم، ہونٹ گریاں، ہاتھ سرد
شورِ نالہ، سوزِ غم، طوفانِ درد
قاصدانِ عمرِ رفتہ کا خیال
کیا یہی ہے حسرتِ دل کا مآل ؟
کیا اسی صورت کٹیں گے ماہ و سال ؟

○

باقر مہدی

قیامت کے بعد

مانا کہ فکرِ نو کا لہو کم نہیں گیا
اُمید ٹوٹی، درد مِٹا، غم نہیں گیا

ٹوٹا تصورات کے شیشوں کے ساتھ دِل
دھڑکا لگا ہوا تھا مگر تھم نہیں گیا

جوشِ یقیں، چمک کے خلاؤں میں گم ہوا
رگ رگ سے زندگی کا مگر سَم نہیں گیا

اِتنا تو یاد ہے کہ مسیحا کے ساتھ ساتھ
زخمِ دل و نگاہ کا مرہم نہیں گیا

سب چھٹ گئے، کسی کا نہیں غمگسار تک
لیکن نئے خیال کا ہمدم نہیں گیا

افسانہ بن کے ساری حقیقت گذر گئی
کیوں چُپ رہیں کہ سر سے قیامت گذر گئی

احمد شمیم

المیہ

سیاہ شب
رہِ طلب
میں اک فصیل بن کے ایستادہ ہے!
فصیلِ شب کے اُس طرف
سحر کا سیلِ نور ہے!

فصیلِ شب کے اِس طرف
دیئے
جگر کا خوں لئے
چلے —— زبانِ شعلہ سے
فصیلِ شب کو چاٹنے
فصیلِ شب کو توڑ کے
دیئے، سحر کو لائیں گے

ہر ایک رہ لہو میں ڈوب جائے گی
کرن کرن ردائے تیرگی میں منہ چھپائے گی
بنامِ تیرگی سحر یہی دیئے بُجھائے گی

اصغر بٹ

نہ رادھا ناچے گی......

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

(وقت ۔ بعد دوپہر

منظر ۔ ڈرائنگ روم ۔ سامنے کی دیوار پر گھڑی دو بجا رہی ہے ۔ کمرے میں ایک صوفہ سیٹ ، دو آرام کرسیاں چھوٹی بڑی تین میزیں ہیں ۔ بائیں کونے میں ایک فرشی لیمپ ہے ۔ پچھلی دیوار کے ساتھ ایک لمبی کتابوں کی الماری ہے جو کتابوں سے ٹھسی ہوئی ہے ۔ الماری کے اوپر مٹی کے چند بت اور چند فائلیں رکھی ہیں ۔ پچھلی دیوار میں دائیں جانب کو ایک دروازہ ہے ۔ جو اندرون خانہ کھلتا ہے ۔ دائیں دیوار میں بیرونی دروازہ ہے ۔ بائیں دیوار میں ایک کھڑکی ہے ۔ کھڑکی کے قریب ایک تپائی پر ٹیلیفون رکھا ہے ۔ دونوں دروازوں اور کھڑکی پر سستے مگر خوش رنگ پردے لٹک رہے ہیں ۔ فرش پر دری ہے ۔ کمرے کی آرائش ایک درمیانے درجے کے گھرانے کا پتہ دے رہی ہے ۔

پردہ اٹھتا ہے تو ایک درمیانہ قد کے نہایت دبلے سے آدمی جو شکل و صورت سے یتیم خانے کے مینیجر لگتے ہیں ۔ ذرا میلی سی اچکن پہنے چشمہ لگائے سامنے صوفے پر بیٹھے نظر آتے ہیں ۔ کیفیت سے اعصاب زدہ معلوم ہوتے ہیں ایک ملازم لڑکا ٹرے میں انہیں شربت کا گلاس پیش کر رہا ہے ۔ اچکن والے صاحب کے زانو پر دو فائلیں رکھی ہیں)

اچکن والے صاحب :۔ (شربت کا گلاس لیتے ہوئے) تو تم نے بیگم صاحب سے کیا کہا تھا ــــــ ؟

ملازم لڑکا :۔ جی میں نے بول دیا تھا کہ ایک صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں ۔

اچکن والے :۔ تو انہیں نام نہیں بتایا ــــــ ؟

ملازم :۔ جی نام بھی بتایا تھا ۔

اچکن والے :۔ کیا نام بتایا تھا ۔ ؟

ملازم :۔ جی میں نے بولا تھا (ذرا تامل سے سوچ کر) نالائق صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں ۔

اچکن :۔ (بگڑ کر) لاحول ولا ۔ نالائق اسی لیے نام رٹوا کے بھیجا تھا ۔ "نالاں" صاحب نالاں ۔ سمجھے ــــــ ! ظاہر ہے کہ وہ کیا آئیں گی باہر اس اعلان کے بعد ۔

ملازم :۔ جی ہاں یہی بولا تھا ۔

نالاں :۔ کیا بولا تھا خاک ۔ پہلے "نالا" کہہ رہے تھے اب "نالائق" کہہ رہے ہو ۔ اسی لیے تو وہ آ نہیں رہیں ۔

ملازم :۔ جی نہیں اس وقت مجھے ٹھیک یاد تھا ۔ پھر کام میں بھول گیا ۔

نالاں:- تو وہ کتنی دیر میں آئیں گی آخر ——— ؟ (شربت کا لمبا گھونٹ لیتا ہے)

ملازم:- صاحب ہم نوکر لوگوں کو کیا معلوم۔ وہ بول رہی تھیں کہ کچھ لکھ رہی ہوں۔

(دائیں جانب دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ ملازم باہر کی طرف لپک کر نکل جاتا ہے۔ دستک دینے والا اور ملازم حاضرین کی نظروں سے اوجھل ہیں لیکن اُن کی باتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس اثنا میں نالاں صاحب آہستہ آہستہ شربت پیتے ہیں)۔

نووارد:- نجم صاحب تشریف لائے۔ ؟

ملازم:- جی نہیں۔

نووارد:- کس وقت آتے ہیں کھانے کے لیے۔ ؟

ملازم:- بس صاحب آنے ہی والے ہیں۔

نووارد:- تو میں اندر اُن کا انتظار کرتا ہوں۔ کمرہ خالی ہے یا اندر کوئی ہے۔ ؟

ملازم:- جی ایک صاحب بیٹھے ہیں۔

نووارد:- کون صاحب۔ ؟

ملازم:- جی کچھ مشکل سا نام ہے۔ میری سمجھ میں "نالا" ہی آتا ہے۔ (نالاں صاحب جھلا کر ہاتھ سے شربت رکھ دیتے ہیں)

نووارد:- نالاں صاحب تو نہیں۔ ؟

ملازم:- جی ہاں جی ہاں وہی۔

نووارد:- رسالہ "ادب آداب" کے ایڈیٹر۔ ؟ (نالاں صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے)

ملازم:- جی یہ تو نہیں معلوم۔

نووارد:- خیر کوئی بات نہیں۔ وہ بھی نجم صاحب کے انتظار میں ہوں گے۔ میں بھی اُن کے ساتھ جا بیٹھتا ہوں۔

ملازم:- جی اچھا۔

(نووارد ایک نوجوان ہے جس کی عمر پچیس برس کے قریب ہے۔ ریشمی بش شرٹ اور پتلون پہن رکھی ہے اور اُس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ سی کھیلتی رہتی ہے۔ داخل ہوتا ہے)

نوجوان:- السلام علیکم۔

(نالاں تکلفاً اٹھتے ہیں لیکن چہرہ بتا رہا ہے کہ نوجوان کو نہیں پہچانا)

نالاں:- وعلیکم السلام

نوجوان:- مجھے جاوید کہتے ہیں۔

نالاں:- مجھے نالاں کہتے ہیں۔

نوجوان:- جی ہاں بھلا آپ کو کون نہیں جانتا۔ رسالہ "ادب آداب" بچہ بچہ جانتا ہے۔

نالاں:۔ شکریہ۔ تشریف رکھئے نا۔

(ملازم اندر آکر شربت کا گلاس اٹھاتا ہے)

نالاں:۔ (ملازم سے) جاوید صاحب کے لیے شربت لاؤ نا بھئی۔

ملازم:۔ جی بہتر۔

(ملازم پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ نالاں اور جاوید دونوں صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

نالاں:۔ نجم صاحب نے اتنا بیوقوف ملازم جانے کیوں رکھ چھوڑا ہے۔

جاوید:۔ واقعی۔ لیکن آپ نے بھی ٹھیک کیا۔

نالاں:۔ جی — ؟

جاوید:۔ میرا مطلب ہے کہ آپ نے شربت کا آرڈر دیا ٹھیک کیا۔ آخر جب نجم صاحب اپنے ملازم کو تربیت نہیں دے رہے تو ظاہر ہے کہ پھر یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی تربیت کریں۔

نالاں:۔ (کسمسا کر) جی ہاں شکریہ۔ (جلدی سے) میں دراصل بیگم نجم سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔

جاوید:۔ اُن کی بیگم مشہور افسانہ نگار خاتون ہیں نا — ؟

نالاں:۔ جی ہاں محترمہ نسرین ناز

جاوید:۔ کسی زمانے میں خوب لکھتی تھیں صاحب۔

نالاں:۔ جی معاف فرمایئے اَب بھی خوب لکھتی ہیں۔

جاوید:۔ اَب تو مدت ہوئی اُن کی کوئی چیز دیکھی نہیں۔

نالاں:۔ یہی تو ہمیں شکایت ہے اِن سے کہ لکھتی ہی نہیں۔ میں اپنے پرچے کا خاص نمبر نکال رہا ہوں۔ انہوں نے آج افسانہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سوچا خود ہی آکر لیتا جاؤں

جاوید:۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ خود آگئے ورنہ ان کے وعدوں پر جیئے تو مرے۔

نالاں:۔ (خفیف ہو کر ذرا ہنستا ہے) جی ہاں بہت خو۔۔۔ (موضوع بدل کر) کیا فرمایا تھا آپ نے اپنے شغل کے بارے میں — ؟

جاوید:۔ ابھی اس موضوع پر بات ہی نہیں ہوئی۔ میرے اشغال کی فہرست یوں ہے کہ زمانہ ماضی میں ایک رپورٹر ہوتا تھا۔ حال میں بیکار ہوں۔ اور مستقبل میں ایک نیا پرچہ نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

نالاں:۔ بہت خوب۔ آپ کو ادب سے خاصی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً کچھ لکھتے بھی رہتے ہوں گے۔

جاوید:۔ جی ہاں۔

نالاں:۔ خوب! آپ کی کبھی کوئی چیز شائع بھی ہوئی — ؟

جاوید:۔ جی نہیں۔ اللہ نے ابھی تک اس سے محفوظ ہی رکھا ہے۔

نالاں:۔ میں سمجھا نہیں۔

جاوید:۔ دراصل ادب میں اکثر مجھ سے بے ادبی ہو جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ چیزیں شائع ہو جائیں تو یہ اُبھرتا ہُوا ادیب ہمیشہ کے لیے آسمانِ اُدب سے غروب ہو جائے اور اس سانحے سے اس خاکسار کے چند دوست مغموم اور بے شمار دشمن شاداں اور فرحاں نظر آئیں۔

نالاں:۔ بہت خوب! (گھوم کر گھڑی کی طرف دیکھتا ہے) یہ لیجئے مجھے آئے ہوئے آدھ گھنٹہ ہو گیا۔

جاوید:۔ تو آپ نے اطلاع نہیں کروائی؟

نالاں:۔ (جلدی سے) معلوم نہیں اِن کا ملازم اندر جا کر کیا کہہ آیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ وہ کچھ لکھ رہی ہیں (موضوع بدل کر) تو آپ کو نجم صاحب سے کام ہے کیا؟

جاوید:۔ جی ہاں۔ دراصل نجم صاحب میرے بڑے بھائی کے کلاس فیلو تھے۔ ایک مرتبہ بھائی صاحب کے ساتھ ان سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھ سے فلمی پرچے کا سُن کر چند ایک اشتہارات دلوانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ شام کو وہ کہیں پارٹی پر جا رہے ہیں۔ اس لیے مجھے اس وقت بلوالیا۔

نالاں:۔ اُچھا۔! مجھے علم نہیں تھا کہ اشتہارات بھی ان کے قبضۂ قدرت میں ہیں ورنہ ہم تو اِن کے پُرانے نیازمند ہیں۔

جاوید:۔ نیازمندی سے کچھ نہیں ہوتا نالاں صاحب۔ یہ تو اِس ہاتھ دے اِس ہاتھ لے کا زمانہ ہے۔

نالاں:۔ تو آپ کا کیا خیال ہے کہ نجم صاحب کوئی خدانخواستہ رشوت وغیرہ . . . . . .

جاوید:۔ (ٹوک کر) جی نہیں۔ نجم صاحب دراصل آج کل گھر بنا رہے ہیں اور ہمارے بڑے بھائی کے پاس سیمنٹ اور لوہے کا ایک ڈپو ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ چیزیں آسانی سے ملتی نہیں۔

نالاں:۔ (منہ لٹکا کر) اور اُدھر اشتہار بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔

جاوید:۔ آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ نالاں اور جاوید ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں گویا اٹھائیں یا نہیں۔ دائیں جانب سے ایک صاحب جن کی عمر کوئی چالیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ کھلتا ہُوا گندمی رنگ۔ ناک نقشہ عام آنکھوں پر موٹا چشمہ۔ سلیٹی رنگ کا سوٹ پہنے داخل ہوتے ہیں اور سیدھے ٹیلیفون کی طرف لپکتے ہیں نالاں اور جاوید اپنی اپنی جگہ پر اُٹھتے ہیں اور جتنا عرصہ وہ ٹیلیفون پر بات کر رہے ہیں۔ یہ کھڑے رہتے ہیں)۔

نووارد:۔ ہیلو ——— جی۔؟ ——— جی میں نجم بول رہا ہوں ——— ہیلو کہئے لیلے بہن کیسے مزاج ہیں ——— ؟ ہاں ہاں نسرین ہوں گی بلواؤں ———؟ ——— اچھا۔ (ٹیلیفون رکھ کر آواز دیتا ہے) نسرین ——— نسرین بھئی لیلے کا ٹیلیفون ہے۔؟ (اندر سے آواز آتی ہے "آ۔۔۔")

نووارد:۔ (نالاں اور جاوید کی جانب متوجہ ہو کر دونوں سے ہاتھ ملاتا ہے۔) آؤ بھئی جاوید کیسے ہو۔؟ کہئے نالاں صاحب کافی دِنوں میں تشریف لائے آپ

نالاں:۔ بیگم صاحبہ نے افسانے کا وعدہ فرمایا تھا اور میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا لگے ہاتھوں لیتا جاؤں۔

نجم:۔ تو پھر کیا ہُوا افسانہ نہیں ملا آپ کو۔؟

نالاں:۔ جی مِل جائے گا کوئی ایسی بات نہیں۔

(پچھلے دروازے سے ایک نوجوان خوش وضع عورت سفید جارجٹ کی ساڑھی پہنے کس کانٹے سے لیس داخل ہوتی ہے)۔

عورت:۔ (ذرا برہمی سے) خاک مِل جائے گا۔ یہ گھر مجھے کچھ لکھنے دے گا تو مِل جائے گا۔ نالاں صاحب (میاں کی طرف اشارہ کر کے) اب یہ دیکھئے اس د

چلے آ رہے ہیں کھانے کے لیے۔ اب کھانا دوبارہ گرم کرواؤں یا افسانہ لکھوں۔

نجم :۔ (ٹیلیفون کی طرف اشارہ کرکے) ٹیلیفون۔ !

عورت :۔ (بڑھ کر ٹیلیفون اٹھاتی ہے) ہاں بھئی لیلٰے میں نسرین بول رہی ہوں۔ کہاں سے بول رہی ہو تم۔؟ —— تو وہ قریب ہی تو ہے —— ہاں آجاؤ
بلکہ میں تمہیں خود ٹیلیفون کرنے والی تھی —— میری ادبی زندگی پر آج کل بالکل جمود طاری ہے —— تم آؤگی تو بتاؤں گی۔ (ٹیلیفون رکھ
دیتی ہے اور پہلی مرتبہ جاوید کو دیکھتی ہے)

نجم :۔ ہاں نسرین یہ جاوید ہیں۔ مسعود کے چھوٹے بھائی۔

جاوید :۔ آداب عرض۔

نسرین :۔ آداب عرض۔

نجم :۔ مسعود کو تو تم جانتی ہو نا —— ہمارے ساتھ علی گڑھ میں ہوتے تھے۔

نسرین :۔ اچھا۔؟ (حافظے پر زور ڈال رہی ہے گویا) آپ لوگ بیٹھئے نا (سب بیٹھ جاتے ہیں)

نجم :۔ میں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا۔ تم بھول گئی ہوگی۔ !

نسرین :۔ اب تو حافظہ بھی جواب دے گیا اس گھر کے ہاتھوں اور نالاں صاحب ایک زمانہ تھا —— زمانہ کیا شادی سے پہلے کی بات ہے۔ جتنے
افسانے چھپتے تھے مجھے ازبر ہوتے تھے۔

نجم :۔ (موضوع بدل کر) جاوید ایک فلمی پرچہ نکال رہے ہیں۔

نسرین :۔ (جس کی نظروں میں جاوید کا وقار اب گر چکا ہے) خوب! —— نالاں صاحب تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ آدھا افسانہ لکھا رکھا ہے بس اتنی فرصت
نہیں ہو رہی کہ اُسے مکمل کردوں۔

نالاں :۔ کوئی بات نہیں کل بھجوا دیجئے۔

نسرین :۔ (زہرخند) آپ کل کو کہہ رہے ہیں۔ جناب والا یہ افسانہ پچھلے چھ مہینے سے یونہی رکھا ہے۔

نالاں :۔ لیکن آپ کے لیے اُسے مکمل کرنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ آپ تو بہت تیز لکھتی ہیں۔ ایک دس پندرہ منٹ نکال کر بیٹھ جایئے گھر کے کسی
گوشے میں۔

نسرین :۔ کاش آپ عورت ہوتے۔

نالاں :۔ (ذرا جھینپ کر) جی۔؟

نسرین :۔ اور نجم صاحب کی بیوی ہوتے۔ تو پھر میں آپ سے پوچھتی۔ جناب والا آپ چھ سال میں بھی آدھا افسانہ نہ لکھ سکتے۔

نجم :۔ خیر آپ ساری دنیا کو تو اپنی طرح نالائق نہ سمجھیئے۔

نسرین :۔ (جھک کر) بہت خوب! نالاں صاحب آپ ہی بتائیے نالائق کون ہے۔ یہ ہیں یا میں۔؟

نالاں :۔ (گھبرا کر) جی ماشا اللہ آپ دونوں ہی ہیں —— میرا مطلب ہے آپ دونوں ماشا اللہ لائق ہیں۔

نسرین :۔ جب میری ان سے شادی ہوئی تو سب لوگوں نے انہیں کو مبارکباد دی کہ بیوی لائق ملی۔

نالاں:۔ جی ہاں۔ظاہر ہے۔

نسرین:۔ اور ایسے میاں ملنے پر میرے تو سارے گھر والے رو رہے تھے رخصتی کے وقت۔

نالاں:۔ جی ہاں وہ کچھ موقع ہی ایسا رقت انگیز ہوتا ہے۔

نجم:۔ اچھا مجھے ذرا جلدی دفتر جانا ہے کھانا لگوا دیا ہے آپ نے۔؟

نسرین:۔ (بے اعتنائی سے) کھانے کے کمرے میں رکھا ہے۔

نجم:۔ (نالاں اور جاوید سے) آیئے۔ جو پکا ہے حاضر ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کی نگرانی میں جو ادھ پکا ہے یا جلا ہے حاضر ہے۔

نسرین:۔ خدا ناشکروں سے سمجھے۔

جاوید:۔ جی نہیں میں کھا کر آیا ہوں۔

نجم:۔ نالاں صاحب آپ تو آیئے۔

نالاں:۔ جی نہیں بسم اللہ کیجئے۔

نجم:۔ (پچھلے دروازے پر پہنچ کر مڑتا ہے) ہاں بھئی جاوید تم یہیں بیٹھو۔ میرے ساتھ تمہیں دفتر چلنا ہوگا۔ میں تمہارے کاغذات لانا بھول گیا ہوں۔

جاوید:۔ جی بہتر (نجم پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

نالاں:۔ (اٹھ کر) تو میں پھر اجازت چاہتا ہوں۔

نسرین:۔ جی نہیں بیٹھئے۔

نالاں:۔ آپ کو بھی تو کھانا کھانا ہوگا۔

نسرین:۔ جی نہیں۔ مجھ سے بھلا کہاں انتظار ہوتا ہے۔ آج دو بجے آ رہے ہیں تو کل چار بجے۔ شروع شروع میں تو بہت انتظار کیا۔ لیکن فاقوں سے اتنی کمزور ہو گئی کہ قلم نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس گئی تو وہ کہنے لگے کہ سگھڑاپا گیا بھاڑ میں۔ ملک کو ادب کی ضرورت ہے۔ اور آپ پر ملک کا بھی حق ہے۔ بس اپنی صحت کا خیال رکھئے۔

نالاں:۔ بے شک مجھے ڈاکٹر صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے۔ (بیٹھ جاتا ہے)

نسرین:۔ کیا کروں اپنا تو کچھ نہیں قوم اور ملک کا خیال آتا ہے تو کبھی انڈے تلوا لیتی ہوں اور کبھی حلوہ بنوا کر کھا لیتی ہوں۔

نالاں:۔ آپ بالکل ٹھیک کرتی ہیں۔ میری طرف دیکھئے ادب کی جانب زیادہ اور کھانے کی جانب کم توجہ دیتا رہا اور نتیجہ یہ ہے کہ کمزوریٔ جگر —— معدہ —— ہر طرح کی کمزوری حتٰے کہ کمزوریٔ دماغ کا شکار رہتا ہوں۔ تنخواہ سے زیادہ حکیم کا بل آتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ بائرن۔ شیلے اور کیٹس کی طرح اس دنیا سے جوانا مرگ چلا جاؤں گا۔ اور گیسوئے اردو منت پذیر شانہ رہ جائیں گے۔

جاوید:۔ اللہ نہ کرے نالاں صاحب

نالاں:۔ (جو اب آبدیدہ ہو چکے ہیں) پھر آپ لوگوں پر ہے کہ ہماری خدمات کو یاد رکھیں یا بھلا دیں۔

جاوید:۔ بھلا ہم کیسے بھلا سکتے ہیں۔ آپ کے مرتے ہی انشاء اللہ ہر پرچے کے خاص نمبر نکلوائیں گے۔ تعزیتی قرار دادیں منظور کریں گے۔ جتنی داد آپ کو اس دنیا میں ملی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ فریاد کریں گے۔

نالاں :۔ (رومال نکال کر آنسو خشک کرتا ہے) شکریہ بھائی۔ مجھے آپ لوگوں سے یہی اُمید ہے۔

نسرین :۔ (جس کی نظروں میں جاوید کا وقار بہتر ہو رہا ہے) آپ تو خاصے ادب دوست معلوم ہوتے ہیں۔ آپ یہ قلمی پرچہ کیوں نکال رہے ہیں۔؟

جاوید :۔ ادب دوستی کر کے کوئی کیا کرے۔ جس نے اُدب کا دامن پکڑا اُس نے رزق کا دامن چھوڑا۔

نسرین :۔ تو آپ کے خیال میں ہم سب لوگ بے وقوف ہیں کیا۔؟

جاوید :۔ جی نہیں۔ لیکن آپ کے لیے تو ادب روزی کا ذریعہ نہیں ہے نا۔

نسرین :۔ لیکن نالاں صاحب کے لیے تو ہے۔

جاوید :۔ مانا لیکن نالاں صاحب تو اُدب سے خود نالاں ہیں۔ ابھی ابھی اس کا رونا رو چکے ہیں۔

نالاں :۔ (فخریہ) لیکن اس کے باوجود ہم ادب کا دامن چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

نسرین :۔ (جاوید سے) آپ کے خیال میں اگر ادب پیٹ بھر کے کسی کو کھانا نہیں دے سکتا تو کیا اُدب کو چھوڑ دینا چاہیئے۔؟

جاوید :۔ جی نہیں میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ پہلے اپنا پیٹ بھرنا چاہیے اور پھر ادب کا پیٹ۔

نسرین :۔ آپ کے نظریے بے حد مادی ہیں۔ آپ تو قلمی پرچے کی بجائے ہلدی بیچنے کا کام شروع کرنا چاہیئے۔

جاوید :۔ ہلدی ——؟ چلے گا نہیں

نسرین :۔ کیوں۔؟

جاوید :۔ پہلے کرشن چندر نے ہلدی کے خلاف ایک افسانہ لکھ دیا اور اگلے روز آپ کا ہلدی کے خلاف انٹرویو ریڈیو پر سنا۔

نسرین :۔ تو میں نے جھوٹ کہا تھا کیا۔؟

نالاں :۔ آپ نے بالکل صحیح فرمایا تھا میرے گلے کی خرابی اور معدے کی خرابی سب ہلدی میں ملاوٹ کی وجہ سے ہے۔

نسرین :۔ کون نہیں جانتا کہ کاروباری طبقہ ہمیشہ سے ادب دشمن چلا آیا ہے۔

نالاں :۔ وہ تو اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں کہ ہم لوگ اَدب کی تخلیق میں ناکام رہیں، لیکن ہم سخت جان ہیں۔ ہمارے سینوں میں ایک چراغ روشن ہے اور پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔

جاوید :۔ آپ صفیہ کو جانتے ہیں۔؟

نالاں :۔ کون صفیہ معصوم۔

جاوید :۔ جی ہاں۔

نالاں :۔ واہ صاحب ہم کیسے نہیں جانتے۔ اُن کا سب سے پہلا افسانہ ہمارے ہی پرچے میں تو شائع ہوا تھا۔ ہم ہی نے تو دنیائے ادب کو ہونہار ادیبہ سے روشناس کرایا۔ اور آج سے پورے تین مہینے پہلے پیش گوئی کر دی کہ یہ لکھنے والی ایک دن انشاء اللہ ہیلن اور کلو پیٹرا کو مات کرے گی۔

نسرین :۔ (ذرا طنز سے) نالاں صاحب آپ کی صفیہ کے بارے میں صحیح صحیح رائے کیا ہے۔

نالاں :۔ جی بے حد حسین ہیں۔

نسرین :۔ (جل کر) میری مراد تھی کیسا لکھتی ہیں۔

نالاں:۔ (ذرا چونک کر) جی اس پر تو میں نے غور نہیں کیا۔ انہوں نے پہلے افسانے کے ساتھ اپنی تصویر بھجوائی تھی۔ اس کے بعد اُن کی تحریر تو چھاپنا بڑی زیادتی ہوجاتی۔

نسرین:۔ (نالاں صاحب سے مایوس ہو کر جاوید سے) آپ کا کیا خیال ہے صفیہ کے بارے میں۔؟

جاوید:۔ میرے خیال میں بے حد معمولی ہیں۔

نسرین:۔ (تذبذب میں) یعنی اُن کے افسانے۔؟

جاوید:۔ جی افسانے تو میں نے کبھی نہیں پڑھے۔ میری مراد تھی اُن کی شکل۔

نسرین:۔ (اشتیاق سے) ہاں تو آپ کیا کہنے والے تھے صفیہ کے بارے میں۔؟

جاوید:۔ میں یہ عرض کرنے والا تھا کہ وہ بھی تو دیسی ہلدی کھاتی ہیں۔ لیکن اُن کے ڈیل ڈول دیکھ لیجئے ماشاء اللہ کلیکسو کا اشتہار ہیں اور لکھتی بھی بہت ہیں۔

نسرین:۔ (طنز سے) جی ہاں "بہت" تو ضرور لکھتی ہیں۔

جاوید:۔ اور آجکل اصلی چیز "بہت" ہے پبلشر تول کر دام لگاتا ہے اور گاہک تول کر خریدتا ہے۔

نسرین:۔ جی میرا خیال ہے کہ ادب کی بکری اور ردّی کی بکری میں اب بھی فرق ہے۔

جاوید:۔ ہو سکتا ہے لیکن دیکھ لیجئے ایک سے ایک ایسی کتاب چلی آرہی ہے جو کسی کا سر پھوڑنے کے کام آجائے تو آجائے پڑھی بالکل نہیں جا سکتی۔ افسانے اور ناول تو خیر پڑھنے والوں نے سو پچاس صفحے چھوڑ کر بھی پڑھ لیے لیکن تنقید کو لیجئے۔ تنقید نگاروں کی صفوں میں بھی ایک سٹرلونگ مچی ہوئی ہے۔ کم گوئی کو کم مائیگی سمجھا جاتا ہے۔ اُن میں بھی بڑا نقاد وہ ہے جو موٹی کتاب لکھتا ہے چنانچہ نقاد ہیں کہ قلم زیادہ اور عقل کم استعمال کر رہے ہیں۔

نالاں:۔ ہم آپ سے متفق نہیں ہیں۔ یہ ہمارے نقادوں کے خلاف بڑی زیادتی ہے۔

نسرین:۔ اگرچہ میں خود بہت کم لکھنے لگی ہوں لیکن پھر بھی میں جاوید صاحب سے متفق نہیں ہوں۔ آخر ایک زمانہ تھا جب میں خود بہت لکھا کرتی تھی۔ اور اب بھی اگر میری شادی نہ ہوتی تو ویسے ہی کھٹا کھٹ لکھ رہی ہوتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں آ آ کر ہم سے میدان نہیں جیت سکتی تھیں۔

نالاں:۔ صحیح تو یہ ہے [illegible] آپ کا مقام بھلا کون چھین سکتا ہے۔ وہ تو غنیمت جانیں کہ وہ آپ کا ملازم کہہ رہا تھا کہ آپ کچھ لکھ رہی تھیں

نسرین:۔ جی ہاں [illegible] بچوں کے رونے کی آواز آئی [illegible] حوالے کر کے [illegible] اور لکھنے لگی۔ میں اس مقام پر تھی جب میری ہیروئن اُس شخص سے شادی پر رضامند ہو گئی ہے جس سے شادی کا اُسے نفرت رہی ہے۔ آپ خود خیال فرمائیے کہانی کیسے موڑ پہ کہ اتنے میں ٹن ٹن ٹیلیفون کی آواز اور پھر میرے میاں صاحب کی آواز اب بھلا اس ماحول میں کوئی کیا خاک لکھ سکتا ہے۔

(اندر سے نجم کی آواز آتی ہے۔ "نسرین")

نسرین:۔ (جھنجھلا کر) یہ لیجئے!۔ اب بتائیے بات نہیں کر سکتی تو لکھوں گی کیا ——— (پچھلے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دیتی ہے) کیا ہے!

نجم کی آواز:۔ بھئی ذرا اندر آؤ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے۔

نسرین:۔ میں نہیں آسکتی۔ (نالاں سے) بس صبح سے شام تک یہی ہوتا رہتا ہے۔ اس گھر نے تو میری صلاحیتیں کچل کر رکھ دی ہیں۔ اب اُردو ادب کا اللہ ہی حافظ ہے۔

(نجم پچھلے دروازے سے نمودار ہوتا ہے۔ کوٹ نہیں ہے ایک ہاتھ میں چمچہ
اور دوسرے میں رومال ہے اور منہ میں لقمہ معلوم ہوتا ہے۔)

نجم :۔ نسرین بھئی وہ ٹیلیفون آیا تو تم اپنی ساڑھیاں اور میک اَپ کا سامان یونہی کھلا چھوڑ کر آ گئیں۔ نسیم ساڑھیاں پر لپ اسٹک سے لکھ رہا ہے۔

(نسرین "اوئی" کہہ کر اٹھتی ہے اور پچھلے دروازے سے تیر کی طرح نکل جاتی ہے)

نالاں :۔ (نجم سے) دیکھئے صاحب وہیں پر اُن کا کوئی مسودہ وغیرہ نہ ہو۔ بچے پھاڑ دیں گے۔

نجم :۔ جی نہیں مسودہ وہاں پر کہاں۔ وہ تو کوئی چھ مہینے سے یہ رکھا ہے۔ (کتابوں کی الماری پر رکھی ہوئی ایک کاپی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

نالاں :۔ جی نہیں وہ تو ایک افسانے کا ذکر کر رہی تھیں۔

نجم :۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی تو کوئی افسانہ ہی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ (بڑھ کر کاپی اٹھاتا ہے اور صفحے اُلٹ کر دیکھتا ہے اور پڑھتا ہے)

"نرگس نے روتے ہوئے کھڑکی میں سے جھانکا۔ ہاں یہ وہی شخص تھا جس سے اُس نے ساری عمر نفرت کی تھی۔ اور اب یہ اُس کا میاں بننے والا تھا" یہ ہیں اس کے آخری فقرے۔

جاوید :۔ (جلدی سے) آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہو گا آپ جا کر کھانا کھائیے۔

نجم :۔ نسرین ابھی آتی ہیں۔

(کاپی دوبارہ الماری پر رکھ کر پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ نالاں
جاوید کی طرف اور جاوید نالاں کی طرف دیکھتے ہیں)

نالاں :۔ میرا خیال ہے بیکار ہی انتظار کیا۔ چلنا چاہیئے۔ (اٹھتا ہے)

جاوید :۔ تو نسرین صاحبہ سے مل کر نہیں جایئے گا۔

نالاں :۔ آپ میری طرف سے معذرت کر دیجئے گا۔ مجھے اچانک ایک کام یاد آ گیا۔

(جاوید اُٹھ کر نالاں سے ہاتھ ملاتا ہے)

جاوید :۔ جی بہتر۔

نالاں :۔ خدا حافظ

(دائیں جانب دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ اس دروازے سے ایک نوجوان عورت داخل ہوتی
ہے۔ عمر قریباً پچیس برس۔ شکل و صورت درمیانی لیکن شگفتہ۔ فیشن بہت زوروں کا ہے۔ اونچی اور
پتلی ایڑی کی سینڈل ٹپٹپاتی ہوئی ساڑھی کا پلو لپیٹے ایک آن سے کمرے میں آتی ہے۔)

نالاں :۔ (پہچان کر) آداب عرض لیلےٰ بہن۔

لیلےٰ :۔ آداب عرض۔ کہئے کیسے آنا ہوا۔؟

نالاں :۔ نسرین صاحبہ نے اپنی تازہ تخلیق دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی بنا پر نہیں لکھ سکیں۔

لیلےٰ :۔ ہاں یہی تو مشکل ہے۔ ہم لوگوں کو گھرداری سے فرصت نہیں ہوتی لکھیں کیسے؟

نالاں:۔ میں آپ کی طرف آنے ہی والا تھا۔ آپ نے بھی تو ایک افسانہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

لیلےٰ:۔ میرے پاس تو ایک ناول لکھا رکھا ہے فی الحال۔

نالاں:۔ تو اس کا ایک باب دے دیجئے۔

لیلےٰ:۔ ایک باب سے لوگوں کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ آپ پورا ناول چھاپ دیجئے۔

نالاں:۔ پورا ناول۔؟ (پھر سنبھل کر) مجھے تو بڑی مسرت ہو گی لیکن پرچے میں کچھ اور لوگوں کو بھی چھپنا ہے۔

لیلےٰ:۔ اجی ہٹایئے۔ آج کل لکھنے والے ہیں ہی کتنے۔ بس لے دے کے ایک نسرین ناز ہیں اور ایک میں ہوں اور اگرچہ نسرین ناز خاصہ لکھتی ہیں لیکن آخر وہ بھی کیا۔

نالاں:۔ بے شک۔ بے شک (بوکھلا کر) نہیں میرا مطلب ہے کہ آپ دونوں بہت اچھا لکھتی ہیں (موضوع بدل کر) آپ کا جاوید صاحب سے تعارف ہے؟

(جاوید آداب بجا لاتا ہے)

لیلےٰ:۔ (جاوید کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے) جی نہیں ——— میرا نام لیلےٰ ہے۔

جاوید:۔ جی ہاں یہ تو معلوم ہو ہی گیا تھا۔

لیلےٰ:۔ آپ تشریف رکھئے نا ——— ہم سب لوگ کھڑے کیوں ہیں۔؟

نالاں:۔ مجھے تو اجازت دیجئے ——— ایک ضروری کام یاد آگیا ہے (دروازے کے قریب) اور افسانہ بھجوانا نہ بھولئے گا۔

لیلےٰ:۔ (آواز دے کر) ناول! (نالاں جا چکے ہیں۔ جاوید سے مخاطب ہو کر) تشریف رکھئے۔ (جاوید اور لیلےٰ دونوں بیٹھ جاتے ہیں) اصل میں سب اونچے ادیب ناول لکھتے ہیں۔ چنانچہ میں تو اب سوائے ناول کے کچھ نہیں لکھتی۔ آپ کا شغل کیا ہے؟

جاوید:۔ جی میں ایک فلمی پرچہ نکالنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

لیلےٰ:۔ بہت خوب! مجھے فلمی پرچوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ بلکہ آپ سے کیا پردہ سوائے فلمی پرچوں کے اور کچھ پڑھا ہی نہیں جاتا۔

جاوید:۔ میرے لیے تو یہ بات بڑی حوصلہ افزا ہے۔

لیلےٰ:۔ آپ کے پاس تو سب فلمی خبریں رہتی ہیں۔ یہ بتایئے کہ مس ڈَم ڈَم کی طلاق کی خبر صحیح ہے کیا۔؟

جاوید:۔ جی ہاں۔

لیلےٰ:۔ اور اُس کا نکاح مسٹر پری جمال سے ہو چکا ہے کیا۔؟

جاوید:۔ ابھی پورا نکاح تو نہیں ہوا۔

لیلےٰ:۔ پورا کیا مطلب۔؟

جاوید:۔ یعنی کچا پکا ہے۔ تجرباتی سمجھ لیجئے۔

لیلےٰ:۔ کتنا اچھا خیال ہے۔ میں ہمیشہ سوچا کرتی ہوں کہ اکثر شادیوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ اس کا پورا ریہرسل نہیں ہوتا۔ خیر آپ کو بھلا زندگی کے گہرے مسائل سے کیا دلچسپی ہو گی۔ میں خواہ مخواہ ہر ایک سے فلسفے کی بات لے بیٹھتی ہوں۔

جاوید:۔ جی نہیں آپ بلا تکلف فرمایئے۔ میں بھی بڑا سخت جان واقع ہوا ہوں ایک آدھ فلسفے کی بات سے کبھی نہیں مرتا۔

لیلیٰ :۔ آپ جیسے لوگ کم ہی رہ گئے ہیں۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے کہ جن کے سامنے فلسفے کا نام لو تو اُن کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی ہے ۔ میری ایک دوست نے جو آپ کی طرح سخت جان ہیں ہمت سے کام لیا اور ایک ہفتے تک میری گفتگو سنی آخر انہیں بھی دق ہو گئی۔ اب تو مجھے ڈر لگنے لگا ہے کہ پولیس کہیں آکر مجھے پکڑ نہ لے ۔

جاوید :۔ تو کیا مضائقہ ہے ۔ ایک طرف لوگ آپ کو فنا لۂ عالم کے نام سے یاد کریں گے ۔ تو دوسری طرف جیل کی کوٹھڑی میں ایسی تنہائی میسر آئے گی کہ آپ ہر روز ایک ناول مکمل کر لیا کریں گی ۔

لیلیٰ :۔ یہ بھی اچھا خیال ہے ۔ (سوچتے ہوئے) اس پر بھی ایک ناول لکھا جا سکتا ہے (پھر فوراً جاوید سے مخاطب ہو کر) خیر ! تو بات آپ کے پرچے کی ہو رہی تھی ۔ کب تک چھپنے لگے گا ۔

جاوید :۔ بس دو ایک ماہ میں ۔

لیلیٰ :۔ میں آپ کو ایک مشورہ ضرور دوں گی ۔

جاوید :۔ آپ بلا تکلف فرمایئے ۔

لیلیٰ :۔ شکریہ ۔ وہ مشورہ یہ ہے کہ ٹائیٹل پر یعنی سرورق پر کسی ایکٹرس کی تصویر نہ چھاپئے ۔

جاوید :۔ (سوچتے ہوئے) لیکن اس کی بجائے کسی گدھے یا گھوڑے کی تصویر کہاں تک موزوں ہو گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیلیٰ :۔ جی نہیں آپ اُس کی بجائے خوبصورت ادیبوں کی تصویریں شایع کیجئے ۔

جاوید :۔ مثلاً نالاں صاحب کی ۔ ؟

لیلیٰ :۔ ارے صاحب مرد نہ خوبصورت ہو سکتا ہے نہ ادیب ۔ میری مراد ہے کہ عورتوں کی تصویر ہونی چاہیئے ۔

جاوید :۔ تو آپ کے خیال میں ادیب عورتوں کی تصویر فلم ایکٹرسوں سے بہتر رہے گی ۔ ؟

لیلیٰ :۔ انشا اللہ ۔ کیا آپ کے خیال میں ہم کسی فلم ایکٹرس سے کم ہیں ۔ (اُٹھ کے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور پوز بناتی ہیں) اب اگر اس زاویے سے میری تصویر اتاری جائے اور آپ کے رسالے کے سرورق کی زینت بنے تو کیا رسالہ ایک دم مارکیٹ میں آگ نہ لگا دے گا ۔ ؟

جاوید :۔ مارکیٹ کا تو کہہ نہیں سکتا فلم ایکٹرسوں کے آگ لگا دے گا ۔

لیلیٰ :۔ (ہنستے ہوئے واپس آکر) شکریہ ۔ میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ ہم لوگ فلم ایکٹرسوں سے بہتر ہیں ۔

جاوید :۔ بے شک ۔

لیلیٰ :۔ آپ سمجھے نہیں ۔ میری مراد ہے ۔ پرسنیلٹی میں ۔ شخصیت میں ۔ ناک ایک انچ چھوٹی یا بڑی ہو جانے سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ ؟

جاوید :۔ قطعی ۔ بلکہ آپ لوگوں کو تو فلموں میں کام بھی کرنا چاہیئے ۔

لیلیٰ :۔ ہمارا فوٹو جینک ہونا ہمارے لیے مصیبت ہو گیا ہے ۔ سب دوستوں کا یہی مشورہ ہے ۔ اصل میں گھرداری سے فرصت نہیں ہوتی بمشکل مہینے میں ایک ناول لکھ پاتی ہوں ۔ چار عدد چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ۔ اُن سے ذرا بڑے ایک میاں ہیں ۔ اور اگرچہ بچے آیاؤں کے پاس اور میاں کلب میں رہتے ہیں ۔ لیکن احساسِ ذمہ داری ! ۔

جاوید :۔ جی ہاں بڑی ظالم چیز ہے ۔ ہمارے ایک دوست ابھی ابھی اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ احساسِ ذمہ داری سے مرے ۔

بڑا موذی مرض ہے لیکن ہوتا کسی کسی کو ہے۔

لیلےٰ:۔ آپ کے خیال میں ہمارے ملک میں سیاسی بحران۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(پچھلے دروازے سے نسرین داخل ہوتی ہے لیلیٰ اُسے دیکھ کر رُک جاتی ہے اور اُٹھ کر اُسے گلے سے لگاتی ہے)

لیلےٰ:۔ ہائے کتنی پیاری لگ رہی ہو۔

نسرین:۔ پیاری تو تم لگ رہی ہو۔

لیلےٰ:۔ اصل میں ہم دونوں پیاری لگ رہی ہیں۔

نسرین:۔ بیٹھو۔ کافی پیئو گی یا چائے۔؟ (نسرین اور لیلیٰ دونوں بیٹھ جاتی ہیں)

لیلےٰ:۔ کافی بنوا لو۔

نسرین:۔ (آواز دے کر) رحیم! (گھر کے اندر سے آواز آتی ہے "جی") کافی بنا کر لاؤ۔ (لیلےٰ سے) بھائی صاحب کیسے ہیں۔؟

لیلےٰ:۔ ہمارے شوہرِ نامدار خوب مزے میں ہیں سُنئے کو کل سے کھانسی ہو رہی ہے البتہ۔

نسرین:۔ اچھا ——؟ موسم ہی ایسا ہے پرسوں سے راحت کو نزلہ ہو رہا ہے۔

لیلےٰ:۔ کاڈ لیور آئل پلاؤ اُسے۔

نسرین:۔ ڈاکٹر مرزا کو ٹیلیفون کیا تھا۔ اُس نے کچھ "ٹانک" لکھوا دیا ہے۔ ہاں اور یاد آیا میں نے کہا "وہ ڈاکٹر میرا وزن بڑھ رہا ہے۔ کیا کروں؟" تو معلوم ہے اُس نے کیا جواب دیا۔

لیلےٰ:۔ کیا۔؟

نسرین:۔ کہنے لگا کہ کھایا کم کرو۔

لیلےٰ:۔ ہائیں۔!

نسرین:۔ بھلا بتاؤ کہ اگر فاقے ہی کرنا ہیں تو ڈاکٹروں کا فائدہ۔

لیلےٰ:۔ یہی مشکل تو میرے لیے بھی ہے۔ ہر مہینے اپنے کو تولتی ہوں تو وزن پانچ پاؤنڈ زیادہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے وزن تولنے کا کانٹا خراب ہے

نسرین:۔ ضرور خراب ہوگا۔ میرے کانٹے میں بھی کچھ ایسی ہی خرابی ہے۔ اور میرے میاں خواہ مخواہ کہتے رہتے ہیں کم کھایا کرو۔ لیکن اگر ہم کھانا کم کر دیں تو ادب کی خدمت کیا خاک کریں گے۔

لیلےٰ:۔ تو کیا لکھ رہی ہو آجکل۔؟

نسرین:۔ کچھ بھی نہیں۔ لکھنے کون دیتا ہے۔ آج صبح سے سوچ رہی تھی کہ کچھ لکھوں گی کہ فلاں صاحب آن پہنچے۔ اب بتاؤ۔ تیار ہو کر نکلنے میں گھنٹہ دو گھنٹے تو لگ ہی جاتے ہیں۔ ابھی تیاری مکمل نہیں کی کہ تمہارا ٹیلیفون آگیا۔ جو چھوڑ کر بھاگی تو کپڑے وہیں بکھرے رہ گئے۔ نسیم نے اب لپ اسٹک اُٹھا میری ساڑھی پر لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔

لیلےٰ:۔ اوئی میں مر گئی!

نسرین:۔ لیکن خیر میں نے پہنچ کر چیزوں کو سنبھالا۔ ہمارے یہاں ہیں اُن سے کسی کام کی توقع رکھنا ہی بیکار ہے۔ ہر دوسرے روز پارٹی پر جانا ہوتا

ہے۔تم یقین کرو گی اپنا پورا میک اَپ مجھے خود اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے۔

جاوید:۔ نجم صاحب کہہ رہے تھے کہ آج شام بھی وہ کسی پارٹی پر جا رہے ہیں۔

نسرین:۔ جی ہاں جا تو رہے ہیں لیکن نتیجہ کیا ہے۔صبح سے سوچ رہی ہوں کہ کپڑے کونسے پہنوں گی۔وہاں کون کون آیا ہُوا ہوگا۔شام کو دو گھنٹے تیاری میں لگیں گے۔اب ان مصروفیات میں انسان لکھے گا کیا خاک۔

جاوید:۔ ہاں یہ تو ہے لیکن پارٹی سے انکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ادبی کام گھر پر ہی ہو سکتا ہے۔پارٹی پر تو مشکل ہے۔

نسرین:۔ اور جو دعوت دینے والا ناراض ہوگا۔

جاوید:۔ ہُوا کرے۔

لیلیٰ:۔ معلوم ہوتا ہے کہ جاوید صاحب کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔

جاوید:۔ جی ہاں شادی تو نہیں ہوئی۔

لیلیٰ:۔ اسی لیے آپ سماجی ذمہ داریوں سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔اس کے تقاضے پاؤں میں بیڑیاں ہو جاتے ہیں۔جب آپ کی بیوی آئے گی۔تو آپ کو پتہ چلے گا۔

جاوید:۔ ارے صاحب کبھی تو کوئی دن ایسا آجاتا ہوتا جب آپ کو باہر نہ جانا ہو۔

نسرین:۔ ایسا مبارک دن جب آتا ہے تو اس روز کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔میاں کی خالہ ہی ملنے کو چلی آتی ہیں۔

جاوید:۔ ہاں جب تو واقعی ٹریجیڈی ہے لیکن کبھی تو آپ کی خالہ بھی ملنے کو آجاتی ہوں گی۔

نسرین:۔ تو دن بہت اچھا گزر جاتا ہے۔لیکن لکھا نہ یوں جاتا ہے نہ یوں۔

جاوید:۔ اور اگر کوئی پارٹی مل جائے تو آپ شکر کرتی ہوں گی۔

لیلیٰ:۔ ارے صاحب ہم لوگ نفل پڑھتے ہیں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔نسرین جا کر اٹھاتی ہے)

نسرین:۔ ہیلو—— جی ہاں نجم صاحب ہیں لیکن کھانا کھا رہے ہیں—— جی میں بیگم نجم بول رہی ہوں۔ہاں آپ پیغام بتائیے—— آج شام کی پارٹی کو کیا ہُوا—— کینسل ہو گئی!—— کیوں؟ خیریت ہے۔(ٹیلیفون رکھ دیتی ہے)۔

(پچھلے دروازے سے نجم اب باقاعدہ کوٹ وغیرہ پہنے داخل ہوتا ہے)

نجم:۔ کس کا ٹیلیفون تھا؟

نسرین:۔ شمسی کا؟

نجم:۔ کیا کہتا تھا؟

نسرین:۔ آج شام کی پارٹی کینسل ہو گئی۔

نجم:۔ چلو اچھا ہُوا—— میں بھی پارٹیوں سے تنگ آگیا ہوں۔آج شام آرام سے گھر میں بیٹھیں گے۔

نسرین:۔ (جل کر) آپ کے خیال میں گھر آرام کی جگہ ہو گی۔میرے خیال میں نہیں ہے۔

نجم :۔ یوں تو میرے خیال میں بھی نہیں ہے۔ میں نے تو اس لیے کہہ دیا کہ مہمانوں کے سامنے آپ کے گرہست کی نیک نامی ہو جائے۔

نسرین :۔ جی آپ میری نیک نامی کے فکر میں تو دُبلے ہوئے جا رہے ہیں۔ مہمانوں کو میں اس گھر کی خوبیاں بتا چکی ہوں۔ اُن کو معلوم ہے کہ یہ کتنی بڑی جنت ہے۔

نجم :۔ جنت ہے یا جہنم لیکن تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ افسانہ لکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اب فرصت ہوئی ہے تو لکھو۔

نسرین :۔ فرصت کہتے ہیں ذہنی سکون کو۔

نجم :۔ تو آپ کو کسی ذہنی اذیت میں مبتلا ہیں خدانخواستہ ؟

نسرین :۔ کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔

نجم :۔ مثلاً۔ ؟

نسرین :۔ مثلاً غیر ہمدرد میاں۔

جاوید :۔ (جلدی سے دائیں دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں باہر انتظار کرتا ہوں۔

(باہر نکل جاتا ہے لیکن کوئی اُس کے باہر جانے کی طرف دھیان نہیں دیتا)

لیلیٰ :۔ نجم بھائی آرٹسٹ بیوی رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ ہم لوگ بے حد حساس واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی ذرا سی بے اعتنائی ہمارے ذہن ایک پوری کتاب کا خون کر سکتی ہے۔

نسرین :۔ ان کے ہاتھوں ایسے کئی خون ہو چکے ہیں۔ یہ تو میرا ہی صبر ہے کہ ان کے ساتھ پھر بھی نبھا کر رہی ہوں۔

نجم :۔ اچھا تو بتائیے کہ کیا کیا جائے۔ پارٹی پر جاتے ہیں تو لکھنا پڑھنا جاتا ہے اور نہیں جاتے تو کتاب کا خون ہوتا ہے۔ وہ کم بخت نازک مزاج کتاب صاحبہ ہیں کہ لکھی ہی نہیں چکتیں۔ لکھ چکیں تو ہماری بھی جان چھوٹے۔

نسرین :۔ اب آپ کی جان چھوٹنے کی صورت تو ایک ہی ہے کہ میں مرجاؤں۔

لیلیٰ :۔ کیا کہہ رہی ہو نسرین۔

نسرین :۔ (روہانسی) خدا گواہ ہے بس اب میری یہی تمنا ہے کہ میں مرجاؤں۔ اور دیکھو اگر میں مرگئی تو میرے بچوں کا خیال رکھنا۔

لیلیٰ :۔ توبہ نسرین خدا کے لیے ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالو۔

نسرین :۔ (اب باقاعدہ روتے ہوئے) کیونکہ میں مرگئی تو یہ کوئی گنوار دیہاتی بیوی لے آئیں گے اور وہ میرے بچوں کو بہت ستائے گی۔

نجم :۔ اب لیلیٰ بہن آپ ہی بتائیے۔ اس پاگل پن کا ہے کوئی علاج۔ ؟

لیلیٰ :۔ نجم بھائی یہ پاگل پن ایک عظیم ذہن کا پاگل پن ہے اسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔

نجم :۔ برداشت تو کر ہی رہا ہوں۔

نسرین :۔ (ویسے ہی روتے ہوئے) میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔

(دائیں جانب دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

نجم :۔ کون ہے۔

جاوید کی آواز :۔ میں ہوں جاوید۔

نجم :۔ ارے تم کب باہر نکل گئے۔ آجاؤ اندر (نسرین سے) دیکھو سنبھل جاؤ اب۔

(نسرین جلدی سے آنسو پونچھتی ہے۔ وائیں جانب سے جاوید داخل ہوتا ہے)

نجم :۔ (جاوید سے) یہ آنکھ مچولی کیا کھیل رہے ہو بھائی تم۔؟

جاوید :۔ مجھے یاد آیا کہ یہ رقعہ دینا تھا آپ کو۔ (جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر نجم کو دیتا ہے)

نجم :۔ (پڑھتے ہوئے) ہوٹل استقبول میں رات کا کھانا ہے مسعود کی طرف سے۔ یہ آپ کے بھائی صاحب کس خوشی میں بلا رہے ہیں۔؟

جاوید :۔ آج شام وہ آپ کو بلانا چاہ رہے تھے اور یہ رقعہ انہوں نے مجھے کل دیا تھا۔ میں نے اس لیے نہیں دیا کہ آپ مجھے آج کی پارٹی کا بتا چکے تھے اب معلوم ہوا ہے کہ آپ نہیں جا رہے تو دعوت نامہ حاضر خدمت ہے۔

نجم :۔ تو اور کون کون آرہا ہے اُس میں؟

جاوید :۔ کچھ فلم ایکٹر اور ایکٹرسیں ہیں۔

لیلےٰ :۔ کون کون۔؟

جاوید :۔ آپ کی مِس ڈم ڈم ہیں۔ مسٹر پری جمال ہیں۔ مِس نزاکت ہیں۔ مِس شگوفہ ہیں سبھی ہیں۔ آپ بھی آیئے نا۔

لیلےٰ :۔ (ذرا بن کر) آپ نے بلایا تو ہے نہیں۔

جاوید :۔ پہلے آپ سے تعارف نہیں تھا۔ اَب میری طرف سے دعوت قبول فرمایئے۔

لیلےٰ :۔ شکریہ۔ (نسرین سے) نسرین شام کو کونسی ساڑھی پہنوں۔ کاسنی پہن لوں؟

نسرین :۔ (جو اَب بہت اشتیاق ہے) کاسنی رنگ تو میرا پہننے کا ارادہ ہو رہا تھا۔

لیلےٰ :۔ تمہارے پاس تو سرخ رنگ کی بھی بہت بڑھیا ہے۔

نسرین :۔ ہاں وہ تو ہے لیکن رات کو اُس میں رنگ بہت کالا لگتا ہے۔

لیلےٰ :۔ اُوہ! کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کیا پہنا جائے۔ سبز رنگ کی ساڑھی تو میری ایسی ہے کہ ایکٹرسوں کے سامنے جچے گی نہیں۔

نسرین :۔ یہی تو مصیبت ہے۔ اب ہمارے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے ان لوگوں نے۔

لیلےٰ :۔ اور ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ذہنی سکون کا۔

نسرین :۔ اَب اِن حالات میں کوئی افسانہ کیا خاک لکھ سکتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

خلیل الرحمٰن اعظمی

وجدان

دھوپ معمول سے بھی سوا تیز ہے
کوئی بادل کا ٹکڑا نہیں
کوئی سایہ نہیں
روشنی،
چڑھتے سورج کی یہ روشنی
مجھ کو گھیرے ہوئے ہے
ایسا لگتا ہے جیسے بہت بھیڑ ہو
ہر طرف شور و غل،
ہر طرف قہقہے
میں کسی سے بھی کچھ کہنا چاہوں
تو شاید نہ اب کہہ سکوں

میں اس روشنی میں
کھلی آنکھ سے
راستے کی طرف اپنے تکتا ہوا
ساری آوازیں سنتا ہوا
ایک لمحے کو
خود اپنے ہی آپ سے
ہو کے رخصت وہاں جا نکلتا ہوں
جس راستے میں کوئی قافلہ
نرم معصوم پھولوں کے اک کنج میں
چھاؤں میں خوبصورت درختوں کی
اس طرح بیٹھا ہوا ہے
جیسے اس قافلے کا
ہر اک فرد گم سم ہے، چپ چاپ ہے
اور ہر شخص
خود اپنی آواز سننے میں مصروف ہے

○

ادبِ لطیف

ظہیر کاشمیری

آہنگِ وصال

جشنِ دل کا موسم ہے، بام و در چراغاں ہیں
شہرِ عشق کی گلیاں، شام سے درخشاں ہیں

چاندنی کے گجرے ہیں، روشنی کی کلیاں ہیں
آج دل سے دنیا تک، راستے فروزاں ہیں

آرزوئے جاناں کی نکہتیں پر افشاں ہیں
ہر نظر کے دامن میں سینکڑوں گلستاں ہیں

ایک سرمدی لے ہیں، گو بجتی ہے شہنائی،
تم بھی جوشِ نغمہ ہو، ہم بھی سب غزلخواں ہیں

آج آنے والا ہے، عشق پیشوائی کو
دلبری کے عالم میں حسن کے شبستاں ہیں

زُلف و رُخ کی باتیں ہیں، چشم و لب کے افسانے
ذہن کی ہواؤں میں پرفشاں نگاراں ہیں

کوئی یوسفِ ثانی اس طرف سے گزرے گا
سینکڑوں زلیخائیں قسمتوں پہ نازاں ہیں

حُسن ایک بے تابی، عشق ایک مجبوری،
اک نئے طریقے سے ربطِ دل کے ساماں ہیں

مہر و ماہ کی کرنیں، تھرتھرا کے چھلکتی ہیں
صبح و شام کے مطرب دیر سے غزلخواں ہیں
مہندیوں کے جھرمٹ میں، ڈھولکیں ہمکتی ہیں
چلمنوں کے نظارے، رو کشِ بہاراں ہیں
سو سہاگنیں مل کر سیم و زر لٹاتی ہیں
بزمِ ناز سجتی ہے، سر خوشی کے عنواں ہیں
عشق کی محبت پر آج کبریائی ہے
آج نذر ہونے کو حسن کے گریباں ہیں

کیسری فضاؤں میں ناپ تول گھنگروں کا
آنچلوں کی چھاؤں میں قہقہوں کی جھڑیاں ہیں
بادلوں کے بھچوؤں سے راگ رس ٹپکتا ہے
جھانجھریں ہواؤں کی نغمگی بداماں ہیں
ڈولیوں کی صورت میں، گل ہجوم کرتے ہیں
جالیاں دریچوں کی سر بسر گلستاں ہیں
اے ظہیرؔ آپہنچیں وصلِ دوست کی گھڑیاں
اوّلیں نگاہوں کی قسمتیں فروزاں ہیں

اوبِ لطیف

قیُّوم نظر

بڑے مسائل

ہمیشہ میں نے قریب رکھا ہے ننھی خوشیوں کی زندگی کو
نئے جہاں کی ہزار ہا الجھنوں سے دل ریش جب ہوا ہوں
ذرا ذرا سی شگفتہ باتوں سے بنتے قلعوں میں چھپ گیا ہوں

بڑے بڑے جاں گسل مسائل کو دامنِ شب میں جب بھی باندھا
نحیف تاروں کی روشنی ایک چشمۂ نور بن کے اُتری
حقیر ذرّوں نے میری خاطر مسرتوں کی جھڑی لگا دی

بڑے مسائل مگر مری چشم پوشیوں کے دبیز پردے
ہٹا کے اس طرح دخل دیتے ہیں زندگی کی حقیقتوں میں
جہاں کی ہر چیز جیسے گم ہو انہی کی بے باک وسعتوں میں

وہی ہوں جیسے زمیں کی آبادیوں کی صورت، سکوں کا مرکز
قدم قدم پر انہی کے دم سے خوشی کا نغمہ چھڑا ہو جیسے
خدا بھی اپنے وجود کا راز ان ہی میں دیکھتا ہو جیسے

یوسف جمال انصاری

عورت اور شاعر

یہ نظم "ہم قلم" کراچی میں اس طرح چھپی تھی کہ ترتیب غلط ہو جانے سے مطلب نہیں نکل سکتا تھا ۔

رنگ و آہنگ و صوت و صورت میں — ذوقِ تخلیق جب اُبھرتا ہے
جو سزاوارِ صانعِ کُل ہے — وہی فنکار کر گذرتا ہے

تُو نے چکھا ہے شہدِ نخلِ حیات — سِرِّ تخلیق تُو نے کھولا ہے
تُو نے روحوں کو جسم بخشے ہیں — تیرا ہر نقش منہ سے بولا ہے

درد اور پیار کی لگن ہے وہی — حُسنِ تخئیل کا فسوں ہے وہی
بندگی میں بھی دُھن خدائی کی — جو تجھ کو، مجھے جنوں ہے وہی

تیرے شہ کار استعارے ہیں
میرے اشعار بھی اشارے ہیں

اعجاز حسین رضوی

پیار کی ریت

اُن کو کچھ پتہ نہ تھا، میں بھی ان کے پاس ہی
اُن کو دیکھتا رہا، ایک بات ان کہی
دل سے پوچھتا رہا، اُن کا جی ہے مطمئن،
اور میرے پاس کیا، آنسوؤں بھرے نَین!

اُن کو اپنے کام سے وقت بھی اگر ملے
میری چاہ تو کہاں، جو کہیں نظر ملے
اپنے آپ سے کہیں، بات یہ بھلی نہیں،
اُن کے من میں موہ کی آگ بھی جلی نہیں

انگنی پہ اپنی گیلی ساڑھیوں کو ڈال کے
دُھلی ہوئی ہر ایک شے دوبارہ دیکھ بھال کے
گئے، تو میرے دل نے یہ کہا۔ کہ دیکھتا ہے تو
اب تو اُن کو روک لے، بتا دے اپنی آرزو

مگر میں سوچتا رہا، یہ آنسوؤں بھرے نَین
ان کی چاہ بس یہی، میرا بھی یہی ملن

رباعیات

عارف عبدالمتین

(۱)

ہے بادِ صبا صرصرِ سوزاں تجھ بن،
ہر پھول ہے اک خارِ مغیلاں تجھ بن،
اے رنگِ معطر کے نرالے خورشید،
ہے صبحِ چمن شامِ بیاباں تجھ بن!

(۲)

ہونٹوں کا ترے، خواب میں ملنا کم کم
کلیوں کا گلستاں میں ہے کھلنا کم کم،
سوتے میں مرے ساتھ لپٹنا تیرا،
پتوں کا سرِ شاخ ہے ہلنا کم کم!

(۳)

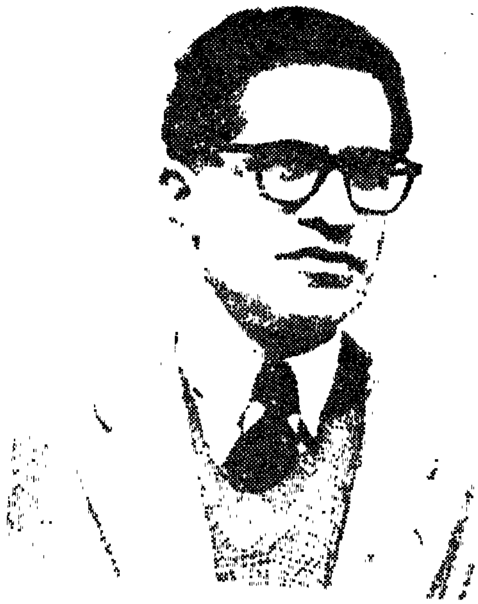
آغوش میں شعلے کے شرارا جیسے
بنسی کی رفاقت میں گدارا جیسے
یوں گود میں بچے کو لیے بیٹھی ہو
مہتاب کے پہلو میں ستارا جیسے!

(۴)

معراج کی رات شمعیں جلانا تیرا
دیوار و درِ خانہ سجانا تیرا
بزمِ مہ و انجم میں مجھے لے آیا
انوارِ مقدس میں نہانا تیرا

(۵)

ہونٹوں کو مرے چوم کے تو اُٹھے گی
رقاصہ صفت گھوم کے تو اُٹھے گی
ہنگامِ سحر، لیتے ہوئے انگڑائی
پہلو سے مرے جھوم کے تو اُٹھے گی!



احمد ندیم قاسمی
(ایک نئی تصویر)



جاویدہ اخلاق گیلانی



ظہیر کاشمیری



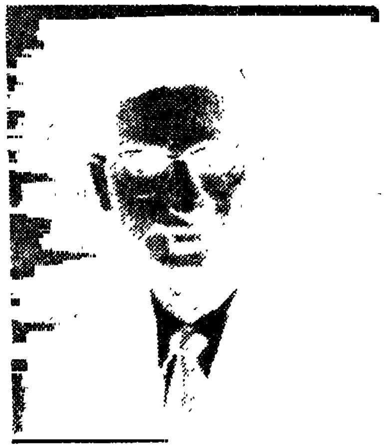
رشیدہ سلیم سیمیں



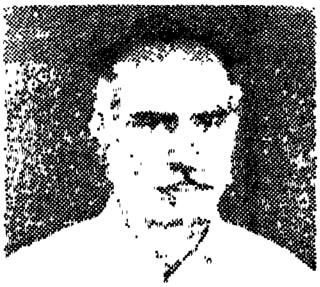
سید وقار عظیم



ڈاکٹر عبادت بریلوی



مسعود مفتی



شیر افضل جعفری



نوید انجم



سجاد حارث



مصطفیٰ زیدی



قیوم نظر



اقبال متین



عابد حسن منٹو



ساقی فاروقی



مظہر امام



حنیف فوق



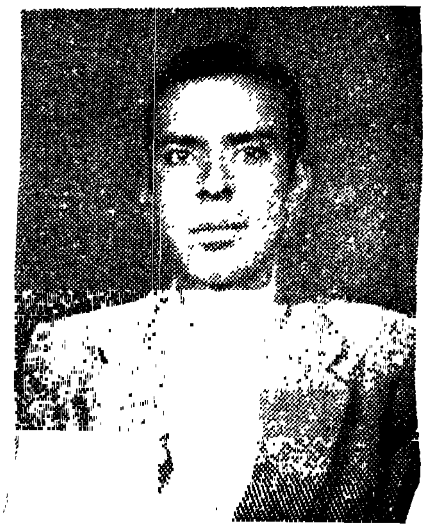
راجہ مہدی علی خان



رام لال



منظر ایوبی



جلیل حشمی



محسن احسان

بشیر منذر

گیت

کہاں میں ، کہاں تو
میں ذرّہ زمیں کا ، تو اڑتی سی خوشبو

بہاروں نے تجھ کو ہے نازوں سے پالا —— اے جانِ بہاراں
میں دھرتی کے پاؤں کا ہوں ایک چھالا —— سرِ نوکِ خاراں
وہاں رنگ و بو ہے یہاں غم کا جادو
کہاں میں کہاں تو

وفاؤں کے ہنستے ہوئے پھول چن کر —— چمن اک بسایا
تمنّاؤں کے نو بنو خواب بُن کر —— محل اک سجایا
مگر چھو سکا نہ میں تجھ کو اے ماہرو
کہاں میں کہاں تو

زمانے کے ہاتھوں میں ہے تیرا دامن —— چھڑاؤں تو کیسے
ستاروں سے بھی ہے پرے تیرا مسکن —— میں آؤں تو کیسے
مرا سارا سامان ہیں چند آنسو
کہاں میں کہاں تو

فکر تونسوی

F. JC.

مرحوم آنریبل گنگا رام جمنا داس کٹاری

آج آٹھ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایک بجے بعد دوپہر ہماری جمہوریہ کے معقول کم اور معقول زیادہ ممبر پارلیمنٹ آنریبل گنگا رام جمنا داس کٹاری کا انتقال ہو گیا۔ ان کی آخری بیوی پریم کماری دتہ کے دردناک بیان کے مطابق مرحوم نے چوبیس گھنٹے پہلے ہی اپنی موت کی پیش گوئی کر دی تھی۔ مرحوم نے آج تک جو بھی پیش گوئی کی صحیح نکلی! چنانچہ گذشتہ دنوں انہوں نے کہا تھا کہ مجھے فلاں تاریخ کو زکام ہو جائے گا تو انہیں واقعی زکام ہو گیا تھا۔

مرحوم کا انتقال معمول کی طرح پُرملال تھا اس لئے معمول کی طرح پارلیمنٹ میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ دس منٹ ایک چڑیا کی چوں چوں کے، ایک ماتمی ریزولیوشن بھی اتفاقِ رائے سے پاس کیا گیا۔ پارلیمنٹ کی گذشتہ دو برس کی تاریخ میں یہ دوسرا ریزولیوشن تھا۔ جو اتفاقِ رائے سے پاس کیا گیا۔ اس سے پہلا ریزولیوشن بھی ماتمی تھا۔

ہاؤس کے رہنمائے اعلیٰ نے تمام معزز ممبران کو یہ بھی بتا دیا کہ مرحوم کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے کبھی پُر نہیں ہو سکتی — مگر بالائی حلقوں کی رائے تھی کہ جگہ ضرور پُر ہو گی۔ کیونکہ آئین کی رو سے اس سیٹ کا ضمنی الیکشن ہو گا۔

مرحوم آنریبل گنگا رام جمنا داس کٹاری کون تھے؟ — اس کے متعلق کچھ قابلِ اعتبار مواد نہیں مل سکا۔ اگر ان کے سوانح حیات کا تھوڑا بہت مواد ملتا ہے تو اس وقت سے جب غلہ منڈی بھگتان پورہ میں ایک جوا خانہ پر پولیس نے چھاپہ مارا تھا۔ اور مرحوم آنریبل کٹاری "انقلاب زندہ باد!" کا نعرہ لگاتے ہوئے جوا خانہ سے ہتھکڑی پہنے باہر نکلے تھے — اس سے پہلے کی تاریخ پر ظلمات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

گو آنریبل کٹاری کے ایک سیاسی مخالف نے بتایا کہ اگرچہ کسی کی پیٹھ پیچھے غیبت کرنا شیوۂ مردانگی نہیں ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرحوم صرف چھ جماعتیں پڑھے تھے۔ اور نہایت نالائق طالب علم شمار کئے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ لفظ "خدا" کے غلط ہجے کرنے پر استاد نے ان کا ایک دانت توڑ دیا تھا جس پر خدا اور تعلیم دونوں سے متنفر ہو گئے تھے۔ اور منڈی بھگتان پورہ میں مونگ کی دال کے پکوڑے تلنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ بڑے جفاکش تھے، اس لئے مونگ کی دال کو بڑی جانفشانی سے گھوٹا کرتے تھے، اس لئے ان کے پکوڑے نہایت لذیذ اور پاپولر ہو گئے تھے۔ انہی پکوڑوں کی بدولت وہ عوام میں اتنے پاپولر ہو گئے کہ ایک سیاسی پارٹی کو مجبور ہو کر انہیں ایک جلسہ کے رتیہ ویلیوشن کی تائید مزید کے لئے سٹیج پر بلانا پڑا۔

اُن دنوں آنریبل کٹاری کا نام اصلی تھا یعنی وہ "گنگو کھتری" کے نام سے مشہور تھے۔ منڈی کے ایک پینٹر نے ان کی دوکان کے لئے از خود ایک بورڈ "گنگو پکوڑہ مینوفیکچرر" انگریزی میں لکھ کر لٹکا دیا تھا۔ ان کی کڑاہی کے رائٹ پہلو پر فلم ایکٹرس جہاں آرا کجن کی تصویر کے نیچے ایک گتے پر مشہور پولیٹیکل اور قومی شاعر جناب ڈنڈا ذات ڈنڈا کا ایک منظوم سرٹیفکیٹ بھی اکثر لٹکا رہتا تھا کہ — "میں نے ذاتی طور پر گنگو کھتری کے پکوڑوں کو آزمایا ہے اور ان میں اپنے اشعار کی سی لذت محسوس کی ہے۔ جو حضرات میری شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ان پکوڑوں کو بھی ضرور چکھ کر دیکھیں۔"

آنریبل کٹاری سابقہ گنگو کھتری ایک قوی الجثہ انسان تھے اس لئے بھگتان پورہ میں ایک "پرسنیلیٹی" کہلاتے تھے۔ آواز میں گھن گرج تھی اس لئے ایک بار کسی کو دھتکارتے تو وہ مہینوں سر جھکا کر چلتا۔ چونکہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے ہندوؤں کے بڑے مداح تھے ہندو جاتی کے زوال پر انہیں بے حد غصہ آتا تھا۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوتے تو انہیں مسلمانوں کے زوال پر غصہ آتا ——— بھگتان پورہ میں ایک اکھاڑہ بھی قائم کر دیا تھا۔ جہاں صرف ہندو نوجوانوں (اور کچھ ہندو بوڑھوں) کو ہی پہلوان بننے کی اجازت دیتے تھے۔ اکھاڑے کے ساتھ ساتھ ایک جوا خانہ بھی قائم کر دیا تھا۔ اور ہر جواری پر یہ "ٹیکس" لگا دیا تھا۔ کہ اپنی جیت کی رقم کا پانچواں حصہ ہندو جاتی کے رکھشا فنڈ کے لئے دیا کرے۔ منڈی کے غلہ بیوپاری جو چاولوں میں مٹی ملا کر سرکار کے ہاتھ فروخت کیا کرتے تھے۔ اور سرکاری ملوں کی ادائیگی میں تاخیر کے سبب سرکار کے سخت مخالف تھے۔ گنگو کھتری کو ہندو جاتی کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ اور ان کے ہندو رکھشا فنڈ میں روپیہ دینا فخر سمجھتے تھے۔ گنگو کھتری جتنے فنڈ کا مطالبہ کرتا، وہ چاولوں میں اتنی ہی مٹی زیادہ ملا دیتے ——— چنانچہ جب جوا خانہ پر چھاپہ پڑا۔ اور گنگو کھتری کو پولیس ہتھکڑی پہنا کر لے گئی۔ تو بطور پروٹسٹ منڈی میں ایک دن کی ہڑتال رہی۔ اور اس دن کوئی بھی گاہک مٹی ملے چاول نہیں خرید سکا۔

پکوڑا، اکھاڑا اور جوا ——— ان عناصر ثلاثہ نے آنریبل کٹاری کے سیاسی وجود کا پتلا تیار کیا۔ اس پتلے میں صرف روح داخل کرنے کی کسر تھی۔ چنانچہ تین مرتبہ جیل سے فرار ہوئے۔ تین مرتبہ جیل میں بھوک ہڑتال کرنے اور بالآخر تین ماہ کی جیل کاٹنے کے بعد جب رہا ہو کر باہر آئے تو ان کی "پرسنیلیٹی" میں روحِ عصر داخل کر دی گئی۔ ان کی رہائی پر ایک جلسۂ استقبالیہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ایک قرارداد کے ذریعے عوام کو آگاہ کر دیا گیا۔ کہ ہندو جاتی اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتی اور گنگارام جمنا داس کٹاری کو اپنا لیڈر بناتی ہے۔

اور یوں گنگو کھتری، گنگارام جمنا داس کٹاری بن کر روحِ عصر کے نمائندہ بن گئے۔ روحِ عصر جو سدا تبدیلی چاہتی ہے، ارتقا چاہتی ہے۔ کھتری کو کٹاری بنا دیتی ہے

جب وہ کھتری سے کٹاری بن کر اونچے اٹھ گئے۔ تو انہیں پکوڑا، اکھاڑا اور جوا سے بھی اونچا اٹھ جانا پڑا۔ چنانچہ آمدنی کے یہ تینوں ذریعے بند ہو گئے تو انہوں نے تاریخ ہند کا مطالعہ شروع کر دیا۔ تاکہ ہندو جاتی کے زوال کے اسباب معلوم کر سکیں ——— زوال کے اسباب تو معلوم ہو گئے۔ لیکن انہیں یہ تو معلوم نہ ہو سکا۔ کہ آٹا، کپڑا کیسے خریدا جائے؟ گیتا کے مطالعہ سے انہیں یہ تو معلوم ہو گیا۔ کہ ارجن کی آتما فنا نہیں ہوتی۔ لیکن گیتا میں کہیں نہیں لکھا تھا۔ کہ ارجن میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے ناشتہ کہاں سے کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہندو جاتی کے زوال سے پہلے اپنے اقتصادی زوال کو دور کرنا ضروری سمجھا۔ لہٰذا انہوں نے ایک وطن پرست سیٹھ سے روپے ادھار لے کر بناسپتی گھی سے دیسی گھی بنانے والی ایک فرم کھول لی۔ پکوڑوں کے تمام گاہک اب دیسی گھی کے گاہک بن گئے۔ اس سے جہاں مرحوم کٹاری کو ارجن کے ناشتہ کا راز معلوم ہو گیا وہاں دیسی گھی کھانے سے ہندو جاتی کے رگ پٹھوں میں بھی ارجن کی سی شکتی سرایت کر گئی، اتنی شکتی کہ ایک بار تو "کٹاری گھی سٹور" سے دروپدی "زلفِ پریشاں" لئے ہوئے باہر نکلتی دیکھی گئی ———

دراصل کٹاری گھی سٹور کے عقب میں بھارتیہ استری سنگ کا سیکرٹریٹ بھی تھا۔ جس کی انچارج پریم کماری دتہ تھیں۔ جب سے کٹاری گھی سٹور چالو ہوا تھا۔ جب سے پریم کماری دتہ کی آنکھوں کے سیاہ حلقے بھی سرخ و سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مگر شری کٹاری کے بازوؤں کی طاقتور مچھلیوں کے خوف سے کسی نے پریم کماری دتہ سے یہ سوال نہیں کیا، کہ رنگ کی اس تبدیلی کا کارن استری جاتی کی جاگرتی ہے یا کچھ اور ہے کچھ کمینہ خصلت لوگوں نے یہ افواہ اڑا دی تھی۔ کہ شری کٹاری نے دیسی گھی کے ساتھ ساتھ دیسی شراب کی خفیہ بھٹی بھی لگا رکھی ہے۔ لیکن کوئی

اس الزام کو ثابت نہیں کر سکا۔ کیونکہ بھٹی اگر تھی بھی تو وہ گھی سٹور سے ملحقہ ایک چھوٹے سے مندر کے تہہ خانہ میں تھی۔ اور مندر پر چھاپہ مارنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ (اپنا اپنا رواج ہے) لیکن بات صاف تھی کہ نشری کٹاری کے نیچے اب پالسن مکھن کے ڈبہ سے ناشتے کیا کرتے تھے۔ اور انہیں مکھن میں سے دیسی شراب کی بُو کبھی نہیں آئی تھی۔ اگرچہ اس کی مستی شراب سے کچھ کم بھی نہیں تھی۔

مرحوم چونکہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ اس لئے اُن میں ایک عجیب سا عجز سا پیدا ہو گیا تھا۔ بہت جو ڈرنے لگے تھے۔ اتنا مقبول آدمی جب اتنی عاجزی دکھانے لگے۔ تو بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگ جھک جاتے ہیں۔ اب تو باقاعدگی سے اخبار بھی پڑھنے لگے تھے۔ پلاننگ کمیشن کے بیانات اگرچہ ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ لیکن وہ انہیں اپنی تقریروں میں ضرور کوٹ کرتے تھے۔ کیونکہ کم از کم اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ یہ باتیں سامعین کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ اس لئے کوئی خطرہ نہیں۔ اُن کی ہر تقریر بعید از خطرہ ہوتی تھی۔ کیونکہ ہر خطرناک پوائنٹ پر وہ تالیاں پٹوا دیتے تھے۔ اکثر تالیوں کی گونج میں اپنی لاعلمی کے پرخچے اُڑا دیا کرتے تھے۔ تالیاں پٹوانے کے آرٹ میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس سلسلہ میں اُن کی ایک تقریر کا مختصر سا ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے جس پر مسلسل پانچ منٹ تک تالیاں بجتی رہی تھیں۔ اس وقت سلائی مشین کی ایک فیکٹری کا افتتاح کر رہے تھے تو انہوں نے کہا۔

.... اور جب میں جاپان گیا، وہاں دیکھا، تو شرم سے آنکھیں جھک گئیں میری ——— شرم کسی چیز پہ؟ آپ پوچھیں اپنے دیش کی بدقسمتی پر جو کبھی سُدرشن چکر بناتا تھا، اب سلائی مشین کی ایک گراری بھی نہیں بنا سکتا۔ گراری بھی ایک چکر ہے، اور اے بدنصیب ہندو جاتی کے سپوتو! تم گراری کی بجائے تناؤ کے چکر میں پھنس گئے۔ اور تمہاری گیتا کو جاپان چرا کر لے گیا اور گراریاں بنانے لگا۔ جاپان نے سُدرشن چکر کے خاندان کو چکر میں ڈال دیا ہے۔ اُس رات اے ہندو جاتی! میں رات بھر گیتا کو آنکھوں پر رکھے روتا رہا۔ آنسو بہاتا رہا! گن گن کر ناؤ کے آنسو بہائے، جب سوالی بہانے لگا تو جیسے گیتا میں سے آواز آئی۔

——— جب بھی دھرم کا ناش ہونے لگتا ہے، جب میں شنر دل کرتا ہوں۔" اور پھر سٹیج پر ہی زار و قطار رونے لگے۔ تو رو تے رہے او سامعین جذبات سے محو ہو کر تالیاں پیٹتے رہے۔ حتیٰ کہ کئی نوجوانوں نے تو غیرت قومی میں آ کر دو پولیس مینوں کو بھی پیٹ ڈالا ——— جو تالیاں نہیں پیٹ رہے تھے

مرحوم آنریبل کٹاری ——— عام سیاستدانوں کی طرح جرنلسٹ بھی رہے۔ پہلے وہ بھگتاں پورہ میں چیمبروں کی کرنٹ اور ایک چوہدری کی بلطرفی کی قسم ... کہ اپنے بیٹے ... کے شعر "نورتنم" پر اپنی قیمتی رائے اشتہاروں میں چھپوا دیا کرتے تھے۔ کئی نیوز ایڈیٹر اُن کے اتنے مداح تھے کہ اُن ... ایک سیر ہونے جانے اور ایک ... دو خبریں شائع کر دیا کرتے۔ یہ اُن کا کھلا مارکیٹ ... یٹ تھا۔ بلیک کا ریٹ قدرے مختلف تھا۔ یعنی ... بشرطیکہ نیوز ایڈیٹر دس برس کا پرانا تجربہ رکھتا ہو۔

ایک مرتبہ شہر میں ایک مسلمان امیرزادے نے ایک ہندو امیرزادی ... سے عشق شروع کر دیا۔ عشق جب اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ تو دونوں کی شادی طے ہونے لگی۔ مرحوم آنریبل کٹاری نے اس مہر کی بنیاد پر ایک ہندو ... رکھشک دل قائم کر دیا۔ اور اس شادی کے خلاف ایک عوامی تحریک منظم کر دی ہر شمار ہندو نوجوان اس تحریک میں اپنا خون دینے پر آمادہ ہو گیا۔ جب خون کھولنے لگے۔ تو اخباروں کی بکری بھی بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ ایک اخبار روزنامہ ... کی اشاعت تو اتنی زیادہ بڑھی۔ کہ خطرہ پیدا ہو گیا۔ کہ اس کا مالک منسٹر بن جائے گا ——— مگر روزنامہ "بگاڑ" اس شادی کے حق میں تھا۔ چنانچہ مرحوم کٹاری نے ایک دن بھرے جلسہ میں روزنامہ "بگاڑ" کے ایک سو پرچے سٹیج پر ہی جلا دیئے۔ اور گرج کر کہا۔

——— نوجوانو! ہندو استریوں کے اس زر خرید دلال کو اپنے انتقام کے دوزخ کی آگ میں جھونک دو۔ کہ شاعر نے کہا ہے

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی ٭ اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

دوسرے ہی دن روزنامہ "بگاڑ" کے مالک نے آنریبل مرحوم کماری کو ایک دعوت پر بلا کر انہیں اخبار کی چیف ایڈیٹری کی پیشکش کر دی۔ جو مرحوم نے اس شرط پر قبول کر لی کہ زدوانشنگ جوشا کبھی دوسرے ملک میں جا کر شادی کر لے،

اور یوں آنریبل کماری عشق کی بنیاد پر جرنلسٹ بن گئے۔ اور دوسرے دن اخبار بگاڑ کے پہلے صفحہ پر ان کا قد آدم فوٹو شائع ہو گیا۔ جس کے نیچے لکھا تھا۔

"۔۔۔۔ کماری لارج رکشنگ اندولن کا مانچ ہیرو"

اور اس کے بعد تیس برس تک مرحوم نے جرنلزم میں ایسے ایسے کارنامے نمایاں سرانجام دیے کہ جرنلزم کی تاریخ انگشت بدنداں ہو گئی۔ جرنلزم میں ان کا رنگ بالکل منفرد تھا۔ جس کی تقلید بڑے سے بڑے جرنلسٹ سے بھی نہیں ہو سکی۔ ان کے رنگ کی انفرادیت کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے ۔۔۔

(۱) بھگنان پورہ (۲) ۱۷ جنوری۔

کل صبح شری گنگا رام جمنا داس کماری کو زکام کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ زکام خالص دھارمک نوعیت کا تھا۔ ایک رات پہلے ایک آوارہ گئے کی حفاظت کرنے کے لئے سخت سردی میں باہر سڑک پر سوئے رہے۔ (گائے اور شری کماری کی مشترکہ فوٹو صفحہ پانچ پر ملاحظہ فرمایئے) گائے بھی ایک بیان دینے کے ناقابل ہے۔ لوگ جوق در جوق اس گائے کے درشنوں کے لئے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے شری کماری کو ایک ہفتہ تک آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ مگر شری کماری نے ایک ہنگامی بیان میں کہا ہے کہ جب تک گائے مذکورہ کے لئے ایک کوارٹر الاٹ نہیں کر دیں گے زکام کا علاج نہیں کرائیں گے۔ عوام صورتِ حالات کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔۔۔"

اور یوں مرحوم آنریبل کماری ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ گھوڑوں کی جگہ اخبار نے لے لی، اکھاڑے کی جگہ اسمبلی رکشا سنگھ کے مینا بازار نے لے لی۔ اور جوئے کی جگہ سٹہ بازی نے لے لی۔ کہ بظاہر یہ بھی ایک قسم کا جوا تھا۔ جس میں ۱۹۵۲ء کی بجائے انسانوں کو داؤ پر لگانے تھے۔ ان کے اس ارتقاء میں ممکن ہے، کچھ لوگ شبہ کریں، خود ہندو جاتی بھی شبہ کرے، کیونکہ وہ بعد میں نظریۂ ارتقاء کے حامی ہو گئے تھے۔ مگر حقیقت ہے کہ ارتقاء ایک سائنٹیفک چیز ہے۔ یہ مادے کی تبدیلی کی مختلف حالتوں کا نام ہے۔ گھوڑے سے اخبار کی طرف، اخبار سے میونسپل کمشنری کی طرف، میونسپل کمشنر سے پارلیمنٹ کی ممبری کی طرف اور پارلیمنٹ کی ممبری سے وزارت کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ مادے کا رخ ظالم موت کی طرف ہو گیا۔ ۔۔۔ کیونکہ مادے کا رخ فطرت کی طرف ہوتا ہے، ہندو جاتی کی طرف نہیں ہوتا۔ مادے کے اپنے الگ اصول ہیں۔ ہندو جاتی کے الگ ۔۔۔ اور مرحوم کماری مادہ تھے۔ ہندو نہیں تھے۔ حتیٰ کہ آخری عمر میں تو وہ کارل مارکس کا مطالعہ کرنے لگے تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ "ہندو شاستر اور داس کیپٹل بالکل ایک دوسرے کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔"

آنریبل کماری جب جرنلزم میں حد سے زیادہ شہرت حاصل کر گئے۔ تو ان کی نظر میں بے ۱۹ ہزار کے ایک متمول سوداگر پر پڑی۔ سوداگر مذکور نے ایک دن شراب کے نشہ میں آ کر ہندوؤں کی ایک مقدس پیپل پر غلطی سے جام شراب انڈیل دیا تھا۔ جس کی اطلاع مرحوم کو بھی مل گئی۔ مرحوم نے مظاہرین کا ایک جتھہ تیار کیا اور سوداگر مذکور کی کوٹھی پر پتھراؤ کیا۔ اور کوٹھی کی تمام کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے ۔۔۔ جس پر لاٹھی چارج ہوا۔ چار ہلاک اور ساٹھ افراد زخمی ہوئے۔ ہلاک شدگان کی لاشوں کا پھر جلوس نکالا گیا۔ جس میں پانچ افراد اور ہلاک ہو گئے۔ تیسرے دن تین ہلاک شدگان کی لاشوں کا جلوس ابھی نکلنے والا تھا۔ کہ آنریبل کماری کو تین سال کے لئے ملک بدر ہونے کا آرڈر مل گیا۔ جب وہ تین سال کے بعد وطن لوٹے۔ تو ان کا اتنا عظیم الشان استقبال ہوا، کہ سرکار نے ڈر کے مارے انہیں ایک کلچرل ڈیلی گیشن کا لیڈر بنا کر پھر ملک سے باہر بھیج دیا۔ جہاں

اُنہوں نے کچھ غریب موسیقاروں کو بھنگڑا، ڈانس اور کتھا کلی کی تربیت دی۔ اور لوٹتے ہوئے کچھ سونا بھی سمگل کر لائے ——— اور اٹلی میں کسی قدیم شوجی کے مندر کا ایک تولو بھی ہمراہ لائے جو اُنہوں نے ہیروں کے اُسی سوداگر کو بطور تحفہ پیش کر دیا۔ اتنی بڑی وسیع دنیا کا دورہ کرنے سے اُن کا وژن بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے سوداگر مذکور کو اپنی وژن کی آنکھ میں سُرمے کی طرح ڈال لیا۔

اُن کے وژن کو وسیع ہوئے ابھی چند ہی ہفتے گذرے تھے۔ کہ قضاو قدر کی مرضی سے ایک بوڑھے ممبر پارلیمنٹ کا انتقال ہو گیا۔ اُن دنوں آنریبل کٹاری ایک نئی عوامی تحریک کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کہ دیش کی تمام کچی جھونپڑیوں کو زبردستی گرا دیا جائے ——— اس کے لئے انہوں نے دو ہزار والنٹیر بھی بھرتی کر لئے تھے۔ کہ کسی وطن کے بہی خواہ نے انہیں مشورہ دیا۔ کہ بوڑھے ممبر پارلیمنٹ کی سیٹ کے ضمنی الیکشن لڑیں۔

چنانچہ اُنہوں نے "جھونپڑیاں گرا دو" کے سیاسی نعرہ کی بنیاد ہی پر یہ الیکشن لڑا۔ اور برسرِ اقتدار پارٹی کے ایک لیڈر کو جو شومئی قسمت سے ایک پکے بنگلہ ہی رہتا تھا، شکست دے کر کامیاب ہو گئے۔ حلف اُٹھانے کے فوراً بعد برسرِ اقتدار پارٹی کے سیکرٹری نے انہیں اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی۔ جو انہوں نے ملک کے وسیع تر مفاد کی خاطر قبول کر لی۔ اور اس سے ان کا وسیع تر وژن اور بھی وسیع ہو گیا۔

——— جھونپڑیاں اپنے گرنے کا انتظار کرتی رہیں۔ اور جو جھونپڑیوں کا لیڈر محلوں میں پہنچ گیا۔ ارتقا میں کئی مرتبہ عمل تیز اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ تعدادی تبدیلی یکدم خصلتی تبدیلی اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ جھونپڑی صرف تعدادی تھی اور محل ایک خصلت ——— اور تبدیلی مادے کی خصلت ہے۔ اور آنریبل کٹاری نہ ہندو تھے، نہ جھونپڑی تھے، نہ بھنگڑا تھے ——— خالص مادہ تھے۔

ممبر پارلیمنٹ بن کر مرحوم آنریبل کٹاری نے بہت سی نادر قومی خدمات سر انجام دیں ——— جس کا عوام نے صدقِ دل سے اعتراف کیا۔ اگرچہ اس اعتراف کے ساتھ ہی ساتھ اُن پر کچھ اور الزام بھی لگائے گئے۔ مثلاً یہ کہ انہوں نے زرعی مسائل حل کرتے کرتے اپنی ایک آنہ گز خریدی ہوئی بنجر زمین پچاس روپیہ فی گز فروخت کی۔ کہ انہوں نے پہلوانی کے فن پر ایک کتاب لکھ کر ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور سکولوں میں لگوا دی۔ کہ انہوں نے اپنے کئی میٹرک فیل رشتہ داروں کو یونانی طب کا مطالعہ کرنے کے لئے سرکاری خرچہ پر یونان بھیجا۔ کہ انہوں نے ایک معصوم اور بھولی بھالی دوشیزہ پریم کماری دتہ کے ساتھ بیاہ کر لیا۔ کئی شاعروں کو سرکاری وظائف دلا کر اُن سے اپنے جلسوں کے لئے نظمیں لکھوائیں ——— مگر یہ سب الزامات تحقیق کے بعد غلط نکلے اور ثابت ہو گیا کہ انہوں نے یہ تمام سرگرمیاں کی ضرور ہیں مگر آئین اور قانون کی حدود کے اندر رہ کر کی ہیں۔

مرحوم نے اپنی عمر کے آخری چند برسوں میں مختلف یونیورسٹیوں میں "خدا کے ہندوستانی تصور" پر لیکچر دیئے۔ خدا کی شان کہ خدا کے غلط تلفظ کرنے پر جس شخص کا دانت ٹوٹ گیا تھا، وہ وقت پر خدا کے نہ صرف ہجے بلکہ معانی تک صحیح صحیح کرنے لگا۔

جیسا کہ بڑے آدمیوں میں رواج ہے، مرحوم کی موت بھی ہارٹ فیل سے ہوئی۔ ایک افواہ یہ بھی اُڑائی گئی کہ مرحوم اپنی پارٹی میٹنگ میں ایٹم انرجی کے مسائل پر بحث کر رہے تھے کہ کسی مخالف ممبر نے ان پر پھبتی کسی کہ پکوڑوں اور ایٹم انرجی میں بنیادی فرق ہوتا ہے ——— وہ کرسی پر ہی بے ہوش ہو گئے اور پھر نہ اُٹھ سکے۔ اُن کی موت پر جو ماتمی جلسہ ہوا۔ اُس کی صدارت مرحوم کی آخری بیوی پریم کماری دتہ نے کی۔ سامعین نے کھڑے ہو کر پریم کماری دتہ سے مطالبہ کیا۔ کہ مرحوم کی خالی سیٹ پر وہی الیکشن لڑیں۔ تاکہ مرحوم کے ادھورے کاز کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں پریم کماری نے گلوگیر لہجہ میں یہ پیشکش قبول کر لی۔

———— ————

مسعود مفتی

بے زبانی

جرمنی میں پروفیسر صاحب بے اختیار یاد آ گئے۔

ایف ایس سی میں تو کبھی اُن کی بات مانی نہیں۔ وہ بیالوجی کے قابل اُستاد اگر تھے تو ہوا کریں پیغمبر تو نہیں تھے۔ کہ اُن کی ہر بات درست ہی ہو۔ کہنے لگے انسان بھی حیوانات کی ایک قسم ہے اور بیالوجسٹ اسے حیوان ہی کہتے ہیں۔ اب ہم کیسے مان لیتے۔ گدھے اور اونٹ میں ہمیں تو کوئی چچا ماموں والی بات نظر آئی۔ ہم ٹھہرے اشرف المخلوقات۔ اگر حیوان ہیں بھی تو گرے پڑے تو نہیں۔ حیوانِ ناطق ہیں۔ بول لیتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ تقریر کریں تو دل ہلا دیں، رزمیہ اشعار پڑھیں تو فوجیں ٹکرا جائیں۔ فصاحت کو استعمال میں لائیں۔ تو بروٹس کو قتل کروا دیں۔ جب تک نطق ہے ہم حیوان نہیں بالکل نہیں۔

لیکن جب میونخ پہنچے تو نطق جواب دے گیا۔ جس سے بات کی وہ سمجھا ہی نہیں۔ انگریزی، اُردو، پنجابی، ٹوٹی پھوٹی جرمن سبھی کچھ آزما ڈالا لیکن بے سود۔ اب حیوانِ ناطق کا نطق اگر فیل ہو جائے تو باقی حیوان ہی حیوان تو رہ جاتا ہے نا۔ اس لئے ہمیں پروفیسر صاحب کی بات میں کچھ وزن معلوم ہونے لگا بعد میں جب ایک چڑیا گھر میں گئے تو بالکل قائل ہو گئے کیونکہ جب ہم نے ایک بڑے بے نیاز سے اونٹ سے پوچھا "او میاں! یہاں ہٹلر کی محبوبہ کا مکان کدھر ہے؟" تو اُس نے عاشقانہ افسردگی کے ساتھ گردن ایک طرف اٹھا کر سر ہلا دیا اور جب ہم اُس طرف گئے تو ٹھیک جگہ پہنچ گئے۔

کیمرج کی یونیورسٹی لائبریری کے لان میں بیٹھ کر جب یورپ کی سیر کا پروگرام بن رہا تھا۔ تو زبان کی دقت کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تھا۔ گرو جی اپنے مخصوص انداز میں پائپ جھٹک کر بولے۔

"سب ہو جائے گا ــــــ چلو تو سہی۔ . . . . . . انگریزی بولنے والے بہت مل جائیں گے" مرسیہ آلمیٹ جو تین ہفتے لاہور میں فرانسیسی زبان پڑھ چکے تھے۔ اپنی جیب پر ہاتھ مار کر بولے "فرانس میں میں سنبھال لوں گا"

کاکا نے حسبِ عادت پچیس تیس مشہور مقامات کے نام گن دیئے جو اُس نے لوگوں سے سنے تھے۔ یا کتابوں سے رٹے تھے۔ اور اپنے چھوٹے قد پر اُچھال کر بولا۔

"میں تمہیں ہر جگہ لے چلوں گا ــــــ فکر نہ کرو"

کوائیٹ صاحب اپنی خاموشی کے باوجود اور شتر آفندی اپنی لمبائی کے باوجود اُن کے اعتماد کی مار کھا گئے اور ہر چہ بادا باد کہتے ہوئے زائرین کی یہ برات چل پڑی لندن کے وکٹوریہ سٹیشن پر کوائیٹ صاحب ایک بُک سٹال میں لپکے چلے گئے اور "پالیا: پالیا" کے نعرے لگاتے برآمد ہوئے انہوں نے ایک ڈکشنری خریدی تھی۔ جس میں گفتگو کے فقرے اس طرح دیئے تھے کہ پہلے انگریزی میں اور پھر اُس کے مقابل فرانسیسی۔ جرمن اطالوی وغیرہ کوئی چھ سات یورپی زبانیں تھیں۔ اس کلید کامیابی کو لئے ہم بڑے پرامید ہو کر رودبارِ انگلستان کو عبور کرنے لگے۔

لیکن جب یورپ پہنچے تو سب ہتھیار بے کار ثابت ہوئے۔ انگریزی بولنے والے اوّل تو بڑے شہروں کے علاوہ ملتے ہی نہ تھے اور جو ملے

بھی تو اتنے کم کر دیئے گئے کہ ان گنت مشکلات کا ہر وقت حل نہ مل سکتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہُوا کہ انگریزی جاننے والا ملا بھی تو بے فائدہ۔ کیونکہ ہم میں سے بعض تو انگلش پنجابی میں بولتے تھے۔ جیسے انگریزی کی ہیر وارث شاہ پڑھ رہے ہوں۔ اور بعض براؤن انگلش مین تھے۔ جن کی انگریزی پاکستان میں اس لئے مثالی سمجھی جاتی تھی کہ انگریز کیسے بولتے ہیں۔ اور انگلستان جا کر اس لئے مثالی بن گئی کہ انگریز کیسے نہیں بولتے۔ پھر یوں بھی ہوتا تھا۔ کہ ہمارا مخاطب انگریزی اپنے کو سپڑ جانان کے تلفظ میں بولتا تھا۔ حاصل ضرب ہر حالت میں یہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ ہماری نہ سمجھتے یا ہم اُن کی نہ سمجھتے۔ غالب تو کہہ گئے کہ

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا میں
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!!

لیکن وہاں بار بار سمجھانے پر جب کوئی نہ سمجھتا تو اپنے اوپر جنونی کیفیت طاری ہونے لگتی مجبوراً اشاروں کی عالمگیر زبان کا سہارا لیا تو تھوڑی دیر بعد یہ حال ہو گیا۔ کہ زبان کا کام زبان کے علاوہ جسم کے ہر حصے سے لیا جانے لگا۔ کئی دفعہ پولیس والے اِدھر اُدھر سے منہ پھاڑ کر اکٹھے ہونے والے راہگیروں کو سمجھاتے کہ سڑک پر کھڑے چار پانچ "ڈوارف براؤنز" جو ہوا میں ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں۔ اور قلابازیاں لگا رہے ہیں۔ وہ کسی مشرقی سرکس کا اشتہار نہیں دے رہے۔ بلکہ راستہ پوچھ رہے ہیں۔

جرمنی میں ایک جگہ ہم اپنے ہوٹل کا نام اور راستہ بھول گئے اتنا یاد تھا کہ ہوٹل کے قریب سڑک ایک پل پر سے گزرتی ہے جس کے نیچے سے گاڑی جاتی ہے۔ ایک راہگیر کو گھیر کر ہم اس پل کا پتہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب سب اشارے ناکام ہو گئے تو گردیجی کی ڈرامے کی رگ پھڑکی۔ انہوں نے فوراً ریل کی پٹڑی کی طرح دو متوازی لکیریں کھینچیں اور ان پر دھواں اڑاتا پائپ انجن کے انداز میں چلانے لگے پھر کاکے سے کہا کہ وہ اوپر سے کود جائے اب کاکا ایسی شخصیت ہے جس نے پہلے تو عموماً پھلانگنے میں کوتاہی کی۔ اور بعد میں معذرت کے طور پر اُردو گر وِھپلنا شروع کیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ انگلینڈ میں جا کر مشینوں کا خالص دودھ جو ملا تو چھبیس سال کی عمر میں ہی گلیلسو بے بی بن گیا۔ جسم کے حصوں کا فرداً فرداً ذکر تو بداخلاقی ہو گی صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر کسی ایٹمی جنگ میں خدانخواستہ اہرامِ مصر تباہ ہو گئے تو مصر والے کاکے کی پتلون کے پائنچے آسمان کی طرف کر کے نہایت کامیابی سے دنیا کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ ایسی مخلوق کا پھلانگنا یورپ جیسے ترقی یافتہ برِاعظم کے لئے بھی نئی چیز تھی۔ چنانچہ ہمارے رہبر نے پہلے تو حیرانی سے منہ بنا لیا۔ پھر باچھوں سے سارے اپنی جگہ بدل کر مسکرانے کے انداز میں پھیلے اور وہ تالی بجا کر قہقہہ لگانے لگا۔ چشم زدن میں اس نے کیمرہ کھول کر آنکھ سے لگا لیا اور اشاروں سے منت کرنے لگا۔ کہ کاکا ایک دفعہ پھر کرے تاکہ وہ فوٹو لے سکے۔ شریف آدمی نے یہ بھی نہ سوچا کہ یورپ میں فوٹو کے لئے جو نازک اندام ماڈل مل جاتے ہیں۔ کاکے کا وزن ان سے کئی گنا زیادہ تھا۔

کاکے کی پھلانگ کا بدل ہمارے پاس ایک مناسب کی موٹی ڈکشنری تھی۔ جس سے شمسان علاقوں میں ہم سوداگروں کو ڈراتے تھے اور آبادی میں لوگوں سے بات چیت کرنے میں مدد لیتے تھے۔ اس میں مختلف عنوانات سے مختلف موقعوں کے متعلق گفتگو کے کئی طریقے جملے دیئے ہوئے تھے۔ سٹیشن پر، ریستوران میں، ہوٹل میں۔ ڈاکٹر کے پاس۔ حجام کی دکان میں۔ ہر جگہ کام چل جاتا تھا۔ لیکن جب استعمال کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ جو فقرے کتاب میں دیئے گئے ہیں اُن کی اس انداز میں کہیں ضرورت نہیں پڑتی اور جن کی ضرورت پڑتی ہے وہ اس انداز میں کتاب میں نہیں دیئے گئے۔ دوسری مشکل یہ تھی۔ کہ ڈکشنری اپنی موٹائی کے باوجود حروف کی آوازوں کے بارے میں خاموش تھی۔ اس لئے جب ہم مختلف زبانوں کے فقرے پڑھتے تو تلفظ کچھ ایسا ہی ہوتا جیسا کوئی "سکاچ" (Scotch) کو "سکاچ" پڑھے۔ یا کوئی ایک (COGNAC) کو "کاگ نیک" اور "لائسٹر" (LIECESTER) کو "لائی سسٹر" پڑھے۔ عام طور پر ہماری تکنیک یہ ہوتی تھی۔ کہ پہلے ورق گردانی کر کے متعلقہ سوال ڈھونڈا جاتا۔ پھر کسی معصوم راہگیر کو تاڑ کر باقی لوگ اس کے گرد گھیرا ڈال

بیٹھے کہ کہیں بھاگ نہ جائے اور ایک آدمی اکھڑے ہوئے سانسوں میں ڈکشنری سے فقرہ پڑھتا۔ ہمارے تلفظ کا ردِ عمل ہر مخاطب پر بقدرِ ظرف مختلف ہوتا کوئی تو ایسا منہ بناتا۔ جیسے کونین پی رہا ہے۔ کوئی ایسے لگتا جیسے بچے کو رونے سے عین پہلے چھینک آجائے۔ اور کوئی ہمیں غیر ملکی سمجھ کر بے معنی مسکراہٹ سے رواداری کا بھرم رکھتا۔ سمجھنے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا کیونکہ اگر ہم سے کوئی غیر ملکی اردو دان "جھی نزہ" کہے تو ہم کیا خاک سمجھیں گے کہ اس کا مطلب "جہیز" ہے۔ اس تکنیک کا ایک پہلو یہ بھی تھا۔ کہ جس کے ہاتھ میں ڈکشنری ہوتی اسے سخت شدت سے ڈھونڈنے کے باوجود متعلقہ فقرہ اُس وقت تک نہ ملتا تھا۔ جب تک مس سمارٹ قسم کی کوئی چیز قریب نہ آجاتی۔ لیکن بعد میں ہم اُن سے پہلو بچانے لگے۔ کیونکہ ایک دفعہ لوزان میں اپنی تکنیک کے مطابق جب ایک لڑکی کو گھیرے میں لیا۔ تو پولیس کے دو تیرہ سپاہی اُس کی مدد کو بھاگے آئے۔ گو یہ علیحدہ بات تھی۔ کہ جب ہم نے ڈکشنری کا منہ اُن کی طرف موڑ کر اپنی تکنیک اُن پر آزمائی تو وہ لڑکی کو فرضی خطرے میں گرفتار چھوڑ کر خود بھاگ کھڑے ہوئے۔

جرمنی سے گزر کر جب سوئٹزرلینڈ پہنچے تو یہی ڈکشنری مزاجِ محبوب کی طرح معمہ بن گئی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے تجربات نے ہمیں اتنی عقل دی تھی۔ کہ فقرہ بولنے کی بجائے ہم ڈکشنری کھول کر اس فقرے پر انگلی رکھ کر لوگوں کو پڑھا دیتے۔ بسوں اور ٹراموں میں زیادہ تر سفر اسی طریقے سے کیا۔ ایک ہاتھ میں نقشہ۔ اور دوسرے میں ڈکشنری۔ پہلے کنڈکٹر کو نقشے پر مقام بتاتے اور پھر ڈکشنری میں سے یہ دو فقرے پڑھوا دیتے جن کے نیچے سُرخ نشان لگایا ہُوا تھا۔

"کیا آپ مجھے ——— جگہ کے قریب اتار دیں گے۔

"جب سٹاپ آئے تو براہِ کرم مجھے بتا دیں۔

کنڈکٹر اور گرد کے مسافر قہقہہ لگا کر ہنستے۔ اشاروں سے یقین دلایا جاتا۔ سارا راستہ مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے اور اسی سٹاپ پہ ہمیں اتار دیا جاتا۔ اور جب ہم اُتر کر "ڈنکے شون" (شکریہ) کہتے تو سب لوگ پھر ہنستے اور ہمارا سفر پورا ہو جاتا۔

لیکن جب سوئٹزرلینڈ پہنچے تو وہاں تین زبانوں سے پالا پڑا۔ جرمن، فرانسیسی اور اطالوی۔ ڈکشنری کی گذشتہ کامیابی کی وجہ سے ہم مطمئن تھے کہ کام ہو جائے گا۔ لیکن جب استعمال کرنے لگے تو دیکھا کہ ڈکشنری کے ہر صفحے پر انگلش کے علاوہ چھ کالم تھے۔ جن کے اُوپر یہ نہیں لکھا تھا۔ کہ یہ کون سی زبان ہے نتیجہ یہ ہُوا کہ اکثر اوقات ہم اطالین بولنے والے کو پولش کا فقرہ دکھا رہے ہوتے اور جرمن بولنے والے کو روسی زبان کا پڑھنے والے کبھی کتاب کو تکتے اور کبھی ہمیں۔ اور ہمیں اُس سے کہیں زیادہ ہونق سمجھتے جتنا کہ ہم اُن کو سمجھ رہے ہوتے۔

جب اس قسم کے پریشان کن حادثے کئی دفعہ ہوئے تو میٹنگ کے بعد طے پایا کہ ڈکشنری کو حمائل شریف کی طرح گلے میں لٹکا لیا جائے اور جس طرح مسلمان قرآن سمجھے بغیر اس کو گلے میں لٹکا کر یا کپڑوں کے صندوق میں رکھ کر برکت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح ڈکشنری گلے میں لٹکا کر زبانوں کے علم سے مستفید ہُوا جائے۔ لیکن جینوا میں سٹرپ ٹیز کے فوارے کے پاس ایک اور میٹنگ کرنا پڑی۔ کیونکہ سات زبانوں کے بوجھ کو اٹھا کر ہم میں سے کوئی بھی دن بھر مارچ کرنے کو تیار نہ تھا۔ خصوصاً جب جینوا میں انگریزی بولنے والے اکثر مل جاتے تھے۔ بالآخر پورے ملٹری اعزاز کے ساتھ ڈکشنری جھیل جینوا میں گرا دی گئی اور اُس کی یاد میں دو منٹ کی خاموشی کی گئی۔

ڈکشنری کا ساتھ چھوٹا تو کلیتہً" اشاروں کا استعمال کرنا پڑا۔ اگر کبھی بولنے پر مجبور بھی ہوئے تو انگریزی کی بجائے پنجابی بولی۔ کیونکہ ایک تو گذشتہ چھ ماہ سے کیمبرج یونیورسٹی میں ہر وقت انگریزی بول بول کر اپنے جبڑے دکھنے لگ گئے تھے۔ اور دوسرے غیر ملک میں انگریزی اور پنجابی کا وہی حال تھا۔ جو مختلف عورتوں کی اضافی خوبصورتی کا ہوتا ہے ویسے بھی کسی بوڑھی عورت کو میڈموزیل یا سینوریٹا کہنے میں گلے کو جو ناگوار ورزش کرنا پڑتی

ہے۔ وہ "بے بے" کہنے سے بالکل نہیں ہوتی تھی۔ اور جب سوٹ بوٹ میں ملبوس پائپ پینے والے کسی معزز بوڑھے کو ہم "چاچا" کہہ کر پکارتے تو غیر ملک میں احساسِ اجنبیت ختم ہو جاتا اور تسکین سی ہوتی۔ بعد میں تو ہم فرانک۔ لیرا۔ مارک۔ فینی وغیرہ کو روپیہ۔ اٹھنی۔ چونی وغیرہ کہنے لگے اور اس سے چیزوں کی قیمتوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ لیکن ہمیں کرنسی کے استعمال میں بڑی آسانی ہو گئی۔

اشارے البتہ کافی پریشان کن ثابت ہوئے۔ سوئٹزرلینڈ میں ہمارا داخلہ بالکل اُن حاجیوں کی طرح تھا جو حج سے زیادہ عرب کا سستا سونا خریدنے کے لئے جاتے ہیں۔ سوائے میرے سبھی لوگ گھڑیاں خریدنے کے لئے تلملا رہے تھے۔ سارے گروپ میں صرف میرے پاس گھڑی تھی۔ اور باقی سب لوگ خالی کلائیاں کندھوں پر رکھے گھڑیوں کی تلاش میں تھے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ لوزان تھا۔ جس کے متعلق سُنا تھا۔ کہ وہاں گھڑی سازی کا گھریلو انڈسٹری ہے اس لئے خیال تھا کہ اُس شہر میں ہر طرف ڈائل چمک رہے ہوں گے۔ پنڈولم ہل رہے ہوں گے۔ اور فضا میں گھڑیالوں کی ٹن ٹن گونج رہی ہو گی۔ لیکن وہاں پہنچے تو کھودا پہاڑ نکلا چوہا کا سماں نظر آیا۔ گھڑیوں کی دکانیں تو ایک طرف رہیں۔ عام وقت دیکھنے کو بھی گھڑی نہ ملی ایک دکان میں غالباً سجاوٹ کے لئے ایک گھڑی پڑی تھی۔ جس کی سوئیاں غائب تھیں۔ شاید کوئی ابدی لمحہ بتا رہی تھی۔ ایک مینار پر ایک گھڑیال دیکھا جو شام کے چار بجے دس بجا رہا تھا۔ خدا معلوم دن کے یا رات کے شک دور کرنے کے لئے ایک راہگیر سے وقت پوچھا تو وہ خالی بازو دکھا کر گھڑی نہ ہونے کی معذرت کرنے لگا۔ ستم بالائے ستم یہ تھا کہ میری گھڑی بھی وہاں پہنچ کر گم ہو گئی۔ گھڑیوں سے مایوس ہو کر ہم اُس شہر کی بے مثالی خوبصورتی میں ڈوب گئے۔ لیکن کوائیٹ صاحب بڑے بے چین تھے۔ کیونکہ ان کو اپنی گھڑی کے علاوہ ایک لیڈیز واچ بھی خریدنا تھی۔ جس کا جواز وہ باوجود ہمارے اصرار کے بتاتے نہ تھے۔ گو ہم سب جانتے تھے کہ وہ اس قسم کے حالات میں گھرے تھے۔ بھانجے بھتیجی۔ ماموں زاد قسم کے لوگ بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ اور گھڑیاں وغیرہ خریدنا ایک فرض بن جاتا ہے چنانچہ اگلی صبح کوائیٹ صاحب نے ایک گنجے آدمی کو گھیر لیا۔ انگریزی آزمائی۔ لیکن وہ اس کے گنجے سر سے صاف پھسل گئی۔ گرو جی نے آگے بڑھ کر کمان سنبھالی اور اشاروں کے ترکش میں سے ایک تیر نکالا۔ سامنے مینار پہ گھڑیال کی طرف اشارہ کر کے اُنہوں نے دائیں ہاتھ کی بڑی انگلی اور انگوٹھے کو بائیں ہاتھ کی کلائی کے گرد چھلا بنا کر لپیٹ لیا اور سر کے اشارے سے پوچھا "کدھر ہے"؟

گنجے صاحب نے ایسے کھلکھلا کر سر ہلایا۔ جیسے ہمارا مطلب سمجھ گئے ہوں۔ اور ہاتھ ہلا کر ہمیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا لوزان پہاڑی نشیب و فراز پر واقع ہے۔ اس لئے کئی دفعہ ہم چڑھائی چڑھے۔ کئی دفعہ ڈھلانوں سے لڑھکتے چلے آئے۔ اور سینکڑوں سیڑھیاں اتر چڑھ کر جب گھٹنے چوں چوں کرنے لگے۔ تو وہ خدا خدا کر کے ایک دکان کے سامنے رک گیا۔ دکان بند تھی۔ اُس نے بالکل گرو جی کی طرح گھڑیال کیطرف اشارہ کیا۔ جس پر نو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ پھر پانچوں انگلیاں پھیلا کر دکھائیں۔ اور بند دروازے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا۔ ہم سمجھ گئے کہ دکان نو بجے کھلے گی۔ بڑی زوردار مسکراہٹوں سے سر ہلا ہلا کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔ دوسری دکانوں کے برعکس اُس کا کوئی شوکیس نہ تھا اس لئے کھلنے سے پہلے اندازہ نہ ہو سکا کہ کس قسم کی گھڑیاں وہاں مل سکتی ہیں۔ لیکن جب دکان کھلی تو وہ جیولری کی تھی۔ چونکہ جیولر بھی گھڑیاں رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم خاموش رہے گو وہاں گھڑی کوئی نظر نہ آئی۔ ہمارے رہبر نے سیلز گرل سے کچھ کہا تو وہ یورپی لوگوں والی مشینی مسکراہٹ سے نیلی مخمل کی ٹرے ہمارے سامنے بچھا گئی۔ اور پھر اُس میں لا کر کچھ رکھنے لگی ہم نے غور سے دیکھا تو وہ بریسلیٹ (BRACELET) تھے۔ جو یورپ میں لڑکیاں کلائی کے گرد باندھتی ہیں دریں اثناء ہمارا گنجا رہبر بڑے پرمعنی انداز میں مشفقانہ مسکراہٹیں ہم پر نچھاور کرتا رہا۔ جن کا واضح مطلب یہ تھا۔ "چھوکرو عیش کرو۔ تمہاری تو جوانی کی عمر ہے"

خوش قسمتی سے سیلز گرل گھڑی باندھے تھی۔ ہم نے فوراً بتایا کہ ہمیں گھڑیاں چاہئیں۔ گنجے راہبر کے چہرے پہ مایوسی کی لہر دوڑ گئی جس کا صاف مطلب یہ تھا "ارے یہ لوگ تو بالکل نکمے نکلے"۔ بہر حال باہر نکل کر اُس نے سامنے والی پہاڑی پر ایک سرخ رنگ کی دکان کی طرف اشارہ کیا۔ ہم شکریہ

ادا کر کے چل تو دیئے لیکن تھوڑے فاصلے بعد ہی معلوم ہو گیا کہ پہلے سے چار گنا زیادہ سیڑھیاں چڑھنا ہونگی۔ اور کئی گنا زیادہ اتار چڑھاؤ ہوگا۔ چونکہ اتنی کڑی مہم سر کرنے کے لئے کسی کے پاس وہ ایٹمی قوت نہ تھی جو کوائٹ صاحب کو آگے چلا رہی تھی۔ اس لئے اکثریت کے ووٹ سے لوزان میں گھڑی نہ خریدنے کی قرارداد پاس کی گئی۔ ورنہ جو پہنچے تو وہاں بھی گھڑیوں کی دکانیں بہت کم تھیں۔ اور ہم بغیر بانسوں کی بریلی پر حیران ہوتے ہوئے جینوا کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچے تو البتہ معلوم ہوا کہ واقعی سوئٹزرلینڈ میں گھڑیاں بنتی ہیں۔ سب سے پہلے تو سٹیشن سے کچھ دور سڑک کے کنارے پھولوں کی گھڑی نے ہمارا استقبال کیا۔ جس کی بڑی بڑی سوئیاں زمین پر پھیلے ہوئے پھولوں کے ڈائل پر کانپ کانپ کر چل رہی تھیں۔ ذرا آگے بڑھے تو گھڑیاں زیادہ ہو گئیں۔ اور سوئٹزرلینڈ گم۔ دروازوں پر۔ درختوں پر، خوانچوں میں، دکانوں میں، ہر طرف لال پیلے پنڈولم بسنت کے پتنگوں طرح ہل رہے تھے۔ کہیں چڑیا بیٹھی دُم ہلا رہی ہے ذرا دیکھنے لگیں تو منہ کھول کر ٹن ٹن پکار اٹھے گی۔ آپ ایک خوبصورت لائٹر دیکھ کر ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ یہ گھڑی ہے۔ ایک گڑیا بیٹھی مسلسل جھولا جھول رہی ہے غور سے دیکھیں تو جھولا کسی کلاک کا پنڈولم نظر آتا ہے۔ نوبت بایں جا رسید کہ اگر کوئی داڑھی والا نظر آیا تو ہم سمجھے کہ داڑھی کسی گھڑی کو چلا رہی ہو گی۔ ایسے میں ہمارے خریداروں کی دماغی حالت اس گدھے کی سی تھی جس کے سامنے گھاس کا ڈھیر رکھا گیا تو اُسے سخت بھوک کے باوجود پتہ نہ چلتا تھا۔ کہ شروع کدھر سے کرے۔ بہرحال ایک کشادہ سی دکان میں داخل ہو گئے۔

ایک گول مٹول سی گڑیا لپکی چلی آئی۔ "کین آئی ہیلپ یو" ہم اچھل پڑے۔ انگریزی زبان سُنی تو سمجھی کمریں کھولنے لگے۔ کہ بس جی یہیں سے گھڑیاں خرید کر ہی نکلیں گے اور جب ہم نے اپنی ضرورت بتائی تو وہ ایک ایک کے چہرے کو دیکھتے ہوئی بولی "سستی یا مہنگی؟" ————

"مہنگی" ! گرو جی کا ہمیشہ سے یہ اصول ہے کہ پہلے لوگوں پر رعب ڈالو۔ خواہ بعد میں دب جاؤ۔

"درمیانی !" کوائٹ صاحب یہ نہ بھولے کہ انہیں دو خریدنا ہیں۔

"سستی !" میں نے سوچا کہ ممکن ہوا تو کسی کے لئے تحفہ ہی لے چلیں گے کیونکہ جینوا پہنچ کر اپنی گم شدہ گھڑی ایک رومال کی تہ میں سے برآمد ہو گئی تھی۔

لڑکی نے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کاؤنٹر پر بھیج دیا۔ شتر آفندی، موسیو آملیٹ اور کوائٹ صاحب ایک طرف چلے گئے اور کالا اس خیال سے گرو جی کے ساتھ چلا گیا۔ کہ پہلے تو تھوڑا سا رُعب جما لیں بعد میں ہلکی سی خرید لیں گے۔

سیلز گرل نے میرے سامنے درجن بھر کے قریب گھڑیاں لا کر رکھ دیں۔ میں بڑے اطمینان سے انتخاب کرتا رہا اور دل ہی دل میں جیب کا حساب لگا کر اندازہ کرتا رہا کہ اگر اتنے تک مل سکے تو فلاں کے لئے تحفہ ٹھیک رہے گا۔ بالآخر فیصلہ کر کے میں نے اس اعتماد سے قیمت پوچھی جیسے بہت سی عیدی ملنے والا بچہ میلے میں چاٹ کے دام پوچھتا ہے۔

"پانچ سو فرانک" (ایک فرانک ایک روپے سے ذرا زیادہ ہوتا ہے)

میں نے گھڑی فوراً رکھ دی۔ ڈرتے ڈرتے دوسری اٹھائی۔

"سات سو تیس فرانک"

حلق خشک ہو گیا۔ کانوں میں گھڑی کی ٹک ٹک ہونے لگی۔ اور مری ہوئی آواز میں بہانہ لگایا۔ "میں ذرا دوسرے کاؤنٹر دیکھ لوں تو انتخاب میں آسانی ہو گی"۔ مڑ کر جو دیکھا تو EXIT کے بورڈ کے نیچے گرو جی اور کالے کے پاؤں کی متحرک ایڑیاں نظر آئیں اور غائب ہو گئیں۔ دوسرے کاؤنٹر پر موسیو آملیٹ، کوائٹ صاحب اور شتر آفندی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جوں توں کر کے باہر نکلے تو کسی نے دوسرے کو نہیں بتایا کہ اس پر کیا گزری اور سب خاموشی سے کسی چھوٹی دکان کی تلاش میں چل دیئے۔ میں تحفہ دینے کا خیال ترک کر چکا تھا۔

اشاروں کا دوسرا حادثہ روم میں پیش آیا۔ سارے دن کی آوارہ گردی کے بعد سخت تھکاوٹ اور شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ کالوسئیم کے آس پاس کوئی ریستوران نظر نہ آیا گرو جی تو تنگ میں تھے ایک پولیس والے کے پاس پہنچ گئے۔

"سنتری جی۔ ایتھے کوئی تندور ہے فالسے ؟"

پولیس والا مجسم انکساری بن گیا۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر مسکراتا ہوا تھوڑا آگے جھک کر سُننے لگا۔ انگریزی چابولی گئی۔ لیکن بے سُود۔ تب گرو جی نے ہاتھ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے کھانے کا اشارہ دیا۔ پولیس والے کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔ اُس نے حیرانی سے گرو جی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ چند لمحے سوچا۔ اُس کی آنکھوں میں ہم نے ترس کی جھلک دیکھی۔ پھر بڑی بے دلی سے اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ نقدی نکالی۔ اُسے ہتھیلی پہ رکھ کر کچھ ڈھونڈا اور پھر غالباً چھوڑ نا سکنے نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ کی تیز حرکت سے گرو جی کو جانے کا اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو" جاؤ بابا معاف کرو"

اسی طرح روم میں سینٹ پیٹرز چرچ کی سیڑھیوں پہ بیٹھے تھے کہ باوجود پوپ کے زیرِ سایہ ہونے کے سردی محسوس ہونے لگی۔ روم میں جولائی میں سردی کچھ عجیب سی لگی۔ کیونکہ جب ہم وہاں پہنچے تو یورپ میں پہلی دفعہ مکھیوں کے غول سے پالا پڑا۔ چوری ہوئی ٹیکسی ڈرائیوروں اور ہوٹل والوں نے دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ مذہب کے نام پہ سادہ لوح ایمان والوں کی جیب لٹتی دیکھی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے ہم محسوس کر رہے تھے۔ گویا پاکستان میں ہی ہیں اس لئے جولائی میں سردی کچھ غیر معمولی چیز معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ گرم کپڑے پہننے کی بجائے موسیو آملیٹ نے اپنی مرغوب تجویز پیش کی کہ کہیں سے انڈے خریدے جائیں۔ اور اُبال کر کھائے جائیں۔ اسی تلاش میں ایک سٹور میں پہنچ گئے۔ عام طور پر روم میں انگریزی بولنے دکاندار مل جاتے ہیں یا کسی دکان پہ لکھا ہوتا ہے "یہاں امریکن بولی اور سمجھی جاتی ہے" لیکن جب غریب روزے رکھتے ہیں تو دن بڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں کوئی ڈھنگ کی دکان نہ ملی۔ مجبوراً اشاروں پہ اُتر آئے۔ انگلی اور انگوٹھے کو انڈے کی موٹائی کے برابر کھول کر جسامت بتائی اور ساتھ ایک سفید کاغذ دکھا کر رنگ کا اندازہ کر دیا۔

سیلز گرل نے پہلے تو بھنویں سکیڑ کر کچھ سوچا اور پھر ایک دم "سمجھ گئی" کے طریقے سے سر ہلایا۔ اگلے لمحے ایک گتے کا بڑا سا ڈبہ کاؤنٹر پر رکھے وہ کھول رہی تھی۔ ہم حیران ہوئے کہ یہاں انڈے گتے کے ڈبوں میں رکھتے ہیں تو کوائیٹ صاحب بولے "بھئی یورپ مہذب علاقہ ہے ممکن ہے یہاں مُرغیاں انڈے ڈبوں میں دیتی ہوں"۔ اور جب لڑکی نے سفید سی گول چیز نکالی تو کوائیٹ صاحب کی بات کافی وزنی معلوم ہوئی۔

لیکن جب اُس نے لا کر موسیو آملیٹ کے ہاتھ پر رکھا تو وہ ٹیبل ٹینس کا بال تھا۔ اُسے دیکھ کر ہم ہنسے بھی اور روئے بھی۔ روئے اس لئے کہ وہ انڈہ نہ تھا اور ہنسے اس لئے کہ شکر ہے انڈے سے کافی ملتی جلتی شے تھی۔ اصل چیز لینے میں زیادہ وقت نہ ہو گی۔ اشاروں کا دوسرا کورس کیا گیا لیکن اُس کے پلے نہ پڑا۔ تب شتر آفندی نے کاؤنٹر کی اوٹ میں ہو کر ہاتھ کانوں پہ رکھے۔ کُہنیاں پھڑپھڑائیں اور مرغے کی اذان کی آواز دی۔ یہ بھی شکر تھا کہ وہاں کے مرغے یورپی ہونے کے باوجود اذان پاکستانی طریقے سے ہی دیتے ہیں۔ اس لئے لڑکی فوراً سمجھتے ہوئے ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور ہمیں لے کر دکان کے دوسرے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چلدی۔ ادھر ہم ڈر رہے تھے۔ کہ چونکہ مرغ کی آواز شتر آفندی نے نقل کی تھی۔ اس لئے کہیں وہ شتر مرغ کا انڈہ نہ لے آئے اس دفعہ لڑکی نے ٹین کا ڈبہ لا کر دیا۔ کھولا تو اس میں سے چکن سوپ بنانے والی گولیاں نکلیں۔ ہم نے سر پیٹ لئے۔ تنگ آ کر میں نے کاغذ پر مُرغی کی تصویر بنائی اور اس کے نیچے انڈہ بنایا اور چلا چلا کر کہا کہ ہمیں یہ چاہیئے۔ لڑکی "آئی ایم سوری" والی مسکراہٹ ہنسی اور اب کے تیسرے کاؤنٹر کی طرف لے چلی .... وہاں جا کر پتہ چلا کہ انڈے ختم ہو چکے ہیں۔

فرانس میں پہنچے تو سب موسیو آملیٹ کے تین ہفتے کے کورس کے پیچھے پناہ لئے تھے۔ ویسے بھی فرانس کے لوگ تعصب کی وجہ سے انگریزی جانتے ہوئے بھی نہیں بولتے۔ اگر آپ کسی سے انگلش میں سوال کریں تو وہ سوال سمجھ جائے گا۔ لیکن جواب فرانسیسی میں ہی دے گا۔ اس لئے کسی فرانسیسی جاننے

والے کا ساتھ ہونا لازمی تھا کیونکہ اشاروں کے تجربات کچھ زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ پیرس کے سٹیشن پہ پہنچتے ہی موسیو آملیٹ کو لیڈر مان لیا گیا۔ سب سے پہلا اور ضروری کام انکوائری آفس سے ہوٹلوں کی فہرست لینا تھی۔ کچھ دور ریلوے کا ایک ملازم جنرل ڈیگال والی ٹوپی پہنے کھڑا تھا۔ موسیو نیم پاکستانی نیم فرانسیسی چال چلتے اس کے پاس گئے اور کچھ پوچھنے لگے۔ خدا معلوم انہوں نے پوچھا کیا تھا۔ ہم تو فاصلے سے اس شخص کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ کبھی وہ کان آگے کرتا۔ کبھی ایک آنکھ میچ کر غور کرتا۔ کبھی ایک انگلی کان کے پیچھے رکھتا۔ ہمیں پتہ چل گیا کہ تین ہفتے کا فرانسیسی زبان کا جو کورس موسیو آملیٹ نے کیا ہے وہ اس نے نہیں کیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر خیال ہوتا تھا۔ کہ شاید انسانیت کی تاریخ میں یہ پہلا مرد ہے جو درد زہ میں مبتلا ہے۔ قریب گئے تو کانے زکام زدہ مینڈک کی طرح نتھنے پھلا کر کہا" آنال میسیوں ؟"

" اوہ . . . . آناں . . . . . آناں . . . کہتا ہوا وہ ہمیں انکوائری آفس تک لے گیا۔ بعد میں ہمارے استفسار پہ موسیو کہنے لگے "عجیب جاہل آدمی ہے میں اتنے اخلاق سے بار بار پوچھ رہا ہوں کہ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو براہ کرم انکوائری آفس کا پتہ بتا دیں ہم بہت مشکور ہوں گے لیکن وہ سمجھتا ہی نہیں حالانکہ گرامر کے لحاظ سے فقرہ بالکل درست تھا "

موسیو آملیٹ کا" پاسنگ آؤٹ" امتحان بھی اسی شام کو ہو گیا۔ ہوا یوں کہ ہم صدرے روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ کہ راستے میں ایک جگہ کبابوں کی خوشبو نے بیرون لوہاری گیٹ کی یاد تازہ کر دی۔ ناک نے نظر کی راہنمائی کی تو دیکھا کہ ایک دکان میں چمکیلے شفاف شیشوں کے پیچھے گردے تکے کباب چانپ کباب وغیرہ بھونے جا رہے ہیں۔ صحرا نوردوں کے معدے تو عاشقوں کے دل کی طرح سدا ہی خالی رہتے ہیں۔ اس لئے سب مچل پڑے کہ کھائیں گے۔ موسیو آملیٹ اپنے لیڈرانہ فرائض مدنظر رکھتے ہوئے بولے " پہلے پتہ کر لوں۔ سؤر کے تو نہیں "

اندر داخل ہونے لگے تو دروازے میں ایک ایسی چیز نظر آئی۔ جس کا یک مشت نظارہ تو ممکن نہ تھا۔ البتہ قسطوں میں دیکھا تو تمام حصے مل کر ایک عورت بناتے تھے جو تن و توش سے سارے سیزر کی دادی معلوم ہوتی تھی۔ پورا روم اس کے پیٹ کے زیر سایہ بسا نظر آتا تھا اور وہ موٹاپے کے باوجود مسکرا رہی تھی۔ ریسٹوران والوں نے غالباً کباب کھانے کے نتائج کے اشتہار کے طور پر اسے ملازم رکھا تھا۔ کیونکہ اس کی فاتحانہ مسکراہٹ " استعمال کے بعد" کا صحیح ترجمہ معلوم ہوتی تھی۔ موسیو آملیٹ نے تھوڑی کوشش کے بعد چہرہ تلاش کر لیا اور مخاطب ہو کر پوچھنے لگے۔

" پارلے وُو فرانسے ؟" (کیا آپ فرانسیسی جانتی ہیں ؟)

ہم سب ہنس پڑے لیکن شستر آفندی رہ نہ سکے "کہاں جانتی ہو گی سارا فرانس اس انتظار میں ہے کہ پاکستان سے کوئی تھرڈ کلاس سکالر . . انہیں آ کے پڑھائے"

"بکو نہیں"، موسیو آملیٹ چلائے اور عورت سے پھر پوچھا۔

" ووئی " (ہاں) اس نے کہا اور پھر جو انجن کی فالتو بھاپ کی طرح اس نے فرانسیسی اگلنی شروع کی۔ تو موسیو منہ پھاڑے سوچنے لگے کہ ایسی زبان پہلے کہیں سنی ہے پندرہ بیس جملوں کی بات ختم کر کے اس نے ذرا وقفہ ڈالا۔ تو موسیو ایسے آنکھیں جھپک رہے تھے جیسے غسل کرتے وقت کسی بچے کے سر پہ ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا ہے۔ ابھی وہ ایسے ہی کھڑے تھے کہ عورت نے گرم گرم تکا اٹھا کر ان کے کھلے منہ میں ڈال دیا اور بازوؤں کے شہتیر کمر پہ ٹکا کر بڑی عمدہ انگریزی میں پوچھنے لگی -

"وہاٹ لینگویج ڈو یو سپیک ؟"

"اڑے انگریشری !" موسیو اپنی تکابردار زبان سے چلائے۔

اس کے بعد ہم اس عورت سے بات چیت کرتے رہے اور موسیو فرانسیسی بولنے والے منہ میں فرانسیسی تکا چباتے رہے۔

کافی دنوں بعد ہم نے موسیو سے پوچھا کہ آپ نے اُس فرانسیسی عورت سے یہ کیوں پوچھا تھا کہ آیا وہ فرانسیسی جانتی ہے تو بولے "میں نے جو دس بارہ جملے رٹ رکھے تھے اُن میں یہ پہلا تھا۔ اور خود اعتمادی کے لئے یہ بولنا ضروری تھا۔"

کھانے کے سلسلہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیرس میں پیش آیا۔ جس ہوٹل میں جاتے مینو فرانسیسی میں لکھا ہوتا۔ جو ڈاکٹر کے نسخے کی طرح ہماری سمجھ سے بالکل باہر تھا۔ دو چار دفعہ مری ہوئی کوشش بھی کی۔ تو نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی ایسی چیز سامنے آجاتی جس کے بارہ میں گھنٹہ بھر بحث کرنا پڑتی کہ ترقی یافتہ ممالک کا یہ کھانا ہمارے پسماندہ معدے میں جا کر پسند بھی کرے گا یا نہیں اور ہمارے شبہے اکثر درست ثابت ہوتے جب وہ معدے میں جا کر باآواز بلند احتجاج کرتا۔ دو چار تجربوں کے بعد یہ طریقہ نکالا تھا کہ کاغذ کے پرزوں پر بیس تک ہندسے لکھ لئے تھے۔ اور جب مینو لایا جاتا تو ان پرچیوں میں سے لاٹری کے طریقے سے نمبر اُٹھاتے۔ جو نمبر نکلتا۔ فہرست سے وہی نمبر منگوا لیتے۔ ایک دفعہ پرچیاں گم ہو گئیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ مینو پر ہر جفت نمبر کی چیز منگوائی جائے۔ چنانچہ دو۔ چار۔ چھ۔ آٹھ۔ دس کا آرڈر دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے سوپ پلایا گیا اور پھر بیرہ ٹرے میں تین شرابیں رکھ کر لے آیا۔ چونک کر مینو پھر سے دیکھا تو پتہ چلا کہ تمام فہرست کی بجائے اُس میں فائیو کورس ڈنر تھا۔ جس میں کھانوں کا نمبر طاق تھا اور ساتھ پینے کی شراب کا جفت۔

ہم مایوس ہونے ہی لگے تھے کہ ایک دم شتر آفندی کو یاد آیا کہ میونخ کے ہوائی اڈے پر جس فرانسیسی سے ملاقات ہوئی تھی اُس نے ایک فرانسیسی کھانے کا نام لکھ کر دیا تھا فرانسیسی اور انگریزی کھانے میں یہ فرق ہوتا ہے۔ کہ فرانسیسی کھانے کا ذائقہ ہوتا ہے اس لئے بے صبری سے اس کاغذ کی تلاش میں جیبوں میں غوطہ زنی کی گئی۔ تو وہ جیب کی مشقِ ناز سہتے سہتے پڑیا کی شکل میں برآمد ہوا لیکن جب بعد مشکل کھولا گیا تو کام نہ بنا کیونکہ اُسی چٹ پر لڑکے نے اپنا نام بھی لکھا تھا۔ اور ہمیں یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ اس میں سے لڑکے کا نام کون سا ہے۔ اور کھانے کا کون سا۔ کافی بحث کے بعد طے یہ پایا کہ اگر بیرے کو چٹ دے دی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ کھانا لائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ چٹ اسے دینے کے تھوڑی دیر بعد ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی آکھڑا ہوا۔ جس کا بطور غذا ہضم کرنا ہمارے لئے کئی صدیوں تک ممکن نہ تھا۔ اُس کا پہلا نام اور ہمارے محسن دوست کا پہلا نام ایک ہی تھا۔ اور ہمارے دوست نے جلدی اور بے تکلفی کی وجہ سے اپنا پہلا نام ہی لکھا تھا۔ اب اُسے سمجھاتے کیسے کیوں کہ وہاں تو زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم والا نقشہ تھا۔ مجبوراً اشاروں سے ہوا میں تانے بانے بننے لگے۔

رات کے دس بجے جب کیمبرج واپس پہنچ کر ہم بوٹ کھول کر آگ تاپنے لگے تو گرو جی خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

"سنا ہے قیامت کے روز ہمارے جسم کا ہر حصہ ہمارے اعمال کے خلاف گواہی دے گا۔ انگلیاں۔ آنکھیں۔ پاؤں۔ بازو وغیرہ سب بولیں گے۔ شکر اس بات کا ہے کہ یورپ کے سفر کے بارہ میں زبان کچھ نہ کہہ سکے گی۔ بلا سے ایک دشمن تو کم ہوا۔"

کسی نے کہا "اتنا چلے ہیں کہ سب سے زیادہ مخالف گواہی ٹانگیں دیں گی"

شتر آفندی خوفزدہ ہو کر اپنی لمبی ٹانگیں دیکھنے لگے۔

راجہ مہدی علی خاں

میرے دیئے ہوئے آٹوگراف

راجندر سنگھ بیدی کو

۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء

مقام بمبئی بیدی کا گھر

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کی زلفوں پہ پریشان ہوگئیں

ن م راشد کو

تاریخ تقسیم سے پہلے

مقام دہلی - آل انڈیا ریڈیو

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہے تُو
دیکھتے ہی میری آنکھیں شعلہ ساماں ہوگئیں
شکر کر مسٹر کہ تو ہے ریڈیو کے محکمے میں
آج کل افسر مرا
ورنہ تجھ کو باندھ دیتا میں کسی دیوار سے

وزیر آغا ایڈیٹر "ادبی دنیا" کو

تاریخ آغا صاحب کو معلوم ہے

مقام لاہور

جی میں آتا ہے لگا دوں آگ میں لاہور کو
پھر خیال آتا ہے آغا بے وطن ہو جائے گا

ایک کمانڈر انچیف کو

۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء

مقام رڑکی

عشرتِ فوج ہے جنگوں میں فنا ہو جانا
راہیِ رہگذرِ ملکِ بقا ہو جانا

ایک مولوی صاحب کو

منارہ مسجد بمبئی　　　جنوری ۱۹۵۸ء

جاؤ گے دوزخ یا جنت میں پوچھ لو بات ذرا سی ہے
اللہ میاں کے ٹیلیفون کا نمبر سات سو چھیاسی ہے

ایک گونگے کو

مقام ایران　　　تاریخ پھر بتا دوں گا

تا مردِ سخن نہ گفتہ باشد　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ایک شکاری کو

مقام ایران　　　۲۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست　　شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

ایک میوزیشن کو

مقام بمبئی　　　۲ر دسمبر ۱۹۵۹ء

No More To Chiefs And ladies , Bright
The Harp of Tara Swells.
The Dog Alone That Barksat night
its Tale of Ruins Tells.

ایک اُستانی کو

بمبئی کے ایک پرائمری سکول کا بالاخانہ　　　۱۵ر اگست ۱۹۵۸ء

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ طفلِ مکتب　　تھا لکھا لات کے پڑتے ہی خفا ہو جانا

ایک سالی کو

مقام پونا　　　۱۱ر فروری ۱۹۵۵ء

اے مرے ہم زلف اس کو تھام لے
سیج پر سے بھاگ کر آئی ہے یہ۔

ایک شریر بچے کو

ڈیرہ دون کا ایک پرائمری سکول　　　۱۴ر مارچ ۱۹۵۶ء

قناعت نہ کر ایک مال سے پٹ کر　　چمن اور بھی باغباں اور بھی ہیں

ایک قیدی کو

آرتھر روڈ جیل بمبئی — یکم مارچ ۱۹۵۲ء

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
بول کہ چوری تو نے کی تھی

ایک برطرف شدہ ملازم کو

مقام بمبئی میرا گھر — اپریل ۱۹۵۵ء

مہرباں ہو کے بلالو گا میں چاہوں جس وقت — تو گیا وقت نہیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکے

ایک شور مچانے والے بچے کو

مقام بمبئی میرا گھر — اپریل ۱۹۵۵ء

ارے بھاگ جا میرے کمرے سے ظالم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

ایک یورپین دوشیزہ کو

مقام دہلی کی ایک عالی شان کوٹھی — ۵ جنوری ۱۹۵۶ء

Sigh Nomore Lady Sighno more,
Men Were Deceiversever.
One Glanceat one and Two on FOUR
To one Girl Constant Never

خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" کو

مقام دہلی فسادات کا ایک علاقہ — پارٹیشن کے دن

ہندو مسلم، سکھ، عیسائی — آپس میں ہیں بھائی بھائی

ایک ڈاکٹر کو

مقام بمبئی کا ایک قبرستان — یکم اپریل ۱۹۵۵ء

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
اپنا کام چلانے کو کیوں اس کا کام تمام کیا؟

ایک بھوکے فقیر کو

حیدرآباد — تاریخ یاد نہیں

اندرون از طعام خالی دار — تا دروں نورِ معرفت بینی

مس مہ جبیں کو

بمبئی کا ایک پرانی وضع کا بنگلہ — مئی ۱۹۵۹ء

رات تاریک ہے اور لیمپ نہیں ہے گھر میں
مہ جبیں گھر سے نہ اِس وقت ہوا ہو جانا

ایک چور کو

مقام بمبئی میرا گھر۔ رات کے بارہ بجے — ۱۴ر اگست ۱۹۵۹ء

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ایک کروڑپتی سیٹھ کو

مقام بمبئی — ۱۲ر نومبر ۱۹۵۹ء

اُٹھو میرے کوچے کے غریبوں کو بھگا دو — کاخِ غربا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے "ٹاٹا" کو میسر نہیں روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لیے سونے کا محل ایک بنا دو

ایک ہیروئن کو

بمبئی فلمستان اسٹوڈیو — یکم جون ۱۹۵۹ء

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتی رہو تو کیا گناہ ہو

ایک چلبلی آیا کو

دلی ایک دوست کا گھر — ۲۳ر جولائی ۱۹۵۶ء

سرہانے بچے کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ایک مسلمان ایکٹرس کو

مقام بمبئی — ۲۲ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری "مسلم جوانی" جوش پہ آئی ہوئی

ایک لمبے چغے والے فقیر کو

مقام دہلی

۲۰ر اپریل ۱۹۵۸ء

ارے بھاگو بھاگو ہٹو تم ہو غالب تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہو؟

ایک خوبصورت نرس کو

بمبئی کنگ ایڈورڈ ہاسپٹل

۲۵ر دسمبر ۱۹۵۸ء

تیرے آتے ہی جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
کیوں سمجھتی ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے؟

ایک کبابچی کو

مقام دہلی

۱۵ر مارچ ۱۹۵۹ء

کبابِ سیخ ہے یہ۔ اس کو تو ہر سُو بدلتے ہیں
جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں
ارے ظالم کبابِ سیخ کو تم نے جلا ڈالا

ایک رنڈی کو

مقام ایک شرمناک آبادی

تاریخ خدا جانے

گلی میں کھڑے کچھ جواں اور بھی ہیں
ابھی حسن کے امتحاں اور بھی ہیں

گھر پر ایک حسینہ کو

مقام بمبئی

یکم جنوری ۱۹۵۹ء

میں آٹوگراف کیا دوں تجھ کو ظالم؟
لکھا گر کچھ تو بیوی دیکھ لے گی۔

چراغ فروش کمہار کو

سب ہوں گے تجھ کمہار کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھائے نہ جائیں گے

ایک نائکہ کو .

مقام بمبئی
۲۱ فروری ۱۹۵۸ء

بعض بنات النعش گیتی دن کو کپڑوں میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی جو عریاں ہو گئیں

ایک آم فروش کو

مقام حیدرآباد
۹ اگست ۱۹۵۷ء

تین آموں کے دو روپے ؟ توبہ !
مرزا غالب نہیں ہوں میں اے یار !

میرزا ادیب ایڈیٹر "ادب لطیف" کو

مقام لاہور
یکم اپریل ۱۹۴۵ء

تو قد کو کر بلند اتنا کہ ڈر کر آسماں بولے
نہ اتنا قد بڑھا مسٹر! بتا تیری رضا کیا ہے

احمد ندیم قاسمی

ثواب

مسجد میں ادھر صبح کی نماز ختم ہوئی، ادھر نقارہ بجنے لگا۔

اذان سن کر جو لوگ کروٹیں بدلنے لگے تھے، نقارہ سنتے ہی تڑپ کر اُٹھے اور گلیوں میں آ گئے۔

"یا الٰہی خیر" کہہ کر عورتوں نے کھاٹوں پر سے پاؤں لٹکا لئے۔

نقارہ بجے جا رہا تھا، اور فضاؤں کو یوں گونج رہی تھی جیسے نقارے کے بجائے فضا بج رہی ہے ایک مسلسل "ہُم ہُم ہُم" کی آواز جیسے گاؤں کو چار طرف سے محاصرے میں لینے کے لیے صبح کے اجالے کے قدم بہ قدم بڑھی آ رہی تھی۔

"ہائے کس کا گھر اجڑ گیا نور پیر کے وقت!" عورتوں نے گلیوں میں آ کر پوچھا۔

معلوم ہوا چنگا جیبو کنوئیں میں گر گیا ہے۔

ماں بیٹا دونوں پانی کھینچ رہے تھے کہ بھرا ہوا بوکا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، ڈھیر سی رسّی جو اُن کے آس پاس جمع ہو رہی تھی، بھاری بوکے کے گرنے سے ایک دم کھچی تو چنگے کی ایک ٹانگ رسی کے پھندے میں آ گئی اور وہ اپنی ماں کی آنکھوں کے سامنے جھپاک سے کوئیں میں گر گیا۔ اسے چیخنے تک کی مہلت نہ ملی۔

"ہائے لٹ گئی بے چاری کرماں، کرماں جلی" عورتوں نے بآوازِ بلند آہیں بھریں اور چھتوں پر چڑھ گئیں۔ مرد کنوئیں کی طرف بھاگنے لگے۔ نقارہ رک گیا۔ اور صبح کا سانولا چہرہ زرد پڑنے لگا۔

کرماں کا میاں ہر صبح کو گاؤں کے عقب میں میلوں تک پھیلی ہوئی ڈھلان کا رخ کرتا۔ جہاں وہ دوپہر تک بھیکڑ اور سنیٹھے کی جھاڑیاں اکھیڑتا رہتا۔ یہ سرکاری رکھ تھی اس لئے وہاں کلہاڑی لے جانا منع تھا۔ دوپہر کو واپس آتا تو اس کے سر پر اتنی بہت سی جھانکڑوں کا انبار ہوتا کہ دور سے یوں معلوم ہوتا جیسے ایک گھنا درخت چلا آ رہا ہے۔

کرماں ان جھاڑیوں سے تنور گرم کرتی اور سارے محلے کی روٹیاں پکاتی، بھٹی جلاتی اور بچوں کی پوٹلیوں میں بندھے ہوئے مکی اور چنے دانے بھون کر آٹے اور دانوں میں سے ذرا ذرا سا بھاڑا لیتی اور یوں میاں بیوی اور بیٹے کا پیٹ پلتا۔

دوپہر کو میاں کے واپس آنے اور تنور کو ٹھنڈا کرنے کے بعد میاں بیوی دو گدھوں پر بندریاں لاد کر گھستے پیٹتے گھروں سے گھڑے جمع کرتے اور کنوئیں پر جا کر پانی بھرتے۔ کنوئیں کی جگت پر چار طرف رکھے ہوئے شیشم اور توت کے تنوں پر رسیوں کے جو لمبے لمبے نشان پڑ گئے تھے، ان میں سب سے گہرا نشان انہی میاں بیوی کے بوکے کی رسی کا تھا۔ کیونکہ گاؤں میں وہ سب سے زیادہ پانی بھرتے تھے۔ ہر پھیرے میں چھ گھڑے گدھے اٹھاتے، دو کرماں کے سر پر ہوتے اور ایک گھڑا اس کا میاں کبھی اپنے سر پر اور کبھی کندھے پر رکھ لیتا۔ ہر روز دو پھیروں میں اٹھارہ گھڑے بھر کر وہ مہینے میں اٹھارہ دونے چھتیس آنے کما لیتے اور شاید

اسی لئے انہیں اپنے بیٹے کو پڑھانے کا شوق چرایا۔

وہ کہتے تھے کہ ہم بابر بادشاہ کے زمانے سے پانی بھرتے آ رہے ہیں اور اب تھک گئے ہیں۔ اب ہمارا چنگا منشی بنے گا اور اگلی نسل تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ دوسرے لوگ ہمارا پانی بھریں۔

چنگا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ گھڑوں کا حساب جوڑ لیتا تھا اور ہر رات سونے سے پہلے ماں باپ کو کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں سناتا تھا تو وہ ان باتوں کو سمجھے بغیر یہ سوچ کر خوش ہوتے رہتے تھے کہ ان کا بیٹا یہ باتیں سمجھتا ہے۔

پھر ایک روز جب کہ ماں کا میاں سرکاری رکھ میں ایک کگر پر کھڑا مہینگڑ کی ایک جھاڑی کو جھٹکے دے دے کر جڑ سے اکھیڑ رہا تھا تو اچانک اس کی توقع سے پہلے ہی جھاڑی اکھڑ آئی۔ اس کے ساتھ ہی خود اس کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ اور وہ کگر سے نیچے ایک چٹان پر یوں گرا کہ آس پاس کنکروں اور بھیجے کا چھڑکاؤ ہو گیا۔

بیوہ ہو کر بھی ماں نے چنگے کو مدرسے سے نہ اٹھوایا۔ البتہ اس نے تنور کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا۔ بھٹی جلانے کے لئے وہ خود ہی کسانوں کے ہاں جا کر ناندوں کھرلیوں میں سے مڑے تڑے ٹانڈے اور میلا سیلا بھوسہ سمیٹ لاتی، یا پھر ماں بیٹا کنوئیں پر جاتے اور گاؤں کے کھاتے پیتے گھروں کے لئے پانی بھرتے۔ بھیڑ سے بچنے کے لئے دونوں منہ اندھیرے سے پانی بھرنا شروع کرتے اور سورج کے نیزہ بھر اونچا ہونے تک فارغ ہو جاتے۔ پھر چنگا مدرسے کی راہ لیتا اور کرماں بھٹی کے لئے ایندھن سمیٹنے نکل جاتی۔

اور ابھی کرماں کے میاں کو مرے تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے۔ اور وہ لپنے بیٹے کو ڈول لٹکاتے یا کھینچتے ہوئے رسی سے ہٹ کر کھڑا ہونے کا سلیقہ بھی نہیں سکھا پائی تھی کہ چنگے کو بجلی کی سی تیزی سے کھلتی ہوئی رسی نے اپنی لپیٹ میں لے کر پہیے تو کنوئیں کے سامنے والے حصے پر پٹخا اور کرماں وہیں کنوئیں کی جگت پر گر کر بیہوش ہو گئی۔ اس نے کنوئیں کے پانی میں اپنے بیٹے کے جسم اک سے گرنے کی بھی آواز نہ سنی۔ دو اور جھیور بھی وہاں پانی بھر رہے تھے ان میں سے ایک کرماں کے پاس بیٹھ گیا کہ کہیں ہوش میں آ کر کنوئیں میں نہ کود جائے، دوسرا سرپٹ بھاگتا ہوا گاؤں میں آیا۔ گلی گلی میں لوگوں کو اس حادثے کی اطلاع دیتا چلا گیا۔ پھر مسجد میں پہنچ کر حجرے سے نقارہ اٹھایا اور وہیں دہلیز پر بیٹھ کر اسے پاگلوں کی طرح پیٹنے لگا۔

کنواں، پہاڑی پر بسے ہوئے گاؤں کے قدموں میں تھا، لوگ جب کنوئیں کی طرف بڑھے تو جیسے انہیں راستے بھول گئے۔ کھیتوں میں کود کر وہ بھری بھری فصلوں میں سے بھاگے اور پھر اونچی اونچی منڈیروں پر سے لڑھکتے ہوئے کنوئیں کی سمت لپکے۔ پورے گاؤں کی عورتیں چھتوں کی منڈیروں پر آ بیٹھی تھیں اور کنوئیں کے قریب کالی کالی گٹھڑیوں کی قطاروں معلوم ہوتی تھیں۔ بچے گلیوں میں سے بھاگے آ رہے تھے۔ پورا گاؤں کنوئیں پر امڈ پڑا تھا۔ ۴

کنوئیں پر سب سے پہلے جھیور، کمہار، موچی، مراثی، نائی اور دھوبی پہنچے اس وقت ایک جھیور چنگے کی ماں کے پاس بیٹھا لوگوں کی طرف یوں گھور رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

"چنگے۔ او چنگے۔" اکٹھے بہت سے لوگوں نے کنوئیں کی جگت پر جھک کر پکارا۔

ان کی آواز گہرے کنوئیں کی گولائی میں چکر کھاتی ہوئی جیسے نیچے گئی تھی۔ ویسی ہی ایک گونج بن کر اوپر آ گئی اور دور نیچے ایلومونیم کی ایک تھالی کی طرح چمکتے ہوئے پانی کی سطح جوں کی توں رہی۔

رستے کے سرے پر ایک گز لمبی مضبوط لکڑی باندھ کر اس پر ایک نوجوان غوطہ خور کو یوں بٹھایا گیا کہ رسہ سامنے اس کے ہاتھوں میں تھا۔ رانیں لکڑی پر تھیں اور پاؤں لٹک رہے تھے۔ پھر تین آدمیوں نے رستے کو مضبوطی سے تھاما۔ نوجوان غوطہ خور نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر ایک بار کنوئیں میں دیکھا اور پھر

آہستہ آہستہ نیچے اتارا جانے لگا۔

لوگوں کا ہجوم مسلسل بڑھ رہا تھا۔ چند چھیور عورتیں بھی روتی چلاتی آپہنچی تھیں اور کرماں کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگی تھیں۔ چند لوگ بچوں کو کنوئیں کے قریب آنے سے روک رہے تھے۔ اور نوجوان غوطہ خور کنوئیں کے نصف تک پہنچ گیا تھا۔

یکایک کرماں ہوش میں آگئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پھر اس کی پتلیوں میں وحشت بھر گئی اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی مگر عورتوں نے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ پھر وہ ایک دم بچوں کی طرح رونے لگی اور اپنی رانیں کوٹ کوٹ کر پکارنے لگی "ہائے میرا چنگا۔ میرا لال۔ میرا چاند کا ٹکڑا۔ میرا سونے کا دانہ۔ چنگے وے چنگے۔ تجھے خدا رسول کا واسطہ، مرنا نہیں۔ یوں ہنستا ہنستا باہر آ جا۔ جیسے تو مدرسے سے آتا ہے۔ مرنا نہیں میرے بیٹے۔ تو مر گیا تو خدا کی خدائی میں زندہ کون رہے گا۔"

وہ روتی پیٹتی اور بین کرتی رہی۔ عورتیں اس کی ڈھارس بندھانے کی بجائے خود بھی روتی رہیں کنوئیں کے گرد اتنا ہجوم ہو گیا تھا جیسے میلہ لگا ہوا ہے۔ تیس چالیس آدمی کنوئیں کے چاروں طرف جھک جھک کر ایک دوسرے کو جھک جھک کر دیکھنے سے منع کر رہے تھے اور تاکید بھی کر رہے تھے کہ ایک ذرا سا کنکر بھی نیچے نہ گرنے پائے۔ ورنہ غوطہ خور کو گولی کی طرح لگے گا۔

پھر کنوئیں میں سے غوطہ خور کی گونجتی ہوئی آواز آئی "میں پہنچ گیا ہوں۔ رسّے کو ذرا سا ڈھیلا چھوڑ دو۔ میں غوطہ لگاتا ہوں۔"

سارے ہجوم نے جیسے سانس روک لی۔ کرماں تک خاموش ہو گئی۔

ادھر ہوا میں ایک ٹٹیہری "پیاسی ہوں۔ پیاسی ہوں" پکارتی ہوئی نکل گئی۔

کنوئیں پر جھکی ہوئی شیشم کی ایک شاخ سے ایک زرد پتہ ٹوٹا اور پھرکی کی طرح چکر اتا ہوا کنوئیں میں اتر گیا۔

"کچھ نہیں ملا۔" پاتال سے آواز آئی "پھر سے غوطہ لگاتا ہوں۔"

لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کرماں نے بڑی وحشت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سر کے بال نوچنے لگی۔

پانی بہت گہرا ہے۔" غوطہ خور پکارا۔ "میں تہ کو نہیں چھو سکا۔ سانس ٹوٹ جاتی ہے مجھے کھینچ لو۔"

"ہائے بیٹا ذرا ادھر ادھر کنارے کنارے تو دیکھ" کرماں کنوئیں پر جھک کر پکاری۔ عورتوں نے اسے بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ "ابھی واپس نہ آ تیری ماں تیری خوشیاں دیکھے۔ ایک اور غوطہ لگا۔ پھر وہ رونے لگی اور اس کے آنسو کنوئیں میں گرنے لگے۔

چند لمحے خاموش رہی۔ نقارہ بجانے والا میر دھیور سر پر ایک کھٹولا رکھے بھاگا بھاگا آپہنچا۔

"نکلا؟" اس نے پوچھا

"ابھی نہیں" کسی نے کہا۔

"نہیں ماسی۔ کوئی نشان نہیں" غوطہ خور کنوئیں میں سے بولا "پانی نیزہ نیزہ گہرا ہے۔ میرے قدم تو تہ پر لگتے ہی نہیں۔ مجھے کھینچ لو۔"

کرماں سینے پر دو ہتڑ مار مار کر پیٹنے اور چیخنے لگی، اور لوگ غوطہ خور کو کھینچنے لگے۔

وہ باہر آیا تو ایک اور غوطہ خور نیچے اتارا گیا اسی طرح باری باری چھ غوطہ خور کنوئیں میں اترے اور یہ کہتے ہوئے واپس آ گئے کہ نہ جانے کنوئیں میں ایک دم اتنا بہت سا پانی کہاں سے آ گیا ہے تہ کا پتہ ہی نہیں۔

لوگ چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ اور کرماں روتی پیٹتی رہی۔

ایک آدمی قریب کے گاؤں کو دوڑا کہ وہاں کے مشہور غوطہ خور کو بلا لائے۔ جھیو ر اور کمہار کنوئیں پر سے ہٹ آئے اور شیشم کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئے کرماں کو بھی عورتیں کچھ پرے لے گئیں اور تازہ دھوپ میں کنوئیں کا دہانہ معمول سے زیادہ پھیل گیا۔

کچھ لوگ ٹہلتے ہوئے کنوئیں سے دور نکل گئے۔ اور پھر گاؤں کے رستے پر ہولئے۔ اور گاؤں کی چھتوں کی منڈیروں پر گٹھڑیوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی۔

ملک رحمان خاں جب نماز اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر کنوئیں پر آئے تو کرماں کنوئیں کی پرلی طرف اسی طرح رو پیٹ رہی تھی، ان کے ہاتھ میں تسبیح اور ماتھے پر سجدے کی مٹی تھی۔ آتے ہی انہوں نے کہا "کرماں بیچاری کو پیٹنے سے روکو۔ رونے بے شک، پر پیٹنا جائز نہیں ہے۔"

کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ ملک رحمان خاں نے بھی یہ مشورہ شاید رسماً دیا تھا، کیونکہ وہ بھی کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر کنوئیں کی جگت پر آ گئے نیچے جھانکا۔ پھر جیسے اپنے آپ کو دھکا مار کر پیچھے ہٹ گئے اور بولے "ہمارے پہاڑی علاقے کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ پانی بہت گہرائی میں ملتا ہے میدانی علاقوں کے کنوؤں میں تو گبرو شرطیں لگا کر چھلانگیں مارتے ہیں، ہمارے کنوئیں میں تو کوئی گرے تو آدھے راستے ہی میں مارے خوف کے روح قبض ہو جائے۔"

"آہستہ بولئیے ملک جی" میرو جھیو ر بولا "کرماں بہن کا تو خیال کیجئے۔"

"تم بھی یہیں ہو میرو؟" ملک جی نے اس کے پاس جا کر کہا "نہیں ملا بے چارا؟"

"جی ابھی نہیں"۔ میرو بولا۔

"یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔" وہ بولے۔

میرو ہوا میں دیکھتا رہ گیا۔

پھر ملک جی نے کہا "اور بھئی وہ ریت کے بتین بورے جو میں نے تم سے لانے کو کہے تھے؟ وہ اگر اگلی صدی میں لانے کے ارادے ہیں تو بھیا، اگلی صدی آنے کی ہی نہیں۔ قیامت آ جائے گی اسی صدی میں۔"

"جی اچھا" میرو بولا اور اس نوجوان کی طرف بڑھ گیا جو ابھی ابھی گاؤں سے آیا تھا۔ اور کنوئیں میں اترنے کے لئے لنگوٹ باندھ رہا تھا۔

غوطہ خور کو کنوئیں میں اتارنے والے کنوئیں کے قریب آ گئے مگر باقی لوگ ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے باتیں کرتے اور ٹہلتے رہے۔ جیسے پلیٹ فارم پر ہیں اور گاڑی لیٹ ہے۔

کرماں غوطہ خور کو دعائیں دینے لگی اور ملک رحمان خاں میرو سے یہ کہہ کر گاؤں کی طرف چل پڑے کہ "نکل آئے تو قبر کی جلدی کرنا شام نہ ہو جائے میت دن کو دفن ہو تو اس کی قبر میں روشنی رہتی ہے۔"

ملک رحمان خاں گاؤں کی بڑی گلی کی چوٹی والے موڑ پر پہنچ گئے تھے جب غوطہ خور کے قدموں نے پانی کو چھوا۔ مگر یہ غوطہ خور بھی ناکام واپس آیا۔ اور جب تک وہ کنوئیں میں سے نکلتا، ملحقہ گاؤں کا نامی غوطہ خور وہاں پہنچ چکا تھا۔

دوپہر قریب تھی۔ شیشم کا تنا جیسے شاخوں کے بکھرے ہوئے سائے کو اپنی طرف سمیٹ رہا تھا

کرماں نے نامی غوطہ خور کو یوں دیکھا جیسے عقیدت مند کسی ولی اللہ کو دیکھتے ہیں "بڑا مشکل کا کام ہوتا ہے"۔ اس نے پہلی بار آس پاس کی عورتوں سے بات کی "یہ غوطہ مارنے والے ماؤں سے تبھی دعائیں بخشوائے پھرتے ہیں۔ خدا ان کا بخت سلطان سکندر جیسا کرے۔ خدا ان کی عمر حضرت خواجہ خضرؑ جتنی کرے۔ یہ اپنی ماؤں کے حلالی بیٹے ہیں" ذرا سا رک کر وہ بولی "میرے چنگے جیسے"۔ اور پھر بے تحاشا رونے لگی۔

غوطہ خور چھوٹے قد کا دبلا پتلا جوان تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں رسّہ پکڑ کر، کنوئیں کی اساری کے ساتھ ساتھ یوں تیزی سے قدم رکھ کر اترنا شروع کیا۔ جیسے گلی میں چل رہا ہے۔

"رسّہ ڈھیلا چھوڑ دو" نیچے پہنچ کر اس نے پکارا

رسّے کو ڈھیلا چھوڑ دیا گیا۔

کنوئیں کی جگت پر فضا کا سناٹا اتر آیا اور کرماں سجدے میں گر گئی۔

"پانی بہت گہرا ہے بھائیو۔ دوسرا غوطہ لگا رہا ہوں" غوطہ خور نے اطلاع دی۔

غوطہ خور نے چار غوطے مارے اور جب پانچویں غوطے کے بعد اس نے آواز دی "مل گیا لڑکا" تو دعائیں مانگتی ہوئی کرماں کے چہرے پر ایک چمک سی آگئی۔ پھر یہ چمک بجھ گئی اور اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔

کسی نے غوطہ خور سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ لڑکا زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ غوطہ خور نے بھی اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

آنے والے خطرے کے نیچے دبی ہوئی کرماں یکا یک چلا اٹھی "کیسا ہے میرا بچہ؟"

غوطہ خور نے کوئی جواب نہ دیا اور کرماں کی آواز گہرے کنوئیں کی گہرائی میں چکر کھا کر جیسی نیچے گئی تھی ویسی ہی ایک گونج بن کر آ گئی۔

"ڈھیلا کھینچ لو" غوطہ خور نے آواز دی۔ "میں لکڑی پر بیٹھ لاش کو رانوں پر رکھ لوں گا۔"

رسّہ کھینچنے والے تین آدمیوں نے پہلی بار پلٹ کر دیکھا تو کنوئیں کے مضافات خالی ہو چکے تھے۔ وہ جہاں ایک میلہ سا لگ گیا تھا اب وہاں شبنم کے پتے اڑ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سارے گاؤں کی آبادی چپکے سے کنوئیں میں اتر گئی ہے۔ بس چند بچے ایک طرف سہمے ہوئے کھڑے تھے اور دو گاؤں کے مکانوں کی منڈیریں نیلے آسمان کو خطِ مستقیم میں کاٹ رہی تھیں۔

"لوگ کہاں گئے؟" مہر و جھیورے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پھر ایک آدمی نے غوطہ خور کو اطلاع دی" نہ جانے لوگ ایک دم کہاں چلے گئے ہیں۔ ہم کل تین آدمی ہیں۔ دو کو کیسے کھینچیں؟"

"لوگ تھے کہاں؟" غوطہ خور بولا۔ "میں تو جب آیا تو تمہیں تینوں تھے یا ماسی تھی یا کچھ بچے تھے۔"

کسی کو پتہ بھی نہیں چلا تھا اور لوگ گاؤں واپس جا کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ریوڑ آس پاس کی پہاڑیوں پر چر رہے تھے اور دور ایک چھت پر کوئی عورت دُھلے ہوئے کپڑے خشک ہونے کے لیے پھیلا رہی تھی۔

کرماں کچھ دیر تک گاؤں کو اپنی بھیانک آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں لے کر رسے والوں کے پاس آئی۔ "لاؤ میں کھینچوں گی۔"

تینوں جھیوروں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر ایک نے بچوں کو بلایا۔ وہ بھاگتے ہوئے آئے اور رسّے سے چمٹ گئے کرماں سینے پر ہاتھ رکھے ایک طرف کھڑی رہی۔

آہستہ آہستہ رسّہ کھنچتا رہا۔ کنوئیں کے آخری خط پر غوطہ خور نے جینگے کی لاش اپنی رانوں پر سے اٹھائی مگر اب اسے لینے والا کوئی نہ تھا سب رسّے کو کھینچے کھڑے تھے۔

پھر کرماں آگے بڑھی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اور بازو پھیلا کر بولی "میرے اس پھول کو یہاں میری جھولی میں ڈال دے میرے بیٹے۔"

کرماں بچے کی لاش کو اپنے بازوؤں میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور گاؤں کی طرف تکتی ہوئی چل پڑی۔ "چل میرے بچے مدرسے جانے میں دیر ہو جائے گی۔"

مہدو کھٹولا اٹھا کر بھاگا بھاگا آیا۔ اور کرماں کے سامنے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کرماں نے بچے کو کانچ کے سامان کی طرح بڑی احتیاط سے کھٹولے پر رکھا اور پھر بولی: "تم تو تین ہو۔ جنازہ تو چار اٹھاتے ہیں۔"

پھر کسی کو سامنے سے ملک رحمان خاں بولے: "میں سمجھا تھا۔ بہت سے لوگ ہوں گے۔ تو ان سے بات کروں گا۔ مگر یہاں تو تم ہی تین جنے ہو۔ سب چلے گئے تھک کر۔ صبح سے آئے ہوئے تھے۔ اور اب تو ظہر کی اذان ہونے والی ہے۔"

اب ملک رحمان خاں کھٹولے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے: "بات یہ ہے بھئی"۔ انہوں نے کہا "کہنا یہ تھا کہ کفن دفن کے بعد تم لوگ یہیں کنوئیں پر واپس آ جانا۔ جنازے پر میں لوگوں سے بھی کہہ دوں گا کہ سب کنوئیں پر چلیں۔ لاش نکل آئی ہے تو کنوئیں کو پاک بھی کر لینا چاہیئے۔ دو سو ڈولچے نکالنے ہوں گے۔ تم مجبور لوگ ڈول خوب کھینچتے ہو۔ اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں اور پھر یہ ثواب کا کام بھی ہے۔"

بزیرِ دلقِ مُرقّع کمندہا دارند
درازدستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں

(حافظ)

جیلانی بانو

ستی ساوتری

میں لاکھ سوچتی ہوں کہ لڑکیاں آوارہ کیسے ہو جاتی ہیں؟
کیا ان کے پاس وہ ننھی کلی نہیں ہوتی جس کے اندر عورت کا دل دھڑکتا ہے؟
اللہ قسم میں تو ان آوارہ لڑکیوں کو الف لیلہ کی پریاں سمجھتی تھی ——— کسی غیر مرد سے آنکھیں لڑانا۔ اسے محبت بھرے خط لکھنا اور پھر ———
اور پھر ——— اللہ توبہ ——— کانوں سنی نہیں آنکھوں دیکھی کہتی ہوں!

ابھی میں ساتویں کلاس میں تھی، جب دینیات پڑھانے والی آمنہ آپا مدرخ کا حال سناتی تھیں تو مجھ سے زیادہ رونے والی لڑکی کلاس بھر میں کوئی نہ تھی۔ بقول باجی کے بارہ برس کی ڈھنڈو بات بات پر ٹسوے بہانے کیوں بیٹھ جاتی تھی۔ مگر اپنے دل کو کیا کروں۔ اس نامراد دل نے مجھے کیسے کیسے کنوئیں جھنکوائے کیسی میں نے اپنی مٹی پلید کی ——— ہائے ہائے۔

ہاں، تو میں کیا کہہ رہی تھی ———؛ جب میں ساتویں کلاس میں تھی تب ہی میں نے الف لیلہ کی وہ پری دیکھی تھی۔ شیلا میٹرک میں پڑھتی تھی۔ اور جناب میٹرک والی لڑکیاں تو چھوٹی کلاس والیوں کے لئے پریوں سے بڑھکر پُراسرار ہوتی ہیں۔ میری آنکھیں پھوٹیں جو میں نے پھر کبھی شیلا سی خوبصورت لڑکی دیکھی ہو (رعنا کہتی تھی کہ شیلا تو تیرے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے سچ؟) اور سراج کہتا تھا کہ اللہ میاں نے تمہاری آنکھیں بنانے سے پہلے جانے کتنی لاکھ بار اسکیچ بنا کر مٹائے ہوں گے۔ مگر نواز ——— نواز ——— وہ بڑا بے شرم تھا اس کی نظر ہمیشہ میرے ——— میرے ——— اونہہ چھوڑیئے میری بات۔ اس وقت میں آپ کو اپنے حسن کی کہانی تو سنانے نہیں بیٹھی ہوں۔!

مجھے تو ان لڑکیوں پر حیرت ہو رہی ہے جو اچھی خاصی پڑھی لکھی صورت شکل کی ہیں اللہ کرم دیکھو تو ایسے۔ اب شیلا ہی کو لے لو۔ ہمیشہ اسکول میں، فرسٹ ڈویژن لاتی۔ اسکول کا سالانہ جلسہ ہوتا تو دس دس انعام پاتی۔ ناچ میں اوّل۔ ڈرامے میں اوّل۔ رسّی پھاندنے میں فرسٹ ———۔ دوڑ میں۔ اور ایک دن معلوم ہوا کہ وہ کتنا تیز دوڑ رہی تھی۔ جب اس کے ہاتھ میں ایک گلابی لفافہ دیکھکر مسز شراف نے بھری کلاس میں اُسے روک لیا ——— توبہ، تو یہ کیسی بھد ہوئی ہے اس بیچاری کی۔ جب انہوں نے ٹیچرز روم میں وہ خط زور زور سے سنایا ہے سب لڑکیاں کھڑکیوں میں سے لٹک لٹک کر سن رہی تھیں اور ٹیچروں کی ڈانٹیں سُن کر خوب ہنس رہی تھیں۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح ہنسی کا کال تھوڑی تھا۔ ہم سب ہر وقت ہنسی کے بہانے ڈھونڈتے پھرتے۔ ہنسا کرتے تھے۔ کچھ نہیں تو آمنہ آپا کی چوٹیا کی دم جیسی چٹیا کو گھور کر ہی کچھ تبصرے جاتے ہیں۔ یا ہیڈ مسٹرس صاحبہ کے ٹھک ٹھک کر چلنے پر ہنسی آجاتی تھی۔

دوسرے دن ہم اسکول پہنچے تو شیلا غائب تھی اور ہماری ٹانگ برابر والیاں بھی منہ بھر بھر کر کہتی پھر رہی تھیں کہ شیلا پر وہ صادق آپا کا بھائی، محمود مرتا ہے۔ جی ہاں۔ لڑکیاں اس معاملے میں لڑکوں کی طرح بدھو نہیں ہوتیں۔ ارے وہ تو گڑیاں کھیلتے ہی میں سمجھ جاتی ہیں کہ فلاں گڑیا فلاں گڈے پر کس بُری طرح مرتی ہے۔ مگر ہائے یہ شیلا کیسی خوش نصیب نکلی کہ وہ موٹر سائیکل والا محمود اس پر مرتا جس پر اسکول کی ساری لڑکیاں فدا تھیں۔ وہ روز

صادق آپا کو موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا کر اسکول چھوڑنے آتا تھا۔ ایک ہماری اشو پھوپو تھیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے چار پانچ رشتے ناتے کے بھائیوں پر مرنے کی آخری حد سے چکی تھیں۔ یوں تو ہماری محبت کی خوشبو میلوں دور سے کتے کی طرح سونگھ کر بھونکنا شروع کر دیتی تھیں۔ اور اماں جوان لڑکیوں کو ٹائم بم سے کم نہ سمجھتیں کہ وقت آنے پر ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالتا ہے۔ مگر اشو پھوپو کی سرگرمیوں پر سب انجان بن جاتے۔ کیونکہ وہ عمر میں ان چھوٹی خالہ سے بھی بڑی تھیں، جن کی راحت میری کلاس فیلو تھی۔ خیر، بقول اماں کے اشو پھوپو کو کافی کہہ لو، بدصورت کہہ لو۔ مگر ہمارے خاندان میں تو جانے کیوں دولہا والے آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ نسیم خالہ تھیں تو بیاہ کا انتظار کرتے کرتے انہوں نے میٹرک پاس کیا۔ ایف اے کیا۔ بی اے کیا اور ایم اے میں پہنچ گئیں۔ نانی نے جہیز کے نام کے جو کپڑے سیئے تھے اُن کا فیشن ختم ہو گیا۔ گوٹا کناری ماند پڑ گئی۔ جب بھی اماں یا نانی محلے ٹولے میں کسی کے بیاہ کا حسرت بھرا ذکر کرتی تھیں تو نسیم خالہ اپنے کالج کے پچاسوں قصے سنا ڈالتی تھیں۔ ایک لڑکی نے کیسے اپنی کلاس کے ایک لڑکے کو پسند کیا اور بغیر روپے جہیز کے پلک جھپکتے میں دونوں کی شادی ہو گئی۔ شروع میں ایسے قصے سُن کر نانی شیطان پر لعنت بھیجا کرتیں۔ مگر آخر میں انہوں نے بھی نسیم خالہ کو اپنی مرضی کا مختار بنا دیا۔ لیکن اس کے باوجود اب وہ زمانہ آ گیا تھا جب کالج میں وہ نسیم آپا پکاری جانے لگی تھیں۔

ہاں، تو میں کیا کہہ رہی تھی ———— ؟ کہ اسکول میں سب لڑکیوں کا خیال تھا کہ وہ موٹر سائیکل والا لڑکا یقیناً شیلا کی غزالیں آنکھوں پر مر مٹا۔ تب ہی اچانک مجھے خیال آیا تھا کہ رعنا کو میری آنکھوں کی چمک کتنی پسند ہے۔ ان ہی دنوں مجھے اپنے بہت ہی قیمتی ہونے کا احساس ہوا تھا۔ افوہ، مجھے کتنا ڈر لگتا تھا۔ ہر آدمی پر ڈاکو ہونے کا شبہ ہوتا۔ رات کو بار بار اٹھ کر دیکھتی کہ کوئی چور میرے سرہانے نہ کھڑا ہو۔ کمبخت میری آنکھوں کی دمک تو بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میں اسکول جاتی تو راستہ چلنے والے پلٹ پلٹ کر دیکھتے۔ اسکول کی ٹیچرس آتے جاتے میرے گال تھپتھپا جاتیں اور میرا بدن جلنے لگتا۔

مگر بھئی آپ جو اس بات کو کہانی سمجھ کر پڑھ رہے ہیں، اللہ جانے کس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے کہ میں نے اپنی چاند سی صورت سے کیا کیا فائدے اٹھائے ———— ؟ خاک ———— ارے میں بھی کوئی شیلا تھی جو راتوں رات اُڑ گئی۔ میں تو بچپن ہی سے ایک بہت ہی آئیڈیل انسان کے خواب دیکھ رہی تھی۔ یہ زمین پر بسنے والے ذلیل کیڑے، خواہشوں کے مارے ہوئے رومان زدہ نوجوان میری نظر میں کیا خاک جچتے! کہتے ہیں اگلے وقتوں میں جب میری طرح کوئی عقل میں بے مثال، صورت میں لاثانی شہزادی پیدا ہوتی تھی تو اللہ میاں اس کے لئے کسی دور دراز ملک میں ایک چاند سا شہزادہ بھی بھیج دیتے تھے۔ پھر وہ خوبصورت شہزادہ سات ناممکن سوالوں کو حل کرتا، دنیا کے سارے پہاڑ اور سمندر پھلانگتا اُس شہزادی کے پاس آ جاتا تھا جو اپنے دل کی بند کلی میں اُسے چھپا لیتی تھی۔ اسی لئے تو میں نے اپنے کالج کے دوستوں اور رشتے ناطے کے بھائیوں سے کہہ رکھا تھا کہ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ کوئی مجھے چھوُ کر کے تو دیکھے! آپ کی بلا سے ہم چاہے کیسے ہی کپڑے پہنیں، کتنا ہی میک اَپ کریں۔ چاہے میری آنکھوں کا سونا دمکے یا گالوں پر گلاب مہکیں اور میرے ———— میرے ———— بھئی، ان مردوں کی نظریں کیسی بُری ہوتی ہیں۔ مگر خیر ان سے نبٹنا کوئی مجھ سے سیکھے۔ میں نے کتنوں کے دماغ ٹھکانے لگا دیئے کتنوں کے ہوش و حواس لوٹا دیئے۔ مگر کون ہے جو میری قدر کرے۔ کل وہ چڑیل بلقیس ایک بھیشم سی کپڑے کی دکان میں کھڑی تھی۔ ساتھ ہی وہ نفاست پسند مغرور احمر بھی تھا۔ ایک روتی صورت بچے کو کاندھے پر ڈالے، دو کی انگلیاں تھامے۔ مگر اس بُری گت میں بھی وہ فلم کی ہیروئین کی طرح فخر سے اکڑی جا رہی تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ کوئی ایکٹرس اس کے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر میری آنکھیں پھوٹیں جو میں نے آج والی بلقیس سے زیادہ بدصورت کوئی عورت دیکھی ہو۔ احمر بھی مجھے ترس کھانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور بلقیس جانے کیا بکے جا رہی تھی ———— اری سچ تو کتنی بدل گئی۔ بڑا افسوس ہوا یہ سُن کر کہ سریندر نے تجھے چھوڑ دیا۔ اور تو نے ہماری چھوٹی سے بی کو دیکھا اب تو باتیں کرنے لگی ہے۔ کل کہہ رہی تھی پپا میرا بیاہ کر دو ———— پھر دونوں میاں بیوی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ لوگوں کو

جانے کہاں سے ہنسی کا خزانہ ہاتھ لگ جاتا ہے ——————!

مگر سریندر نے مجھے چھوڑ دیا تو بلقیس کو کیوں افسوس ہوا۔ کیا وہ چاہتی تھی میں بھی اس کی طرح تین بدصورت بچوں کو انگلی تھام کر اپنی ساری خوبصورتی لٹا بیٹھوں۔ میں نے تو سریندر کی صورت پہ تھوک دیا۔ میرے لئے کیا چاہنے والوں کی کمی تھی؟ ارے میں تو وہ ہوں جس کی ایک جھلک پر جانے کتنے مرمٹے۔ مگر مجھے تو احمد پر تعجب ہو رہا ہے۔ کیسا باذوق انسان کس بُری طرح تباہ ہوا۔ "عورت کی روح" سراج نے اس کا یہی نام رکھا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں ان ہزاروں عورتوں میں عورت کی روح ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔

اکثر میں جب سراج کے ساتھ جاتی تھی تو وہ بھی کسی اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ کسی سینما ہاؤس یا کلب میں مل جاتا۔ میں ہمیشہ اس سے پوچھ لیتی "کہئے روح ملی یا نہیں ——————؟ اور وہ اداسی سے جواب دیتا —————— "روح، ارے مجھے تو زندہ جسم بھی نہیں ملتے"۔

احمد کی یہ بکواس جانے کیوں مجھے کبھی اچھی نہ لگی اس کی نظروں میں جیسے میرے لئے بھی حقارت ہوتی تھی۔ جیسے میں نہ تو زندہ جسم ہوں نہ عورت کی روح رکھتی ہوں۔ بعض مردوں کو اپنے بارے میں کیسی خوش فہمی ہو جاتی ہے ——————؟

سراج بھی عین بین ایسا ہی تھا۔ ہمارے ہاں آکر گھنٹوں بیٹھتا۔ کھاتا پیتا مگر دوسرے لڑکوں کی طرح اس نے کبھی میری اہمیت نہ مانی۔ جیسے میں اسے گھر میں نظر ہی نہیں آتی۔ آتے ہی ننھے پپو سے کھیلنے بیٹھ جاتا۔ جیسے میری سنہری آنکھوں میں کوئی کشش ہے نہ ہنسی میں کوئی جادو ہے۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہونے لگی۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ مجھے اس کی کوئی پروا تھی ——————؟ اب آپ کو کیسے یقین دلاؤں —————— ثبوت کے لئے سراج کو کہاں سے لاؤں ——————؟ وہ تو میرے ٹھکرائے ہوئے دل کی کرچیں اٹھائے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شاید امریکہ میں ہے۔ یا شاید لندن میں —————— میری بلا سے اس کی بیوی جانے کہاں سے ڈھونڈی ہوگی۔ مگر یہ لڑکیوں کی ذات کیسی خود غرض ہوتی ہے! زندگی بھر کی مستیں، بچارے ایک ہی مرد سے وصول کر لیتی ہیں۔ اور مرد نہال ہوئے جا رہے ہیں کہ روح مل گئی۔

ہاں، تو میں کیا کہہ رہی تھی ——————؟ وہ شیلا چیٹوپل کا قصہ ——————!

اللہ توبہ کیسی بے حیا نکلی وہ لڑکی۔ اس کی بڑی بہن رعنا لڑکیوں کو سناتی تھی کہ وہ کیسے چھپ چھپ کر محمود سے ملتی تھی۔ کیسے اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ مر جائے گی محمود کے بغیر۔ یہ باتیں سن کر ہم سب لڑکیاں تھر تھر کانپتی تھیں۔ ہمارے حلق خشک ہو جاتے تھے ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ جاتی تھیں، ایک بار میں نے ہنسی ہنسی میں کہہ دیا تھا کہ میں بیاہ نہ کروں گی۔ مجھے کسی مرد کی اپنے اوپر اجارہ داری ذرا اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر اتنی سی بات سن کر اماں روتے روتے نڈھال ہو گئی تھیں۔ دادی کو بھی زہر لگتی تھیں میری باتیں۔ آپ ساری دنیا کی مریل بدمزاج بڈھیوں کو چھان ڈالتے۔ مگر ہنسی پر کنٹرول کرنے والی بڑھیا میری دادی کے علاوہ کوئی نہ ملتی۔ اب تو خیر سنا ہے وہ مر کھپ چکی ہیں اور میری چھوٹی بہنیں مزے میں ہر سال ان کی برسی کا پلاؤ اڑایا کرتی ہیں۔

آپ ہی بتلائیے کہ جب سراج اپنے دوست نواز کے رومانس سنا رہا ہو تو کسے ہنسی نہ آئیگی؟ اونہہ، توبہ —————— تو اب گویا مجھے نواز کی بات بھی سنانا پڑے گی ——————؟ ارے بھئی یہ ایک شوقین مزاج کسی بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا۔ عشق لڑانا اس کی ہابی تھی۔ مگر اتنی بات ہے کہ ایسے خوبصورت مرد میں نے کم دیکھے ہیں جو نواز کی طرح لڑکیوں کو کسی مقناطیسی کشش سے اپنی طرف کھینچ لیں۔ وہ ہر سال بڑی پابندی سے دو عشق کرتا تھا۔ سراج سناتا تھا کہ کس طرح ایک عشق کی مدت ختم ہونے سے پہلے اس کے دوست کنوؤں جال ڈالتے پھرتے نئی محبوبہ کے لئے۔ پھر سب کے مشورے سے ایک لڑکی کا انتخاب ہوتا۔ دوست پہلے خود دیکھتے پھر نواز شدت سے نئے عشق میں مبتلا ہو جاتا۔ نواز کے لطیفوں پر مجھے بہت ہنسی آتی تھی۔ سراج کہتا تھا کہ ایک ہزار کی انگوٹھی سے تو وہ تحفوں کی ابتدا کرتا تھا۔ ایک ہزار —————— اللہ میرے، یہاں تو کبھی ایک چاندی کا چھلا نصیب نہ ہوا۔ آتا کہاں سے۔ ابا کی ساری کمائی

بھائیوں اور بہنوں کی پڑھائی میں جھونکی جاتی تھی۔ ابا سمجھتے تھے کہ لڑکوں کو پڑھانا تو روپے کو بیاج پر چلانا ہے۔ بعد میں مع سود کے وصول کر لو۔ سراج کی زبان میں بھی بڑا سحر تھا۔ گھنٹوں اس کی باتیں سنو مگر دل نہ بھرے۔ مگر دادی کو تو میری خوشی سے بیر تھا۔

"اری سراج تیرا کونسا مال جایا ہے کہ گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی رہتی ہے ——— ! یہ بھی خوب رہی ناکردہ گناہوں کی سزا۔

جب سے شیلا کی کہانی مشہور ہوئی تھی اماں جانے کیوں مجھے ہوّا سمجھنے لگی تھیں ——— ہاں تو میں شیلا کی بات سُنا رہی تھی۔ مگر بعض اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے۔ سُنا ہے اس کے باپ نے کمرے میں بند کر دیا تو وہ دوسری منزل سے چھلانگ لگا کر بھاگ گئی۔

مجھے تو اسی دن یقین ہو گیا کہ عشق میں ضرور کچھ نہ کچھ روحانیت بھی ہوتی ہے۔ ورنہ دوسری منزل سے گر کر تو انسان عشقِ حقیقی میں جذب ہو جائے۔ اچانک شیلا سارے اسکول کی ہیروئین بن گئی۔ ساری لڑکیاں بڑے فخر سے ان لمحوں کو یاد کرتی تھیں۔ جب شیلا نے ان سے بات کی تھی۔ ان کے ساتھ کھیلی تھی، انہیں گالیاں دی تھیں۔ جانے ان لڑکیوں کے دیدے کا پانی کیسے مر جاتا ہے۔ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ ایک انجانے مرد کے ساتھ یوں چل دیتی ہیں۔

دور کیوں جائیے، خود ہمارے خاندان میں ایک سے ایک چھٹی ہوئی لڑکیاں پڑی ہیں۔ بے شک میرا خاندان بڑا نامی گرامی ہے۔ مگر اس اونچے خاندان میں مجھے کون سے لڈو پیڑے دیتے ہیں جو میں سب کی بُرائیاں بلی کے گو کی طرح چھپاتی پھروں۔ ابھی تو میں نے دوپٹہ اوڑھنا بھی نہ سیکھا تھا جو صدیقہ آپا نے اپنی پسند سے شادی کی ہے۔ اور ایک ہماری شمیم خالہ تھیں۔ ہائے اللہ، ندرسے کیسے کہوں! خود ان کے ابا نے ان کے خط پکڑے تھے۔ مگر یہ خاندان میری ذرا سی بات نہ سہہ سکا۔ سراج کے ساتھ پکچر دیکھنا ایسا کیا خطرے کا الارم تھا کہ سب چونک پڑے تھے مجھ سے۔ میں بھی کوئی ایسی ویسی تھی! سراج بچارا تو خود ہی مجھ سے کانپتا تھا۔ میری جرأت پہ گھبرا جاتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہوٹلوں میں گئی۔ پکچر دیکھے اور پھر اس کے کمرے میں گھنٹوں بیٹھی، محض یہ جتانے کے لئے کہ میں اس سے نہیں ڈرتی۔ کسی نوجوان مرد سے بھی نہیں ڈرتی۔ مگر ایک دن سراج اپنی توہین پر بگڑ بیٹھا ——— "تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا سچ ——— ! اور میری حقارت بھری مسکراہٹ پر وہ بپھر گیا اور پھر بعد میں میری آنکھوں کا سونا لٹ جانے پر خود ہی آنسو پونچھنے لگا اپنے۔ جیسے اس نے مجھ سے موت اور زندگی چھین لی۔ جیسے وہ اب مجھے دنیا کی مظلوم ترین عورت سمجھ رہا ہو۔ اللہ قسم میرا دل تو اس کے، آنسوؤں میں بہہ گیا۔

میں کمبخت کس کام کی تھی۔ سوائے گھر اور کالج کے چکر لگانے کے میرا اور مصرف ہی کیا تھا۔ میں چاہتی تھی اس بات کو سراج اپنی فتح نہ سمجھے۔ میں بھُولا جاؤں۔ مگر سراج نہ بھول سکا۔ اس نے کیسی کیسی میری ناز برداریاں کیں۔ زندگی بھر کا بندھن باندھنے کے لئے کہیں سے ایک انگوٹھی خرید لیا۔ جیسے میں اس انگوٹھی میں پھنس کر اپنی زندگی بھر کی آزادی کھو دوں گی اور وہ اپنی فتح پر ناز کرے گا۔ سراج سے میری نفرت بڑھتی ہی گئی میرے چہرے کا رنگ اُڑتا ہی گیا۔ جانے کیسے شیلا محمود پر مر مٹی تھی ——— ! اسے زندگی بھر کے لئے پسند کر لیا۔ توبہ توبہ، کیسی بے باک ہوتی ہیں یہ لڑکیاں۔ میں تو سوچ، سوچ کر حیران ہوں۔ مگر قصوروار مرد بھی ہیں۔ واقعی بعض مرد بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔ اب نواز ہی کی مثال لو۔ ایک دن میں نے اسے سراج کے کمرے میں دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس دن مجھے محسوس ہوا کہ لڑکیاں اس کی ایک ہزار کی انگوٹھی تو دیکھتی بھی نہ ہوں گی۔ اس کی ہنسی کی کشش بچاریوں کو گرفتار کر لیتی ہو گی۔ میری آنکھوں میں کون سا سونا تھا۔ میری گلابی رنگت میں کونسی خوشبو تھی ——— ! میرے ——— میرے۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہ آیا۔ نواز میرے لئے جو زیور کا سٹ لایا۔ اس نے مجھے جو ساریاں دلوائیں، وہ تو مجھے اس دن یاد آئیں، جس دن میں سرینڈر کے ہاں سے ایک سوتی، ساری پہنے نکلی اور رات بھر سڑکوں پہ سردی سے کانپتی پھری۔ مگر اس وقت تو میں صرف گھر والوں کو جلا رہی تھی۔ آخر ان سب کو میری شرافت پہ بھروسہ

کیوں نہیں رہا تھا ——— ؟ شام کو ذرا دیر سے گھر پہنچی اور دادی نے کُتّے کی طرح ٹانگ لی ۔ اماں مگرمچھ اپنے نصیبوں پر آنسو بہا رہی ہیں ۔ بعض وقت تو میرا جی چاہتا تھا کہ اماں واقعی کسی آوارہ لڑکی کی ماں ہوتیں ۔ نواز ٹھیک ہی تو کہتا تھا کہ یہ دنیا تو ہم سے کبھی راضی نہ ہو گی پھر کیوں نہ اپنی من مانی کر کے مریں ۔

کتنا جی چاہتا تھا کہ کوئی رومینٹک سی انگلش پکچر دیکھ کر لا حول پڑھیں ۔ اچھی اچھی ساریاں پہن کر میک اپ کر کے کسی کے ساتھ گھومنے جائیں مگر سراج کی بات بالکل سچ تھی کہ یہاں دبنے والے کو سب ہی دباتے ہیں ۔ عورتیں جب تک اپنے لئے خود کچھ نہ کرے گی کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان کی خدمت میں پھولوں کی طرح آزادی کا گاسکٹ پیش کریں ——— ؟ میں نے تو سوچ لیا تھا کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی ۔ کیا دنیا میں لڑکیوں کا ایک ہی معرف ہے کہ ان مردوں کے لئے مسکرا کے خود جل بجھیں ۔ مجھے تو ان سیتاؤں ساوتریوں اور مریموں سے شدید نفرت تھی جنہوں نے مردوں کے لئے اپنے آپ کو مٹا ڈالا ۔ دھرتی میں سماگئیں ——— روح ——— روح ——— یہ کیا چیز ہے جو آج تک میری سمجھ میں نہ آئی ۔

زندگی زندگی ہے ۔ چاہے اسے ایک آنسو کا قطرہ بنا لو یا نواز کی طرح ایک طویل قہقہہ . . . میری کون سی خواہش تھی جو نواز نے پوری نہ کی ہو ۔ زندگی میں اب چاہے کبھی ہنسی سے مڈبھیڑ نہ ہو مگر اس عیش کی تلافی پھر بھی نہ ہو گی ۔ اس کی محبت پر مجھے سراج کی طرح یقین تھا ۔ مگر اچانک کالی رات نے آگھیرا ۔ نواز کی محبت کا کیلنڈر بدل گیا ۔

گھر والوں کا بس چلتا تو مجھے کچا چبا ڈالتے ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مردوں کی یادداشت اتنی کمزور ہوتی ہے ۔ وہ ہر بات بھول سکتے ہیں ۔ میں بچاری کرنے پڑی معصوم روح ۔ کوئی دنیا جہاں کی سی چلتی پرزہ لڑکی تو تھی نہیں کہ بہت سوں کو کھنگال چکی تھی ۔

میری تو قسمت ہی خراب تھی ۔ جتنا چاہتی کہ مردوں سے ہٹ کر چلوں ، اتنے ہی راستے میں روڑے اٹکتے ۔ ایک ہماری پڑوسن للتیا تھی کہ کیا کچھ نہیں کر ڈالا ۔ بمبئی جا کر ماں کے ساتھ ایک لڑکی بھی لے آئی جسے سب اس کی بہن کہتے تھے ۔ اور پھر دیکھو تو اپنے میاں کے ساتھ راج کرتی تھی ۔ میاں بچارا بھیگی بلی بنا دوڑ دوڑ کر اس کے احکامات بجا لاتا ۔

مگر ہماری اماں دن رات یہی کوسے جاتی تھیں کہ اب کوئی تھوکنے نہ آئیگا ۔ تو گویا میں نے یہ اپنی روح کو رسی صراحی کی طرح بچا کر رکھی تھی یوں ہی رکھی رہ جائے گی ——— ؟ گھر والوں کی پھٹکار سے بچنے کے لئے میں نے للتیا کے ہاں پناہ اور للتیا کے بھائی سریندر نے مجھ میں پناہ ڈھونڈی للتیا ٹھیک کہتی تھی کہ بتو ، لوگ ہمیں مفت میں بدنام کرتے ہیں ۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ان مردوں کے کاٹے کا منتر کہاں ہے ——— ؟

سریندر بھی الٹی کھوپڑی کا تھا ۔ ایک بدصورت چیچک زدہ لڑکی پر مرتا تھا اور وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی ۔ اس کے فراق میں سریندر نے جوگ لے لیا ۔ دنیا کی ہر خوبصورت عورت میں وہ اپنی محبوبہ کو ٹٹولتا پھرتا تھا ۔ جب کبھی اس لڑکی کا ذکر آتا سریندر فوراً گاجر کا حلوہ یاد کرنے لگتا ۔ وہ گاجر کے حلوے میں جانے کتنی مٹھاس ڈالتی تھی کہ اس کی بے وفائی کا زہر بھی اس کی شیرینی نہ بھلا سکا ۔ اس کی آگ میں میں خود بھی جل اٹھی ۔ نہیں ، مجھے سریندر سے کوئی ہمدردی نہیں تھی ۔ میں تو نواز کو جلا رہی تھی ۔ بلکہ یوں کہیئے کہ میں تو دراصل گھر والوں سے انتقام لے رہی تھی ۔ میں ان سب سے بدلا لینا چاہتی تھی جو میرے دروازے پر شہنائیاں بجانے اور برات لانے سے انکار کر رہے تھے ——— ایک دن تو ، ایک دن تو ابا نے مجھ پر ہاتھ بھی اٹھا دیا ۔ بس اسی وقت میں نے طے کر لیا کہ اب مجھے اس گھر میں نہیں رہنا ہے ۔ لوگ کہتے ہیں لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں ، اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں ۔ لعنت ہے ایسے چاہنے والوں پر ۔ میں تو اپنی معصومیت میں ماری گئی ۔ میرے ساتھ کون تھا جب میں نے گھر سے باہر قدم نکالا ہے تو ——— اس رات جانے کیا کیا ہوا ——— میں جیسے خواب میں اٹھ کر سریندر کے گھر پہنچ گئی ۔ وہ حیران تھا ۔ اس نے شاید خواب میں

بھی کبھی نہ سوچا ہوگا کہ میں ایسی بد دماغ مغرور حسینہ، ایک دن پناہ مانگنے اس کے دروازے پر پہنچ جاؤں گی۔ میں کیا کرتی! سارا قصور تو ابا کا تھا۔ سریندر مجھے کار میں اپنے گاؤں لے گیا۔ وہاں میں پہنچتے بعد اس خواب سے جاگی ایک مہینے تک کمرے سے باہر نہ نکلی۔ باقی دنیا میں اب کیا رکھا تھا۔!

سریندر کا جی چاہتا تھا کہ میرے منہ پر بھی سریندر کی محبوبہ کی طرح چیچک اپنے دستخط کر دے۔ میں اس کے لئے روٹی پکاؤں۔ گاجر کے حلوے میں خوب شکر ڈالوں۔ صبح جب گاؤں جاگتا تھا تو شوہر اپنی بیویوں کو پیٹنے سے دن کا آغاز کرتے تھے۔ سریندر بڑی آنسو بھری نظروں سے انہیں دیکھتا۔ یہ کیسی پیاری زندگی تھی۔ مار اور پیار —— نفرت اور محبت —— وہ مجھ پر جی جان سے فدا تھا۔ ایک لمحے کو نہ چھوڑتا۔ لیکن میرے دل کو سکون کہاں تھا! ہر آہٹ پر چونک پڑتی۔ دن بھر سریندر کے ایک وکیل دوست کے پاس بیٹھی اپنا وہ بیان رٹا کرتی تھی جو مجھے عدالت میں ابا اور ، دادی کے خلاف دینا ہوگا۔ ڈر کے مارے میں باہر نہ نکلتی تھی کہ کہیں ابا کی نظر نہ پڑ جائے کہیں مجھے کوئی زبردستی گھر نہ لیجائے مگر ایک دن احمد نے بتایا کہ ابا نے میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ وہ اب مجھے گھر بلانے کے روادار نہیں۔ میں انگاروں میں نہا گئی۔ جی چاہا اس توہین پر کپڑوں میں تیل چھڑک کر آگ لگالوں۔ ادھر اس گاجر کے حلوے نے میری زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ اس چڑیل نے ضرور حلوے میں اُلّو کا گوشت کھلایا ہوگا۔ سریندر کو اُلّو کیا، ایسی چالاک عورتوں سے کیا بعید ہے۔ ایک دن میں نے کہا۔ گاجر کا حلوہ کونسی نایاب چیز ہے میں تمہیں روز بازار سے لاکر کھلا دیا کروں گی۔ بس وہ بگڑ گیا۔ اُسی دن یہ ڈور ٹوٹ گئی۔ تو میں نے بھی اس سے کون سا جنم مرن کا بندھن باندھا تھا۔ میں خود ہی ایسے مفلس قلاش شخص کی اوقات پر تھوک دیتی ورنہ دنیا کیا کہتی کہ ان ہی پُرانی ساڑیوں کے لئے بیراگن کا جوگ لیا تھا؛ میری اسکول کی سہیلیاں کہیں مل جاتیں تو ہنس ہنس کر میرے ، بے جوڑ کپڑوں کا مذاق اڑاتیں اور آکر میرا گھر دیکھنے کو آ دھمکتیں۔ جیسے میں نے اس کنجوس کے ساتھ گھر بسانے کے سپنے سجائے تھے۔

اب قیامت کے آنے میں کیا شبہ رہا ہے۔ توبہ توبہ۔ آوارگی کتنی بڑھ گئی ہے۔ سنا ہے شیلا اور اس کے عاشق کو لوگوں نے ٹرین میں پکڑا تھا ذرا ملاحظہ تو فرمایئے ان لڑکیوں کی جرأت! کیسی ڈھٹائی ہے اس نے عدالت میں بیان دیا ہوگا۔ جانے کیسی کیسی جراح کی ہوگی وکیلوں نے میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ایسی باتیں سن کر جی چاہتا تھا کہ چوہیا کی طرح پوری زندگی کسی بل میں گھس کر گذار دوں ورنہ شریف لڑکیوں کا بچاؤ کہاں ہے! پھر میری آنکھوں کا کمبخت سونا۔ جانے میری صورت پر کونسے لعل جڑے تھے کہ لوگ ایک بار دیکھتے تو پھر منہ نہ پھیرتے۔

میں نے تو اللہ قسم کبھی ایک منٹ کے لئے بھی نہ سوچا تھا کہ شیلا کی طرح کسی کے ساتھ فرار ہو جاؤں۔ یہ بات نہیں کہ مجھے ستی ساوتری بننے کا خبط ہو۔ میں تو شروع ہی سے مرد کی اجارہ داری کے خلاف تھی۔ بیوی۔ بیوی —— مرد کی سب سے بڑی فتح۔ عورت کا سب سے ذلیل روپ مجھے یہی لگتا کہ وہ ایک مرد کی غلام بن جائے۔

آخر عورت کو بھی تو آزادی کی ضرورت ہے۔ خود مختاری کی۔ کیا میرے سینے میں دھڑکتا پھڑکتا دل نہیں تھا کہ میں بھی کسی کو ایسی ہی آزادی سے چاہوں جیسے مرد —— اسی فن کے موتی کی تلاش میں تو میں اتنی دور چلی آئی تھی۔ مگر یہ دیکھکر کیسی مایوسی ہوتی ہے کہ ساری دنیا کی عورتیں ایک مرد کی پناہ ڈھونڈتی ہیں اور ہر مرد کو اس بات پہ فخر ہے کہ اس کی بیوی صرف اس کی ہے۔

سرتیش بچارا سیدھا سادھا نوجوان تھا۔ غریب کی قسمت پھوٹ گئی تھی کہ بیوی ٹکسن کا ناچ نچاتی۔ ساری تنخواہ چھین لیتی۔ شراب پی کر آتا۔ تو گھر سے باہر نکال دیتی۔ کسی عورت کی طرف دیکھتا تو میکے چلی جاتی۔ میں نے سرتیش کا دل بہلانے کے لئے کیا کیا نہیں کیا؛ محض اس لئے کہ وہ سمجھ جائے عورت کی رفاقت بڑی چیز ہے، کیا ضروری ہے کہ وہ بیوی کی طرح گلے کا ہار بن جائے۔ ہم دو آزاد پنچھیوں کی طرح کیوں نہیں ساتھ رہ سکتے؟ اپنے پاس سے منگوا کر شراب تک اسے پلاتی۔ روز اسے پکچر دکھانے لے جاتی پھر ہم کسی بڑھیا سے ہوٹل میں کھانا کھاتے۔ دن بھر ہم دونوں بیٹھے دمی کھیتے

ایک دن وہ ہارتا ہی گیا روپے سے بات گھڑی تک پہنچی پھر انگوٹھی پر آئی ۔ مگر انگوٹھی میں چھیننے لگی تو وہ اچانک خفا ہوگیا ۔

"اسے تم مت پہنو ۔ اسے کیسے داؤ پر لگا سکتا ہوں ۔ یہ تو سنیتا کی یاد ہے "

اچانک وہ انگوٹھی مجھے سانپ کا پھن نظر آنے لگی ۔ یہ مرد چاہے اپنے بارے میں کچھ کہتے پھریں مگر بے حد قدامت پسند ہوتے ہیں ۔ گاجر کے حلوے کے بغیر ان کا کسی چیز سے پیٹ نہیں بھرتا ۔

میرا جی چاہا وہ سارے گزرے ہوئے دن لوٹ آئیں ۔ میں پھر سے پیدا ہوں ۔ پھر سے دادی میرے ہنسنے پر ٹوکیں اور میں آنسو پی کر رہ جاؤں ۔ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس مرد کے ہاتھ میں ہاتھ دیدوں جو میری یاد کی پرستش کی طرح حفاظت کر سکے ۔ اس کے لئے میں دوسری منزل سے چھلانگ لگا سکتی ہوں ۔ ساری زندگی چولہے کا دھواں نگل کر گاجر کا حلوہ پکا سکتی ہوں ۔ اس کے لئے میں اپنی روح کا تحفہ ہمیشہ محفوظ رکھوں گی ۔

اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے شکنتلا کو بارہ برس تک تپسیا کرنا پڑی تھی ۔ ایک سنیتا تھی جس کے لئے دھرتی نے اپنے پٹ کھول دیئے تھے تاکہ وہ خود چھپ جائے اور اس کی پاکیزگی کا سورج ہمیشہ چمکتا رہے ۔ میں بھی رفتہ رفتہ دھرتی میں سما رہی ہوں ۔ میری آنکھوں کے خزانے خالی ہو چکے ہیں ۔ میرے گالوں کے گلاب مرجھا رہے ہیں ۔ جانے وہ شہزادہ کہاں ہے جسے اللہ میاں نے میرے لئے بھیجا ہوگا ۔ کہیں کسی چڑیل نے بیوی کا روپ دھار کر اسے قید تو نہیں کر لیا ! کون آئے گا اب یہ دیکھنے کہ میں نے اپنے جیون کے ہون کنڈ میں مسرتوں کی آہوتی ڈال دی ہے ۔ میں جس کی روح بند کلی کی طرح پاک تھی ۔

اے ساوتری ——— اے سنیتا ——— اے مریم ——— توبہ اللہ ۔ اس وقت میں اپنی کہانی، تو سنانے نہیں بیٹھی ہوں ۔ ! ———

مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ لڑکیاں آوارہ کیسے ہو جاتی ہیں ——— ! کیا ان کے پاس وہ بند کلی نہیں ہوتی ۔ جس کے اندر عورت کا دل دھڑکتا ہے ——— ؟

ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی ——— میں کیا کہہ رہی ہوں ——— ؟

اندرونِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

غلام الثقلین نقوی

پی کے نگر

ا۔ پگڈنڈی

پگ ڈنڈی دھوپ میں چمک رہی تھی!

یہ پگڈنڈی گل بہار اور سنبل پور کو ملاتی تھی۔ گل بہار کی ایک لڑکی جس کا نام شیماں تھا سنبل پور جا رہی تھی جہاں اس کے ننھیال تھے۔ اور اس کی نانی بیمار تھی۔

پگڈنڈی کے دونوں طرف دھان کے سرسبز کھیت جھوم رہے تھے۔ منجروں سے بڑی دھیمی مست خوشبو اُٹھ رہی تھی اور دھوپ کی سنہری چمک میں سبزے کی نرم گرم ٹھنڈک رچی ہوئی تھی۔ وہ ٹھُمک ٹھُمک چل رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر جیسے اُسے سنبل پور پہنچنے کی کوئی جلدی نہ ہو اور سنبل پور تھا ہی کون سا دور۔ دونوں گاؤں اتنے قریب تھے کہ اگر ایک میں برات آتی، باجے اور نفیریاں بجتیں تو دوسرے گاؤں والے گھر بیٹھے دھیمے نغموں کو سُن لیتے۔ رستے میں ایک ٹیلہ حائل نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے کو چلتے پھرتے کام کرتے دیکھ بھی سکتے۔ ٹیلے کے دامن میں ایک چھوٹا سا نالہ بھی تھا۔ یہ نالہ پہاڑوں کی طرف سے آتا تھا اور یہ پہاڑ نیلم کی دیواروں کی طرح شمال کی طرف اُبھرے ہوئے تھے اور ان کی چوٹیاں اُفق کی گولائیوں کو چھو رہی تھیں۔

شیماں کا رنگ سانولا تھا۔ اس کا کومل سا جسم دھان پان تھا لیکن بھرا بھرا بھی شگفتہ سا جیسے برسات میں پھوٹنے والی نیم کی ایک ہری بھری ٹہنی میں جوانی کا رس لبالب بھر گیا ہو۔ اس کی ننھی سی ناک میں سونے کی کیل تھی اور کیل کا سفید نگ شبنم کی بوند کی طرح جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تازہ تازہ تھے سنگترے کی قاش جیسے کہ جن میں مٹھاس بھی تھی اور کھٹاس کی لذت بھی۔ اس کے کپڑے دُھلے ہوئے اور ہلکے پھلکے تھے۔ سر پر آسمانی رنگ کا دوپٹہ تھا اور پاؤں میں لمبی نوک والی مُشک سی جوتیاں تھیں جن کے پنجوں پر ایک ایک طلائی پھول کڑھا ہوا تھا۔

بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی تنگ بھی تھی اور دھان کے کھیتوں کی سطح سے تھوڑا سا بلند بھی۔

بعض جگہ تو یہ اتنی تنگ اور اونچی ہو جاتی کہ سوچ سوچ کر قدم رکھنا پڑتا۔ ورنہ دھم سے کھیتوں کی کیچڑ میں گر جانے کا ڈر تھا۔ ایک بار شیماں کا پاؤں پھسلا تو وہ بڑی مشکل سے سنبھلی۔ اس کے ہونٹوں پر بے اختیار ہنسی کی ایک لہر اُبھر آئی اور سانولے رخساروں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔ پھر اسے اپنے آپ پر لاج آ گئی جیسے کسی نے اُسے دیکھ لیا ہو۔ ننھے ننھے گڑھوں میں دھیمی سی لَویں جل اُٹھیں۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

جب اس نے نظریں اٹھائیں تو ٹیلہ سامنے تھا۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ ٹیلے پر سُرخ ٹھیکریاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان پگڈنڈی کی سفید لکیر چاندی کے تار کی طرح چمک رہی تھی اور ٹیلے کی چوٹی پر کیکروں کا سایہ تھا۔ سایہ آہستہ آہستہ ٹیلے سے نیچے اتر کر اس کی طرف آ رہا تھا۔

سایہ اتر رہا تھا اور شیماں ٹیلے پر چڑھ رہی تھی۔

ایک سبز رنگ کی ننھی سی چڑیا ایک جھاڑی میں سے پھُر سے اڑی اور ہوا کا ایک دھیما سا جھونکا بن کر اس کے کان کے پاس سے گزر گئی۔ اب

شیماں پھر مسکرا پڑی۔ رخساروں میں گڑھے پڑے اور پھر اس کی مسکراہٹ ان گڑھوں میں ڈوب گئی۔ اس نے سوچا جب وہ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچے گی تو ایک دفعہ پھر مسکرائے گی اور اس کے بعد بڑا سنجیدہ سا چہرہ بنا کر سنبل پور چلی جائے گی۔ وہ کون سا شادی پہ جا رہی تھی۔ اس کی نانی بیمار تھی اور ماں نے اُسے اس کی خبر گیری کے لئے بھیجا تھا۔

ٹیلے کی چوٹی پر کئی پگڈنڈیاں اِدھر اُدھر سے آکر مل گئی تھیں!

ہوا چل رہی تھی یا شاید جب اُس نے چوٹی پر پہلا قدم رکھا تھا تو ہوا کا پہلا جھونکا آیا تھا۔ ٹیلے کے اردگرد دور دور تک کھیت سبز چادر کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ منظر بڑا خاموش تھا جیسے اس پہ کسی نے جادو کر دیا ہو۔ ایک طرف گل بہار دھوپ میں چمک رہا تھا اور دوسری طرف سنبل پور رہوا کا جھونکا گزر گیا تھا۔ درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ اسے نہ جانے ٹھنڈے سائے تلے مسکرانا کیوں بھول گیا۔

کُو۔۔۔۔کُو۔۔۔۔۔کُو۔

کیکر کی ایک شاخ پہ بیٹھی ہوئی فاختہ نے نغمہ سرائی کی۔ اس نے اوپر کی طرف نظر اٹھائی۔

"سشش!"

فاختہ نے پر پھیلائے۔ ایک جست لگائی اور درختوں سے اونچی اُڑ کر سنبل پور کی طرف اُڑ گئی۔ دیر تک فاختہ کے پروں میں گھنگھرو بجتے رہے۔ شیماں کے ہونٹ مسکرانے کے لئے کھلے۔ نقرئی گھنگھرو اس کے گلے میں اُتر گئے۔ چھن چھن ایک قہقہہ بجا۔۔۔۔ جوانی کا الہڑ نغمہ۔۔۔۔۔ سایہ کانپا۔۔۔۔۔ اور دھان کے کھیتوں کی مخملیں سبز سرسراہٹوں میں رچ گیا۔ دو پہاڑوں کی چوٹیوں پہ شفق کے سنہری تیر گڑ گئے اور تھرتھرانے لگے۔۔۔۔ پھر یکایک اُن پہاڑوں سے شام اُتر آئی۔

"واہ! واہ!" ایک حیرت زدہ آواز آئی۔

شیماں نے چونک کر آنکھ اٹھائی تو اس کا قہقہہ گلے میں دم توڑ گیا۔

اس کے ہاتھ میں بانس کی لمبی سی لاٹھی تھی اور اس پر پیتل کی "شامیں" تھیں۔ اس کی ٹیڑھی پگڑی کا شملہ تھرتھرا رہا تھا اور اس کی مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح بل کھائے ہوئے تھیں اور وہ اس پگڈنڈی پر کھڑا تھا جو شمال میں پہاڑوں کی طرف جا رہی تھی۔

شیماں سہم کر دم بخود ہو گئی!

"لوگوں سے سُنا تھا اس ٹیلے پر روحوں کا ڈیرہ ہے۔ آج پتہ لگا لوگ سچ کہتے تھے۔"

شیماں کو یکایک اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ پھر ٹیلے سے متعلق خوف ناک کہانیاں پرے باندھ کر آئیں۔ وہ ڈر گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔

"یہ لوگوں کو کیا پتہ اس ٹیلے کی بلا کتنی خوبصورت ہے۔ الہڑ مٹیار جو خود بخود قہقہے لگاتی ہے!"

شیماں اپنے آپ میں دبک سی گئی۔

"میں تو کہوں گا اس ٹیلے پہ پریوں کا بسیرا ہے۔ میں نے ایک پری کو دیکھا جس کے سر پہ نیلا دوپٹہ تھا جس کے پاؤں میں نازک جوتیاں تھیں۔ جس کی کمر سو سو بل کھا کر لچکتی تھی۔"

شیماں شرما کر جھک گئی۔ دھان کے نازک پودے کی طرح جس کے ساتھ ہوا کے ایک گستاخ جھونکے نے اٹھکیلی کی ہو اور وہ جھک کر زمین

سے لگ گیا ہو۔

"اور وہ پری شرماتی بھی تھی، لاج کے مارے سکڑ سمٹ کر ......"

یشماں نے قدم بڑھایا۔ اس نے بڑھ کر راستہ روک لیا۔ یشماں کا تن بدن کانپ گیا۔ اس کی آنکھوں میں رَم کردہ آہو کی وحشت بھر گئی۔ اس نے ٹھٹک کر آنکھیں جھکالیں "میں تو اپنی بیمار نانی کو دیکھنے جا رہی ہوں"

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔

"سنبل پور میں ....." یشماں نے رک رک کر جواب دیا

"سنبل پور!" اس نے حیران ہو کر پوچھا "سنبل پور کون سا کالے کوسوں دور ہے؛ میں تو ابھی جی بھر کر دیکھوں گا۔ پرستان کی مخلوق روز روز تو اپنی چھب نہیں دکھلاتی۔ یہ تو کسی کی قسمت کی بات ہے"

"میری نانی بیمار ہے" یشماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اور شام ہو گئی ہے" اس نے جواب میں ایک ننھا سا قہقہہ لگایا لیکن راستے سے نہ ہٹا۔ یشماں نے پگڈنڈی سے ہٹ کر نکل جانا چاہا تو اس نے بڑے پیار سے پوچھا —

"کیوں رانی مجھ سے ڈرتی ہو؟"

"ہاں!" یشماں نے کہا "میرے راستے سے ہٹ جاؤ"

"جو نہ ہٹوں تو" اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا

یشماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے بڑی بے بسی کی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ معصوم سی نگاہیں جھک گئیں اور پھر وہ رونے لگی۔ پلکیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ آنسو گالوں پر بہنے لگے۔ نوجوان نے ان آنسوؤں کو دیکھا تو وہ راستے سے ہٹ گیا۔ یشماں نے رستہ صاف پایا تو قدم بڑھا لیا۔ وہ قدم قدم پر مڑ کر دیکھتی رہی۔ نوجوان راہی اپنی جگہ پر بُت بنا کھڑا تھا۔ پھر اُس نے لرزتی ہوئی گھمبیر آواز میں اُسے پکارا "رانی!"

"میرا نام رانی نہیں" یشماں نے دھیمے سے کہا اور ایک قدم بڑھا لیا۔

"تو پھر میں تجھے کس نام سے پکاروں؟" اس کی آواز میں بڑا گہرا دکھ تھا اور اس دکھ میں فراق کا نغمہ تھا جو کانپ رہا تھا۔ یشماں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ ایک دو لمحوں کے لئے خاموش ہو کر کچھ سوچتی رہی۔ تب یکایک اس کا ڈر جاتا رہا۔ اس نے مڑ کر دیکھا "کہیں پریوں کے نام بھی پوچھتے ہیں" یشماں نے چہک کر کہا۔

"نیلم پری ..... سبزپری ..... بہت سے نام ہیں ..... میں تجھے کس نام سے پکاروں؟" نوجوان نے قہقہہ لگایا اور ایک قدم اس کی طرف بڑھایا۔ پھر اچانک رُک گیا۔ اس نے سنبل پور پر ایک نظر ڈالی، دوسری یشماں پر ..... پھر اس نے منہ موڑ لیا۔ یشماں ٹیلے سے نیچے اُترنے لگی۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ راہی ٹیلے کی چوٹی پر بُت بن گیا تھا۔ یشماں یکایک اداس ہو گئی یا پہاڑوں سے اترنے والی شام اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

نالے کے کنارے پہنچ کر اس نے جوتیان اتاریں اور شلوار کے پائنچے چڑھا لئے اور پایاب پانی میں سے شپ شپ گزر گئی۔ دوسرے کنارے پر اس نے پاؤں دھوئے اور جوتیاں پہن لیں۔ پگڈنڈی کے پیچ وخم شام کے سایوں میں گم ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنے خیالوں میں کھو گئی۔ گاؤں کی گلیوں میں کئی بار ان جوانوں سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ کھیل کر پروان چڑھے تھے پر آج تک کسی نے اس کا راستہ

روکا تھا۔ بس نظروں میں ہی نظروں میں کچھ پیغام دیئے تھے جن کا مطلب پاکر بھی وہ نہ پا سکی تھی ..... آج اس کے کانوں نے ایک نیا نغمہ سُنا تھا۔ ..... البیلا نغمہ ..... جیسے الغوزے پر کسی نے کچھ گایا ہو اور راگنی کی ایک سُر اس کے دل میں اُتر گئی ہو ... "نیلم پری .... سبز پری ... پریاں ٹیلوں پہ رہتی ہیں! ..... اس نے میرا راستہ روک لیا ... میں کوئی پری ہوں ... میں تو گل بہار کی شیتاں ہوں جو سنبل پور جا رہی ہے ... میں نے اچھا کیا جو اسے اپنا نام نہ بتایا .... اب وہ سنبل پور آیا تو لوگوں کو پوچھتا پھرے گا ..... (اس گاؤں میں کوئی سبز پری بھی آئی ہے ؛ کوئی نیلم پری جو ٹیلے پہ کھڑی قہقہے لگا رہی تھی) ..... میں نے شش کہا اور فاختہ چھن چھن اڑ گئی ... سنسان ٹیلے پر میں نے قہقہہ کیوں لگایا بھلا؟"

ہر قدم پر اس کی سوچ میں ایک نیا موڑ آیا۔ پگڈنڈی کے بل ختم ہو گئے۔ شام کے سایوں پہ سنبل پور خاموش کھڑا تھا، جیسے اس کا انتظار کر رہا ہو۔ ایک گھر کے آنگن میں قدم رکھتے ہی پرستانی خواب دھند کا ایک غبار بن کر اندھیاروں میں تحلیل ہو گیا۔

"شیتاں تو؟ ..... تو اتنی دیر سے کیوں پہنچی؟"

"یونہی ..... ٹیلے پہ ..... نانی ماں! ٹیلے پہ پریوں کا بسیرا ہے کیا؟"

"پریاں! ... لوگ کہتے ہیں سنسان ٹیلوں پہ روحوں کا بسیرا ہوتا ہے۔"

"روحوں کا!" شیتاں کی آواز کپکپائی۔

"وہ تجھ جیسی اچھی بی بی لڑکیوں کو کچھ نہیں کہتیں پر اچھا ہوتا جو تو شام ہونے سے پہلے پہلے آجاتی۔"

"نانی ماں! تو بیمار ہے نا؟ ماں نے کہا تھا جا شیتاں اپنی نانی کو دیکھ آ۔"

"ہاں بیٹی! میں بیمار ہوں۔ تو نے اچھا کیا کہ آگئی۔ تیرے آنے سے میرا جی خوش ہو گیا۔"

دیئے میں بتی پڑی تو شیتاں کو ننھیال گھر بڑا سونا سونا لگا۔

"نانی ماں! مامی کہاں گئی؟"

"اپنے میکے اور کہاں؟"

"ماموں؟"

"اس کو لینے کے لئے گیا تو وہیں کا ہو رہا۔ اس کلموہی کے پیچھے پیچھے یوں لگا رہتا ہے جیسے اُس کا سایہ ہو۔ اتنے دنوں پال پوس کر پروان چڑھایا تو اسی کا ہو کر رہ گیا۔" نانی ماں نے کہا اور شیتاں اداس ہو گئی۔ جوان ماموں اور نئی نویلی ممانی کے بغیر گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ شیتاں نے جلدی جلدی دو چار روٹیاں سینکیں۔ دو چار لقمے کھائے تو اس کی بھوک ہٹ گئی۔ آنگن میں چارپائی بچھا کر شیتاں لیٹی تو ٹھنڈک رینگ رینگ کے آئی۔ اور اس نے کپکپی سی محسوس کی۔ اس نے پوچھا "نانی ماں! ٹیلے کے ایک کیکر پہ ایک فاختہ بیٹھی تھی۔ میں نے شش کیا تو پھر سے اُڑ گئی۔ اس کے پروں میں گھنگھرو چھنک اٹھے۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کھلکھلا کر!" نانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ نانی ماں!"

"وہ کوئی نیک روح ہو گی۔ نیک روحیں ڈراتی نہیں۔"

"نانی ماں!" شیتاں نے پکارا۔ نانی ماں سو گئی تھیں۔ خر خر خر۔ ایک بچے کی طرح سانس لے رہی تھیں ..... اور

خاموشیاں گہری ہو ہو کر رات میں رچ رہی تھیں ۔" نیلم پری ..... سبز پری ..... میں نے اچھا کیا جو اسے نام نہ بتایا ...... میں نام بتا تی تو وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتا ۔ نہ جانے کون راہی تھا ۔ پگلا ..... راہی !"

۲۔چاندنی رات

بیتاں جب سنبل پور آئی تھی تو چاند کی آخری راتیں تھیں ۔

پھر ایک دن جب وہ شام کے دھندلکے میں آنگن میں کھڑی تھی تو اسے پہلی کا چاند نظر آیا ۔ پھیکا پھیکا ، دبلا پتلا ، درانتی کی طرح بل کھایا ہوا ، اور بیتاں کو یہ چاند بڑا عجیب سا لگا جیسے اس کا کوئی ادھورا سپنا ہو جو نیلے آسمان کے ساتھ جا لگا ہو ۔ وہ دیر تک چاند کو دیکھتی رہی اور چاند ڈھلتا رہا ، حتیٰ کہ آنگن کی دیوار کے پیچھے چھپ گیا ۔

"بیتاں !" اس کی نانی نے پکارا ۔

"آئی نانی ماں !" اس نے چونک کر کہا ۔

"تیرے ماموں کو کیا ہوا ؟ آج آٹھ دن ہو گئے ، ابھی تک نہیں لوٹا ۔ تو کب تک میرے پاس بیٹھی رہے گی ۔ کل نائی کو اس کے سسرال بھیجوں گی ۔"

"نانی ماں ! ضرور بلواؤ ماموں کو ۔ میرا اپنا جی اس سے ملنے کو ترس رہا ہے ۔"

"وہ کلموہی اسے آنے بھی دے گی ، دیکھ بیتاں ! اس نے میرا بیٹا چھین لیا ۔ میں نے اسے برسوں پالا ۔ اتنا لمبا رنڈیا پا کاٹا ۔ پر اب وہ اسی ڈائن کا ہو کر رہ گیا ۔"

"نانی !" بیتاں نے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی لیکن کوئی بات نہ بنا سکی ۔ تب اس نے کہا " آج میں نے پہلی کا چاند دیکھا ۔"

"پہلی کا چاند ! خدا مبارک کرے ۔" نانی نے چاند دیکھے بغیر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دئے ۔ اس کے ہونٹ ہلے ۔ نہ جانے نانی نے کیا دعا مانگی پر دعا کی تاثیر بیتاں کے سینے میں رچ گئی ۔ اس تاثیر کو الفاظ نہ مل سکے ۔ لیکن ایک جذبے کی شدت اس کی آنکھوں میں مرتسم ہو گئی ۔ دئیے کی مدھم سی روشنی میں اس کی آنکھیں ٹمٹماتے ہوئے تارے بن گئیں ..... چاند کے جلو میں چمکنے والے تارے جو نہ جانے کب سے چاند کے ظہور کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں ..... اور جب انہیں چاند کا دیدار نصیب ہو جاتا ہے تو خود ماند پڑ جاتے ہیں ۔ زرد اور بیمار سے ....

"کیوں ؟" بیتاں نے بستر پر لیٹ کر سوچا "کیوں ؟" اسے اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا لیکن ایک دکھ کہیں چور دروازے سے آیا اور چپکے چوری اس کے روئیں روئیں میں رچ گیا ۔ اس کا سینہ اس دکھ سے لبالب بھر گیا اور اس دکھ میں کانٹوں کی چبھن نہیں تھی ۔ گلاب کی باس کی ہلکی ہلکی لہریں تھیں جو سنبل پور پر رات کی خاموشیاں بن کر چھا رہی تھیں اور بیتاں جاگ رہی تھی ۔ بیتاں نے محسوس کیا " نہیں وہ تو سو رہی ہے ۔ ایک دکھ جاگ رہا ہے جس کا دوسرا نام بیتاں ہے ۔"

اور دوسری رات کا چاند ذرا شوخ ہو کر نکلا ۔

سنبل پور کے مکانوں کی منڈیروں سے چند کرنیں چھو کر لرز سی گئیں اور سالفہ کے گھر سے ڈھمک ڈھوں ڈھولک کے بجنے کی آواز آئی ۔

نانی نے کہا " جا بیتاں تو بھی ذرا ہو آ ۔ دو گھڑی ہنس بول لے ۔" بیتاں نے انکار کیا تو نانی نے اصرار ۔

سنبل پور کی فضاؤں میں ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ ماہیے کے بول ابھرے ۔ ان میں الہڑ جوانیوں کا گداز تھا ، گویا چاندنی میں آگ تھی ۔

اور اس آگ میں خنکی بھی تھی۔ دبی دبی سی آگ جسے چنگاری بھی نہیں کہا جا سکتا اور جو بھڑک کر شعلہ بھی نہیں بنتی۔ فن کے الاؤ میں شعلوں کی روشنی تھی جو جلا کر راکھ بھی کر دیتی ہے اور راکھ کو اُمر بھی کر دیتی ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ شیماں ایسا لگا جیسے اس نے ماہیا آج پہلی بار سنا ہو۔ ماہیے کے بول پہلی بار اس سے ہم کلام ہوئے تھے۔ آج سے پہلے یہ بول گونگے تھے۔ ایک آواز، صرف ایک آواز سہانی من موہنی آواز جو روح کے ساتھ ٹکرا کر لوٹ جاتی رہی۔ آج اس کی روح نے اس آواز کا مطلب پا لیا تھا۔ یہ آواز اس کی روح میں نغمہ پاشی کر رہی تھی اور روح نفیری کی ایک تان بن گئی تھی۔

پھر یہ تان دکھ کا ملہار راگ بن گئی۔

ٹپ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹپ ۔ ۔ ۔ ٹپ!

دکھ کی ملہار۔ بوندیوں کی پھوار۔ ساون کی جھڑی اس کے گالوں پر ایک چھینٹا دے گئی۔ وہ حیران ہو گئی۔ اس نے اوڑھنی کا پلو گالوں پہ پھیرا تو اس کے گال جل اُٹھے۔ گال جل اٹھے۔ ہونٹوں پر اس چھینٹے کی گرم گرم لذت دیر تک محسوس ہوتی رہی۔

گھمک۔ گھمُں۔ ڈھمک ڈھوں ڈھولک بج رہی تھی!

ایک لڑکی نے کہا "شیماں! تو نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں کیا، کوئی بول تو بھی گا۔"

شیماں شرما گئی "میں! نرجی میں کیسے گاؤں، مجھے تو کوئی بول نہیں سوجھتا!"

"کیوں شیماں! تیرے من کی کان کوٹھڑی میں ابھی تک کسی چاند نے چمکارا نہیں مارا؟"

"چاند نے؟" شیماں نے حیران ہو کر پوچھا۔ اُس کی سکھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شیماں بات کی تہہ تک اچانک پہنچ گئی۔ اس کے گال تپنے لگے۔ ہونٹوں پر جلن اُبھر آئی۔

"رتی!" ایک اور لڑکی نے کہا "تو اسے کیوں چھیڑ رہی ہے؟"

پر شیماں کے کانوں میں ماہیے کا ایک بول دھیرے دھیرے اُبھر رہا تھا۔ جانے کس اندھیری گپھا سے نکل رہا تھا۔ وہ بول از خود اس کی زبان پر آ گیا:

دو پتّر اناراں دے
آپیں نسیں سکھی وسدے سندے حال بیماراں دے۔

شیماں کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کے گال تمتما رہے تھے۔

شریر سہیلی نے کہا "شیماں! تیری آواز میں اتنا دکھ کہاں سے آ گیا؟"

"دکھ! نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔" شیماں نے اُکھڑے اُکھڑے انداز میں۔

تب اس نے سوچا "سکھی! تو نے سچ کہا۔ وہ من جس میں کسی دکھ نے جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا، اب ایک دکھ کو پال رہا ہے۔ ایک نیارا دکھ ۔ ۔ ۔ جس میں مٹھاس بھی ہے اور گلاب کی باس بھی۔"

ڈھولک ہر رات بجتی رہی۔

چاند مشرخ ہوتا رہا۔ اس کی نانی بیمار رہی۔ اس کی نانی میکے کی ہو رہی پر اس کا ماموں لوٹ آیا۔ ماموں نے کہا:

"شیماں! کچھ دن اور رہ جا۔ تیری مامی آ جائے تو گھر چلی جانا۔ پھر چوہدری بہادل کی لڑکی کی شادی ہے۔ سنا ہے برات بڑی دھوم دھام سے

آئے گی۔ تو بھی رونق دیکھ لینا، اور ماں بھی تو بیمار ہے۔"

"اچھا ماموں!" شیماں نے کہا اور بیاہ والے گھر چلی گئی۔ دلہن کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ میلے کپڑوں کی گٹھڑی بنے سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی۔ شیماں نے سوچا جب کسی کا بیاہ ہوتا ہے اسے میلے کپڑوں کی گٹھڑی کیوں بنا دیا جاتا ہے اور وہ سب سے الگ تھلگ کیوں لگتی ہے۔ شیماں کھسک کر دلہن کے ساتھ جا لگی۔ دلہن اس کے بدن کے چھو جانے سے کانپی اور شیماں کا ایک ایک رواں کانٹے کی نوک بن گیا۔ اس نے دلہن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا پر آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان میں خوف بھی تھا اور بڑی گہری لگن بھی جیسے کہیں دور بہت دور دیکھ رہی ہوں اور پھر کسی کو پا کر اپنے اندر رچا رہی ہوں ۔۔۔ اور ان نگاہوں میں جو ابھرا ابھرا سا اٹھ رہا تھا۔ یہ بجھ بجھ کر جل رہی تھیں ۔۔۔ ان کا راز انوکھا تھا ۔۔۔ نرالا راز جو شیماں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا ۔۔۔۔۔

شریر سکھی نے کہا "شیماں! دلہن کو ٹکٹکی باندھ کر کیوں دیکھ رہی ہو؟" شیماں چونک کر جاگی تو سہیلی نے کہا "ادھر آ میرے پاس۔ تجھے کچھ بتاؤں" شیماں اس کے ساتھ جا لگی۔ سہیلی نے بڑی دھیمی بڑی میٹھی بڑی پیاری آواز میں کہا "تو ہونے والی دلہن کی آنکھوں کا راز نہیں پا سکتی۔ پگلی! یہ آنکھیں بہت دور دیکھتی ہیں، تاروں سے بھی پرے ۔۔۔ نیلے آسمان سے بھی پرے ۔۔۔ یہ ڈھولک نہ بجے تو دلہنیں پاگل ہو جائیں ۔۔۔ ہاں! ۔۔۔ ماہیے کے بول اور پیار کے گیت نہ گائے جائیں تو یہ آنکھیں پتھرا جائیں ۔۔۔۔"

"پر دلہن کا چہرہ اتنا اداس سا کیوں ہے؟"

"اداس سا! ۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔۔ پھر اداس کیوں نہ ہو ۔۔۔ شیماں ایک زندگی مر جائے تو دوسری جنم لیتی ہے اور کون جانے دوسری کا جنم مبارک ہو یا ۔۔۔۔"

شیماں لرز گئی اور ڈھک ڈھوں، گھک گھوں ڈھولک بجتی رہی!

بیاہ سے ایک دن پہلے شیماں کی ممانی بھی آ گئی۔ سرِ شام ہی چاندنی شیماں کے آنگن میں سیلاب کی طرح امڈ آئی۔ دور کہیں شہنائی کی پہلی گرگوں شوخ کرنیں کانپ اٹھیں۔ سارا گاؤں بے چین ہو گیا۔

"برات آ رہی ہے۔" شیماں کی نئی نویلی ممانی نے کہا "چل شیماں۔"

"ابھی سے؟ ابھی تو برات کہیں دور ہو گی۔" اس کے ماموں نے کہا۔

"ذرا دلہن کے گھر کی رونق بھی دیکھ لیں۔" ممانی نے جواب دیا۔

دلہن کے گھر میں افراتفری پڑی ہوئی تھی۔ برات والوں نے گولے چلا کر اپنی آمد کا اعلان کیا تو گاؤں کے سبھی لوگ باہر نکل آئے۔ مرد اور بچے گھر سے باہر نکل گئے۔ جس گلی سے برات نے گزرنا تھا اس کے دونوں طرف کوٹھوں پر عورتیں پرے باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔ گہما گہمی میں شیماں کو اپنا دکھ بھول گیا۔ پھر چاندنی بھی تو کھل کھلا کر ہنس رہی تھی جیسے چنبیلی اور موتیے کے سفید سفید پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ اس سہانے سمے اپنے دکھ کو کون پالتا رہے!

شیماں اپنی ممانی سے جدا ہو گئی تو شریر سہیلی کا سنگ ہو گیا۔ وہ کوٹھوں پر سے ہوتی ہوئیں گلی کی اس نکڑ پر چلی گئیں جہاں سے برات نے گزرنا تھا۔ باجوں کی آواز گاؤں کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ اس کی سہیلی نے کہا "شیماں! برات کا مزا تب آتا جو برات اتنی چاندنی نہ ہوتی۔"

"کیوں؟" شیماں جس کے من میں چاند بسا ہوا تھا تڑپ کر بولی۔

"اندھیری رات میں برات کے آگے آگے روشنیاں چل رہی ہوں تو ہوائی ساتھ سے معلوم ہوتے ہیں جیسے ستاروں کا قافلہ چلا آ رہا ہوا

سے باجوں کا نغمہ یوں اُبھرتا ہے جیسے رات گا رہی ہو۔ آتش بازی کے پھول بوٹے بھی تو اندھیرے میں نکھرتے ہیں۔"

"نہیں ..... نہیں ..... چاندنی نہ ہوتی تو دل کا دیا بجھا بجھا سا رہتا۔"

شریر سہیلی نے کوئی جواب نہ دیا۔

دل کا دیا!

"شیماں! برات کا جلوس تو بہت لمبا ہے۔ گھوڑوں کی قطار تو دیکھو۔ یہ تو پوری فوج ہے جو سنبل پور پر چڑھائی کرکے آ رہی ہے۔"

"فوج!"

"ہاں! ہاں! سنبل پور کی ایک کومل مٹیار کو راج پور لے جانے کے لئے گھڑسواروں کی فوج۔" اس کی سہیلی نے ہنس کر کہا۔

برات کو گاؤں سے باہر روک لیا گیا۔ سنبل پور کے میزبانوں نے گھوڑوں کی باگیں تھام لیں اور گھوڑوں کو ایک طرف لے گئے۔ تب ایک حلقہ سا بن گیا۔ اس کے درمیان گیس کی روشنی تھی۔ ایک طرف سنبل پور کے لوگ کھڑے تھے۔ دوسری طرف راج پور کے بانکے۔ دونوں طرف سے دو سفید داڑھیوں والے بوڑھے بڑھے اور ایک دوسرے سے گلے مل گئے۔ ٹھاہ ٹھاہ گولے چلے۔ شُرشُر ہوائیاں چلیں۔ باجے بجنے لگے اور برات کا جلوس گاؤں میں داخل ہو گیا۔ برات کے آگے آگے گیس کی روشنی تھی۔ اس کے پیچھے باجے والوں کا قافلہ تھا۔ شیماں جسے شہنائی سمجھی تھی وہ تو سیاہ رنگ کی لمبی سی بین تھی جس پر جھلمل جھلمل کرتے ہوئے چاندی کے بٹن چمک رہے تھے۔ لمبے لمبے بڑے بڑے باجے شہنائی کا ساتھ دے رہے تھے۔ شیماں نے اتنے باجے اکٹھے بجتے نہ سنے تھے۔ عورتیں کہہ رہی تھیں کہ راج پور والے اتنے دھوم دھڑکے سے آئے ہیں کہ سنبل پور نے اس سے پہلے اتنی شاندار برات نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی اور پیدل براتیوں کے درمیان صرف دولہا گھوڑی پر سوار تھا۔ گھوڑی کے پاؤں میں گھنگھرو چھن چھن بج رہے تھے اور پا کھر کے ساتھ چاندی کی سفید جھالریں جھوم جھوم کر متوالا ناچ کر رہی تھیں۔ دولہا کی گلابی پگڑی پر سنہری تاروں والا لمبا سہرا بندھا ہوا تھا اور بانکے دولہا کا چہرہ اس کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

برات گزر رہی تھی۔ شیماں اپنے خیالوں میں کھو گئی گویا چاندی کے تار ایک دوسرے سے اُلجھ گئے تھے۔ کرنوں کے جال میں شیماں کا انگ انگ جکڑا گیا تھا۔ ذرا خاموشی ہوئی تو شیماں نے چاہا کہ چاندی کے یہ تار توڑ ڈالے پر اس نے انہیں توڑنا بھی نہ چاہا۔

"برات تو گزر گئی شیماں، تو کون سے خیالوں میں کھو گئی؟" اس کی سہیلی کی آواز شدتِ جذبات سے بھرائی ہوئی تھی۔

"ہیں! ..... نہیں تو ......" شیماں نے کہا اور یونہی مسکرا دی۔

چاندنی رات میں ہوائیاں اور چکر چلے۔ پھول بکھرے۔ چٹاخ پٹاخ پٹاخے چلتے رہے اور پھر آگ کا کھیل بھی ختم ہو گیا اور وہ گھر لوٹ آئی۔ رات جب کبھی اس کی آنکھ کھلی اس نے سنبل پور کو جاگتے ہوئے پایا اور اُس کے آنگن میں چاندنی بھری رہی۔ آخری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو چاند ڈوب گیا تھا۔ آنگن میں اندھیرا تھا۔ اندھیرا لپک کر آیا اور اس کے من کا چاند بھی ڈوب گیا اور گاؤں چپ چاپ ہو گیا تھا۔ اس نے انجانے دکھ کی میٹھی سی جلن کو پھر محسوس کیا۔

صحن میں ایک سایہ سا لپکا تو اس کی ماں نے کہا "کیوں جی، اتنی دیر؟"

"آج بھی دیر نہ ہوتی، ایسی راتیں روز روز آتی ہیں بھلا! آج تو جی بھر کے گانا سنا۔ بھئی، کیا گانے والا تھا۔ راتی بے شدھ ہو ہو کر سو گئے پر وہ نہ تھکا۔ راج پور نے نوٹ پر نوٹ برسائے۔ مرزا صاحباں سننے کا آج پہلی بار مزا آیا۔"

"راج پور والے اتنی دولت کیوں لٹا رہے ہیں؟"

"پیسے موتھوں، پر بھی دولت نہ لٹے؟ پھر دولہا بھی تو رشتی جوان ہے۔ ایسے جوان کی برات بھی ایسی ہی سج دھج کی ہونی چاہیے تھی۔ گانے والا مرزا

گا رہا تھا اور میں دولہا کے چہرے کو تک رہا تھا "

"کیوں جی ؟" اس کی بھابی نے سوئی سوئی آواز میں پوچھا۔

"میں یہی سمجھتا رہا کہ دانا باد کا مرزا برات لے کر اپنی صاحباں کو لینے آگیا ہے " اس کے ماموں نے بڑے عجیب لہجے میں کہا۔ اس میں درد بھی تھا اور حیرت بھی۔

"چلو سو بھی جاؤ " بھابی نے جمائی لیتے ہوئے کہا " صبح ہونے والی ہے "

"پر ایک بات سوچتا ہوں تو حیرت بھی ہوتی ہے۔ راج پور کا مرزا خوش نہیں تھا۔ اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ جیسے وہ اپنی صاحباں کو کہیں اور کھو آیا ہو "

"کیسی باتیں کرتے ہو، سو جاؤ۔ رت جگے نے تھکا دیا ہو گا بے چارے کو ....."

"نہیں جی ! ہم بھی تو ساتھ تھے۔ ساری رات جاگے تھے۔ ایسا بے رنگ چہرہ نہ ہوا تھا۔ اپنی صاحباں کا عشقِ صادق دل میں تھا۔ چہرہ بجھتا کیوں "

"ہوں" اس کی بھابی نے کروٹ بدل کر کہا " سونے بھی دو "

اس کے دل کا جاگا ہوا دکھ پہلی بار کانٹے کی تیز نوک بن کر چبھا!

۳۔ پی کے نگر

نو بجے تک باجے والوں نے بڑے دھیمے راگ میں صبح کو خوش آمدید کہا!

آج تھی بھی بڑی نرم۔ ٹھنڈی میٹھی بھیگی بھیگی دھلی دھلی سی۔ اس نے رات بھر چاندنی کا رس پیا تھا۔ کھیتوں کی ہریاول پر شبنم کی بوندیں ایسی بھیگی بھیگی ... شبنم کا شہد پی کر جاگ رہی تھی۔ وہ رات جو ہنستا مون میں بس کر پوچھل سی بن گئی تھی۔ اب خوشبوں کی دنیا کی طرح ہلکی پھلکی تھی۔ شیشاں نے ... دل ... اب ... اصل مل لیا تھا

دھوپ نے پھیلتے ہی ... لوٹ آئے !

بھابی اسے ... دلہن ... دلہن کے ... تھا۔ لوگ ... ادھر ادھر ... رہے تھے۔ دلہن ایک کونے میں دبک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ زرد زرد تھا۔ آنکھیں سُرخ سُرخ جیسے رات بھر کسی خیال سے اسے سونے نہ دیا ہو۔ ہجوم میں شیشاں کی بھابی اس سے بچھڑ گئی۔ وہ اکیلی رہ گئی۔ تب اس کی سہیلی اسے مل گئی۔ اس نے کہا " شیشاں جب دلہن اس گھر سے چلی جائے گی تو دیکھنا اس گھر کا کیا حال ہو گا۔ بیر ویرانوں کی طرح اجاڑ ہو جائے گا۔ سنا پتا ہے ... پت جھڑ میں ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے " شیشاں یکا یک اداس ہو گئی۔ پت جھڑ کا سماں بندھ گیا۔ پچھم کی سرد ہوا چلی۔ پتے جھڑ جھڑ گرنے لگے۔ سوکھے پتے ..... ویرانی ہی ویرانی ..... اور شیشاں کے دل پر وحشت سی طاری ہو گئی۔

وہ دلہن کے کمرے سے چلی آئی۔ سہیلی اسے ڈھونڈتی رہی۔

شیشاں نے سوچا میں کل ہمارے سنہرے پورے آئی تھی تو ایک الہڑ نادان لڑکی تھی۔ میرا من کتنا ہلکا پھلکا تھا۔ اس اودھنی کی طرح جو ڈھل کر آنگن کی دھوپ میں پھڑ پھڑا رہی ہوتی ہے۔ اب مجھے کیا ہو گیا ہے ؟ میں تو یکا یک دانا عورت بن گئی ہوں۔ جیسے چند دنوں میں میں نے دنیا کی ہر مٹھاس اور کڑواہٹ کا مزا چکھ لیا ہو جیسے اب میری الہڑ جوانی دھوپ اور چاندنی کا پنچھی بن کر نیلے آسمانوں کو نہ چھو سکے گی۔

وہ گھر آکر بیمار نانی کے پاس پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔

نانی نے کہا "دلہن کی ڈولی چلی گئی؟"

"نہیں تو۔"

"پھر تو کیوں آگئی شیماں؟"

"میرا جی نہ لگا وہاں۔"

"جی نہ لگا! کیوں شیماں؟ جا سکھیوں کے ساتھ دو گھڑی ہنس بول لے۔ بوڑھی نانی کے پاس رہ کر کیا کرے گی تو؟"

"نہیں..... میرا جی نہیں چاہ رہا۔ جب دلہن کی رخصتی کا وقت آئے گا تو ہو آؤں گی۔"

دیر بعد اس کی ممانی بھی چھم چھم کرتی آگئی۔

"کیوں ری شیماں، تو گھر کیوں بھاگ آئی؟ دلہن کے گھر میراثنوں نے وہ لہک لہک کر گایا اور وہ وہ نقلیں کیں کہ ہنستے ہنستے دم اُلٹ گئے۔ شیماں تیری تو کوئی بوڑھی روح ہے۔" شیماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ نانی آنا گوندھنے لگی۔ پھر اس کا ماموں بھی گھر آگیا۔ اس نے بیٹھتے ہی کہا "وہ بات سچ نکلی جو میں نے رات تجھ سے کہی تھی!"

"کون سی بات؟" ممانی نے انجان بنتے ہوئے کہا اور آنکھ سے شیماں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا ماموں وہاں سے کھسک گیا۔ ممانی ہاتھ دھو کر اٹھتے ہوئے اس کے پیچھے چلی گئی۔ آنگن میں تنور کے پاس ماموں اور ممانی نے کچھ باتیں کیں۔ سرگوشیاں فاصلوں کو پھاند کر شیماں کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ دھیمی آواز کا ٹھنڈا سانس شیماں کے سینے میں تیر بن کر لگا جیسے سردیوں میں پہاڑوں کی طرف سے یخ بستہ ہوا کا پہلا جھونکا آیا ہو۔ ایک پردیسی سُر جو سائیں سائیں کرتی رات میں دلوں کے چور دروازوں سے مدتوں دستک دیتی رہتی ہے۔ اچانک اس کے اجڑے اجڑے من کی مہمان بن گئی۔ شیماں نے اس ٹھنڈے سانس، اس پردیسی سُر کو اپنے مَن میں بسا لیا۔ پھر اس نے سوچا میں نے ایسا کیوں کیا۔ گل بہار کی شیماں سنبل پور میں آکر ایک نرالے دکھ سے کیوں دوچار ہو گئی!

"چل شیماں! اب تو 'کھاٹ' پڑ چکی ہوگی۔"

شیماں چپکے سے ممانی کے ساتھ ہولی صحن میں جہیز کے رنگین پیڑھے اور پلنگ تھے اور ان پر جہیز کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ جھلمل جھلمل کرتے ٹکناری لگے رنگ رنگ کے کپڑے، کھیس، چادریں، لحاف اور تو شکیں۔ نئے نئے برتن چمکارے مار رہے تھے۔ بھیڑ میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا شیماں چھت پر چڑھ گئی۔ ڈیوڑھی میں باجے بجے تو چھت کی منڈیر پر سے لڑکیاں ہمک ہمک کر نیچے دیکھنے لگیں۔ شیماں دبک کر ہٹ گئی۔

"دولہا آگیا!" شور و غل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"ذرا مجھے بھی تو دیکھنے دو۔" شیماں نے اپنے آگے کھڑی لڑکی سے کہا۔ جب وہ لڑکی ذرا سا سرکی تو دولہا ایک پلنگ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کی پشت شیماں کی طرف تھی، اس کے گرد ہنستی بولتی چہلیں کرتی عورتوں کی بھیڑ تھی۔ اچانک شیماں کو کندھے سے پکڑ کر اس کی شریر سہیلی نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"شیماں، تو نے دیکھا دولہا کتنا چھیل چھبیلا ہے؟"

"نہیں۔ میں تو نہیں دیکھ سکی۔" شیماں نے جواب دیا۔

"واہ! شیماں! سنبل پور کی قسمت نے کتنی اونچی اڑان لی ہے۔ راجے اور رہبنواں کی مبارک دھرتی پہ قدم رکھے ہیں۔"

"پر دولہا بجھا بجھا سا کیوں ہے ؟" ایک اور لڑکی نے پوچھا۔

"بجھا بجھا سا!" اس کی سہیلی نے حیران ہو کر کہا۔" تیری نظروں کا قصور ہے۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے۔"

"تو بڑی دانی بی بی بنی پھرتی ہے جیسے دنیا جہان کی ہر بات کو جانتی ہو۔" اس لڑکی نے ذرا چمک کر کہا۔" پر تجھے کوٹھوں پڑھی بات کا پتہ بھی نہ لگ سکا۔"

"کیوں نی! تو نے کون سی ایسی نیاری بات سُنی جو میرے کان میں نہ پڑی۔"

"تجھے پتہ ہے آدھی رات کو کیا ہوا ؟"

"کیا ہوا ؟"

"براتی دولہا کو ڈھونڈھ رہے تھے ؟"

"دولہا کو!" اس کی سہیلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔" وہ ندیدہ اپنی دلہن سے ملنے چلا آیا ہو گا ؟"

"گھوڑوں پر بیٹھ کر براتی چاروں طرف کھوج لگا رہے تھے۔ سنا ہے وہ راج پور تک جا پہنچے اور جب مرغ نے پہلی اذان دی تو دولہا ٹیلے پر کھڑا ملا۔ گم سم پتھر کا بت بن کر سنبل پور کی طرف جا رہا تھا۔"

"ٹیلے پر! کیوں ری ؟ وہ رات کو سنبل پور کی گلیوں میں بھول کر ٹیلے پر کیسے جا نکلا۔ وہاں کون تھا جو اس کی راہ تک رہا تھا ؟"

"کیا پتہ ؟ لوگ تو کچھ اور بات کہتے ہیں!"

"کون سی بات ؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔"

"دولہا پر کسی پری کا سایہ ہے!"

"پری کا!" شیماں چونک کر بولی۔ اس کی شریر سہیلی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"شیماں! یہ تو زمانے بھر کی جھوٹی ہے۔ اس کی باتیں سنے جا۔ بیچ میں مت بول۔ کہہ دو نا جو کچھ کہنا ہے تجھے۔ کیسی اچھی کہانی کہہ رہی ہو۔ ایک تھا بادشاہ زادہ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑا گبھرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑا چھیل چھبیلا۔ اس پر تھا کسی پری کا سایہ۔ نیلم پری کا ۔ ۔ ۔ ۔ سبز پری کا ۔ ۔ ۔ ۔ شیماں تجھے کیا ہو گیا ہے ؟ یہ تو من گھڑت کہانی ہے۔ اس کے گھر والوں کا دلہن کے گھر والوں سے ازلی بیر ہے۔ یہ جھوٹ نہ گھڑے تو اور کون ؟"

"نی!" ایک اور لڑکی نے کہا۔" یہ سچ کہہ رہی ہے۔ کہتے ہیں بیاہ سے کچھ دن پہلے دولہا ٹیلے پر سے گزر رہا تھا۔ چھیل چھبیلا، رنگیلا گبھرو دیکھ کر ایک پری کا دل آ گیا اُس پر۔ اسی دن سے بولایا بولایا پھرتا ہے۔"

"شیماں!" اس کی سہیلی نے پکارا۔" دیکھ تو لاگی داج کا سامان باندھ رہے ہیں۔ چل دلہن کو ڈولی میں بٹھائیں۔ آج کے بعد وہ راج پور والوں کی ہو جائے گی۔"

لیکن شیماں بت بنے کھڑی رہی!

کوٹھے کی چھت خالی ہو چکی تھی۔ دولہا اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ شیماں کی سہیلی نے اُسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ شیماں یکایک جاگ اٹھی وہ دونوں سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئیں۔ آنگن خالی تھا۔ اندر دلہن رو رو کر وداع ہو رہی تھی۔ شیماں کی سہیلی دلہن کے پاس چلی گئی۔ شیماں کچھ دیر آنگن میں کھڑی رہی۔ تب اس نے بت جھڑ کے پہلے جھکڑ کا تھپیڑا کھایا اور وہ تیز تیز قدم اٹھا کر باہر آ گئی۔ ڈیوڑھی کی چوکھٹ پر ڈولی پڑی ہوئی تھی۔

ننھیال گھر بھی خالی خالی سا تھا۔

نانی نے پوچھا "دلہن رخصت ہو گئی؟"

"ہاں نانی ماں!" اس نے ذرا سا جھوٹ بولا "میں بھی گل بہار جا رہی ہوں۔"

"کیوں بیٹی، اتنی جلدی بھی کیا پڑی ہے؟"

"نہیں نانی ماں، مجھے آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے، اب میرا جی بھر گیا ہے سنبل پور سے......"

"اپنے ماموں کو تو آ لینے دے۔"

"کیوں نانی ماں!"

"وہ تمہیں ٹیلے تک چھوڑ آئے گا۔"

"مجھے اکیلے میں کیا ڈر ہے؟" اس نے ہنس کر کہا۔ "جب میں آئی تھی تو اسی ٹیلے پر سے گزر کر آئی تھی۔"

"نہیں بیٹی! تمہیں آتے ہوئے کسی نیک روح سے واسطہ پڑا تھا۔ اب جاتے ہوئے کیا پتہ؟"

"نہیں نانی!" اس نے قہقہہ لگا کر کہا "مجھے کوئی روح کیا کہے گی۔ میں تو خود بدروح ہوں۔ مجھے کسی کا سایہ کیا ہو گا؟"

"ہائیں لڑکی! تو کس قسم کی باتیں کر رہی ہے۔" نانی دہشت زدہ ہو کر پلنگ پہ اکڑوں بیٹھ گئی۔

شیماں نے نانی کے گلے میں بازو ڈال دئے اور بڑے پیار سے کہا "نانی دیکھ میں نے تجھے ڈرا دیا۔"

اور شیماں گھر سے باہر نکل آئی۔

جونہی اس نے گلی میں قدم رکھا تو باجے والوں نے وداعی نغمہ چھیڑ دیا:

چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر

آج جانا پڑا!

پی کے نگر!

شیماں ٹھم ٹھم پی کے نگر چلی

سنبل پور کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ڈولی کہاروں کے کندھوں پہ راج پور نہیں پی کے نگر جا رہی تھی۔

پی کے نگر!

باجے بجتے رہے۔ پھر سنبل پور کی گلیاں ختم ہو گئیں۔

پی کے نگر جانے والی ایک لمبی چمکیلی گلی کا آغاز ہو گیا۔

اس کے دونوں طرف دھان کے کھیت تھے۔ سنہری دھوپ میں نرم گرم چمبیلی چمبیلی مہندی لگی خوشبو اڑ رہی تھی۔

نالے کا پانی پایاب تھا۔ پی کے نگر کی پیچ دار گلی اس میں ڈوب کر ابھری اور ٹیلے کی چوٹی پہ پہنچ گئی۔ یہاں چار کھونٹ سے کئی بل کھاتی ہوئی گلیاں

آ کر ایک دوسری سے لپٹ گئی تھیں۔ یہاں ٹھنڈا اور گھنا سایہ تھا۔ شیماں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

پی کا نگر کس طرف ہے؟

کُو۔۔۔۔۔۔ کُو۔۔۔۔۔۔ کُو۔

"شِش"

فاختہ پھُر سے اُڑی اور اس نے پی کے نگر کا رُخ کر لیا۔

چھن چھن گھنگھرو بجے اور اس کے گلے میں اُتر آئے۔

ایک ننھا سا قہقہہ گونجا۔ شیماں اپنے قہقہے پر حیران ہو گئی۔

کہاں جاؤ گی رانی؟

پی کے نگر۔

اس ٹیلے پر سے تو کوئی پگڈنڈی پی کے نگر نہیں جاتی۔

نہیں جاتی؟

اور شیماں رو پڑی۔ بھادوں کی جھڑی نے بُندیوں کا ملہار راگ نہ گایا۔ کونل کی ایک کوک میں پانی کے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

چھَم۔ چھَم۔ چھَم۔

وہ ٹیلے سے نیچے اترنے لگی۔ رنگی بہاری شیماں۔

سایہ اس کے ساتھ ساتھ ٹیلے سے نیچے اُترنے لگا۔

سامنے گُل بہار سنہری دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔

○

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
یاراں! خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست

(نظیری)

رام لعل

نئے قدم

میں فیض آباد جانے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا لیکن پتا جی کا حکم تھا۔ جانا پڑا۔

جب سے ریٹائر ہوئے تھے انہوں نے بہت سے کام میرے سپرد کر دیئے تھے۔ پچھلے سال اپنی چھوٹی بہن کی شادی کے لئے لڑکے کا انتخاب اور دوسرے انتظامات بھی ذمے تھے۔ ایک دُور کے رشتے دار کے ہاں ایک شادی کی تقریب ہوئی تو وہاں بھی پتا جی کی نمائندگی کی۔ چھوٹے بھائی کو ملٹری کا کیڈٹ منتخب کرانے کی دوڑ دھوپ بھی میرے حصّے میں آئی تھی۔ اب فیض آباد والے مکان کا جھگڑا ختم کرانے کا بوجھ بھی مجھے اٹھانا پڑ رہا تھا اور یہی کام باقی سب کاموں سے زیادہ مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

پاکستان میں ایک مکان کے سلسلے میں پتا جی کی ایک اور شخص منجندہ صاحب کے ساتھ ساجھے داری رہی تھی۔ منجندہ صاحب اب فیض آباد میں رہتے تھے۔ انہیں وہاں نکاسی جائیداد کے نیلام میں ایک اچھا خاصہ مکان کلیم کے معاوضے میں مل چکا تھا۔ پتا جی نے اس مشترکہ جائیداد کا حکومت سے کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا۔ ذاتی ملکیت کے سب مکانوں کا معاوضہ انہیں وصول ہو چکا تھا۔ مشترکہ جائیداد کے معاوضے کے حصّے کے لئے پتا جی نے منجندہ صاحب کو کئی خط لکھے تھے۔ لیکن ایک کا بھی جواب نہیں ملا تھا۔ منجندہ صاحب کیسے آدمی تھے؟ میں ان کے ساتھ کامیابی سے گفتگو کر سکوں گا یا نہیں، اس بات کا بھی مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ دراصل میری گھبراہٹ اسی وجہ سے تھی۔ پتا جی نے منجندہ صاحب کو تار دے کر میرے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔

اسٹیشن پر کسی کے ملنے کی امید نہیں تھی۔ میں اُس خاندان کے کسی شخص کو نہیں جانتا تھا۔ وہ لوگ بھی مجھ سے ناواقف تھے۔ لیکن جب میں وہاں صبح کی گاڑی سے اترا تو درمیانے قد کے سفید گھنے بالوں والے اور نظر کا چشمہ لگائے ہوئے ایک ادھیڑ شخص نے مجھ سے جھجکتے ہوئے مگر کسی قدر اعتماد کے ساتھ پوچھا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ مسٹر جی سیٹھی ہیں: لالہ گوپال دِتّا مل سیٹھی وزیر آباد والے کے لڑکے!"

"جی مجھے ہی گوپال سیٹھی کہتے ہیں۔"

ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔ مجھے حیرانی ہوئی انہوں نے مجھے پہچان کیسے لیا! میں نے تو انہیں آج تک کبھی دیکھا نہیں تھا! لیکن انہوں نے بتایا۔ "جب تم ہائی سکول میں تھے اور ایک بار اپنے ماموں کی شادی میں لاہور سے وزیر آباد آئے تھے میں نے تمہیں تب دیکھا تھا۔"

اُن کے منہ سے اپنے لئے یکایک تم کا تخاطب سُن کر مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ اُن کے لئے میرے دل میں اور بھی احترام پیدا ہو گیا۔ اگرچہ اس خیال سے دل ڈوبتا رہا، نہ جانے جائیداد کے سلسلے میں کس قسم کی گفتگو ہو گی کہیں تلخی کی نوبت نہ آ جائے

اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر انہوں نے مجھے اپنے چودہ سال کے لڑکے سے ملایا جو سائیکل تھامے ہم لوگوں کا گیٹ کے پاس انتظار کر رہا تھا۔ منجندہ صاحب کہنے لگے۔

"میں تو چلی چلا دفتر کو۔ ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ اب تمہیں ستیش ہی گھر لے جائے گا۔ شام کو لوٹ کر باتیں ہوں گی"

وہ سائیکل لے کر چلے گئے ستیش اور میں ایک رکشے میں اُن کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ستیش بہت کم گو لڑکا تھا۔ نویں درجے کا طالب علم۔ آج اُس نے میرے ساتھ ساتھ رہنے کے لئے سکول سے چھٹی لے لی تھی۔ گھر کے دروازے پر پہنچے تو وہ میرا ہولڈال اور اٹیچی دونوں چیزیں خود ہی اٹھا کر اندر لے گیا۔

اس دو منزلہ مکان کے سات کمروں میں پانچ خاندان آباد تھے۔ تین اُوپر۔ دو نیچے۔ نیچے کے ایک حصے میں منچندہ صاحب خود رہتے تھے۔ باقی حصوں میں وہ لوگ رہتے تھے جو انہیں کرایہ ادا کرتے تھے۔ منچندہ صاحب کے پاس ایک ہی کمرہ تھا۔ باقی کمروں سے نسبتاً بڑا جس کے سامنے ایک برآمدہ بنی تھا۔ ایک کونے میں دیوار تعمیر کر کے ایک اسٹور بنا لیا تھا۔ اُسی اسٹور کو خالی کر کے اب میرے رہنے کے لئے سجا دیا گیا تھا۔ پلنگ، کرسی، میز، فرش پر دری، دیواروں پر ایک دو کیلنڈر اور چند کیل کپڑے لٹکانے کے لئے۔

جب میں مکان میں داخل ہوا منچندہ صاحب کی تینی صحن میں آ بہار رنگے ہوئے سوت کے تاگوں کا تانا بانا لگائے کھیس بننے میں مصروف تھیں۔ ایک سرے پر وہ خود بیٹھی تھیں دوسرے پر ان کی سب سے چھوٹی لڑکی نینا اُن کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ شریمتی منچندہ بھاری بدن کی خاصی دل کش اور محنتی عورت تھی۔ ان کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ باقی دو لڑکیوں سے میں دوپہر کے بعد مل سکا۔ جب وہ اپنی اپنی پاٹھ شالا سے لوٹ کر آئیں۔ شیلا ایف اے فائنل میں تھی اور سب سے بڑی جیوتی بی ٹی کرنے کے بعد اب ایک سکول میں پڑھایا کرتی تھی۔

چاروں بھائی بہن اپنے باپ کی طرح دُبلے پتلے درمیانے قد کے اور اُن کے ہم شکل تھے۔ سب کے سب شرمیلے لیکن بڑے مہذب۔ انہوں نے میرے ہر سوال کا جواب دیا۔ سوال کی طرح جواب بھی مختصر ہوتا تھا۔ میں چاہتا تھا مجھے جلد سے جلد اُن کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے لیکن یوں محسوس ہونے لگا خود میرے سوالات سے اُن لوگوں کے لئے میرے تعارف کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔

"آپ نے سائنس کیوں نہیں لی؟ میں نے تو ہمیشہ سائنس کا سبجیکٹ لئے رکھا تبھی تو اب سول انجنئیر بن سکا ہوں"

"آپ نے ایم اے کیوں نہیں کیا؟ لڑکیوں کو آج کل ایم اے تک ضرور پڑھنا چاہئے۔ میری بہن سنتوش نے بھی ---"

"اچھا آپ لوگ اخبار کیوں نہیں منگاتے؟ خبریں کیسے پڑھتے ہیں؟ میں تو صبح اُٹھتے ہی جب تک اخبار نہ دیکھ لوں' بستر سے نکلنے کے لئے میرا موڈ ہی نہیں بنتا۔"

میرا خیال تھا وہ لوگ میری اس بات پر ہنس پڑیں گے۔ عمر میں مجھ سے چھوٹے میرے کتنے سارے عزیز پھوپھی کے' ماموں کے' چچا کے لڑکے لڑکیوں کو میں اپنی عجیب و غریب عادات کے قصے سُنا سُنا کر کافی محظوظ کر لیا کرتا تھا۔ لیکن منچندہ صاحب کے بچے میری باتیں سُن کر خاموش رہے۔ صرف خاموش ہی نہیں' اُن کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے بھی نظر آئے۔ کچھ دیر بیٹھے سُنا کئے۔ پھر باری باری کمرے سے باہر چلے گئے۔ جیوتی باہر جا کر لوٹ آئی کچھ جھجکتی ہوئی مگر پھر اپنے لہجے کو قابلِ اعتماد بنا کر بولی۔

"سیٹھی صاحب معاف کیجئے گا۔ اگر میں آپ کو اپنے ہاں کے کچھ خاص خاص دستور بتا دوں۔"

وہ میرے سامنے پھر سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک ہاتھ کرسی کے بازو پر دوسرا قریب رکھی ہوئی میز پر۔ ایک کتاب سے بار بار کھیلنے لگا۔

"ہاں ہاں بتلائیے۔ میں آپ سے کیا کچھ نہیں جاننا چاہتا۔"

اسے پہلی نظر ہی دیکھ کر میں نے یقین کر لیا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ میں جی کھول کر باتیں کر سکوں گا۔ اچھی تعلیم و تربیت کی وجہ سے نہیں یقیناً زندگی کے تجربوں سے بھی اُس کے چہرے پر ایک گہرائی' ضبط' توازن اور جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔ میں اُس کے دل کو ٹٹولنے والی بڑی بڑی آنکھوں

بڑی خوب صورت گردن اور سر کے کالے لمبے اور سیدھے بالوں کی طرف دیکھتا رہا۔ جن میں کوئی بل نہیں تھا۔ کوئی زنجیر نہیں تھی کوئی لہر نہیں تھی۔ بال اس کی پشت پر ایک ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ لیکن اتنے نرم اور ملائم تھے کہ باندھ کر رکھنے پر بھی ڈھیلے ہو کر کانوں پر اتر آتے تھے۔ کانوں سے اتر کر گالوں کو چھونے لگتے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"مجھے معلوم ہے آپ یہاں کس مقصد کے لئے آئے ہیں۔ آپ کے آنے کی اطلاع ملنے سے پہلے ہم سب اسی مقصد کے بارے میں دن رات سوچتے رہتے تھے۔ آج شام کو پتا جی کے آنے پر بات چیت ہوگی۔ لیکن آپ نہیں جانتے یہاں اس گھر میں کئی الجھنیں ہیں۔ ایسی الجھنیں بھی جن سے پتا جی اور ہم سب بہت پریشان ہیں۔ لیکن ہم کوشش کرتے ہیں۔ کہ اس موضوع پر کم سے کم بات ہو۔ زیادہ تر دھیان اس طرف رہتا ہے کہ ہم سب کی تعلیم جاری رہے۔ ہم سب کو اچھا کھانا ملتا رہے۔ ہمارے بدن پر ایسے کپڑے ہوں جنہیں دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم لوگ بہت زیادہ غریب ہیں۔ آپ نے ابھی اخبار کے بارے میں پوچھا تھا ہمارے گھر میں صرف دو آدمیوں کو اخبار سے دلچسپی ہے مجھے اور پتا جی کو۔ میں آپ کو یہ بتانے میں کوئی شرم نہیں محسوس کرتی کہ میں اسکول کی لائبریری میں جا کر اخبار دیکھتی ہوں۔ پتا جی صبح بازار میں ایک نیوز ڈیلر کے ہاں جا کر پڑھ لیتے ہیں جہاں سے وہ روزانہ شیو بھی بنواتے ہیں"

میں کھسیانا ہو کر ہنس پڑا۔ کہا۔ میری بات کا ہرگز برا مت مانیے۔ مجھے دراصل آپ کے گھر کے بارے میں کسی بات کا بھی علم نہیں ہے۔ اچھا ہے کہ آپ نے کچھ بتا دیا۔ باقی باتیں بھی بتا دیجئے گا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ معلوم ہو ہی جائے گا۔ آپ دیکھئے گا میں بھی بہت عجیب نہیں ہوں۔ کوشش کروں گا کہ آپ لوگ مجھے اپنے جیسا ہی سمجھیں۔

یہ کہہ کر میں مسکرا دیا۔ کچھ لمحوں تک مسکراتا رہا۔ جب جیوتی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ تو میں نے پھر پوچھا "آپ کا سکول کتنی دور ہے؟"

"دو میل"

"بس سے جاتی ہیں؟"

"یہاں بس سروس نہیں ہے"

"اچھا! تو پھر کیا سائیکل پر؟"

"جی نہیں پیدل۔ دو میل ہوتے ہی کتنے ہیں! زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہی تو لگتے ہیں چلنے میں!"

میں اُسے بتانے لگا "میرا دفتر گھر سے چھ میل ہے۔ روزانہ بارہ میل سائیکل چلاتا ہوں۔ دہلی میں دس پندرہ میل روزانہ سائیکل چلا لینا دہلی والوں کا ایک معمول ہے میں اب ایک سکوٹر خرید دوں گا۔ روپے جمع کر رہا ہوں۔ آئندہ سال امید ہے کہ—

وہ میری طرف بڑی توجہ سے دیکھتی رہی۔ میں نے پھر کہا۔ "ایک دن آپ کے سکول آؤں گا۔ میرے وہاں آنے پر کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

جواب دینے میں اُس نے کچھ تامل کیا۔ پھر کہا "نہیں تو!"

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر باتیں ہوئیں پھر وہ باہر جانے لگی تو دیوار پر ٹنگی ہوئی میری بش شرٹ اور پتلون دیکھ کر بولی "لائیے کچھ کپڑے اتارے ہوں تو"

"ہاں مہربانی کر کے انہیں اپنے دھوبی کے پاس بھجوا دیجئے۔ میرے پاس دو تین ہی جوڑے ہیں۔ کل پرسوں تک دھوبی لوٹا دے گا ناں!"

وہ کچھ کہنے کی بجائے دیوار کی طرف چلی گئی۔ میرے کپڑوں کی جیبوں میں سے پن، پیسے ریزگاری اور کچھ کاغذات جو کچھ بھی ملا، نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ اور پھر کپڑے اٹھا کر باہر چلی گئی۔ میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ ایسی لڑکی تھی جس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ اُس سے ملے بمشکل گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہوگا لیکن

ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے عرصہ کے ذہنی رفیق ہیں۔ جسم کے خوبصورت تناسب میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ کشش کسی انسان کے چہرے کی ذہانت میں بھی ہوتی ہے۔ ایسی ذہانت جو چہرے پر صاف صاف لکھی ہوئی ہو جسے کوئی نظر انداز نہ کر سکے۔

کچھ دیر بعد میں کمرے سے نکلا تو دیکھا جیوتی چھت پر دھوپ میں میرے دھوئے ہوئے کپڑے پھیلا رہی ہے۔ اُس نے خود ہی دھو دیئے تھے مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ شرم بھی آئی۔ میں نے اُس کی ماں سے کہا جو برآمدے میں ایک چٹائی بچھا کر مشین پر کوئی کپڑا سی رہی تھی "جیوتی نے میرے کپڑے دھونے کی کیوں تکلیف کی ہے؟"

وہ مسکرا دیں "تکلیف؟ کیا جیوتی گھر میں کسی اور کے کپڑے نہیں دھوتی؟" اندر کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولیں "یہ سب کپڑے کل دونوں بہنوں نے مل کر دھوئے تھے۔"

کمرے کے اندر واقعی ڈھیر سارے کپڑے دُھلے ہوئے رکھے تھے۔ پتلونیں، پاجامے، قمیصیں، نکریں، شلواریں، دھوتیاں وغیرہ جنہیں جیوتی کی چھوٹی بہن شیلا بڑے انہماک سے پریس کرنے میں مصروف تھی۔ پاس ہی فرش پر ستیش اور نینا بیٹھے ردی اخباروں کے لفافے بنا رہے تھے۔ میں اُن کے پاس گیا۔ اُن کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر انہیں کام کرتا ہوا دیکھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم ہاتھوں نے کاغذوں کو خاص طریقے سے تراش تراش کر، تہہ کر کر کے ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ بنے ہوئے لفافوں کی چھوٹی چھوٹی گڈیاں دوسری طرف لگی ہوئی تھیں۔ میں اُن کے پاس بیٹھ کر کاغذ پر لئی لگا لگا کر اُن کے حوالے کرنے لگا۔ ستیش اور نینا ہنس ہنس کر لفافے بناتے رہے۔ شیلا حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ جیوتی چھت سے اتری اور دُور سے مجھے کام کرتے ہوئے دیکھا تو زینے کے پاس ہی کھڑی رہ گئی۔

اچانک ستیش کی ماں نے اُسے پکارا "کیوں ستیشے! آج بارہ تاریخ ہے۔ راشن لانا بھول گیا؟"

ستیش کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹی بہن کو لفافے بنانے کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر ماں سے بولا ——— "ماتا جی! جلدی سے راشن کارڈ اور پیسے دے دیجئے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

چودہ برس کے معصوم مگر ذمہ دار بچے کے چہرے کو دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ وہ جب ماں سے راشن کارڈ، پیسے اور دو بڑے بڑے تھیلے لے چکا تو میرے دل میں اُس کا ساتھ دینے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ جلدی ——— اُس کے ساتھ ہو لیا۔

ہم دونوں کچھ گلیاں اور بازار طے کر کے ایک دکان پر پہنچے جہاں بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ ایک قطار میں کھڑے باری باری راشن لے رہے تھے۔ قطار دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا۔ ایک گھنٹے سے پہلے باری نہیں آ سکتی ہے۔ ستیش سے کہا ——— "لاؤ کارڈ اور تھیلے مجھے دو۔ تم جا کر اپنا کام کرو۔ میں راشن لے کر آ جاؤں گا۔"

میری بات سن کر وہ بہت حیران ہوا۔ ہنس بھی دیا۔ بولا "نہیں جی، میں خود لے آؤں گا۔ آپ جائیے۔ گھر بیٹھیئے۔"

[illegible] راشن [illegible] ہم دونوں ایک ایک تھیلا اٹھا کر گھر پہنچے۔ اس کے [illegible] تھے۔

[illegible] دونوں بازو [illegible] تھیلا دیکھ کر [illegible] چندو صاحب بھی دفتر سے آ چکے تھے۔ [illegible]

[illegible] نے اپنے بھایا جی کو کیوں تکلیف دی؟ نالائق!"

میں نے [illegible] ہاتھ سے تھیلا چھیننے کی بڑی کوشش کی [illegible] نہیں دیا۔۔۔۔

ستیش [illegible] اپنے کام کو ختم کرنے کے لئے چلا گیا۔ جیوتی [illegible] چندو صاحب اور میں چائے پینے کے

بیٹھ گئے۔ اب اطمینان سے انہوں نے میرے پتاجی کی خیریت پوچھی۔ اُن کے ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد کے مشاغل اور میری سروس کی تفصیلات معلوم کیں۔ کچھ ایسی باتیں بھی جن کا تعلق موسم یا ملکی و غیر ملکی سیاسیات سے تھا۔ ابھی ہم لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ انھیں باہر سے کسی نے پکارا۔ آواز سن کر انہوں نے کہا۔

"قادری صاحب آئے ہیں۔ میرے پڑوسی ہیں۔ ہم دونوں روزانہ اسی وقت واک کرنے کے لیے جایا کرتے ہیں۔ چلو تم بھی چلو۔"

میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ انہوں نے مجھے قادری صاحب سے متعارف کرایا۔ وہ بھی انہی کی عمر کے تھے۔ شیروانی پاجامہ اور ٹوپی پہنے ہوئے۔ ہم تینوں گلیوں اور بازاروں سے نکل کر ایودھیا جانے والی سڑک پر چار پانچ میل تک چلتے گئے۔ دہلی میں اتنی کھلی فضا میں گھومنے اور سانس لینے کا کبھی موقعہ نہیں ملتا تھا۔ اگرچہ میں اس قدر زیادہ کبھی پیدل چلنے کا عادی نہ تھا لیکن اُن کے ساتھ ساتھ چلنے میں خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

جب لوٹے تو شام کا دھندلکا رات میں ڈھل چکا تھا۔ صحن میں ایک جگہ چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ وہاں سب لوگ بیٹھ کر شام کی عبادت کرنے لگے۔ میں نے کبھی پوجا پاٹھ نہیں کیا تھا۔ اُن سب سے الگ ہو کر بیٹھے رہنا بھی مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ وہ لوگ عبادت شروع کر چکے تھے۔ منجندہ صاحب، اُن کی بیوی، تینوں بیٹیاں اور بیٹا۔ دھیمے دھیمے مدھر سروں میں منجندہ صاحب جو کچھ گاتے تھے باقی سب اُسے دہراتے تھے۔ آنکھیں بند کیے، سر کو جھکائے ہوئے۔ دونوں بڑی لڑکیوں نے اپنی ماں کی طرح ڈوپٹوں سے اپنا اپنا پورا آدھا جسم اور سر ڈھانپ لیا تھا۔

میں سب کے پیچھے جا بیٹھا۔ آنکھیں بند کر کے منجندہ صاحب کی آواز کو دہرانے لگا۔ میری آواز سن کر سب نے سر گھما گھما کر مجھے دیکھا۔ صرف منجندہ صاحب بھجن گانے میں مگن رہے۔ انہوں نے بھی میری آواز سنی ہوگی۔ شاید وہ میری شمولیت کو یقینی سمجھتے تھے۔

سندھیا پاٹھ ختم ہوا تو جیوتی نے اپنی جگہ سے اٹھتے وقت مجھے گھور کر دیکھا جو کچھ میں نے کیا تھا۔ اُس کے لیے اُس نے حیرانی ظاہر نہیں کی تھی۔ اُس کی نظر میں میرے عمل کے لیے قبولیت کی کیفیت بھی نہیں تھی۔ بس وہ ایک نظر تھی جس کی کیفیت میں بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن ایسی نظر کی میں توقع ضرور کر رہا تھا۔

کھانے کے وقت میں اور منجندہ صاحب اکیلے تھے۔ کھانا میرے کمرے ہی میں لگایا گیا تھا۔ لیکن ہمارے درمیان ابھی تک وہ موضوع زیرِ بحث نہیں آیا تھا جس کے سلسلے میں خاص طور پر وہاں گیا ہوا تھا۔ دراصل میں چاہتا تھا وہ خود بات شروع کریں۔ وہ جانتے تو تھے ہی کہ پتاجی نے مجھے اسی لیے بھیجا ہے لیکن انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ شاید وہ پہلے مجھے ہی کچھ کہنے کا موقعہ دینا چاہتے تھے۔ میں اپنے ساتھ جائیداد کی سب دستاویزیں لے گیا تھا۔ پتاجی نے کہا تھا "ہوسکتا ہے منجندہ صاحب ہمارے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔" ہماری طرف سے لکھے ہوئے خطوط پر خاموشی اختیار کر کے منجندہ صاحب نے پتاجی کے دل میں ایک شبہ پیدا کر دیا تھا۔ جس مکان میں وہ رہ رہے تھے۔ میں نے اس کی قیمت کا اندازہ بیس ہزار لگا لیا تھا جس کے آدھے کے ہم لوگ حقدار تھے۔

ابھی ہم نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ وہاں ایک شخص اور آ گیا۔ اس کے ساتھ تعارف ہونے پر معلوم ہوا کہ وہ منجندہ صاحب کا چھوٹا بھائی شنکر ہے۔ اسی شہر میں ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔

دونوں بھائی کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے پھر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں سے تھوڑی ہی دیر کے بعد شنکر کے اونچا اونچا بولنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اپنے کمرے میں شنکر کو دیکھ کر مجھے ذرا سا بھی یہ شک نہیں گذرا تھا کہ وہ اپنے اندر ایک بہت بڑا طوفان چھپائے ہوئے ہے۔ منجندہ صاحب اُسے بار بار یہ احساس دلا رہے تھے کہ وہ گھر میں ایک مہمان کی موجودگی میں اس بات کو نہ چھیڑے کسی اور دن آ کر جھگڑا طے کرے۔ لیکن وہ تو جیسے اپنی بات منانے کے لیے بضد تھا۔ آج کوئی نہ کوئی فیصلہ کرانے کا ہی ارادہ کر کے آیا تھا۔

اُس رات کو تو جھگڑے کی پوری نوعیت مجھے معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ دوسرے دن دوپہر کو جیوتی نے سکول سے لوٹ کر مجھے سب کچھ بتا دیا۔ شنکر سائیکل کے پُرزے بنانے والی ایک مقامی فیکٹری میں بہت معمولی تنخواہ پر ٹائم کیپر تھا۔ وہ جس کرائے کے مکان میں اپنے چھ بچوں اور ایک بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا اُس کے لیے اُسے بیس روپے دینے پڑتے تھے۔ منجندہ صاحب کی جائیداد میں اس کا بھی آدھا حصّہ تھا۔ وہ چاہتا تھا یا تو اُسے مکان کے اندر ایک حصّے میں رہنے کی جگہ دی جائے یا پھر مکان بیچ کر اُسے اپنا حصہ نقد رقم کی صورت میں دے دیا جائے تاکہ وہ کہیں ایک سستے داموں کی زمین خرید کر اپنی جھونپڑی بنا لے لیکن منجندہ صاحب دونوں صورتوں میں سے ایک کے لیے بھی تیار نہیں تھے جیوتی اپنے باپ کی ہمنوا تھی۔ اُس کا کہنا تھا منجندہ صاحب اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم اور شادی پر پانچ ہزار روپے خرچ کر چکے ہیں اسے قربانی نہ سمجھا جائے بلکہ جائیداد کا ایک حصہ ہی سمجھا جائے جو ادا ہو چکا ہے۔

ایک دن شنکر مجھ سے الگ ملا۔ بلا کر اپنے گھر لے گیا۔ اُس کے پاس ایک کمرے کا بغیر بجلی کا کوارٹر تھا۔ جس کے صحن کی دیواریں اتنی اونچی نہیں تھیں۔ جتنے اس کی بیٹیوں اور بیٹوں کے قد تھے۔ بارہ سال سے لے کر دو مہینے تک کے درمیان کے بچے ہر لحاظ سے تعلیم، لباس اور پرورش کی کمی کا کافی مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ بہت مہذب بھی معلوم نہیں ہوتے تھے شنکر کی بیوی چھوٹے قد کی ایک بھاری بدن کی عورت تھی۔ دونوں نے منجندہ صاحب کی خود غرضیوں اور زیادتیوں کا دفتر کھول دیا۔ وہ ان کے حصّے کو ہڑپ کر لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس بات کی پیشکش کی کہ ہم دونوں مل کر منجندہ صاحب کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں۔ میں نے اُسے کوئی فیصلہ کن جواب نہ دیا۔ سوچنے کے لیے وقت مانگا۔

اُس دن شنکر کے گھر سے لوٹا۔ تو منجندہ صاحب کے گھر کے ہر فرد کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ میری طرف کوئی پہلی جیسی محبت اور دلچسپی سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے انہوں نے میرے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ میرے ساتھ باتیں کرنے سے بھی احتراز کیا گیا۔ میں اپنے کمرے میں کرسی میں گردن تک ڈوب کر سوچنے لگا۔ آج جائیداد کے بٹوارے کے مسئلے پر کھل کر بات ہو جانی چاہیئے۔ سوٹ کیس میں سے پرانی دستاویز نکالیں انہیں میز پر پھیلایا اور اِدھر اُدھر منجندہ صاحب کو دیکھا۔

وہ دفتر سے لوٹنے کے بعد منہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں گھسے ہوئے تھے۔ شام کی چائے پر ہم دونوں پھر اکٹھے ہوں گے تو یہ بات ان کے سامنے رکھوں گا۔ میں نے کاغذات کو اُسی طرح میز پر پڑا رہنے دیا۔ اسی کمرے میں ہم لوگ چائے پیا کرتے تھے۔ لیکن اس دن وہ میرے کمرے میں نہیں آئے۔ اپنے کمرے میں بلا کر چائے پلائی۔ میں وہاں کاغذات ساتھ نہیں لے گیا۔ چائے کے دوران میں نے اُن کے متعلق بات بھی نہ چھیڑی۔ اُن کے خاموش سنجیدہ اور حلیم چہرے کو دیکھ کر کوئی بات چھیڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ یہ حقیقت جاننے کے باوجود کہ میں ایک خود غرض قسم کے شخص کے گھر میں رہ رہا تھا۔ چائے پی کر ہم لوگ حسبِ معمول قادری صاحب کے آ جانے پر واک کرنے کے لیے چلے گئے۔

وہاں رہتے ہوئے مجھے پانچ روز ہو گئے تھے۔ میں وہاں محض رہنے کے لیے نہیں گیا تھا۔ وہاں جانے کے بعد پتاجی کو کوئی خط بھی نہیں لکھا تھا۔ یہی خیال آتا تھا وہ میرے خط کا ہر روز انتظار کرتے ہوں گے۔ انہوں نے کہا تھا کوئی بات جواب طلب ہو تو مجھے فوراً لکھ کر پوچھ لینا۔ اب یہاں پوچھنا تو ایک طرف اس بات کو شروع ہی نہیں کر سکا تھا۔ اس گھر میں مجھے کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں ہر شخص کے کام دلچسپی لیا کرتا تھا۔ بڑوں اور چھوٹوں سب کے ساتھ۔ لیکن ان سب کے چہرے اب بھی کسی شک اور ایک خاص قسم کے کرب کی غمازی کرتے تھے۔ میری خوشنودی کے لیے وہ اچھے سے اچھا کھانا تیار کر سکتے تھے لیکن کوئی دلچسپ اور متحرک کر دینے والی بات نہیں چھیڑتے تھے۔

ایک روز دوپہر کو میں شہر میں بے مقصد گھومتا پھرا۔ گھومتے گھومتے ایک گرلس سکول کے سامنے جا نکلا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ جیوتی اسی سکول

میں پڑھاتی ہے۔ ابھی تک میں نے اس کے سکول کو دیکھنے کا پروگرام نہیں بنایا تھا جب وہاں پہنچ گیا تو آگے بڑھنے سے خود کو روک نہیں سکا جیوتی منجندہ کو بلوانے میں دیر بھی نہیں لگی۔ جب وہ آئی تو مجھے دیکھ کر گھبرا گئی بولی ـــ "آپ یہاں کیسے ؟"

میں نے کہا ـــ "آپ سے کہا نہیں تھا، ایک دن آپ کا سکول دیکھوں گا !"

"لیکن ـــ !" اس کی گھبراہٹ دور نہ ہوئی۔ بار بار سر گھما کر وزٹرس روم سے باہر اُن استانیوں کی طرف دیکھنے لگتی تھی جو میری آمد پر کچھ چونکی ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے اُسے یاد دلایا ـــ "آپ نے تو کہا تھا یہاں میرے آنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا !"

وہ بولی ـــ "چلئے باہر چلتے ہیں۔ باہر کسی جگہ۔"

میں نے کہا ـــ "چلئے۔ جہاں جی چاہے !"

وہ سکول سے چھٹی لے کر آ گئی۔ سکول کی عمارت سے نکل کر بھی اس کی وہی کیفیت رہی۔ کہنے لگی "آپ کو کام کیا ہے مجھ سے ؟ میرا مطلب ہے کوئی بہت ضروری ـــ !!"

مجھے ہنسی آ گئی۔ کہہ دیا "ہاں ایک بہت ضروری کام ہے۔ لیکن کہاں چل کر بیٹھیں ؟ کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں ہم دونوں باتیں کر سکیں۔ آج میں آپ سے بہت سی باتیں کروں گا۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا، ہم گھر میں جا کر باتیں کریں ؟ آپ کوئی ایسی بات تو نہیں کہنا چاہتے جو گھر کے اندر نہ کہی جا سکتی ہو ؟"

میں نے کہا "مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ کے گھر کے اندر کون کون سی باتیں کہی جا سکتی ہیں اور کون کون سی نہیں پھر بھی احتیاطاً ہم گھر نہیں جاتے۔ چلئے کسی ریسٹوران میں بیٹھیں گے۔"

"کس ریسٹوران میں ؟ اس چھوٹے سے شہر میں کوئی ریسٹوران ایسا نہیں ہے جہاں ہم آزادی سے بیٹھ سکیں۔ آس پاس کے لوگ ہمیں دیکھنے لگیں گے۔ لیکن میں پوچھتی ہوں آج آپ کو یکایک یہ کیا سوجھی ہے ؟"

میں اُس کے جواب پر مسکرا دیا۔ ایک رکشا بلا کر کہا ـــ "چلئے ـــ ریلوے اسٹیشن کے ریسٹوران میں بیٹھیں گے۔ وہاں کوئی نہیں چونکے گا۔"

یہ سن کر اس کے چہرے پر سے گھبراہٹ دور ہوئی۔ لیکن پھر بھی وہ میرے ساتھ جانے میں ہچکچاتی رہی۔ رکشا میں ہم دونوں نے کوئی بات نہ کی۔ در اصل میں اس کے متعلق سوچنے میں مصروف ہو گیا تھا جیوتی آج بہت ہی سمارٹ نظر آ رہی تھی۔ اس نے سر کے بالوں کی چوٹیاں بنانے کی بجائے انہیں ایک دلکش جوڑے میں سمیٹ رکھا تھا۔ گردن کے عین پیچھے۔ اس کے کان بالوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ وہ کانوں میں بہت ہی معمولی قسم کے ٹاپس پہنے ہوئے تھی۔ آج اس کا چہرہ لمبا ہونے کی بجائے چوڑا دکھائی دے رہا تھا۔

اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے دو پلیٹ فارم ٹکٹ لیے۔ ہم دونوں ریسٹوران میں جا بیٹھے۔ وہ میری طرف بہت ہی حیرت زدہ سی ہو کر دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے میں کیا نہ کہہ دوں گا۔ لیکن میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ میں جو باتیں اُس کے باپ سے نہیں کہہ سکتا، اب اس کے سامنے اگل دوں گا۔

جب میں نے جیب سے جائیداد کی دستاویز نکال کر اُس کے سامنے رکھیں تو وہ انہیں غور سے دیکھ کر بولی ـــ "میرے چاچا جی دو روز سے پتاجی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ آپ کو جائیداد میں سے ایک انچ زمین بھی نہ دینے کا فیصلہ سنا دیں۔ دن بھر ان کے دفتر جا کر یہی کچھ بکتے رہتے ہیں۔"

منجندہ صاحب کی اس حرکت پر میں حیران رہ گیا۔ اُس نے مجھے کتنا بڑا دھوکا دیا تھا۔ مجھے مل کر نالش کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اور ادھر درپردہ منجندہ صاحب کو بھڑکا رہا تھا جیوتی کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ ہنس پڑی۔ بولی "میرے چاچا جی کی یہ پرانی عادت ہے۔ اسی لیے تو کوئی ان کی بات پر اعتبار نہیں کرتا لیکن آپ

اتنے دنوں تک کیا سوچتے رہے ہیں؟"

میں نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سے اُس کے دل کی کیفیت بھانپنے کی کوشش کی اور کہا "آپ کے پتا جی نے کیا سوچا ہے؟ آپ خود کیا کہتی ہیں؟"

یہ سن کر اُس نے سر جھکا لیا۔ میز پر پڑے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسایا۔ پھر الگ کیا۔ پھر پھنسایا۔ پھر الگ کیا۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر بڑی بے بسی سے مسکرا دی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ لمحوں تک جھانکتے رہے۔ جب دو آدمی ایک دوسرے کی طرف درحقیقت دیکھنا چاہتے ہیں تو اُن کی نگاہیں کبھی کبھی جمی اور جکڑی بھی رہ جاتی ہیں۔ اُس وقت نگاہوں کے تصادم کا ایک لمحہ بھی بہت طویل معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس ایک لمحے میں آنکھوں کی کتنی گہرائیاں، کتنی سچائیاں، کتنی خواہشات سمندر کی لہروں کی طرح کبھی ابھی ابھلتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی چلی آتی ہیں کبھی شکست یاب ہو کر ہلکے ہلکے بین کرنے کی آواز کے ساتھ لوٹنا شروع کر دیتی ہیں۔

جب اُس نے نظریں جھکا لیں تو میں نے پوچھا "مجھے ایسا لگتا ہے آپ کے گھر کا ہر شخص میرے متعلق ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ کیا سوچتا رہتا ہے یہ میں نہیں جان سکا۔ لیکن میں ڈرتا ہوں وہ میرے بارے میں کوئی ایسی رائے نہ قائم کر لیں جو دراصل میرے بارے میں صحیح نہ ہو۔"

اُس نے جواب دیا "ہم سب یہ نہیں سوچا کرتے کہ آپ کیا ہیں اور کیا نہیں لیکن یہ ٹھیک ہے کہ ہر لمحہ اُس خطرے کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ جو ہم سب کی مل جل ایک اچھی زندگی گزارنے کی لگن اور جدوجہد کو ختم کر کے رکھ دے گا۔"

"تو کیا آپ سمجھتی ہیں وہ خطرہ میں لے کر آیا ہوں۔۔؟"

"یقیناً آپ!"

"وہ کیسے؟"

"جب تک آپ نہیں آئے تھے، ہم اس بات کو بھولے ہوئے تھے کہ اس گھر کے دو یا تین حصے ہو جائیں گے۔ اس چھوٹے سے گھر کے تین حصے ہو جانے کے بعد پھر اس میں کشش ہی کون سی باقی رہ جاتی ہے۔ ہم سب اس بات کو سوچتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں کہ کبھی ہم سب کو اپنے گھر کے ایک کونے میں ہی سمٹ کر رہنا پڑ جائے گا۔"

جب جیوتی بول رہی تھی میری نظر اُس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے دو ریئوں پر مرکوز تھی۔ وہ چمک اس کی شخصیت کے اعتماد اور قوت ارادی کی غماز تھی۔ ناگاہ میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا، یہ لڑکی کسی ایسے شوہر کے سپرد بھی تو کی جا سکتی ہے جو اس سے اعتماد اور ارادے کی طاقت چھین لے گا۔ پھر ایک دن وہ دن رات کام کاج کی چکی پیسنے اور اپنے بدمزاج شوہر کا انتظار کرنے والی ایک بے بس عورت ہی بن کر رہ جائے گی۔ میں اُس کی اس وقت کی شکل کا کوئی تصور ذہن میں نہ لا سکا۔ لیکن انہی لمحوں میں اپنے دل کو کس قدر ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ میں نے ابھی تک اظہارِ محبت بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ اظہار کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن یہ محسوس ہوتا تھا میں اُس سے بہت دور نہیں ہوں۔ جو کچھ میرے دل میں ہے وہ اس پر ظاہر کر دوں تو وہ اگر کسی وجہ سے میری خواہش کا خیر مقدم نہیں کر سکے گی تو وہاں سے اٹھ کر چل بھی نہیں دے گی۔ لیکن مجھے اچانک یاد آیا کل رات وہ اپنے پتا جی کو اپنے جمع کئے ہوئے روپوں کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی۔ وہ ان روپوں کا کیا کرنے والے تھے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ یقیناً وہ شنکر کو روپے نہیں دے سکتے۔ یہ ممکن ہے وہ مجھے کچھ رقم دے کر واپس بھیج دینا چاہتے ہوں!

میں نے پوچھا "آپ لوگ شنکر کو مکان میں اپنا آدھا دے دیں تو کیا حرج ہے؟"

یہ سن کر اُس کی آنکھوں میں غصّے کی لہر پیدا ہو گئی۔ بولی۔ "کیوں؟ آپ کے دل میں یہ خیال کیونکر آیا؟ آپ کو ہمارے چاچا جی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں وہ ایسی ہمدردی کے قابل ہیں؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ کچھ لڑکیاں اور لڑکے بالکل اپنے ماں باپ کی طرح سوچتے ہیں۔ گھر کے ماحول میں ان کے جیسے بھی ذہنی سانچے بن چکے ہوتے ہیں، اُن میں سے نکلنے کی وہ کبھی شعوری کوشش نہیں کرتے۔ یخندہ صاحب کو تو میں ایک مکمل خود غرض انسان سمجھتا ہی تھا، لیکن یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ جیوتی بھی جان بوجھ کر خود غرض بننا چاہتی ہے۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ "آپ لوگوں نے آج تک اُس پر جتنا خرچ کیا ہے۔ وہ آپ کا فرض تھا ——— ——— وہ آپ کی جائیداد میں سے آدھا حصّہ لینے کا بھی پوری طرح حق دار ہے۔"

یہ سن کر وہ غصّے میں اُٹھ کر چلی بھی جاتی تو مجھے کوئی صدمہ نہ ہوتا کیونکہ میں ایک سچی بات اُس پر واضح کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ وہاں جم کر بیٹھی رہی۔ میری طرف یوں گھور کر دیکھا جیسے وہ مجھے اپنی دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس وقت وہ مجھے بہت ہی معصوم اور دلفریب لگی جیسے کوئی بچہ اپنی عمر سے کسی بڑے آدمی کو بیوقوف سمجھ کر ہنسنے لگے۔

"آپ کو یقین نہیں آئے گا پچھلے سال میرے پتا جی نے ایک لڑکا دیکھا تھا۔ اُس نے پانچ ہزار روپے نقد مانگے تھے۔ اُس وقت چاچا جی اگر چاہتے تو اپنے پاس سے کچھ دے کر ہماری مدد کر سکتے تھے۔ لیکن وہ صاف مُکر گئے۔ کیا اب بھی آپ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی حق یا انصاف کے مستحق ہیں؟"

"کیا لڑکا؟ کس کے لیے؟" میں چونک پڑا۔ کہیں وہ اپنے بارے تو نہیں کہہ رہی ہے؟ میرے سوال پر اُس نے سر جھکا لیا۔ پھر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ایک طرف سے دکھائی دینے والے چہرے پر مایوسی اور غصّے کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اُس کی ناک بہت خوبصورت نہیں تھی۔ لیکن اس وقت کس قدر دبے ہوئے رخساروں اور بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ بہت ہی جاذبِ نظر معلوم ہو رہی تھی۔ میں اس کی طرف نہ کتنے لمحوں تک پیار بھری نظر سے دیکھتا رہا۔ وہ اسی طرح دیوار کو گھورتی رہی۔ میں نے پوچھا۔ "لڑکے کو دینا بہت ضروری ہے؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دیوار کی طرف دیکھنا چھوڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ جیسے میرے سوال پر ہنس پڑنا چاہتی ہو۔

"وہ لڑکا کہاں ہے؟ کہاں رہتا ہے؟"

میں نے آج تک کسی نوجوان کے ساتھ اتنی باتیں اکیلے میں نہیں کی تھیں۔ اس کے چہرے کی گہری سنجیدگی بعض دفعہ اس کے حسن کو گہنا بھی دیتی تھی۔ جس وقت وہ میرے سوالوں کو خاموشی سے سن رہی تھی۔ اور ان کا کوئی جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کرب اور حیا کا ایک سمندر بھی کروٹیں لے رہا تھا۔ ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہتے۔ نہ جانے کتنی دیر تک جب اچانک اس کی آنکھیں چھلک پڑیں تو میں نے چونک کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جو میرے سامنے میز پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا "اگر کوئی شخص آپ سے جہیز لینے کی بجائے آپ کو پیشکش کرے تو کیا آپ اسے قبول کریں گی؟" یہ سن کر اس کی آنکھوں میں سے بہا نکلنے والا طوفان تھم گیا۔ گردو پیش کا ایک ایک لمحہ تھم گیا۔ جیسے ہر ایک چیز سانس روک کر اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے پھر پوچھا۔ "میری پیشکش محض ایک سوال نہیں ہے۔ جو محض پوچھنے کی غرض سے ہی آپ کے سامنے رکھا گیا ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُس میں یقین بھی رکھتا ہوں۔" اُس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میری طرف اسی طرح دیکھتی رہی مجھے یاد آیا میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ پر پڑا ہوا تھا جسے اُس نے کھینچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ مسکرا دی۔ میز پر پڑی ہوئی اپنی جائیداد کی دستاویز کو اپنے سامنے سرکا کر ایک جگہ جلدی جلدی کچھ لکھنے لگی۔ اس وقت اس نے سر جھکا لیا تھا۔ اُس کے چہرے پر سرخی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کے ریشم کی طرح ملائم بالوں کی ایک ہی لٹ جوڑے میں سے نکل کر اس کے بائیں کان پر کمان کی طرح آ گری تھی۔ ہم نے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی باہر جانے کا ارادہ کر دیا۔ اور جس وقت ہم باہر آ کر گھر کی طرف روانہ ہوئے شام کے سائے لمبے ہو چکے تھے لیکن ہمارے دلوں سے ساتھ ساتھ گھر لوٹنے کا خوف دور ہو چکا تھا۔

جاویدہ اخلاق گیلانی

بختاور

مصری جان نے نالی گھڑا دو پتھروں میں پھنسا کر رکھتے ہوئے ایک ہلکی سی آہ بھری اور برگد کے تناور تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔
دراصل یہ سرد آہ اب اس کی فطرت بن چکی تھی۔ اس ضعیفی میں جب بھی اُسے اپنے کمزور جسم کو گھسیٹتے ہوئے خانہ داری کا بوجھ سنبھالنا پڑتا تو اچانک اُس کے لاشعور میں سے ماں کی تصویر اُبھر آتی اور پھر یہ دبی دبی سی آہ اُس کے بھنچے ہوئے لبوں میں سسکی کی صورت اختیار کر جاتی اور وہ چونک کر بڑی پھرتی سے کسی نئے کام میں مصروف ہو جاتی۔ اُس وقت بھی اُس نے فوراً ایک کر گھڑے کو اٹھایا۔ دو تین بار اُسے چشمے کے ٹھنڈے پانی میں ڈبو کر کھنگالا اور خالی کر دیا اور پھر اطمینان سے پتھروں پہ ٹیک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بوڑھے برگد کا سایہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا اور لمبی لمبی چٹانیں نیچے نکلتی ہوئی پانی کو چھو رہی تھیں۔ تیز پانی کے دھارے ایک ٹیلے کے پیچھے سے نکل کر پیر کے مزار کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دور آگے وادی کی طرف نکل جاتے۔ گرمی کے دنوں میں یہاں دن کے وقت بڑی رونق ہوتی۔ سڑک کے قریب درختوں تلے دیہاتی دکاندار عارضی دکانیں لگا کر بیٹھ جاتے اور راہ گیروں کو تیل کباب، بھنے ہوئے بھٹوں کی سوندھی سوندھی خوشبو اور خربوزوں اور تربوزوں کے ڈھیر فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ برگد تلے عورتوں کا ہجوم ہوتا اور سڑک کے قریب خنک پانی کے کنارے مردوں کی ٹولیاں ہنسی مذاق میں مصروف نظر آتیں۔ ایک طرف عورتیں نہاتیں، دوسری طرف مرد اور دونوں طرف کے عمل خود بخود بٹے ہوئے۔ درمیان ایک اونچے ٹیلے پہ پیر کا مزار لاتعداد قبروں کا جال بچھائے، سر پہ رنگین جھنڈوں کی ہمہ گیر خاموشی اور جلال کے ساتھ سربلند نظر آتا۔ یہ طریقہ نہ جانے کب سے وہاں رائج تھا کہ بستی کے تمام لوگ بخوبی اس سے واقف ہو چکے تھے۔ اور کبھی کوئی مرد عورتوں کی آزادی میں خلل انداز نہ ہوتا۔ اگر کبھی کوئی بھولا بھٹکا انجان مسافر برگد کی طرف جا نکلتا تو مزار کا تنومند متولی فوراً نسوار کی چٹکی دانتوں تلے دبا کر ننگے پاؤں چلتا ہوا پگڈنڈی تک آ جاتا اور بے خبر مسافر کے قدم وہیں رک جاتے۔

اُس وقت بھی وہاں عورتوں کا ہجوم تھا اور کم عمر لڑکیاں گھڑے کناروں پہ رکھے پانی میں گھسی شور مچا رہی تھیں۔ دائیں طرف روشن جان کی تیسری لڑکی آسمان پری کسی کو دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں مسکرائی۔ مصری جان نے گھوم کر دیکھا۔ مزار کا متولی لٹھے کی سفید کھڑکھڑاتی شلوار اور بوسکی کی نئی قمیص پہنے اتنی آہستگی سے ننگے پاؤں خانقاہ کے صحن میں چل رہا تھا جیسے وہ تپتی اینٹوں کے فرش پہ نہیں بلکہ کوہِ سفید کی برف پوش چوٹیوں کے دامن میں پاراچنار کی مخملیں گھاس پر محوِ خرام ہو۔

مدت ہوئی روشن جان کی بڑی لڑکی ایک رات کسی کے ساتھ بھاگ کر چلی گئی تھی۔ تو بستی کے جوشیلے جوانوں نے لنتبر تک اُن کا تعاقب کیا تھا لیکن نہ معلوم وہ کیسے اُن کی مشتاق گولیوں سے بچ کر نکل گئے تھے۔ پھر جب اُس کی دوسری لڑکی بھی بھاگ گئی تو لوگ ششدر رہ گئے۔ روشن جان پیر کے مزار کے پاس کھڑی ہو ہو کر دہائی دیتی رہی مگر کسی غیور نوجوان نے اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور اب یہ تیسری لڑکی نہ جانے بختاور کی موجودگی میں یہ لڑکیاں کیسے بھاگ جانے کی جرأت کرتی ہیں اور اگر بھاگ جانا اتنی عام سی [illegible] تو پھر بختاور کا تو ابھی وہ زہر مار کے گلے پڑی کیوں قہر بن کر

ٹوٹا۔ اچانک اُس نے گھڑا اٹھا کر پھر سے پانی میں ڈبو دیا اور اوپر اٹھتے ہوئے لاتعداد بلبلوں کو دیکھ کر سوچنے لگی کہ نبی گل نے اُسے کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ وہ ماہ گلے کے متعلق نہ سوچا کرے مگر نہ جانے کیوں پھر دس پندرہ منٹ کے بعد ماہ گلے کی یاد دبے پاؤں کسی پوشیدہ سرنگ کے راستے اس کے دماغ میں آن موجود ہوتی اور اُس کے خیالات چونک کر انجانی راہوں پر بھاگ نکلتے۔ شروع شروع میں جب دل و دماغ میں توانائی تھی تو اس نے اس چیز پر قابو پا لیا تھا مگر جیسے جیسے دن گزر رہے تھے وہ ضعیف اور ماہ گلے کی یاد قوی ہوتی جاتی تھی۔ اور اب اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔

ہاں تو وہ پاراچنار کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کئی برس پیشتر جب وہ سچ مچ مصری جان تھی اور نبی گل ایک طویل برات۔ ڈھول سرنائی اور پٹاخوں کے ساتھ اُسے منڈو سے بیاہ کر لایا تھا۔ اور وہ عورتوں کے گھیرے میں مصری کی نئی شفاف ڈلی کی طرح جھلملاتی پھرتی تھی تب ہی پہلی مرتبہ اُسے بستی میں بختاور کی موجودگی اور لوگوں کی اُس سے گہری عقیدت کا علم ہوا تھا۔ وہ دُلہن بنی خاموش دالان میں اکیلی بیٹھی تھی۔ رات زیادہ آ چکی تھی اور اکثر مہمان عورتیں رخصت ہو گئی تھیں۔ شام سے گا گا کر ڈومنی کا گلا بیٹھ چکا تھا اور وہ اب چولہے کے پاس اس کی ساس کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ دو صحن میں چارپائیوں پر اُس کا خسر حاجی گل چند مہمانوں کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھا۔ اور وہ صحن میں نبی گل کی موجودگی محسوس کر کے جھکی جھکی پُرشوق نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ دُور دائیں طرف کے کونے میں اُسے ہوا میں سرسراتے ہوئے سرکنڈوں کا سا شور سنائی دیا اُس نے چونک کر بغور اُدھر دیکھا تو ایک بڑا سیاہ ڈھیر ایک ہلکی سی پھنکار کے ساتھ پچھلی تاریک کوٹھڑی میں سرکتا ہوا غائب ہو گیا وہ چند لمحے تو مبہوت کھڑی اُدھر دیکھتی رہی۔ اور پھر بے تحاشا چلاتی ہوئی بھاگی۔ دروازے پر نبی گل نے اُسے پکڑنا چاہا مگر وہ اس کے مضبوط بازوؤں میں سے پھسل کر نکل گئی اور اسی طرح بھاگتی ہوئی نبی گل کی ماں کے پاس پہنچ کر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ جب اُسے ہوش آیا تو سسرال کی تمام عورتیں اُس کے گرد بیٹھی ہوئی تھیں۔ نبی گل دور ٹہلتے ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا اور اُس کا خسر حاجی گل جائے نماز بچھائے نماز پڑھنے میں محو تھا۔ سانپ۔ اتنا بڑا۔ سیاہ کالا۔ اُس نے دالان کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھ کر ہکلاتے ہوئے کہا۔ سانپ ــــــ ؟ دور ٹہلتے ہوئے نبی گل کے قدم رُک گئے اور عورتیں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ حاجی گل نے دعا مانگ کر جائے نماز لپیٹی اور مسکراتا ہوا اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اور دوپٹہ کھینچ کر منہ پر ڈال لیا۔

سانپ نہیں بیٹی وہ بخت آور ہو گا۔ بختاور۔ وہ نبی گل کی ماں کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ آج نبی گل کی شادی ہے نا ؟ اور یہ تو ہمارے خاندان کی ریت ہے کہ ہر خوشی کے موقعے پر بختاور برکت دینے ضرور آتا ہے۔"

تمام عورتوں کے چہرے خوشی سے تمتما اُٹھے۔

"ارے بہو۔ سانپ مت کہہ وہ تو بزرگ ہے بزرگ۔ بخت آور ہے۔ خوش نصیب لوگوں کو اُس کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ چاند کی ہر گیارھویں کو پیر کے مزار پر سلام کرنے آتا ہے۔ چشمے کے کنارے گھومتا ہے مگر کیا مجال جو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ جائے۔ لوگ راستہ چھوڑ کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرا نبی گل کتنا خوش قسمت ہے۔ بیٹی اب تیری خوش قسمتی میں شک نہیں رہا۔" بڑھیا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے اور تمام عورتیں اُسے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔

مگر یہ نمایاں خوش قسمتی بھی اُس کا خوف زائل نہ کر سکی۔ اور وہ تمام رات نبی گل کے پیار اور تسلی آمیز باتوں کے باوجود رہ رہ کے کانپتی رہی۔ اُس نے نبی گل سے اصرار کیا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ پاراچنار لے چلے جہاں ان دنوں اس کی کپڑے کی دکان تھی۔ یہ بڑا کٹھن کام تھا نبی گل گھر والوں

کے سامنے یہ بات کہتے ہوئے سخت ہچکچا رہا تھا۔ اور اس کا باپ تو یقیناً اس کے مطالبے کو انتہائی بے شرمی پر محمول کرتا۔

حاجی گل سے اُس کا بیٹا ہی نہیں بستی کے تمام لوگ ڈرتے تھے۔ وہ کافی بااثر اور جابر انسان تھا۔ لیکن اُس کا غضب کبھی کبھار سالہا سال بعد برقِ ناگہاں کی طرح دشمن پر گرتا تھا عموماً وہ پُرسکون، دوست پرور اور لڑائی جھگڑوں سے دُور رہتا۔ اُس کے برخلاف نبی گل تیز طبیعت کا جوشیلا نوجوان تھا۔ اکثر ارد گرد کے علاقے میں وہ کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا رکھتا اور جب باپ سے اس کے متعلق مشورہ یا مدد طلب کرتا تو وہ اُسے ہمیشہ سمجھا بجھا کر ٹال دیتا۔ "غصّے کو وقتی طور پر پی جاؤ۔" یہ اُس کا مقولہ تھا۔ "اگر تمہارا غصّہ غلط اور مہمل قسم کا ہے تو تھوڑے دنوں میں ٹھنڈا پڑنے پر تم اس کو بھول جاؤ گے لیکن اگر تم حق پر ہو تو اس غصّے کا زہر آہستہ آہستہ تمہاری نس نس میں سرائیت کر جائے گا۔ اور پھر تمہارے دشمن کے لیے کہیں جائے امان نہیں ہوگی ہر چھوٹے سے چھوٹے مسئلے پر بھی اتنا ہی جوش و خروش چھچھورا پن کی دلیل ہے۔" وہ نبی گل کو سمجھاتے ہوئے کہتا۔ "اپنے میں پہاڑوں کی سی عظمت پیدا کرو جن کی سرسبز و شاداب سطح پر گھومتے ہوئے کوئی انسان اندازہ نہیں کر سکتا۔ کہ ان کے اندر کیسا آتشیں لاوا کھول رہا ہے۔ جو چند لمحوں میں سب کچھ جلا کر خاکستر کر دے گا۔" اور نبی گل ہمیشہ جھنجلا کر اُس کی دلیلوں کے سامنے خاموش ہو جاتا۔

لیکن اُس وقت تو معاملہ ہی اور تھا۔ اور وہ مصری جان کو ہرگز آزردہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے جھجکتے جھجکتے اپنی خواہش والدین کے سامنے پیش کر ہی دی اور انہیں بہت حیرت ہوئی۔ جب حاجی گل نے مسکراتے ہوئے انہیں بخوشی پاراچنار جانے کی اجازت دے دی۔

اور تب اس نے پہلی مرتبہ وہ سرسبز و شاداب وادی دیکھی۔ کوہ سفید کی برفیلی چوٹیاں گھاس کے مخملیں قطعے اور خنک پانی کے چشمے اُسے بے حد پسند آئے۔ لیکن انہیں مجبوراً بہت جلد واپس آنا پڑا۔ حاجی گل اور بستی کے اکثر لوگ ایک عجب ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ دور نیچے وادی میں ان لوگوں کے پھلوں کے باغات تھے۔ جو اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ مگر ولایت سے آئے ہوئے ایک نئے افسر نے حکم دیا تھا کہ یہ زمین زبردستی خرید کر اور باغات کٹوا کر وسیع گراؤنڈ بنوا دی جائے۔ کیونکہ اکثر ڈاکو اور حملہ آور تاریک راتوں میں انہی گھنے درختوں کی آڑ میں چھپ کر افسروں کے بنگلوں پر حملہ کرتے تھے۔ اور گراؤنڈ بن جانے سے کافی حفاظت کا امکان تھا۔ تمام لوگ کئی دفعہ حاجی گل کی سرکردگی میں صاحب کے بنگلے پر گئے اور اُسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ ہمیشہ انھیں ہنس کر ٹال دیتا اور اپنی بات پر اڑا رہتا۔

دو تین دفعہ مصری جان اُس کی ساس اور گاؤں کی باقی عورتیں بھی مل کر بنگلے پر گئیں۔ جہاں ان کی کافی آؤ بھگت ہوئی اور خوبصورت خوش مزاج میم صاحب نے انہیں ہر طرح مدد کا یقین بھی دلایا مگر ضدی صاحب ٹس سے مس نہ ہوا۔ کام تو کوئی نہیں بنا مگر مصری جان کو نوجوان میم صاحب بہت بھا گئیں اُن کی شادی کو بھی چند ہی مہینے ہوئے تھے اور وہ پہلی مرتبہ یورپ سے وہاں آئی تھی۔ اُس کی خوابیدہ آنکھیں مسکراتے ہوئے ہونٹ ہمیشہ اس طرح نظر آتے جیسے وہ کوئی بڑا ہی سہانا سپنا دیکھ رہی ہے۔ مصری جان بڑی دلچسپی سے اُسے بغور دیکھتی رہتی۔

اور پھر جس دن باغات کاٹے جانے تھے۔ حاجی گل بہت سے آدمیوں کے ساتھ صبح ہی صبح پھاٹک پر راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ صاحب کے آدمیوں نے انہیں بہت سمجھایا کہ وہ سرکاری کام میں مداخلت نہ کریں۔ مگر وہ اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ آخر میں صاحب ایک تنومند گھوڑے پر بیٹھا ہوا باہر نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو گھوڑ سوار رائفلیں تانے چلے آ رہے تھے۔ اگرچہ عام طور پر لوگوں کی رائے صاحب کے متعلق کافی اچھی تھی اور وہ اُسے ایک نرم دل خوش مزاج افسر سمجھتے تھے۔ مگر نہ جانے اس دن اُسے کیا ہوا۔ شاید وہ زیادہ پی گیا تھا اور نشے میں بہت برافروختہ نظر آتا تھا۔ ابھی حاجی گل نے ایک دم آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ تھام کے کچھ کہنے کی کوشش کی ہی تھی کہ صاحب کی خشمگیں نظروں کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی اوپر اٹھا۔ ایک لہراتا ہوا چابک حاجی گل کی سرخ و سفید گردن پر ایک موٹا سا لال نشان بناتا ہوا دوسری بار گھوڑے کے منہ پر پڑا۔ اور تینوں گھوڑے بجلی کی طرح کوندتے

ہوئے سامنے کے باغات میں اوجھل ہو گئے۔ تمام ہجوم ششدر رہ گیا۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکیں اور کئی شعلہ بار سوالیہ نظریں حاجی گل پر جم کے رہ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا حاجی گل کے ایک اشارے پر وہ مشتعل ہجوم تمام وادی کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ مگر حاجی گل نے لوگوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ ساکت و صامت دور اٹھتی ہوئی دھول کو اس طرح ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی روح اس چابک سے لپٹی اڑتی چلی جا رہی ہو اور وہ انسان نہیں پتھر کا کوئی بیجان مجسمہ ہے جس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے قطعاً عاری ہے۔

کافی دیر کی بھیانک خاموشی کے بعد وہ آہستہ آہستہ دو ٹیلوں کی طرف گھومتی مڑتی پگڈنڈی پر چل پڑا اور گھر آ کر وہ چپ چاپ اسی طرح روزمرہ کے کاموں میں کھو گیا جیسے کوئی خلافِ معمول بات اُسے پیش ہی نہ آئی تھی۔ بستی کے لوگ حیران رہ گئے۔ انہیں حاجی گل سے اس بے غیرتی کی ہرگز توقع نہیں نہیں تھی۔ نہ جانے اس کا آفریدی خون کیوں جم کر رہ گیا تھا۔ لوگ چھپ چھپ کر چہ میگوئیاں کرتے۔ رائے زنی ہوتی اور جوں جوں دن گذرتے گئے حاجی گل کی وقعت لوگوں کی نظروں میں کم ہوتی گئی۔ نبی گل ان طنز بھری سوالیہ نظروں کے جواب میں سٹپٹا کر رہ جاتا مگر حاجی گل کے سامنے کچھ نہ کہتا۔ کھلم کھلا کسی کو کچھ کہنا بستی کے اصولوں کے خلاف تھا۔ وہاں نظروں کی زبان زیادہ اچھی طرح سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ اور حاجی گل جیسا جہاندیدہ انسان سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی خاموش رہتا۔ یہ امر ضرور باعثِ حیرت تھا۔ اس کی گردن کا سرخ نشان اب سیاہی مائل نیلا ہو گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی زہریلا سانپ اس کی سفید گردن کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ نبی گل کو یہ سب کچھ دیکھ کر سخت دکھ ہوتا مگر اُسے یقین تھا کہ یہ ہولناک سناٹا کسی عظیم طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ حاجی گل کی عقابی نظر بھیانک تیرگی میں بھی ٹیلے کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے دور سے اپنے دشمن کو تاڑ جاتی ہے اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ دن گذرتے رہے اور اس کی گردن کا نیلا سانپ کب سے غائب ہو کر شاید اُس کی نس نس میں سرائیت کر گیا تھا کہ اب کہیں ڈھونڈنے سے بھی اس کا نشان نہ ملتا۔ اور رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں سے پہلے حاجی گل کی وقعت اور پھر اس واقعے کی اہمیت بھی غائب ہو گئی۔ رُتیں بدلیں۔ باغات کی جگہ وسیع میدان نے اور گرمیوں کی جگہ کڑکڑاتے جاڑے نے لے لی۔

کرسمس نزدیک تھا اور صاحب لوگ دھڑا دھڑ چھٹیوں میں بڑے شہروں کی طرف بھاگ رہے تھے تاکہ وہاں کے کلبوں اور ڈانسنگ ہالوں میں بہترین طریقے پر وقت گذارا جا سکے۔ وہاں سے صاحب دس دن کی چھٹی پر جا رہا تھا۔ جانے سے ایک رات پیشتر باہر سنسان لان میں ٹہلتے ہوئے وہ بہت سے مشکل مسائل کے متعلق سوچ بچار میں محو تھا۔ یہاں کا نظم و نسق درست رکھنے کے علاوہ ذاتی معاملات کی پریشانیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس چھٹی کے دوران میں اکثر سینئر افسروں سے بھی پالا پڑے گا۔ ترقی آرام سے گھر بیٹھے بٹھلائے تھوڑی مل جاتی ہے؟ ٹہلتے ہوئے خیالات یکجا کرنے کی خاطر اُس نے سگریٹ سلگایا اور ابھی لائیٹر بجھا کر جیب تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی اُس کی کنپٹی کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ اور چاروں طرف مکمل تاریکی کا دور دورہ تھا۔ یک لخت ایک حشر برپا ہو گیا۔ تیز روشنیاں۔ سنسناتے گھوڑے اور بھاگتی گاڑیاں چاروں طرف دوڑ پڑیں لیکن دُور دُور تک بھیانک تاریکی اور دم بخود درختوں کے سوا کسی کا نام و نشان نظر نہ آیا۔

صبح ایک ماتمی جلوس ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو رہا تھا جہاں ایک سیاہ عفریت اپنے بھیانک پر پھیلائے صاحب بہادر کو یورپ لے جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ خبر پھیل جانے پر ارد گرد کے علاقے کے لوگ جوق در جوق وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب کے چہرے پر ملال تھے۔ مصری جان نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہوئے جب ایک گاڑی میں بے ہوش میم صاحب کو جاتے دیکھا اور اُسے خیال آیا کہ یہ خوابیدہ آنکھیں اور بھنچے ہوئے ہونٹ اب کبھی کوئی سہانا سپنا دیکھ کر مسکرا نہ سکیں گے۔ تو نہ جانے اُسے کیا ہوا وہ ٹیلے پر کھڑی کھڑی چلا چلا کے رونے اور قاتل کو کوسنے لگ گئی مگر دوسرے ہی لمحے نبی گل کا بھرپور ہاتھ اُس کی کلائی پر پڑا اور وہ اُسے کھینچتا ہوا چشموں کی طرف بڑھنے لگا۔ مصری جان کو اپنی کلائی نبی گل کی آہنی گرفت میں ٹوٹتی ہوئی محسوس

ہو رہی تھی۔ خدا کے لیے میرا ہاتھ چھوڑ دے۔ وہ نبی گل کے رویے پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"بیوقوف ـــــ بابا کی شان میں گستاخی کرتی ہے" نبی گل دانت بھینچ کر آہستہ سے غرّایا۔ مصری جان کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے اُس کا منہ دیکھنے لگی۔ اور پھر یکایک اُسے ہوش آ گیا۔ اور وہ آنسو پونچھ کر خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ گھر کے سامنے حاجی گل بدستور اُسی سکون۔ فراغت اور دلجمعی کے ساتھ اپنی برق رفتار گھوڑی کی مالش کر رہا تھا۔ جیسے اس کا ذہن کبھی کسی پریشانی سے دوچار ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے اس کے باغات کبھی نہیں کٹے تھے۔ بستی کے لوگوں کے سامنے کبھی کسی نے رعونت اور نشے میں اس کی گردن کے گرد چابک سے لال حلقہ نہیں بنایا تھا۔ اور جیسے آج رات صاحب بہادر کو کسی نامعلوم انسان نے گولی مار کر ہرگز ہلاک نہیں کیا تھا۔ روزمرہ کے کاموں میں ایسی چھوٹی باتوں سے کونسا رخنہ پڑ جاتا ہے۔ کام تو چلتے ہی رہتے ہیں اور اس وقت بھی اس کی پوری توجہ کام پر تھی۔ اُس نے آنکھ اٹھا کر بھی نبی گل اور مصری جان کی طرف نہیں دیکھا۔ البتہ نبی گل ٹھٹک کر اُسے شک بھری بےیقینی اور قدرے فخر کے ساتھ دیکھتا ہوا اندر چلا گیا اور نبی گل ہی نہیں ساری بستی کے تمام لوگ اُس کی کھوئی ہوئی وقعت کو نظروں میں بٹھائے چپ چاپ اُس کے پاس سے گذرتے رہے اور کسی کو بھی اُسے مخاطب کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ مگر نبی گل کے لیے اپنی جوشیلی طبیعت کے باعث قطعاً خاموش رہنا سخت مشکل تھا۔ "سخت گیر اور جابر حاکم کا انجام عموماً اسی طرح ہوتا ہے"۔ شام کی نماز کے بعد نبی گل باپ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ حاجی گل نے ایک تیز کاٹتی ہوئی نگاہ بیٹے پر ڈالی اور فوراً دھیرے سے بولا "یوں مت کہو۔ صاحب بُرا آدمی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی اسی طرح تھی۔ جانے والے کے حق میں دعائے مغفرت چاہیئے۔ اور حاجی گل نے وہیں مصلے پر بیٹھے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ نبی گل کے ہاتھ بھی خود بخود ایک برقی قوت کے باعث فوراً اوپر اٹھ گئے مگر اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا اور وہ یوں آنکھیں پھاڑے حاجی گل کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کا باپ نہیں کوئی اجنبی انسان ہے جسے اُس نے آج ہی پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔

اور تب رات کو نبی گل نے مصری جان کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ آئندہ کبھی میم صاحب کے متعلق نہ سوچے اور نہ ہی بات کرے۔ مگر سوچ پر تو قابو نہیں ہوتا اور مصری جان بھی کئی برس تک بلکہ اس کے چار بیٹے بھی ہو چکے تھے کبھی کبھی میم صاحب کے متعلق سوچا کرتی اگر کوئی سنسناتی ہوئی گولی تاریک فضاؤں کو چیرتی ہوئی ایک اُمنگوں بھرے سینے کو ٹھنڈا نہ کر دیتی تو آج میم صاحب کے بھی اسی طرح چھوٹے چھوٹے خوبصورت بچے ہوتے۔ لیکن کیا معلوم ہے ان آزاد قوموں کی عورتوں کا کیا اعتبار۔ وہ نبی گل کے خوف سے زبردستی اپنا خیال دوسری طرف موڑ دیتی۔ اس کے چاروں بچے بہت خوبصورت تھے۔ اور سرخ چہرے پر آتش پر جلد ... یا ہر بچے نے اپنی جھلک دکھا کر بچے کی خوش قسمتی پر مہر بھی لگا دی تھی مگر اپنی بہو کی ماہ گلے کو دیکھ کر اُسے اکثر حیرت ہوتی اس کی تمام شکل و صورت میم صاحب پر تھی۔ شاید اس کی بار اُسے اس واقعے کا تصور زیادہ رہا تھا۔ کم از کم نبی گل کا تو یہی خیال تھا۔

ماہ گلے تینوں بھائیوں سے چھوٹی اور ان دونوں کو بےحد عزیز تھی۔ اور بچوں کے جوان ہونے پر خانہ داری کا بوجھ اور مصروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اب ایسی نکمی باتوں کے لیے سوچ کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ اس کے دونوں بڑے لڑکوں کی منگنی کب کی ہو چکی تھی مگر دونوں خاندانوں کی عورتوں کے خانگی تنازعات کے باعث شادیاں طے ہونے میں ہی نہیں آتی تھیں۔ روز بروز لڑکوں اور لڑکیوں کی بڑھتی ہوئی عمروں کے خوف سے مصری جان کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ گھر کے کام کاج تو ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے۔ مصری جان شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکے میں امام باڑہ کی پُرسکون فضا میں اس مشکل کے حل کے لیے دعا مانگنے چل پڑی۔ سردی زوروں پر تھی۔ جاڑوں میں سورج بھی تو سرِشام ہی غفلت پھیلا

کے پیچھے جا چھپتا تھا۔ امام باڑہ آبادی سے ذرا ہٹ کر ٹیلوں کے پیچھے واقع تھا۔ اور مصری جان اب بچوں کے شور، روشن گھروں اور بل کھاتے ہوئے دھوؤں سے کافی آگے نکل آئی تھی۔ کچی کشادہ سڑک پر چھوٹے چھوٹے سنگریزے بچھا کر بڑا خوبصورت راستہ تیار کیا گیا تھا۔ مصری جان آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اچانک ٹھٹکی۔ ایک لال رنگ کے بھربھرے سے ٹیلے کے پیچھے سے سرگوشیوں کی آواز آ رہی تھی۔ مصری جان ایک عجب تجسس کے عالم میں جوانی کی سی چُستی اور ہوشیاری کے ساتھ دبکتی ہوئی آگے بڑھی لیکن یک لخت اُس نے چکرا کر اپنا سر ٹیلے کے ٹھنڈے سینے پر ٹیک دیا۔ جیسے حاجی گل کی مثالی گولی اس کی کنپٹی کو چیرتی ہوئی گذر گئی ہو۔ ٹیلے کے پیچھے ماہ گلے ایک جوان لڑکے کے پہلو میں بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ مصری جان نے پتھرائی ہوئی نظروں سے یہ منظر دیکھا۔ وہ شیر بادشاہ کا لڑکا مظہر بادشاہ تھا۔ شیر بادشاہ ہ پار کے گاؤں کا ایک باحیثیت انسان جو لاتعداد جھگڑوں میں نبی گل کا مدِمقابل رہ چکا تھا۔ جس کے ذکر سے ہی نبی گل کا چہرہ متغیّر ہو جاتا۔ گو اُس کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار خوب چل نکلا تھا۔ اور اب مختلف بستیوں میں اس کے کئی تانگے بھی چلتے تھے مگر عام لوگوں کا خیال تھا کہ وہ پختون نہیں بلکہ کشمیری ہے اور اس کے آباؤاجداد کہیں باہر سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ مظہر بادشاہ سے رشتہ کر سکنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔ اور مصری جان بخوبی جانتی تھی کہ حاجی گل کا نشانہ اور نبی گل کا غصہ کبھی رائیگاں نہیں گئے۔ ماہ گل کے انجام کے خیال نے اُسے کپکپا دیا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے مگر وہ ان کے انتہائی نزدیک ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ سن رہی تھی۔ الفاظ اُس کے کانوں سے ٹکرا کر ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتے رہے۔ اور وہ بے حس و حرکت کھڑی انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ جیسے اُس کی تمام زندگی سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی ہو۔ اور پھر ماہ گلے کے اُٹھنے سے پیشتر وہ بعجلت گھر واپس پہنچ گئی۔

تمام رات کے کرب و خلفشار کے بعد صبح کی نماز پڑھ کے اس کی طبیعت کو سکون حاصل ہو گیا۔ اور اس نے نبی گل کو چائے کا پیالہ پکڑاتے ہوئے کہا کہ رات اُس نے اُلجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کے لیے امام باڑہ میں جا کر دعا مانگی تھی۔ تو اُس کو اشارہ ہوا ہے کہ پہلے لڑکی کی شادی کر دو تو تمام معاملات خود بخود سدھر جائیں گے۔ نبی گل چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا "ماہ گلے کے ابھی ہنسنے کھیلنے کے دن تھے ورنہ لڑکے والے تو روزانہ اصرار کرتے ہیں۔ رہے گی بھی ہمارے قریب ہی اور لڑکے کا کاروبار بھی خدا کے فضل سے بہت اچھا ہے"۔

"کون ہے وہ؟" مصری جان نے اشتیاق سے پوچھا۔

"افراہیم خان کا لڑکا فتح خان"

مصری جان نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ کسی زمانے میں افراہیم خان کی نبی گل کے ساتھ ہی پارا چنار میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ مگر اس کے بعد کسی انگریز افسر کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے چھاؤنی میں چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لینے شروع کر دیئے۔ جس سے بہت نفع ہوا۔ اور اب اس کے جوان خوبصورت لڑکے کی شہر میں ایک خاصی بڑی دکان تھی۔ دونوں گھرانوں کے تعلقات ابھی تک آپس میں بہت اچھے تھے۔ مصری جان اور نبی گل نے تو لڑکی کی پیدائش کے دوسرے دن سے ہی اُس کے جہیز کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس لیے انتظار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اور پھر اُس دن ماہ گل کی منگنی تھی۔ شادی جاڑے نکلنے پر قرار پائی تھی چونکہ اچانک چند ہی روز میں سب کچھ طے پا گیا تھا۔ ماہ گل نے رو رو کر آنکھیں سُجا لی تھیں۔ نبی گل جھکی جھکی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھ کر بڑے سوالیہ انداز میں مصری جان پر نگاہیں گاڑ دیتا۔ اور وہ گھبرا کر ہنس پڑتی۔

"تو کیا ہوا سبھی لڑکیاں روتی ہیں۔ میں بھی تو روئی تھی" مصری جان شرما جاتی اور پھر تم خود ہی تو کہتے تھے ابھی اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں"

اور نبی گل تب ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتا۔

مہمان عورتوں کے شور میں مصری جان نے کئی مرتبہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لیے ماہ گلے کی عدم موجودگی کو محسوس کر کے قدرے سوچا بھی اور اُسے غصہ بھی آیا۔ مگر شام کو جب ڈومنی کی تیز آواز کے ساتھ سسرال سے آئی ہوئی عورتوں کے رقص میں سب ماہ گلے سرخ گوٹے والے ڈوپٹے میں اپنی سوجی ہوئی آنکھیں چھپائے خاموش بیٹھی رہی تو اُسے اس پر بے اختیار پیار اور ترس آ گیا۔

اس دن مطلع سخت طوفانی تھا۔ اور مہمان سرِ شام رخصت ہو گئے تھے۔ جھکے ہوئے بادلوں کے نیچے تیز سرد ہوا ٹیلوں پر دوڑتی پھر رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب تھکی ہوئی مصری جان ایک ہولناک چیخ سے یک دم بیدار ہو گئی تھی۔ باہر گرتی ہوئی بوندوں میں گیدڑ شور مچا رہے تھے۔ وہ چند سیکنڈ تک تو کچھ نہ سمجھ سکی۔ مگر دوسرے ہی لمحے ماہ گل کا خالی بستر دیکھ کر وہ بے تحاشا دالان کی طرف بھاگی مگر وہاں اُس نے جو ہیبت ناک منظر دیکھا وہ مرتے دم تک نہیں بھول سکتی تھی چاہے نبی گل اُسے بھول جانے کی کتنی ہی تاکید کرے۔ ماہ گلے فرش پر چت پڑی تھی اور ایک عظیم سیاہ ناگ پھن اُٹھائے اس کے سرہانے جھوم رہا تھا۔ اور پھر پلک جھپکنے میں وہ ایک ہلکی سی پھنکار کے ساتھ پچھلی تاریک کوٹھڑی میں اوجھل ہو گیا۔ مصری جان چیخیں مارتی ہوئی بیٹی سے لپٹ گئی۔ چند لمحوں میں ہی ماہ گلے کا رنگ سیاہی مائل نیلا ہو گیا اور منہ سے جھاگ کے مرغولے نکلنے لگے اور پھر اُس کے دیکھتے دیکھتے وہ سدا سپنے دیکھنے والی مسکراتی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

"بخت آور ۔۔۔ بختاور! تجھ پر خدا کی مار۔ تو نے یہ کیا غضب کر دیا ۔۔۔"

مصری جان کی چیخیں بند دروازوں کو توڑتی ہوئی سارے صحن میں پھیل گئیں۔ سب سے پہلے نبی گل وہاں پہنچا۔ اور جو چیز مصری جان نے نہیں دیکھی تھی۔ وہ اُس کی عقابی نظروں سے نہ چھپ سکی۔ ماہ گلے کے پاس اس کے نئے ریشمی برقعہ کے قریب ہی ایک آدھ کھلی گٹھڑی پڑی تھی جس میں اُس کے جہیز کے کپڑوں کے علاوہ ایک نئے شنیدی رومال میں لپٹی ہوئی شبیر بادشاہ کے لڑکے مظہر بادشاہ کی تصویر اور ایک زرکار چپل بھی بندھی تھی جو نبی گل ابھی پرسوں ہی ماہ گلے کے جہیز کے لیے ہمیش گل کی دکان سے اکیس روپے نو آنے میں خرید کر لایا تھا۔ اس کے دماغ نے جھٹکا سا کھایا اور اُس نے برسوں بعد کے لہجہ میں غرّاتے ہوئے مصری جان کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"بدنصیب ۔۔۔ بختاور کی شان میں گستاخی کرتی ہے۔"

اور پھر لوگوں کے آنے سے پہلے وہ گٹھڑی اور برقعہ سینے سے لگائے بھاگتا ہوا پچھلی کوٹھڑی میں اوجھل ہو گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد عورتوں کی آہ و بکا اور لوگوں کے ہجوم سے گھبرا کر وہ باہر نکل کر ٹہلنے لگا۔ اچانک اُس کے قدم رُک گئے۔ دور ٹیلوں کے پیچھے ایک تیز رفتار تانگے کے رکنے اور پھر چند سیٹیوں کی گونج سنائی دی۔ بختاور کا نیلا زہر چند لمحوں کے لیے اُس کی آنکھوں میں چمکا اور پھر ماتم پرسی کے لیے آئے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر اُس نے چپ چاپ سر جھکا لیا۔ باقی تمام رات عورتوں کے بین اور شور کے ساتھ ساتھ تیز سرد ہوائیں ٹیلوں کے ٹھنڈے سینوں پر ہونکتی رہیں۔ کہیں دور برستے بادلوں تلے گیدڑوں کے شور کے ساتھ سیٹیوں کی دبی دبی گونج۔ تیز رفتار تانگوں کے بھاگنے اور رکنے کی ہلکی ہلکی صدائیں آتی رہیں اور نبی گل خاموش ٹہل ٹہل کر سوچتا رہا۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ صرف ایک رات میں اس کی کنپٹیوں کے بال نئی نئی کھلی ہوئی ادن کی طرح سفید ہو گئے ہیں۔

"اولاد کا غم کس قدر ظالم ہوتا ہے" عورتیں ٹھنڈی سانس بھر کر زیرِ لب کہتیں۔

مگر جب کوئی اُسے تسلّی دینے کی کوشش کرتا تو وہ دھیمے لہجے میں بڑبڑاتا۔ یوں نہ کہو۔ بختاور کا کوئی قصور نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی اسی طرح تھی۔ جانے والے کے حق میں دعائے مغفرت کرنی چاہیئے اور پھر بڑے سکون اور عاجزی سے دونوں ہاتھ اٹھا دیتا۔ لوگ حیران رہ جاتے

اور مصری جان کو ایسا معلوم ہوتا وہ نبی گل نہیں بلکہ حاجی گل بول رہا ہے۔

تیسرے دن سب کاموں سے نپٹ کر نبی گل نے مصری جان کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ آئندہ کبھی نہ ماہ گلے کا نام لے اور نہ کبھی اس کے متعلق سوچے۔ کسی بزرگ کے خلاف سوچنا گناہِ عظیم ہے۔ اور پھر مصری جان نے کبھی ماہ گلے کا نام نبی گل کے سامنے نہیں لیا۔ مگر سوچوں اور یادوں پر تو بس نہیں۔ وہ تو چاروں طرف سے پوشیدہ سرنگوں کے راستے دماغ میں درآتی چلی آتی ہیں۔

حتیٰ کہ فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور انسان بے دست و پا رہ جاتا ہے۔

مصری جان نے پھر سے چونک کر ٹھنڈے پانی کا گھڑا اٹھایا اور سرکنڈوں کے پیچھے گھر جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑی۔ سالہاسال گزر رہے جب وہ منڈد سے چل کر سرنائی، ڈھول اور ٹپاخوں کے ساتھ ایک الھڑ خوبصورت لڑکی کی صورت میں اس گاؤں میں داخل ہوئی تھی۔ اس طرح کی لاتعداد گرمیاں اور ان گنت جاڑے۔ تپتی راہوں اور سرسبز و شاداب پگڈنڈیوں پر چلنے ختم ہو جاتے تھے۔ اور خوشبوؤں اور غموں کی اس طویل مدت میں جبکہ اُس کے سرخ و سپید گال جلے ہوئے ٹیلوں کی مانند سیاہ ہو گئے ہیں اور اس کے لمبے سیاہ بالوں پر کوہِ سفید کی مستقل برف جم کے رہ گئی ہے۔ وہ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ حاجی گل اور بختاور نے صحیح کہا تھا یا غلط ——

"انسان اس کائنات کا شاہکار ہے

مگر کائنات میں سب سے زیادہ دکھی ہے"

(سوفوکلیز)

اقبال متین

شکن در شکن

"میں کیا کرتا بھلا ۔ ؟

"میں نے قرآن سر پر اٹھا کر قسم کھائی کہ وہ بچہ میرا نہیں ہے ۔"

اتنا کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گیا ـــــــ

آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے لیکن آنسو کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے ۔

مجھے واصف سے ہمدردی تھی ۔ وہ اتنا بامروت اور اس قدر نرم آدمی تھا کہ اس پر لگائے ہوئے اتہام کو وہ اپنے سر بھی لے سکتا تھا۔ میں نے ایسا آدمی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ خنجر لے کر اس کے سینے پر سوار ہو جائیے وہ آپ کی کلائی مروڑ کر خنجر آپ سے چھین لینے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا ـــ آپ سے التجا کرے گا کہ بھئی مجھے چھوڑ دو ـــــ چھینا جھپٹی میں کہیں تمہارا ہاتھ زخمی نہ ہو جائے ۔

وہ رندھے ہوئے گلے سے کہنے لگا۔ "کیا تمہیں بھی میری بات کا یقین نہیں ہے ۔" ؟

میں نے اس کو تسلی دی ـــ "یار مجھے تمہاری بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا خود تمہاری بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہے ـــ لیکن "ـــ

"کہو بھی جلدی بھئی ـــ یہ لیکن کیا ہے ؟"

"لیکن ـــــ یہی کہ مجھے تمہاری یہ بزدلی پسند نہیں ہے ۔"

وہ بچوں کی طرح رونے لگا ـــــ

"تم اسے بزدلی کہتے ہو۔ جھوٹ سے انکار بزدلی ہے ؟"

"میں نے کب کہا ـــــ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے ۔ لیکن تم جس انداز سے انکار کرتے ہو وہ انداز ہی سچائی کا سب سے بڑا دشمن ہے ۔ تمہیں اس طرح اپنے آنسو ضائع کرنا چاہئیں ـــ اس سے سچائی مر جاتی ہے اور جھوٹ نئی طاقتوں کے ساتھ زندہ ہوتا ہے ۔ تم سچ کو زندہ رکھنے کی خاطر جھوٹ کے منہ پر تھوک کر گزر کیوں نہیں جاتے ۔ جرأت کی یہ کمی، ہمت کا یہ فقدان آدمی کو محرومیوں کے اُن ڈھکے چھپے گوشوں میں چھوڑ آتا ہے جہاں سے نکل آنے کا پھر راستہ نہیں ملتا "ـــ

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے "؟

"تمہیں یہی کرنا چاہئے کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا چاہئے ۔"

"پھر "

"تم بہ بانگِ دہل کہہ دو کہ یہ اتنا مجرا نہ جھوٹ ہے کہ اس سے میرا کوئی علاقہ ہو ہی نہیں سکتا ۔ اور بڑے اعتماد سے اس دنیا کو نظر انداز

کرکے قدم آگے بڑھاؤ جو تمہارے پیچھے چیخ رہی ہے ۔ تم پر کیچڑ اچھال رہی ہے ۔ تم جب اُسے خاطر ہی میں نہیں لاؤگے تو جھوٹ اپنی موت آپ مرجائے گا ۔"

وہ سگریٹ جلاکر کچھ اس طرح نیچی نیچی نظروں سے اپنے ابھرے ہوئے سینے کو دیکھنے لگا جیسے رازوں کے اس خزانے سے سب سے قیمتی راز چن لینا چاہتا ہے جو اسے بے گناہ ثابت کرسکے ۔

میں نے اسے پھر چھیڑا ۔۔۔ "باچھوں میں دبا ہوا سگریٹ ایک خفیفت سے تو اس کا دھواں تمہاری آنکھوں کو معاف نہیں کرے گا ۔۔۔ اس طرح گردن جھکائے کیا سوچ رہے ہو" ؟

اشکوں کی جگہ سگریٹ کے دھوئیں نے اب اس کی آنکھوں کو پانی سے چھلکا رکھا تھا ۔ لمبا سا کش لے کر وہ کہنے لگا ۔

"یار دنیا عجیب ہے ۔"

"اہمیت دو تو سب کچھ ہے ، نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔"

"نہیں یار تم نہیں جانتے ۔۔۔ اب دیکھو نا ۔"

وہ کہتا کہتا رُک گیا ۔۔۔ چاروں طرف نظریں گھماکر اس طرح دیکھا جیسے میرے سوا اور بھی کوئی چھپ کر سن رہا ہو ۔

"کوئی نہیں ہے ۔ کہہ بھی چکو اب ۔" میں نے ہمت بندھائی ۔

"وہ بچہ اسی مرشد کا ہے جس کے ہم دونوں ۔"

"تم دونوں جس کے مرید ہو ۔" میں نے جملہ بے چینی سے پورا کردیا ۔

"ہاں" ۔۔۔

"تمہیں یقین ہے" ! ۔۔۔

"اتنا ہی جتنا یہاں تمہارے اور میرے وجود کا اس وقت یقین ہوسکتا ہے ۔"

"پھر تم نے صاف صاف سب کے منہ پر کہہ کیوں نہیں دیا" ؟

"کیسے کہہ دوں یار" ۔۔۔ ؟

"ایسے ہی جیسے اب مجھ سے کہا ہے ۔"

"تمہاری بات اور ہے ۔"

"یہ سب بکواس ہے ۔" میں برہم ہوگیا "تم میں اتنی جرأت ہی نہیں ہے کہ تم روشنی کو روشنی کہہ سکو اور اندھیرے کو اندھیرا ۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم کچھ ہی دن پہلے اپنے اس مرشد میں جلوہ ہی جلوہ دیکھتے رہے ہو ۔۔۔ نور ہی نور" ۔۔۔

"ایسا نہیں ہے ۔"

"ایسا ہی ہے ۔۔۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ تمھیں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم جب اپنے مرشد کے سامنے بیٹھتے ہو تو ایسا محسوس کرتے ہو جیسے کسی طاقت نے ، کسی عظیم سچائی نے ، کسی روشنی نے ۔۔۔ تمھیں اپنے احاطے میں محصور اور محفوظ کرلیا ہے ۔"

"اور تم اس بات کی ہنسی اڑاتے رہے ہو"

"اور تم آج ہنسی اڑانے کی طاقت سے بھی محروم ہو گئے ہو۔" ۔۔۔ میں نے پھر وار کیا۔
"لیکن وہ مجھ سے محبت کرتی ہے!"
"تم آج بھی یہی سمجھتے ہو!"
"آج بھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں یہی سمجھوں۔"
"تم پاگل ہو گئے ہو، تم جیسے آدمی کے پیچھے اپنی توانائیاں صرف کرتا بجائے خود بیوقوفی ہے۔"
وہ کچھ دیر در و دیوار کو تکتا رہا۔ ایسی نظروں سے جیسے در و دیوار اس کو تک رہے ہوں اور وہ خائف خائف سا انھیں بس دیکھ رہا ہو۔ دیکھے جا رہا ہو۔

"جب جنون کا یہ عالم ہے تو جھوٹ موٹ ہی کہہ دو کہ بچہ میرا ہے۔ نہ تمہاری محبوبہ کی رسوائی ہوگی۔ نہ ہی تمہارے مرشد کی عظمت میں کوئی فرق پڑے گا۔"

لیکن اس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔
"اچھا اب چلتے ہیں۔" وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔
میں نے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔
چلتے ہوئے کہنے لگا ۔۔۔ "کچھ روپئے مجھے قرض دے سکتے ہو؟"
اس نے اپنی دوستی کی اتنی طویل مدت میں پہلی بار مجھ سے قرض مانگا تھا ۔۔۔ میرا عالم یہ تھا جیسے میں کہیں کا نہیں رہا ہوں۔ جیسے زمانے بھر نے اپنے پیروں تلے مجھے روند کر پھینک دیا ہے۔ میری جیب اس طرح خالی تھی جیسے اس کے قرض مانگنے پر میرا دماغ خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ میں نظریں نیچی کئے چپ چاپ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔
"میں ضرور لوٹا دوں گا یار۔"
میرے پس و پیش پر اس نے مجھے غلط سمجھا۔
میں نے چپکے سے اپنی سونے کی جڑاؤ انگوٹھی اتار کر اس کی انگلی میں پہنا دی جو چھ آٹھ ماہ قبل میری ہونے والی دلہن کے والدین نے میری "منگنی" طے ہونے پر مجھے تحفے میں دی تھی۔
"یہ کیا کرتے ہو؟"
"میرے پاس یقین مانو اس وقت کچھ بھی نہیں ۔۔۔ تم اسے کہیں گروی رکھ کر کام نکال لو۔ جیسے آنے پر چھڑا کر مجھے لوٹا دینا۔"
وہ انگوٹھی جیب میں ڈال کر تیزی سے نکل گیا۔ شاید وہ پھر رو رہا تھا۔
وہ جا چکا تو میں دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔
اس سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں اکثر سوئے ہوئے فتنے سر اٹھانے۔ وہ فتنے جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے تھا۔ اس کی اپنی محبتوں سے تھا۔ اس کی اپنی ہنگامہ پرور راہ و رشد بد عشق بازی سے تھا اور ان کی چھوٹی بڑی داستانوں سے تھا۔ ان داستانوں سے جو اس کی نوٹ بک کے صفحات میں اختصار کے طور پر حروف تہجی کی صورت میں محفوظ تھیں۔

ی سے ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء تا ۷ جون ۱۹۴۹ء ——— اب یہ الف۔ الوری بھی ہو سکتی ہے۔ آنسہ بھی یا کوئی اور۔

"ف" سے ۲۲ جون ۱۹۴۹ء تا ۱۲ جنوری ۱۹۵۰ء ——— اس حد تک مجھے معلوم تھا کہ یہ کوئی تہنیت تھی۔ جو واصف کے بیٹے آٹو ڈبن پی لینے کی کوشش میں پکڑی گئی تھی۔ اور بعد میں کسی ضلع میں کسی بیڑی کے بیوپاری سے بیاہی گئی۔

"ج" سے ۷ مارچ ۱۹۵۰ء تا ۱۱ مارچ ۱۹۵۱ء ——— یہ بھی مجھے یاد ہے۔ یہ جمیلہ تھی۔ یو پی کے کسی ضلع سے کچھ دن کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد آئی ہوئی تھی اس لیے کہ یہاں اس کے شوہر کے کچھ رشتہ دار تھے۔ جب اس کے شوہر کو کچھ شبہ ہوا تو خود جمیلہ نے واصف کے خلاف اس کے کان بھرے۔ پھر ایک رات کو جمیلہ کے شوہر نے واصف کا گریبان پکڑ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واصف کا کمرہ آٹھ دس دن تک مقفل رہا ——— اس کے ملنے جلنے والوں میں یہ بات مشہور کی گئی کہ وہ اپنے گھر گیا ہے — لیکن میں ہاسپٹل میں اس سے ملتا رہا۔

یہ عشق و محبت کی داستانیں الف سے لے کر والسلام تک اس کی نوٹ بک میں بکھری پڑی تھیں۔ جو آج اس کے چلے جانے کے بعد مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ بچہ واصف کا نہیں ہے۔ بچہ واصف کا ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے ان چلاتی ہوئی داستانوں کی چیخ پکار کو غلط سمجھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ واصف کی پیاس، واصف کی تشنگی پہلے پہل اس کی محرومی بنی اور پھر اس کا مقدر بن گئی —

اس نے چھوٹے بڑے کئی عشق کیے۔ اتنے شدید عشق بھی کیے کہ اس کا پاگل ہو جانا یقینی تھا لیکن وہ کبھی پاگل نہیں ہوا۔ نہایت احتیاط سے محرومیوں اور کامرانیوں کے درمیان لٹکتا رہ گیا ——— انجام کو جانے بغیر اس نے ہر محبت کی ناکامی پہ دوسری محبت کی بنیاد رکھ دی۔

"س" سے اس نے سب سے "بے اندازہ" بے پناہ اور طویل المیعاد محبت کی۔ اس محبت میں شاید وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ لیکن اس محبت اور فتح نے اس کی رگ رگ میں زہر کے وہ نشتر توڑ کر رکھ دیئے جن کی کھٹک اور کسک اس کی زندگی کا حاصل ہو کر رہ گئی۔ س کا نام غالباً سرو جہاں تھا جس نے واصف کو مرد کی طرح عورت کے قریب آنے کا حوصلہ دیا۔ پندار عطا کیا۔ لیکن اس کے بدلے اس نے گھر بھر کی دولت سمیٹ لی۔ اس نام نہاد عشق کے ہاتھوں واصف جیل جاتے جاتے بچا۔ اس نے ایک جوہری کو دھوکا دے کر زیور حاصل کئے اور جب قانون نے اس کو اپنے شکنجے میں کس لیا تو اس کی ایک متمول رشتہ دار نے اس کو اس مصیبت سے نجات دلائی۔

مجھے یاد ہے ان دنوں واصف کا عجیب عالم تھا۔ اس کو جیسے سب کچھ حاصل تھا لیکن کچھ بھی حاصل نہ تھا۔ سرو کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کی تکمیل اس کی سب سے بڑی خوشی تھی —اور اس خوشی کے حصول میں اس نے اپنی قریب ترین ہستیوں کو ذہنی اور قلبی اذیت پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اس کو بس ہمیشہ یہی فکر دامنگیر ہوتی کہ سرو کو کوئی ایسی نرالی چیز تحفے میں پیش کی جائے کہ وہ مارے خوشی کے پھولی نہ سمائے۔ اور ان تحفوں کے سہارے اس کی محبت پروان چڑھے۔ اور اس طرح وہ اپنے اس جنسی کاروبار کو محبت کا لفظ دے کر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا۔

ان دنوں وہ جب بھی مجھے ملتا، کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے کوئی ایسی چیز اپنی زندگی سے کھو دی ہے جو سب سے زیادہ اہم تھی لیکن وہ کیا چیز تھی یہ خود واصف کو بھی یاد نہیں رہا تھا —

وہ باتیں کرتا کرتا یکایک اس طرح اٹھ کھڑا ہوتا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ اب اس مقام پہ اس کا ایک منٹ کا قیام بھی اس کی زندگی کی ساری پونجی اس سے چھین لے گا۔

وہ کہتا — یار۔ وہ والہانہ عشق کرتی ہے مجھ سے۔ ایک پل مجھ سے جدا نہیں رہ سکتی۔"

"اور تم آج ہنسی اڑانے کی طاقت سے بھی محروم ہو گئے ہو" ــــ میں نے پھر وار کیا۔

"لیکن وہ مجھ سے محبت کرتی ہے!"

"تم آج بھی یہی سمجھتے ہو!"

"آج بھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں یہی سمجھوں"

"تم پاگل ہو گئے ہو، تم جیسے آدمی کے پیچھے اپنی توانائیاں صرف کرنا بجائے خود بیوقوفی ہے"

وہ کچھ دیر در و دیوار کو تکتا رہا۔ ایسی نظروں سے جیسے در و دیوار اس کو تک رہے ہوں اور وہ خائف خائف سا انھیں بس دیکھ رہا ہو یہ دیکھے جا رہا ہو۔

"جب جنون کا یہ عالم ہے تو جھوٹ موٹ ہی کہہ دو کہ بچہ میرا ہے۔ نہ تمہاری محبوبہ کی رسوائی ہوگی۔ نہ ہی تمہارے مرشد کی عظمت میں کوئی فرق پڑے گا"

لیکن اس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھا اب چلتے ہیں" وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

چلتے ہوئے کہنے لگا ــــ "کچھ روپے مجھے قرض دے سکتے ہو؟"

اس نے اپنی دوستی کی اتنی طویل مدت میں پہلی بار مجھ سے قرض مانگا تھا ــــ میرا عالم یہ تھا جیسے میں کہیں کا نہیں رہا ہوں۔ جیسے زمانے بھر نے اپنے پیروں تلے مجھے روند کر پھینک دیا ہے۔ میری جیب اس طرح خالی تھی جیسے اس کے قرض مانگنے پہ میرا دماغ خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ میں نظریں نیچی کئے چپ چاپ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

"میں ضرور لوٹا دوں گا یار"

میرے پس و پیش پر اس نے مجھے غلط سمجھا۔

میں نے چپکے سے اپنی سونے کی جڑاؤ انگوٹھی اتار کر اس کی انگلی میں پہنا دی جو چھ آٹھ ماہ قبل میری ہونے والی دلہن کے والدین نے میری "منگنی" طے ہونے پر مجھے تحفے میں دی تھی۔

"یہ کیا کرتے ہو"؟

"میرے پاس یقین مانو اس وقت کچھ بھی نہیں ــــ تم اسے کہیں گروی رکھا کر کام نکال لو۔ پیسے آنے پر چھڑا کر مجھے لوٹا دینا"

وہ انگوٹھی جیب میں ڈال کر تیزی سے نکل گیا۔ شاید وہ پھر رو رہا تھا۔

وہ جا چکا تو میں دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

اس سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں اکثر سوئے ہوئے فتنے سر اٹھاتے۔ وہ فتنے جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے تھا۔ اس کی اپنی محبتوں سے تھا۔ اس کی اپنی ہنگامہ پرور اور شدید عشق بازی سے تھا اور ان کی چھوٹی بڑی داستانوں سے تھا۔ ان داستانوں سے جو اس کی نوٹ بک کے صفحات میں اختصار کے طور پر حروفِ تہجی کی صورت میں محفوظ تھیں۔

ا سے ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء تا ۷ جون ۱۹۴۹ء —— اب بہ الف۔ انوری بھی ہو سکتی ہے۔ آنسہ بھی یا کوئی اور۔

"ت" سے ۲۲ جون ۱۹۴۹ء تا ۳۱ جنوری ۱۹۵۰ء —— اس حد تک مجھے معلوم تھا کہ یہ کوئی تہنیت تھی۔ جو واصف کے لیے آئیوڈین پی لینے کی کوشش میں پکڑی گئی تھی۔ اور بعد میں کسی ضلع میں کسی بیڑی کے بیوپاری سے بیاہی گئی۔

"ج" سے ۷ مارچ ۱۹۵۰ء تا ۱۱ مارچ ۱۹۵۱ء —— یہ بھی مجھے یاد ہے۔ یہ جمیلہ تھی۔ یو پی کے کسی ضلع سے کچھ دن کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ حیدر آباد آئی ہوئی تھی اس لیے کہ یہاں اس کے شوہر کے کچھ رشتہ دار تھے۔ جب اس کے شوہر کو کچھ شبہ ہوا تو خود جمیلہ نے واصف کے خلاف اس کے کان بھرے۔ پھر ایک رات کو جمیلہ کے شوہر نے واصف کا گریبان پکڑ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واصف کا کمرہ آٹھ دس دن تک مقفل رہا —— اس کے ملنے جلنے والوں میں یہ بات مشہور کی گئی کہ وہ اپنے گھر گیا ہے —— لیکن میں ہاسپٹل میں اس سے ملتا رہا۔

یہ عشق و محبت کی داستانیں الف سے لے کر والسلام تک اس کی نوٹ بک میں بکھری پڑی تھیں۔ جو آج اس کے چلے جانے کے بعد مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ بچہ واصف کا نہیں ہے۔ بچہ واصف کا ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے ان چلاتی ہوئی داستانوں کی چیخ پکار کو غلط سمجھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ واصف کی پیاس، واصف کی تشنگی، پہلے پہل اس کی محرومی بنی اور پھر اس کا مقدر بن گئی ——

اس نے چھوٹے بڑے کئی عشق کیے۔ اتنے شدید عشق بھی کیے کہ اس کا پاگل ہو جانا یقینی تھا لیکن وہ کبھی پاگل نہیں ہوا۔ نہایت احتیاط سے محرومیوں اور کامرانیوں کے درمیان لٹکتا رہ گیا —— انجام کو جانے بغیر اس نے ہر محبت کی ناکامی پہ دوسری محبت کی بنیاد رکھ دی۔

"س" سے اس نے بے اندازہ، بے پناہ اور طویل المیعاد محبت کی۔ اس محبت میں شاید وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ لیکن اس محبت اور فتح نے اس کی رگ رگ میں زہر کے وہ نشتر توڑ کر رکھ دیئے جن کی کھٹک اور کسک اس کی زندگی کا حاصل ہو کر رہ گئی۔ س کا نام غالباً سرو جہاں تھا جس نے واصف کو مرد کی طرح عورت کے قریب آنے کا حوصلہ دیا۔ پندار عطا کیا۔ لیکن اس کے بدلے اس نے گھر بھر کی دولت سمیٹ لی۔ اس نام نہاد عشق کے ہاتھوں واصف جیل جاتے جاتے بچا۔ اس نے ایک جوہری کو دھوکا دے کر زیور حاصل کیے اور جب قانون نے اس کو اپنے شکنجے میں کس لیا تو اس کی ایک متمول رشتہ دار نے اس کو اس مصیبت سے نجات دلائی۔

مجھے یاد ہے ان دنوں واصف کا عجیب عالم تھا۔ اس کو جیسے سب کچھ حاصل تھا لیکن کچھ بھی حاصل نہ تھا۔ سرور کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کی تکمیل اس کی سب سے بڑی خوشی تھی —— اور اس خوشی کے حصول میں اس نے اپنی قریب ترین ہستیوں کو ذہنی اور قلبی اذیت پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اس کو بس ہمیشہ یہی فکر دامنگیر ہوتی کہ سرور کو کوئی ایسی نرالی چیز تحفے میں پیش کی جائے کہ وہ مارے خوشی کے پھولی نہ سمائے۔ اور ان تحفوں کے سہارے اس کی محبت پروان چڑھے۔ اور اس طرح وہ اپنے اس جنسی کاروبار کو محبت کا لفظ دے کر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا۔

ان دنوں وہ جب بھی مجھے ملتا، کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے کوئی ایسی چیز اپنی زندگی سے کھو دی ہے جو سب سے زیادہ اہم تھی لیکن وہ کیا چیز تھی یہ خود واصف کو بھی یاد نہیں رہا تھا ——

وہ باتیں کرتا کرتا یکایک اس طرح اٹھ کھڑا ہوتا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ اب اس مقام پہ اس کا ایک منٹ کا قیام بھی اس کی زندگی کی ساری پونجی اس سے چھین لے گا۔

وہ کہتا —— یار۔ والہانہ عشق کرتی ہے مجھ سے۔ ایک پل مجھ سے جدا نہیں رہ سکتی۔"

مجھے واصف کی اس دیدہ دلیری پہ ہنسی آجاتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ واصف بڑی صفائی سے جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک ایسا جھوٹ جو ہر جذبے کا قاتل ہو۔ ایک ایسا جھوٹ جس کے ہاتھوں خلوص مرتا ہے تو پھر زندہ نہیں ہونے پاتا ـــــ اور اس کے بعد صرف COMPLEX آدمی کے ساتھ رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں رہتا۔

مجھے معلوم تھا کہ واصف اتنا معصوم آدمی نہیں ہے جو سرور جہاں کے والہانہ عشق اور ہوس کے درمیان خطِ فاصل نہ کھینچ سکے۔ وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن دھوکا دینے اور دھوکا کھانے میں اس کو جو لذت ملتی تھی وہی شاید اس کی دانست میں اس کا سب سے بڑا وصف تھا۔

اس طرح جب اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تو ہارے ہوئے جواری کی طرح آخری داؤ لگا کر مطمئن ہو رہا۔ اس لیے کہ اس کا یہ داؤ چل گیا تھا۔ اور وہ سب کچھ ہار کر بھی اس فتح و نصرت پہ فائز تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے ایک بہت ہی کھانے پینے دوست کو جو ایک اپنے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ سرور کی محبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ سرور جہاں کی ہر خواہش کو اپنے دوست کے ہاتھوں مکمل ہوتا ہوا دیکھے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ واصف نے جو راستے اپنے لیے متعین کئے ہیں وہ اس کو ایسی ایسی اندھیری گھاٹیوں میں لے جا سکتے ہیں۔ جہاں نہ صرف ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا بلکہ خود اپنے وجود اور عدمِ وجود کے احساس ہی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

لیکن وہ ان دنوں مجھ سے نہیں ملا۔ اور نہ ہی میں نے اس سے ملنے کی اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کی۔

ایک رات وہ یکایک آدھمکا۔ بہت مسرور۔ بہت خوش۔

میں نے کچھ نہ جاننے کے انداز میں پوچھا ـــ سے تمہارا عشق کس منزل میں ہے۔

اس نے قہقہہ لگایا ـــ یار کیا آؤٹ آف ڈیٹ آدمی ہو۔

میں نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا ـــ کیا بات ہے، میں نہیں سمجھ سکا۔

"بھئی اس سے الگ ہوئے زمانے بیت گئے۔"

"اور تم ابھی تک زندہ ہو۔"

"ہوں ـــ دیکھو۔ بالکل ہوں تمہارے سامنے ہوں۔"

اس نے میرے طنز کے منہ پہ اس طرح تھوک دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

"آخر کس موڑ پہ رہ گئی بے چاری۔"

"موڑ پہ نہیں منزل تک پہنچا آیا ہوں۔"

"تو گویا اس کی منزل اور تمہاری منزل جدا تھی۔"

"بس یہی سمجھو۔ سمجھتا تو یہی تھا کہ منزل دونوں کی ایک ہی ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا تو میں آگے نکل آیا ہوں۔"

"تو اب کہاں تک جاؤ گے۔"

"بس دیکھتے رہو۔"

"کسی نئی منزل کی تلاش ہے یا صرف چلتے رہنا ہی مقصدِ زندگی ہے؟"

"تلاش نہیں منزل متعین ہے۔ اسی کی جانب نگراں ہوں اور قدم اٹھا رہا ہوں"

میں نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

باتوں کا یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس نے پنج وقتہ نماز شروع کر دی ہے۔ عشق کی ساری نئی پرانی داستانوں کا دفتر پارینہ جلا کر پھینک دیا ہے۔ شہر کے کسی نامی پیرو مرشد کا مرید خاص ہو گیا ہے۔

میں نے اس تبدیلی کا مذاق اڑانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کچھ اس طرح خشوع و خضوع سے اپنے مرشد کا تذکرہ کر رہا تھا کہ اس کے اس اعتماد کو متزلزل کرنا مجھے گوارہ نہ ہوا۔ پھر وہ چلا گیا اور کچھ ہی دن بعد ایک بار مجھ سے راستے میں اس کی مڈھ بھیڑ ہو گئی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ مکہ مسجد سے نماز جمعہ ادا کر کے چلا آ رہا ہے۔

مجھے پتہ نہیں اس کے چہرے پر آج پھر وہ بشاشت کیوں نظر نہ آئی جو کچھ ہی دن قبل میں نے دیکھی تھی۔

کہو صحت تو ٹھیک ہے نا۔

"ہاں" اس نے اس انداز سے کہا جیسے میرا سوال ہی مہمل تھا۔

پھر خود ہی کہنے لگا "یار میں تمہارے پاس آنے ہی والا تھا"

میں نے پوچھا "کیوں خیر تو ہے۔ پھر کسی چکر میں تو نہیں پڑ گئے"

"نہیں یار یوں نہ کہو ــــ تم بعض وقت بڑا اہانت آمیز انداز اختیار کرتے ہو"

میں نے اس قسم کی بات اس کی زبان سے پہلی بار سنی تھی۔ محبت کے تعلق سے اس قسم کا اظہار خیال اس کی شخصیت کا ایک بالکل نیا پہلو تھا۔ جو شاید اس پیری مریدی کا عطیہ ہو۔

میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"اچھا بھئی معاف کر دو۔ لیکن بتاؤ تو بات کیا ہے"

اس نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے کسی آیت کا ترجمہ کر رہا ہو۔

"مجھے اپنی ایک پیر بہن سے انس ہو گیا ہے"

"اور یہ انس بہت جلد محبت تک جا پہنچے گا"

"نہیں یار، تم ہمیشہ کی طرح مذاق نہ اڑاؤ"

"حقیقت کا اظہار مذاق تو نہیں ہوتا"

"لیکن حقیقت کا انداز اظہار اتنا تلخ بھی تو نہیں ہونا چاہیئے"

چونکہ ہمارے راستے مختلف تھے اس لیے ہم جدا ہو گئے ــــ اور بات اس سے آگے نہ ہو سکی۔ ویسے میں نے اس کو روکنا بھی چاہا۔ لیکن وہ خود بڑی جلدی میں تھا۔

اس کے بعد وہ ایک بار مجھ سے ملا تو مجھے معلوم ہوا کہ اپنی پیر بہن سے اس کا معاشقہ بڑی شدت اختیار کر گیا ہے۔ وہ بڑی پاک اور بے عیب محبت کر رہا ہے ــــ ایسی محبت جو ٹھنڈا سایہ تو چاہتی ہے گھنا نہیں چاہتی۔ ایسی محبت جو فتنہ تو چاہتی ہے دخت رز نہیں چاہتی۔

ایسی محبت جو روح تو چاہتی ہے جسم نہیں چاہتی۔

میں بھلا اس سے کس طرح کہتا کہ اس کی شخصیت کی یہ نئی پناہ گاہیں اُسے راس آئیں۔

ایک بار یہی باتیں کرتے کرتے اس نے اپنی ہتھیلی میری طرف بڑھا دی — "دیکھتے ہو؟"

میں نے کہا — "نہیں میں پامسٹ نہیں ہوں۔"

"لیکن اندھے بھی تو نہیں ہو۔"

"اوہ" — میری نظر ہتھیلی کے بیچوں بیچ اس داغ پر جم کر رہ گئی جو وہ مجھے بتانا چاہتا تھا۔

"یہ جو داغ ہے نا اس میں مجھے چاند کی ٹھنڈی روشنی نظر آتی ہے۔ اور یہی روشنی اب میرا مقدر ہے۔"

"یار، میں تو سنتا تھا، نماز پڑھنے سے پیشانی پر سجدوں کے نشان ابھر آتے ہیں۔ لیکن تم نے تو ہتھیلی پہ بہشت بنا دی۔"

وہ کچھ برہم ہو گیا — "تمہیں اپنا یہ پرانا طور طریقہ چھوڑ دینا چاہیے۔"

میں نے اس کو منا لیا — اچھا بھئی — اب جو کبھی ایسی گستاخی کی تو وہی سزا دینا جو کبھی تج کے شوہر نے نہیں دی تھی۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا — "یار باز بھی آؤ اپنی شرارتوں سے۔"

میں نے اس کو بھینچ لیا — "اچھا اب بتا بھی دو کہ آخر یہ نشان ہے کیا؟"

اس نے مجھے بتایا کہ اپنی پیر بہن کے انکار پر اس کا دل جیتنے کے لیے اس نے اپنا پہلا نامۂ محبت جو اس کی پیر بہن نے اس کو سخت سست کہہ کر لوٹا دیا تھا اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے ہی آگ لگائی تھی کہ اس کے ہاں کہہ دینے تک وہ اسی طرح اپنی ہتھیلی کو جلاتا رہے گا — اور اس کی پیر بہن نے بے قرار و مضطرب ہو کر حامی بھر لی تھی — اور اس طرح ہتھیلی کا یہ داغ اس کی بے داغ محبت کا جگمگاتا نشان بن گیا تھا۔

اس کے بعد پھر وہ بہت دنوں تک مجھ سے نہیں ملا۔

اور جب آج ملا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ قرآن سر پہ اٹھا کر اس نے قسم کھالی ہے کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔

اور اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ — آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن آنسو کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

پھر جب وہ انگوٹھی لے کر جا رہا تھا۔ تب بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ شاید وہ رو رہا ہے۔

اس کے بعد پھر وہ بہت عرصے تک مجھ سے نہیں ملا۔

اس سے بالکل غیر متوقع طور پر میری ملاقات اپنے ایک دوست کے کسی قریبی رشتہ دار کی شادی میں ہوئی۔

وہ بے حد مصروف تھا — شادی کے انتظامات اس قدر تن دہی سے کر رہا تھا کہ واقعی اس کو منٹ بھر کی بھی فرصت نہ تھی۔

میں دور بیٹھا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے دوست سے جس نے مجھے مدعو کیا تھا۔ استفسار پر مجھے معلوم ہوا کہ دلہن انھیں پیر و مرشد کی صاحبزادی ہیں جن کے ہاتھ پر واصف نے بیعت کی تھی۔

واصف کی مصروفیت کا سبب روزِ روشن کی طرح میرے سامنے واضح اور عیاں تھا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑا ہوا، انتظامی امور کے تعلق سے ہدایات دے رہا تھا — میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے دیکھا اور اس طرح بالکل اتفاقیہ ملاقات کی مسرت میں مجھ سے معانقہ کیا۔

میں اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا اور سگریٹ جلا کر باتوں کا سلسلہ شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک چھوٹی سی لڑکی جلدی سے آ کر ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما گئی۔

اس نے بڑے اطمینان سے لفافہ چاک کیا۔ گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر بڑے انہماک سے پڑھنے لگا۔

لکھا تھا ——

میرا جسم خواہ کسی کی ملکیت ہو، میری روح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کی رہے گی —— یہ انگوٹھی آج تک آپ کی نشانی کے طور پہ میرے دل کے ساتھ رہی۔ اب اس کو آپ میری نشانی سمجھ کر اپنی انگشتِ شہادت کی زینت بنائے رکھئے۔

حشر تک آپ کی

"بڑی صاحبزادی"

اس نے جب ٹھنڈی آہ بھر کر انگوٹھی نکالی تو میں پہلی نظر ہی میں پہچان گیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو نہ صرف میری اپنی ملکیت ہے بلکہ میری منگیتر کی نشانی ہونے کے ناطے سے میرا جذباتی لگاؤ بھی جس سے وابستہ ہے۔ لیکن اس وقت میں نے اس طرح نظریں پھیر لیں جیسے انگوٹھی کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔

واصف خود مجھ سے مخاطب ہوا۔ "پہچانتے ہو اس انگوٹھی کو"

میں بس دیکھتا ہی رہ گیا کچھ بھی نہ کہہ سکا —— وہ پھر خود ہی کہنے لگا —— "یار، ابھی رہنے دو میرے پاس، دو ایک دن میں لوٹا دوں گا"

خط اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے بڑے فخر سے مجھ سے پوچھا جانتے ہو۔ یہ خط کس کا ہے۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

کہنے لگا "پیر و مرشد کی بڑی صاحبزادی کا"

"آج انھیں کی تو غالباً شادی ہے" —— میں نے مکرر تصدیق چاہی۔

"ہاں بھئی —— دلہن بن گئی ہیں لیکن مجھے بھولنے میں اب تک کامیاب نہ ہو سکیں —— تم نے تو اپنی آنکھوں سے خط دیکھ لیا نا"

پھر وہ مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

میں آہستہ سے اس کے پاس سے کھسک آیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس کے ساتھ اب ایک لمحہ گزارنے کے خیال سے بھی وحشت سی ہو رہی تھی۔

شادی سے لوٹنے لگا تب بھی اس سے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ کسی کام سے اندر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔

پھر وقت کا ایک لمبا دریا اس کے اور میرے درمیان حائل ہو گیا۔

وہ اب میری طرف بالکل نہ آتا تھا۔

میں نے اپنی شادی میں بذریعہ رجسٹری بطورِ خاص اس کو رقعہ بھیجا —— وہ پھر بھی نہ آیا۔

اپنی رنگا رنگ نئی زندگی کے سلجھانے اور سنوارنے میں، میں پھر کچھ اس طرح لگا کہ اسے بھول بھال گیا۔

ایک دن راستے پر مجھے کسی جانی پہچانی آواز نے مخاطب کیا —— میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کوئی نہ تھا —— آگے بڑھنے لگا تو بالکل برابر سے کسی نے میری بانہہ پکڑ لی۔

—— "اوہ" تم ہو، بہ ایں ریش و بروت۔"

میں بدقت تمام اس کے اس حلئے کو پہچان سکا۔

داڑھی میں اس کا چہرہ کچھ وقیع ضرور ہو گیا تھا۔

اس نے کہا "اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا —— چلو، تمہیں تمہاری بھابی سے ملاؤں۔"

میں نے شکایت کی "شرم آنی چاہیئے۔ الگ الگ شادی کر لی۔ مجھے مدعو تک نہ کیا۔ اور پھر میری شادی میں بھی نہیں آئے۔"

اس نے معافی چاہی۔ کہنے لگا "کیا بتاؤں کیسے کیسے انقلابات زندگی میں آئے ہیں۔"

میں نے کہا —— "وہ تو تمہارے چہرے سے ہی ظاہر ہیں۔"

وہ مجھے گھسیٹنے لگا —— "چلو بھئی۔"

"بھئی آخر رہتے کہاں ہو۔"

"یہیں —— سامنے، اسی ڈیوڑھی میں۔"

"کیا یہ سسرال ہے تمہاری؟"

"سسرال نہیں۔ میرا اپنا گھر سمجھو۔ بات دراصل یہ ہے کہ —— تمہیں ش تو یاد ہے نا۔"

"ہاں ہاں اچھی طرح یاد ہے۔"

"یہ اسی کے میاں کی ڈیوڑھی ہے۔ بس یہیں میں بھی اپنی بیوی سمیت رہتا ہوں —— دوست ہو یار تو ایسا ہو —— ایک پل میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیا نفیس آدمی ہے۔ سر تا بہ قدم محبت ہی محبت۔ اس سے زیادہ میری اپنی حکومت اس گھر پہ چلتی ہے —— ش بھی مطمئن ہے اس کا شوہر بھی۔ مجھے بھی ہر طرح کا اطمینان حاصل ہے۔ بس اپنی کتب زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ اس کے سوا مجھے کوئی کام نہیں۔ یہی لوگ میرے کفیل ہوتے ہیں۔ بڑا خدا رسیدہ آدمی ہے۔" ایک سانس میں اس نے اتنی ساری باتیں کہہ دیں۔

باتیں کرتے کرتے ہم ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ زنانہ دروازے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ تو اس نے پھر بازو پکڑ کر مجھے کھینچا۔ چلے آؤ بھئی۔ —— تم سے بھلا کون پردہ کرے گا یہاں۔

صحن سے ہو کر دیوان خانے میں پہنچے تو بیٹھے ہوئے لوگ ایستادہ ہو گئے۔

"ان سے ملو یہ میرے کرم فرما۔ میرے جگری دوست، میرے محسن، یہ ان کی بیوی —— اور یہ میری بیوی۔ پیر و مرشد کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ حضرت نے مجھے فرزندی میں قبول فرمایا ہے۔"

واصف کی بیوی نے مجھے سلام کیا تو اس کی انگلی میں انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ میں نے انگوٹھی سے پھر نظریں پھیر لیں۔

میں لوٹنے لگا تو گیٹ کے باہر تک وہ مجھے چھوڑنے آیا —— میں نے کہا یار تمہاری اس پیر بہن کا کیا ہوا تم نے پھر کبھی کچھ بتایا ہی نہیں۔

وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔

بات بدل کر اس نے کہا۔

"ش کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ ہے نا، رہزنِ ایمان و آگہی۔"

سرگوشی کرنے کے انداز میں جھک کر مجھ سے کہنے لگا "اب بھی کبھی کبھی ملتفت ہو جاتی ہے۔"

"اف" میں جیسے گرتا گرتا سنبھل گیا۔ جب ہوش بجا ہوئے۔

تو میں نے پھر پیر بہن کا تذکرہ چھیڑا۔ اور انداز سے پر گولی چلا دی جو ٹھیک اس کے سینے پر لگی ——

"شرماؤ نہیں یار مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔"

"پھر کیا تم یہ چاہتے ہو کہ مکرر اپنے جرم کا اقبال مجھ سے کروائیں" ——

"نہیں بھئی —— میں نے تو بس یونہی تم سے پوچھا تھا۔"

"کیا بتاؤں یار —— میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے اسے اپنے عقد میں لے لینا چاہتا تھا۔"

"پھر کر کیوں نہیں لیتے عقد۔"

"یار تم بھی عجیب آؤٹ آف ڈیٹ آدمی ہو —— اس نے تو انھیں دنوں خود کشی کر لی —— لیکن میں اب بھی ہر جمعہ کو اس کے نام پر ختم قرآن کرواتا ہوں۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ واصف اپنی پیر بہن کی قبر پر بیٹھا اسی قرآن کا ورد کر کے اس کے نام پر بخش رہا ہے جس قرآن کو سر پر رکھ کر اس نے کبھی قسم کھائی تھی کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے ؛؛

نو اثر

سدا سہاگن

اور پھر جب نیلے کھلے آسمان پہ شام کا پہلا ستارہ روشن ہوتا اور امرت نگر کی اونچی نیچی کچی پگڈنڈیوں پہ اڑنے والی گرد تھک ہار کے دھرتی کے پھیلے ہوئے سینے سے لپٹ کر سو جاتی، شام کا سورج آخری بار دکھ بھرا سانس لے کر اپنی گرد آلود آنکھ سے اس جہان کو دیکھتا اور دن کی روشنی میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی اپنی چال میں مست ہوا رات کے اندھیرے میں کسی اندھے بوڑھے مسافر کی طرح راستہ تلاش کرنے لگتی اور اندھیرے کے ساحل پہ کھڑے امرت نگر کے کچے گھروں میں دیئے روشن ہو جاتے تو اس سمے شیرے کو نہ جانے کیا ہوتا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی کالی سی تصویر آ جاتی۔ وہ اسے پہچان تو نہ سکتا۔ لیکن اس کی طرف دیکھتا ضرور رہتا۔ چند لمحے یونہی بیت جاتے اور پھر وہ تصویر اس کے ساتھ اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی۔ پہلے پہل تو اسے اس کی زبان ہی سمجھ نہ آتی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے الفاظ تو صاف ہو جاتے لیکن ان کا مطلب وہ پھر بھی نہ سمجھ سکتا۔ شیرا کتنی دیر اس مورت کی اس زبان کی سنسان راہوں پہ اکیلا ہی بھٹکتا رہتا اور پھر آپ ہی آپ تھک ہار کے ہلکی آواز کے ساتھ گنگنانے لگتا۔

نی ماپے تینوں گھٹ رون گیں بہتے رون گیں دلاں دے جانی!

اپنی ہوش سنبھالنے کے بعد شیرے نے اس قسم کی بولیاں اکثر سنی تھیں۔ گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہروں میں گاؤں کے کچھ لوگ جب ایک بڑا سا دائرہ بنا کے بیٹھ جاتے پیپل کی چھاؤں تلے کوئی پرانا سا حقہ رکھے وہ لمبے لمبے کش لگانے لگتے۔ چاروں اور چلنے والی گرم ہوا ان تک پہنچ کر آہستہ آہستہ نیم سرد آہیں بھرنے لگتی، اس وقت اچانک کسی گوشے سے کوئی دکھ بھری آواز ابھرتی اور پھر یوں لگتا جیسے ساری آنکھیں اس آواز کے غم میں بھیگ گئی ہیں ہوا بھی ان کے پاس سے ڈولتے ہوئے چلتی اور سورج کی تیز کرنیں آنسوؤں سے بھیگ کر سرد سی ہو جاتیں۔ حقے کی نال آپ ہی آپ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چلی جاتی اور اس کا دھواں ایک چھوٹی سی بدلی بن کر برسنے لگتا ——— لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ سارے لوگ وہیں بیٹھے چپ سادھے اس بارش میں بھیگتے رہتے اور پھر گانے والے کی آواز اور بلند ہو جاتی۔ جیسے وہ ان لوگوں کے علاوہ کسی اور تک بھی اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہو۔

ساڈے چم دیاں جتیاں کرے کوئی جیہڑا جیو دا روگ گوا ندا ای!

شیرے یہ سب کچھ سن کے یہی سوچتا رہتا کہ جی کا یہ روگ کیا ہوتا ہے۔ جس کو دور کرنے کے لئے ہم لوگ اپنی کھال تک اتروانے سے گریز نہیں کرتے۔ اوّل تو یہ اکیلے بیٹھ کر آنسو بہاتے ہیں لیکن اگر اور لوگ ساتھ ہوں تو یہ انہیں بھی رُلاتے ہیں اور اگر آنکھوں میں آنسو صرف اسی روگ سے آتے ہیں تو یہ روگ مجھے بھی کیوں نہیں لگ جاتا۔ میں نے تو جب سے آنکھیں کھولی ہیں یہ آج تک آنسوؤں کو ترستی رہی ہیں۔ شیرا انہی خیالوں میں ڈوبا وہاں بیٹھے ہوئے بھی ان لوگوں سے دور رہتا اور گانے والے کی آواز اس کی سوچ کی اس دیوار سے اسے جھانکتی رہتی،

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹ آکھیں کون رُٹھڑے یار منا ندا ای،

یہ بول سُن کر شیرے کے جی میں آتا کہ یہ ہیر کون تھی۔ اگر وہ اسے مل جائے تو وہ اس سے پوچھے کہ تو مجھے اپنے اس ساجن کا نام بتا دے، میں تجھے اس سے ملاؤں گا۔ اسے یقین تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے بچھڑتے ہیں، روٹھ بھی جاتے ہیں لیکن ایک نہ ایک دن مل بھی ضرور جاتے ہیں۔ پچھلے برس کی بات ہے جب اس کا دوست دارا اس سے روٹھ کر شہر چلا گیا تھا۔ اور پھر جب یہ اُسے منانے شہر گیا تھا۔ تو اسے دیکھ کر دارے کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے تھے بغیر کچھ کہے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ راضی ہو گئے تھے۔ شیرے کے جی میں آتا کہ وہ پاس بیٹھے آدمی سے پوچھے۔

"یہ ہیر کہاں رہتی ہے؟"

لیکن جب وہ اس آدمی کو نظریں نیچی کئے بیٹھے دیکھتا تو خود بھی خاموش رہتا اور پھر دل میں بہت کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے اُٹھتا اور اس تپتی ہوئی دوپہر میں گھر کی طرف چلنے لگتا۔

اور پھر گھر پہنچ کر لسی سے بھرا گلاس پی کر جب چارپائی پر لیٹتا تو اُسے اپنا سارا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کی اپنی سوچ کے تیز نشتر اس کے انگ انگ میں چبھنے لگتے اور شیرے کو یوں لگتا۔ جیسے اس کے سارے جسم سے خون بہنے لگا ہے وہ تیزی سے چارپائی سے اٹھتا اور آپ ہی آپ گنگنانے لگتا۔

جے توں ملیں تے سبھے دُکھ دساں

اس کے مُنہ سے اس قسم کے بول سُن کر شیرے کی بوڑھی ماں اس کی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگتی ——— خیر سے شیرا جوان ہو گیا ہے اب کہیں اس کی شادی کر دینی چاہیئے۔

اور پھر شیرے کی زندگی میں ایک ایسی رات آئی جب اس کے پاس شریفاں سو رہی تھی۔ اس کے گورے ہاتھوں پر کچھ دن پہلے کی لگی ہوئی مہندی کا رنگ اب بھی باقی تھا اور اس کے نرم سجرے ہونٹوں پر دنداسے کی سُرخی ابھی روشن تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال اس کے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ اور جب وہ ایک لمبا سانس لیتی تو بالوں کی ایک لٹ کچھ دیر کے لئے اوپر اٹھتی اور پھر وہیں گر پڑتی۔ شیرا اپنی چارپائی سے اٹھا اور آہستہ سے اس کے چہرے پر پھیلے بالوں کو ہٹانے لگا۔ شریفاں نے ایک گہرا سانس لیا اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب اُس نے شرماتے ہوئے اپنی آنکھیں جھکا لیں تو شیرا آہستہ سے بولا۔

"میں تیرے چہرے سے بال ہٹانے آیا تھا"

شریفاں نے کچھ نہ کہا بس ویسے ہی چارپائی پر لیٹی رہی۔ رات کے اس خاموش لمحے میں شیرے کی موجودگی کے احساس سے اس کا سانس تیز ہو رہا تھا۔ وہ پہلے تو کچھ دیر اس کے کھلے بالوں سے کسی بچے کی طرح کھیلتا رہا اور پھر نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ اس نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"کہیں تیرا نام ہیر تو نہیں ہے؟"

اس کے منہ سے یہ فقرہ سن کر شریفاں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی دوسرے کے گھر چلی آئی ہو۔ اُس گھر میں جس میں رہنے والے اس کا نام تک نہیں جانتے۔ اسے اپنے سرہانے بیٹھا ہوا شیرا بھی کوئی غیر مرد دکھائی دینے لگا۔ شریفاں غور سے شیرے کو تکنے لگی۔ دن کی روشنی میں سہرے باندھ کر اس کے گھر داخل ہونے والے شیرے اور بھیگی رات کے اس خاموش لمحے میں اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے شیرے میں کتنا فرق ہے!۔ شیرے کے منہ سے نکلے ہوئے اس چھوٹے سے فقرے نے شریفاں کے دل میں ایک ساتھ کتنے سارے پتھر پھینک دیئے تھے!!

"کہیں تیرا نام ہیر تو نہیں ہے ؟"

شیرے کے اس ایک سوال نے پل بھر میں کتنے اور سوالوں کو شریفاں کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ پہلے تو اُسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ اس کا کیا جواب دے لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر شرماتے ہوئے بڑے پیار سے بولی۔

"تم مجھے بڑے شوق سے ہیر کہہ کے ہی بلا لیا کرو۔"

"تو تمہارا نام ہیر نہیں ہے۔" شیرا کچھ سوچنے لگا "کیا تو اُس ہیر کو جانتی ہے۔ جس نے جوگی سے کہا تھا۔ کہ تم جھوٹ کہتے ہو، روٹھے ہوئے یار کو کوئی نہیں منا سکتا!"

یہ بات سُن کر شریفاں نے مسکراتے ہوئے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا اور آہستہ سے بولی۔

"اس ہیر کو مرے تو زمانہ بیت گیا ہے"

شریفاں کے منہ سے ہیر کی موت کی خبر سن کر شیرے کا جی چاہا کہ وہ ڈھاڑیں مار کے رو دے۔ لیکن اُس کی اس سوچ نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اُس کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ آیا۔ وہ پھر سوچنے لگا۔

"اگر وہ ہیر سچ مچ ہی مر چکی ہے تو لوگ اُسے ایسے کیوں یاد کرتے ہیں جیسے وہ ابھی زندہ ہے"

شریفاں کو اس کی یہ بات سمجھ نہ آئی اور وہ خاموش رہی اُسے تو اس کی بیوی بنے ابھی تیسرا دن تھا۔ ابھی تو وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ شیرے کے دائیں گال پر ایک ایسا کالا تل ہے جو اس کے چہرے پر چاند کی طرح خوبصورت دکھائی دیتا ہے وہ اس کے دل کی یہ بات کیسے سمجھ لیتی؛ بس وہ خاموش ہی رہی اور پھر وہ ایسے ہی چُپ رہتے ایک بچے کی ماں بن گئی۔

اب باہر کھیتوں پر کام کرتے شیرے کی آنکھوں کے سامنے اچانک اس بچے کی صورت آجاتی اور وہ کام چھوڑ کے کچھ دیر کے لیے گھر چلا آتا بچے کو اپنی گود میں لے کر وہ کتنی ہی دیر اس سے کھیلتا رہتا۔ اس کو ہنسانے کی خاطر وہ اپنا اچھا بھلا چہرہ بگاڑ لیتا اور اس کی بگڑی ہوئی صورت دیکھ کر بچے کے ساتھ ساتھ شریفاں بھی ہنسنے لگتی۔

شریفاں کو یوں بے اختیار ہنستے دیکھ کر جب شیرا اس کی طرف دیکھتا تو وہ شرماتے ہوئے اپنی آنکھیں جھکا لیتی اور شیرا بڑے پیار سے اُسے کہتا۔

"بس ایک بار پھر ایسے ہی ہنس دے شریفاں ہنستی تو مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔"

شریفاں شرماتے ہوئے پیار سے کہتی۔

"چل جھوٹھا ———"

اور اس کی یہ بات سن کر شیرا سوچنے لگتا کہ بات تو اس نے ٹھیک کہی ہے۔ یہ مجھے اچھی ضرور لگتی ہے لیکن اتنی اچھی نہیں کہ اگر یہ آج مر جائے تو اس کی موت پر میں اس کے ماں باپ سے زیادہ بین ڈالوں۔ شریفاں کے منہ سے اتنی سچی بات سن کر وہ وہاں سے اٹھتا اور واپس کھیتوں میں آ کر کسی صدیوں پرانے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ کر آہستہ آہستہ گانے لگتا۔

"نی ماپے تینوں گھٹ رون گے بُہتے رون گے دلاں دے جانی"

یونہی گاتے گاتے وہ بے پناہ اُداس ہو جاتا۔ اور سوچنے لگتا کہ یہ لڑکی کس دیس میں رہتی ہے؛ کن راہوں پر پاؤں دھرتی ہے؛ آج تک

مجھے ایسی کوئی لڑکی کیوں دکھائی نہیں دی۔ جس کی لاش پر اس کے ماں باپ سے زیادہ میں آنسو بہاؤں۔ شریفاں میری بیوی ہے، خوبصورت بھی ہے۔ مجھے اچھی بھی لگتی ہے لیکن ——— لیکن اگر آج وہ مر جائے تو شاید میری ان آنکھوں میں ایک آنسو تک بھی نہ آئے۔ میں اس کی موت کے اس غم میں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاؤں اور بس ——— !

اپنے دل کی اس انجانی سوچ کے بوجھ سے اُسے یوں لگتا جیسے اس کی آنکھیں سُوجھ گئی ہیں وہ ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے؟ اُسے ایسی باتیں ہرگز نہیں سوچنی چاہیئں یہ تو بے کار لوگوں کا کام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے بوڑھے رحمو کی شکل آجاتی۔ وہ تو بیکار نہیں ہے اُس کے پاس تو اتنی زمین ہے کہ اگر وہ دن رات ہل چلاتا رہے تو اس کا کام پھر بھی ختم نہ ہو۔ وہ تو یہ بول گاتے گاتے سچ مچ رونے لگتا ہے اور پھر جب وہ اپنی اُداس آواز سے یہ پکارتا ہے۔

"ٹنگے کھمیاں دے نال پراندے جناں دے راتیں یار دچھڑے"!

اس وقت تو دوسرے بھی اس کے ساتھ ساتھ روتے ہیں۔ اُس سمے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دل والوں کی بات رحمو کی آواز بن کر جدائی کے زہر بھرے تیر کی طرح سینوں میں اُتر رہی ہے اور پھر آنکھوں سے آنسو آپ ہی آپ بہنے لگتے ہیں۔" لیکن میری آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں آتے؟"

شیرے کو بس یہی غم تھا۔ میں بھی تو اسی جہان میں رہتا ہوں۔ میری آنکھیں بھی روشنی اور اندھیرے کو دیکھ سکتی ہیں تو پھر مجھے آج تک وہ لڑکی نظر کیوں نہیں آئی۔ جس کی جُدائی میں مجھے اپنے ساتھ ساتھ تمام وقت بین کرتا دکھائی دے۔ میری آنکھیں تو آج تک لونگ کے اس اشارے کو بھی ترس رہی ہیں۔ جسے دیکھ کر لوگ ہل چلانا چھوڑ دیتے ہیں ——— کیا میں اتنا ہی بُرا ہوں، اتنا ہی بدقسمت ہوں!!

اپنے آپ اور اپنی قسمت پر روتے وہ ایک دن کچھ ایسا بیمار ہُوا کہ اس کے لئے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔

شریفاں رات دن اُس کے سرہانے بیٹھی رہتی کبھی اس کا سر اور کبھی اس کے پاؤں دبانے لگتی۔ اُس سے جس قدر ہو سکتا وہ اس کی خدمت کرتی اور شیرے کو پھر بھی یہی محسوس ہوتا کہ وہ لڑکی نہیں ہے جو اگر آج مجھ سے بچھڑ جائے تو اپنے ساتھ ساتھ مجھے تمام وقت بین کرتا دکھائی دے ——— وہ بڑے پیار سے شریفاں کی طرف دیکھنے لگتا۔ اور کچھ دیر بعد وہی شریفاں کسی کالی سی تصویر کے رُوپ میں اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ وہ اُسے پہچان تو نہ سکتا لیکن اُس کی طرف دیکھتا ضرور رہتا۔ چند لمحے یونہی بیت جاتے اور پھر وہ تصویر اس کے ساتھ اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی۔ پہلے پہل تو اُسے اس کی زبان ہی سمجھ نہ آتی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے بول تو صاف ہو جاتے۔ لیکن ان کا مطلب وہ پھر بھی نہ سمجھ سکتا

شیرا تیزی سے اپنی آنکھوں کو جھپکنے لگتا! اور شریفاں اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہتی۔" پانی لاؤں"؟

شیرے نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ اور شریفاں پانی لینے چلی گئی۔ کچھ دیر تو کمرے میں کچھ ایسی خاموشی رہی۔ کہ اسے اپنے سانس تک کی آواز بھی سنائی نہ دی۔ اور پھر کسی انجانے خیال کے طلوع ہونے والے سُورج نے آہستہ سے اس کمرے میں جھانکا اور اس کی ہلکی زرد روشنی میں اپنی سوچ کی گرد آلود راہوں پر شیرے نے چُپ چاپ چلنا شروع کر دیا۔

"میری قسمت میں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے ہو سکتا ہے میرا دل اس لڑکی کی جُدائی کے غم کے قابل نہ ہو ——— اچھا ہُوا میں نے اسے نہیں دیکھا اور بہت اچھا ہُوا ہے وہ لڑکی مجھے نہیں ملی ——— اگر وہ مجھے مل بھی جاتی تو پھر بھی اُس نے مجھ سے بچھڑ ہی جانا تھا ——— یہ دنیا والے بڑے ظالم ہیں۔ میرا کیا ہے میں تو شاید ابھی مر جاؤں۔ لیکن ——— لیکن وہ تو سدا سُہاگن رہے گی نا!"

اور پھر جب شریفاں پانی کا گلاس لے کر اس کمرے میں آئی تو اُس وقت چارپائی پر شیرا بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر ایک ایسی مُسکراہٹ تھی جو آنسوؤں سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے؛

خالدہ اصغر

دِل دریا

ابھی برسات نہیں آئی۔

خشک ہوائیں جب درختوں کے گھنے پتوں میں سرسراتی ہیں تو کہیں روح میں بڑی گہری سی ہوک اٹھتی ہے اور ان خشک ہواؤں کی گرد چمکتے برآمدوں کی شفاف سطح پر ہلکی تہوں میں سمٹی رہتی ہے۔ آموں میں رس بھری زردی آ چکی ہے اور برگد میں ہولے ہولے سیاہ پڑ رہی ہیں۔ املتاس کے زرد پھول سر جھکائے ہواؤں میں اپنا سونا بکھیرتے ہیں۔ اور شام کے گرم دھندلکوں میں کامنی کے سفید پھولوں کی مہک گھل جاتی ہے۔ مگر کوئل بہت کم کوکتی ہے۔ ابھی برسات نہیں آئی۔

اس برآمدے کے سخت ستون کے ساتھ لگ کر میں سڑک پر سے گذرنے والے بے شمار لوگوں کو دیکھتی ہوں۔ اور خود سے کہتی ہوں۔ پانی تو ہمیشہ برستا ہے، پانی تو برسے گا۔ آم اور جامنیں ٹپ ٹپ گیلی زمین پر گریں گی، پتوں کی گرد دھل جائے گی، اور وہ روئی ہوئی آنکھوں کی طرح صاف چمکنے لگیں گے۔ برآمدوں کی شفاف سطح پر گرد کی تہیں بھی دھل جائیں گی۔ بہت سی چیزیں دھل جائیں گی۔ یہ گھروں کی مٹیالی اینٹیں سرخ ہو جائیں گی، پرندے بجلی کے تاروں پر بیٹھے اپنے پر پھڑپھڑائیں گے اور بکھرتے قطرے ادھر ادھر ہواؤں کے رُخ پر اڑ جائیں گے۔ مگر ذہن۔ اس پر گرد کی تہیں اسی طرح جمی رہیں گی اور اس کی سنگلاخ زمینوں کی تپش اسی طرح جان لیوا رہے گی۔ پرندے کبھی اپنے پر پھڑپھڑا کے دکھ کے منجمد ہوتے قطروں کو نہ جھٹک سکے گا۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔ ہر شدت مدہم پڑنے کو وجود چاہتی ہے اور ہر نقش کو دھندلانا ہوتا ہے۔ یوں بھی ہو گا کہ دکھ کے منجمد قطرے پھر سیاہ نقطے بن کر ذہن کی سطح پر سپاٹ ہو جائیں گے اور برسات سے پہلے کے ان دنوں میں روح سے کوئی ہوک نہ اٹھے گی اور میں تمہارے متعلق کبھی نہ سوچوں گی۔

اس وقت یہ سوچ کر مجھے کیسا شدید دکھ ہوا کہ میں تمہارے متعلق کبھی نہ سوچوں گی۔ یہ مجھے ایسا ناممکن لگتا ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے یوں ہو گا۔ چیزیں مٹ کر کسی کے ذہن و دل کے لئے، ابدی، لافانی نہیں بن جایا کرتیں۔ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے۔ ہم سوچتے ہیں، ہم اپنی وفا سے اوروں کو اپنی بقا کا یقین دلا سکیں گے۔ مگر فنا بہرحال فنا ہے۔ اور انسانوں کے حافظے بہت زود فراموش ہیں۔ ہم تم بہت معمولی انسان ہیں۔ اس دنیا میں اکثریت عام انسانوں کی ہے، معمولی، پیارے، معصوم انسانوں کی۔ جو عمر بھر لہو روتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ اب یہاں اس ستون کے ساتھ کھڑے، جبکہ پکے فرش کی گرمی میرے پاؤں جلا رہی ہے۔ مجھے عظمت کا فلسفہ ایسا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ یہاں عظمت، کردار، شخصیت، انا۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ سب بکواس ہے، یہاں صرف موسموں کی ہوائیں ہیں اور موسم ہیں۔ اور ان موسموں کے ساتھ بدلتے ہوئے دکھ، سکھ کے جھلمل کرتے لمحے ہیں۔ باقی سب غلط ہے۔

مجھے یاد ہے ——— اس روز انگریزی کے لیکچر میں انتہائی خاموشی تھی مسز انگلڈن کے خوبصورت لفظوں کا بہاؤ تھا کہ سب کو ہپنوٹائز کیے جا رہا تھا۔ ”دھمک“ سے اچانک کچھ گرا۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ میری پچھلی سیٹ پر تم منہ پر سرخ قند کانے قریب آگری پڑی تھیں۔ میں نے تمہیں سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔ تم بڑی مضمحل مسکراہٹ کے ساتھ کرسی کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گئیں

"میں ٹھیک ہوں!"

لیکچر ختم ہو چکا تھا۔ مسز انگلاٹن نے مجھے تم کو "سک روم" میں پہنچانے کو کہا اور میں تمہارا ہاتھ پکڑ کے گھاس کی لمبی روش پر چل نکلی۔

تم خوبصورت نہ تھیں۔ پھر بھی تم میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ انسان کا جی تم سے ملنے، تم سے بات کرنے کو چاہنے لگے۔ جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو میرا جی چاہا، لیکچر کے بعد، یونہی تم سے بات کروں۔ مگر پھر مجھے محسوس ہوا کہ تمہارے پیشانی سے بال ہٹانے کے انداز میں کافی غرور تھا اور تمہارے ہاتھ نوٹس لیتے ہوئے بہت تیزی سے چلتے تھے اور یہ کہ تمہاری تحریر بے انتہا خوبصورت تھی۔ مجھے یونہی تمہاری ذات میں تھوڑی سی دلچسپی ہو گئی۔

ایک روز میں بس سے اتر رہی تھی کہ تم سبز رنگ کی لمبی سی کار سے آتریں۔ اور تمہارے برابر ایک بہت خوبصورت عورت بیٹھی کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ انتہائی سیاہ تھا اور چہرا بے حد گورا۔ اونچی سی ناک میں دم دم چمکتی، سفید نگینے کی کیل تھی اور ہاتھوں میں کہنیوں تک خوشنما سفید نازک دستانے

تم کتابوں کے ساتھ اپنا ٹینس ریکیٹ سنبھالے، کھٹ سے دروازہ بند کرکے، تیز تیز قدم اٹھاتی گیٹ کی طرف چل دیں۔

اور اس روز میں نے تم سے راہ و رسم بڑھانے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ تم مجھ سے بہت مختلف تھیں۔

تم خوبصورت نہیں تھیں۔ مگر تمہارے اونچے قد اور شانوں تک کٹے ہوئے بالوں نے تم میں وقار پیدا کر دیا تھا۔ اور تمہاری خاموش، کالج کے برآمدوں، روشوں اور لائبریری میں گھومنے والی اکیلی اکیلی ذات اوروں سے بہت مختلف محسوس ہوتی۔ اور اکثر لڑکیوں کا خیال ہے کہ تم میں کچھ بھی نہیں، سوائے ایک سرد قسم کے پندار کے۔

لیکن اس روز جب مجھے مجبوراً تمہیں سہارا دینے کی خاطر تمہارا ہاتھ پکڑنا پڑا۔ تو میرے ہاتھ پر تمہاری گرفت سرد نہ تھی۔ "سک روم" کی نیم تاریک، خاموش فضا میں تم بڑے اکھڑے سے انداز سے پلنگ پر لیٹ گئیں۔ اور میں نے سوچا اب مجھے جانا چاہیئے۔

"تمہاری کوئی کلاس تو نہیں؟" تم نے بڑی غیر متوقع سی بات پوچھی۔

"نہیں!"

"تو پھر رک جاؤ!" میرا خیال تھا تم بڑی سرد سی شائستگی سے میرا شکریہ ادا کرو گی اور میں چپکے سے مسز گل کی تیز نگاہوں کے وار سہتی سک روم سے لوٹ آؤں گی۔

"صبح ناشتہ سکپ مت کیا کرو بیوقوف لڑکیو!" مسز گل شیشے کے چھوٹے سے پیمانے میں سرخ رنگ کا مکسچر لئے آگئیں۔ ان کے ہاتھ میں وہ مکسچر دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آگئی مگر تم نے بڑے اطمینان سے وہ پیمانہ منہ میں انڈیلا اور پلنگ کی پشت کے ساتھ تکیہ لگا کر بیٹھ گئیں۔

"مجھے ایسی دواؤں کی اب عادت سی ہو گئی ہے۔ امی تو چوبیس گھنٹے گولیاں۔ ٹانک۔ مکسچر، جانے کیا کیا کھلاتی رہتی ہیں!"

"تو تم اکثر بیمار رہتی ہو؟"

"نہیں۔ میں کوئی بیمار لگتی ہوں؟" تم نے اپنے اوپر تنقیدی نگاہ ڈالی۔

"بس امی کو وہم سا ہے کہ میں کہیں بیمار نہ ہو جاؤں۔ اور کہیں مر نہ جاؤں!" تم نے اتنی لاتعلقی، اتنی خشکی سے کہا کہ میں چونک گئی۔ تمہیں اپنی ذات، اپنے ماحول اور اس ماحول کے لوگوں اور ان کے احساسات سے اتنا بے نیاز محسوس کرکے مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ میرا خیال تھا تم میں ایک قسم کا خاندانی فخر ہوگا تمہیں اپنی روایات سے محبت ہو گی۔ اور اپنے ماحول سے شدید لگاؤ۔ پھر کچھ لمحوں کے لئے مجھے وہم سا ہوا، شاید تم مجھ تک پہنچنے کی خاطر، یا مجھے اپنے تک لے جانے کے لئے، اپنی ذات سے اتنی منحرف ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور اس خیال سے مجھے بہت دکھ ہوا۔

مگر یوں نہ تھا۔ وقت اور صرف وقت ہمیں کسی دوسرے انسان کے متعلق کچھ بتا سکتا ہے، بہت دن، مہینے اور سال، ہم کسی ایک ہی انسان کو سمجھنے میں صرف کر سکتے ہیں اور پھر بھی اس کے کپکپاتے دل کے کناروں ہی کو ایک نظر دیکھ سکتے ہیں، کنارے جو بیچ پانی کی شوریدہ تموّجوں اور گہرائیوں سے اتنی دور ہوتے ہیں اور برستی آنکھوں کی پلکوں کی طرح پانی کو پل بھر اپنے اوپر ٹھہرنے نہیں دیتے (چاہے جو لوگ ہمارے متعلق رکھتے ہیں)

کچھ دن تمہارے ساتھ رہنے کے بعد مجھے تمہاری منتشر عادتوں کا احساس ہوا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے تم ذرا سی، معمولی سی بات پر اس قدر خوش ہو جاتیں۔ اتنا ہنستیں کہ تمہاری آنکھوں میں جل تھل مچلنے لگتی۔ تمہیں گھڑی اپنے دونوں ہاتھوں سے کوئی چیز کھاتی، اتنا محظوظ کرتی کہ جیسے ایک اس نوالے کے بعد تمہیں کوئی خوشی نہ چاہتی ہو۔ میں تمہیں اتنا بے تحاشا ہنستے دیکھتی رہتی۔ اور پھر کبھی کبھی لائبریری کی سیڑھیوں میں بیٹھی تم دروازے کے ننھے سوراخوں سے چیونٹیوں کو نکلتے دیکھنے لگتیں۔

"یہ اتنی تیزی سے کہاں جا رہی ہیں ——— مجھے بتاؤ!" تمہاری آنکھوں میں بڑا تاریک دکھ ہوتا اور چہرے پر بچوں ایسی معصومیت ——— "کیا ہم بھی اسی طرح کسی طرف جا رہے ہیں؟"

"ہم کون؟"

"ہم انسان ——— نہیں اور انسانوں سے مجھے کیا ——— صرف میں، وہ جو میں ہوں۔"

اور میں ہمیشہ تم کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کرتی۔ "اپنی لائف انشور کرا لو۔ ارسطو بنتی جا رہی ہو" ایسے موقعوں پر تم جو زبردستی کی ہنسی ہنستیں اتنی کھوکھلی، اتنی تلخ کہ میں بہت اداس ہو جاتی۔

ایک روز بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ تمہاری کار گیٹ سے باہر رکنے کی بجائے اندر تک آ گئی۔ میں اتفاق سے برآمدے میں کھڑی تھی۔ تم نے ہلکے نیلے رنگ کی پلاسٹک کی برساتی سر پر ڈالی اور احتیاط سے قدم اٹھاتی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ اور میں کار چلاتی اس حسین اور پُروقار عورت کو دیکھتی رہ گئی۔

"یہ میری امی ہیں۔" تم نے شاید مجھے اس انہماک سے ان کے پیچھے نظریں دوڑاتے دیکھ کر بتایا۔

"میری امی کو مجھ سے جنون کی حد تک پیار ہے!" تمہارے لہجہ میں ایک سویا سویا سا شکوہ تھا۔ مجھے تمہاری بات پر ہنسی آ گئی۔ اور تم برا مان گئیں "سبھی کو ہوتا ہے!" میں نے تمہارے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر بات صاف کرنی چاہی۔

"پیار ہوتا ہے ——— جنون نہیں ہوتا!"

"لیکن تم ان کی ایک ہی ایک بچی جو ہوئیں!"

"اس لئے انہیں جنون ہے۔ واہ" تم پھر نہ جانے کیوں کھل کھلا کر ہنس دیں۔ "وہ آدھی آدھی رات کو دبے پاؤں میرے پلنگ پر آتی ہیں۔ اور مجھے چھو چھو کر دیکھتی ہیں کہ میں کہیں چلی تو نہیں گئی ——— کہیں مر تو نہیں گئی! اوہ مجھے اتنی تکلیف ہوتی ہے۔ میں انہیں کیسے سمجھاؤں۔ میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں!"

"تمہارے ڈیڈی نہیں سمجھاتے ان کو؟" ڈیڈی کے نام پر تم چونک گئیں اور جھک کر برساتی جھاڑنے لگیں۔

"ہاں۔ میرے ڈیڈی۔ سمجھاتے کیوں نہیں۔ سنو! میرے ڈیڈی بہت ہینڈسم آدمی ہیں۔ میں ان کی تصویر لاؤں گی۔"

اگلے دن تم کتابوں کے ساتھ ساتھ سیاہ رنگ کا ایک البم بھی اٹھا لائیں۔ کالج کے عقبی لان میں، یوکلپٹس کے درختوں کے درمیان تم نے بڑی احتیاط سے البم کھولا۔

"یونہی میرا جی چاہتا ہے تم کو اپنے گھر کی تصویریں دکھلانے کو۔" اور تم صفحے الٹنے لگیں۔ اسمیں تمہارے ڈیڈی کی تصویریں تھیں۔ تنکار کھیلتے ہوئے

بلیرڈ کھیلتے ہوئے۔ گالف کھیلتے ہوئے۔ کہیں کسی جگہ پر لیکچر دیتے ہوئے۔ وہ واقعی بہت وجیہہ تھے۔ پھر تمہاری امّی کی تصویریں تھیں۔ بھاری غراروں اور قیمتی ساریوں میں۔ تمہارے ڈیڈی اور امّی دونوں کی ایک ساتھ تصویریں تھیں برف سے ڈھکی پہاڑیوں کے درمیان۔ اُونچی اُونچی گرتی آبشاروں کے قریب ریگستانوں میں، بڑے بڑے گوگلز پہنے ہوئے۔!

"امّی اور ڈیڈی شادی کے بعد قریباً تمام دنیا گھومے تھے!"

میں نے سوچا تم اپنے ماحول میں کس قدر عجیب ہو۔ ایسے ماحول میں واقعی باپ صبح یہاں اور شام کو سوئٹزرلینڈ میں ہو سکتا ہے اور ماں سبز رنگ کی لمبی کار چلا سکتی ہے۔ اس زندگی میں گالف اور بلیرڈ ہے اور گاؤں سے آنے والی سنہری گندم، آم اور رس ٹپکاتی ناشپاتیاں ہیں۔ شہر کی موڈرن کوٹھی کے بعد گاؤں کی بڑی بڑی حویلیاں ہیں اور چمکتے صحت مند گھوڑے ہیں۔ ہرے ہرے لہلہاتے کھیتوں کی گرم مہک ہے۔ اور پھلوں سے لدے باغ ہیں جن میں کسان بیٹھے دن رات رکھوالی کرتے ہیں اور پرندے اُڑاتے ہیں۔ اور شہر میں بڑی بڑی دعوتیں ہیں۔ جن میں رئیس لوگ شریک ہوتے ہیں اور بے تکان انگریزی بولتے ہیں۔ پھر ان رئیسوں کی بیویاں ہیں جن کے مضبوط جسم اور شانوں تک کٹے بھاری بھاری بال ہیں۔ اور جو بڑی عمدہ ٹینس کھیلتی ہیں۔ ستار پر ان کی بجے جے وقتی سن کر لوگ جھوم اٹھتے ہیں۔ اور پھر ان رئیسوں کے رئیس بیٹے ہیں جو ایچیسن کالج میں پڑھتے ہیں اور نیلے رنگ کے اُونچے اُونچے طرّے پہنتے ہیں۔ نفیس سوڈوں کے ساتھ بہترین سگریٹ پیتے ہیں۔ اور گھوڑدوں۔ سر آغا خان، ہالی وڈ اور کاروں کے نئے ماڈلوں کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ تم پر جچتا ہے۔ مگر ایک بات۔ صرف ایک بات تمہارے ضمیر میں یہ سوال کہاں سے اٹھا۔ "ہم انسان کہاں جا رہے ہیں!" یہ سوال، یہ سوچ تو ہماری ہے۔ ہم متوسط طبقہ والوں کی جو خارجی اور داخلی، کشمکشوں میں جو گھرے ہوئے ہیں اور آدھی آدھی رات تک کتابوں میں سکون ڈھونڈتے ہیں۔!

ایک روز باتیں کرتے کرتے تم نے اچانک کہا ——— "کل ڈیڈی آئے تھے!"

"آئے تھے کیا مطلب، گھر میں نہیں رہتے کیا؟"

"اوہ۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں شاید۔" وہ اکثر باہر رہتے ہیں۔ ان کا کام ہی کچھ ایسا ہے۔ آدھی آدھی رات تک انہیں باہر رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی دوسری کوٹھی میں رہ جاتے ہیں۔ صبح آجاتے ہیں۔

مجھے ڈیڈی سے بہت محبت ہے!" اور مجھے تمہاری اس بات پر بھی ہنسی آگئی۔

"تمہارے لئے یہ بڑی عام، معمولی سی بات ہے کہ ایک لڑکی کو اپنے باپ سے محبت ہو۔ مگر میرے لئے تو یہ بہت بڑا سانحہ ہے!"

"سانحہ، خدا کے لئے پاگل نہ بنو!"

"سانحہ ہی تو ہے۔ امّی کو اس بات کا بہت دکھ ہے کہ مجھے ڈیڈی سے بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا اُن سے ہے، وہ ہمیشہ کہتی ہیں۔ ماں ہمیشہ بچّے سے قریب ہوتی ہے۔ باپ کا پیار کوئی بندھن نہیں۔ کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے!"

میں نے سوچا۔ یوں ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں لوگ اپنی اپنی شخصیت کی گرفت آزمایا ہی کرتے ہیں۔ جب سہنے اور سمجھنے کو اور کچھ نہ ہو تو ناطہ کی گتھیاں ہی سلجھائی جاتی ہیں۔ "ڈیڈی جب کبھی رات ہمارے پاس رہتے ہیں تو مجھے ان کو دیکھ کر بہت سکون ملتا ہے۔ صبح صبح ان کے سگریٹ کی مخصوص مہک اٹھتی ہے۔ میں کھڑکی میں سے دیکھتی ہوں وہ برآمدے میں اپنا سُرخ ڈریسنگ گاؤن پہنے، آرام کرسی میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے ہیں۔ میں کافی لے کر ان کے پاس چلی جاتی ہوں۔ اور ان کے قدموں میں، شفاف سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی ہوں۔ وہ اپنا بھاری ہاتھ میرے سر پر رکھ دیتے ہیں۔ اور جانتی ہو۔ میرا جی کیا چاہتا ہے؟" تمہاری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور پلکوں پر عجیب سی چمک آگئی۔ "میرا جی چاہتا ہے۔ میں گاؤں

مگر یوں نہ تھا - وقت اور صرف وقت ہمیں کسی دوسرے انسان کے متعلق کچھ بتا سکتا ہے، بہت دن، مہینے اور سال ہم کسی ایک ہی انسان کو سمجھنے میں صرف کر سکتی ہیں اور پھر بھی اس کے کپکپاتے دل کے کناروں ہی کو ایک نظر دیکھ سکتے ہیں، کنارے جو بیچ پانی کی شورشوں اور گہرائیوں سے اتنی دور ہوتے ہیں اور برستی آنکھوں کی پلکوں کی طرح پانی کو پل بھر اپنے اُوپر ٹھہرنے نہیں دیتے (خواہ وہ جو لوگ ہمارے متعلق رکھتے ہیں)

کچھ دن تمہارے ساتھ رہنے کے بعد مجھے تمہاری متضاد عادتوں کا احساس ہوا - اکثر بیٹھے بیٹھے تم ذرا سی، معمولی سی بات پر اسقدر خوش ہو جاتیں - اتنا ہنستیں کہ تمہاری آنکھوں میں جل تھل مچلنے لگتی - تمہیں گلہری اپنے دونوں ہاتھوں سے کوئی چیز کھاتی، اتنا محظوظ کرتی کہ جیسے ایک اس نظارے کے بعد تمہیں کوئی خوشی نہ چاہئے ہو - میں تمہیں اتنا بے تحاشا ہنستے دیکھتی رہتی - اور پھر کبھی کبھی لائبریری کی سیڑھیوں میں بیٹھی تم دروازے کے ننھے سوراخوں سے چیونٹیوں کو نکلتے دیکھنے لگتیں -

" یہ اتنی تیزی سے کہاں جا رہی ہیں ـــــ مجھے بتاؤ ! " تمہاری آنکھوں میں بڑا تاریک دُکھ ہوتا اور چہرے پر بچّوں ایسی معصومیت ـــــــــ " کیا ہم بھی اسی طرح کسی طرف جا رہے ہیں ؟ "

" ہم کون ؟ "

" ہم انسان ـــــــــــ نہیں اور انسانوں سے مجھے کیا ـــــ صرف میں، وہ جو میں ہوں - "

اور میں ہمیشہ تم کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کرتی - " اپنی لائف انشور کرا لو - ارسطو بنتی جا رہی ہو " ایسے موقعوں پر تم جو زبردستی کی ہنسی ہنستیں اتنی کھوکھلی، اتنی تلخ کہ میں بہت اداس ہو جاتی -

ایک روز بہت تیز بارش ہو رہی تھی - تمہاری کار گیٹ سے باہر رکنے کی بجائے اندر تک آ گئی - میں اتفاق سے برآمدے میں کھڑی تھی - تم نے ہلکے نیلے رنگ کی پلاسٹک کی برساتی سر پر ڈالی اور احتیاط سے قدم اٹھاتی سیڑھیاں چڑھنے لگیں - اور میں کار چلاتی اس حسین اور پُروقار عورت کو دیکھتی رہ گئی -

" یہ میری امّی ہیں - ! " تم نے شاید مجھے اس انہماک سے ان کے پیچھے نظریں دوڑاتے دیکھکر بتایا -

" میری امّی کو مجھ سے جنون کی حد تک پیار ہے ! " تمہارے لہجہ میں ایک سویا سویا سا شکوہ تھا - مجھے تمہاری بات پر ہنسی آ گئی - اور تم بُرا مان گئیں

" سبھی کو ہوتا ہے ! " میں نے تمہارے سنجیدہ چہرے کو دیکھکر بات صاف کرنی چاہی -

" پیار ہوتا ہے ـــــــ جنون نہیں ہوتا ! "

" لیکن تم ان کی ایک ہی ایک بچّی جو ہوئیں ! "

" اس لئے انہیں جنون ہے - واہ " تم پھر نہ جانے کیوں کھلکھلا کر ہنس دیں - " وہ آدھی آدھی رات کو دبے پاؤں میرے پلنگ پر آتی ہیں - اور مجھے چھو چھو کر دیکھتی ہیں کہ میں کہیں چلی تو نہیں گئی ـــــــ کہیں مر تو نہیں گئی ! اوہ مجھے اتنی تکلیف ہوتی ہے - میں انہیں کیسے سمجھاؤں - میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں ؟ "

" تمہارے ڈیڈی نہیں سمجھاتے ان کو ؟ " ڈیڈی کے نام پر تم چونک گئیں اور جھک کر برساتی جھاڑنے لگیں -

" ہاں - میرے ڈیڈی - سمجھاتے کیوں نہیں - سنو ! میرے ڈیڈی بہت ہینڈسم آدمی ہیں - میں ان کی تصویر لاؤں گی - ! "

اگلے دن تم کتابوں کے ساتھ ساتھ سیاہ رنگ کا ایک البم بھی اٹھا لائیں - کالج کے عقبی لان میں، یوکلپٹس کے درختوں کے درمیان تم نے بڑی احتیاط سے البم کھولا -

" یونہی میرا جی چاہتا ہے تم کو اپنے گھر کی تصویریں دکھانے کو " اور تم صفحے اُلٹنے لگیں - اسمیں تمہارے ڈیڈی کی تصویریں تھیں - شکار کھیلتے ہوئے

بلیرڈ کھیلتے ہوئے ۔ گالف کھیلتے ہوئے ۔ کہیں کسی جگہ پر لیکچر دیتے ہوئے ۔ وہ واقعی بہت وجیہہ تھے ۔ پھر تمہاری امّی کی تصویریں تھیں ۔ بھاری غراروں اور قیمتی ساریوں میں ۔ تمہارے ڈیڈی اور امّی دونوں کی ایک ساتھ تصویریں تھیں برف سے ڈھکی پہاڑیوں کے درمیان ۔ اونچی اونچی گرتی آبشاروں کے قریب ریگستانوں میں ، بڑے بڑے گوگلز پہنے ہوئے ۔!

"امّی اور ڈیڈی شادی کے بعد قریباً تمام دنیا گھومے تھے !"

میں نے سوچا تم اپنے ماحول میں کس قدر جچتی ہو ۔ ایسے ماحول میں واقعی باپ صبح یہاں اور شام کو سوئٹزرلینڈ میں ہو سکتا ہے اور ماں سبز رنگ کی لمبی کار چلا سکتی ہے ۔ اس زندگی میں گالف اور بلیرڈ ہے اور گاؤں سے آنے والی سنہری گندم ، آم اور رس ٹپکاتی ناشپاتیاں ہیں ۔ شہر کی موڈرن کوٹھی کے بعد گاؤں کی بڑی بڑی حویلیاں ہیں اور چمکتے صحت مند گھوڑے ہیں ۔ ہرے لہلہاتے کھیتوں کی گرم مہک ہے ۔ اور پھلوں سے لدے باغ ہیں جن میں کسان بیٹھے دن رات رکھوالی کرتے ہیں اور پرندے اُڑاتے ہیں ۔ اور شہر میں بڑی بڑی دعوتیں ہیں ۔ جن میں رئیس لوگ شریک ہوتے ہیں اور بے تکان انگریزی بولتے ہیں ۔ پھر ان رئیسوں کی بیویاں ہیں جن کے منضبط جسم اور شانوں تک کٹے بھاری بھاری بال ہیں ۔ اور جو بڑی عمدہ ٹینس کھیلتی ہیں ۔ ستار پر ان کی بجے بجے دُھن سن کر لوگ جھوم اٹھتے ہیں ۔ اور پھر ان رئیسوں کے رئیس بیٹے ہیں جو ایچیسن کالج میں پڑھتے ہیں اور نیلے رنگ کے اونچے اونچے طرّے پہنتے ہیں ۔ نفیس سوٹوں کے ساتھ بہترین سگریٹ پیتے ہیں ۔ اور گھوڑدوڑ ۔ سر آغا خان ، ہالی وڈ اور کاروں کے نئے ماڈلوں کے متعلق باتیں کرتے ہیں ۔ یہ سب کچھ تم پر جچتا ہے ۔ مگر ایک بات ۔ صرف ایک بات تمہارے ضمیر میں یہ سوال کہاں سے اٹھا ۔ "ہم انسان کہاں جا رہے ہیں ؟" یہ سوال ، یہ سوچ تو ہماری ہے ۔ ہم متوسط طبقہ والوں کی جو خارجی اور داخلی کشمکشوں میں جو گھرے ہوئے ہیں اور آدھی آدھی رات تک کتابوں میں سکون ڈھونڈتے ہیں ۔!

ایک روز باتیں کرتے کرتے تم نے اچانک کہا ——— "کل ڈیڈی آئے تھے !"

"آئے تھے کیا مطلب ، گھر میں نہیں رہتے کیا ؟"

"اوہ ۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں شاید ۔" وہ اکثر باہر رہتے ہیں ۔ ان کا کام ہی کچھ ایسا ہے ۔ آدھی آدھی رات تک انہیں باہر رہنا پڑتا ہے ۔ اس لئے وہ اپنی دوسری کوٹھی میں رہ جاتے ہیں ۔ صبح آجاتے ہیں ۔

مجھے ڈیڈی سے بہت محبت ہے !" اور مجھے تمہاری اس بات پر بھی ہنسی آگئی ۔

"تمہارے لئے یہ بڑی عام ، معمولی سی بات ہے کہ ایک لڑکی کو اپنے باپ سے محبت ہو ۔ مگر میرے لئے تو یہ بہت بڑا سانحہ ہے !"

"سانحہ ! خدا کے لئے پاگل نہ بنو !"

"سانحہ ہی تو ہے ۔ امّی کو اس بات کا بہت دکھ ہے کہ مجھے ڈیڈی سے بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا اُن سے ہے ، وہ ہمیشہ کہتی ہیں ۔ ماں ہمیشہ بچے سے قریب ہوتی ہے ۔ باپ کا پیار کوئی بندھن نہیں ۔ کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے !"

میں نے سوچا ۔ یوں ہوتا ہے ۔ ایسے ماحول میں لوگ اپنی اپنی شخصیت کی گرفت آزمایا ہی کرتے ہیں ۔ جب سوچنے اور سمجھنے کو اور کچھ نہ ہو تو اناء کی گتھیاں ہی سلجھائی جاتی ہیں ۔ "ڈیڈی جب کبھی رات ہمارے پاس رہتے ہیں تو مجھے ان کو دیکھ کر بہت سکون ملتا ہے ۔ صبح صبح ان کے سگریٹ کی مخصوص مہک اُٹھتی ہے ۔ میں کھڑکی میں سے دیکھتی ہوں وہ برآمدے میں اپنا سرخ ڈریسنگ گاؤن پہنے ، آرام کرسی میں بیٹھے ہوتے ہیں ۔ اور آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے ہیں ۔ میں کافی لے کر ان کے پاس چلی جاتی ہوں ۔ اور ان کے قدموں میں ، شفاف سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی ہوں ۔ وہ اپنا بھاری ہاتھ میرے سر پر رکھ دیتے ہیں ۔ اور جانتی ہو ۔ میرا جی کیا چاہتا ہے ؟" تمہاری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور پلکوں پر عجیب سی چمک آگئی ۔ "میرا جی چاہتا ہے ۔ میں گاؤن

کی کوئی معمولی سی لڑکی ہوتی اور اسوقت میرے بال گندھے ہوتے اور سر پہ موٹا سا دوپٹہ ہوتا۔ اور جب ڈیڈی یوں میرے سر پہ ہاتھ رکھتے تو میں بابا بابا کہہ کر ان کے قدموں سے لپٹ جاتی۔ اور وہ ایک سادہ دل دیہاتی کی طرح اپنی تیزی سے رُلتی مجھ کو دیکھا کر رو دیتے! مگر اس ماحول کی زنجیریں تو بہت سخت ہیں۔ ڈیڈی کی سنہری آنکھوں کو مری ٹھنڈک ملتی ہے۔ ان کی ہر بات مجھے اتنی عزیز ہے کہ جی چاہتا ہے بس ہر وقت یوں ان کے قدموں میں بیٹھی رہوں۔ مگر ممی صبح کی ورزش کر کے آجاتی ہیں اور بڑے تکلف سے سنترہ کھاتے ہوئے نئے بجٹ کی بات چھیڑ دیتی ہیں۔ "روزی۔ یہ کیا تم یوں بیٹھی" اور تمام طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔"

پھر ایک دن تم میرے قریب بیٹھی کھڑکی پر اوندھے منہ گر کے گہری گہری سسکیاں لینے لگیں۔ میرے پوچھنے پر تم نے بتایا۔ رات ان دونوں کی بھر لڑائی ہوئی! کل رات ڈیڈی اتفاق سے جلد لوٹ آئے۔ امی کلب جانے کے لئے تیار بیٹھی تھیں۔ ڈیڈی نے کہا آج ہم تینوں مل کر یہاں شام گزاریں گے اور ریکارڈ سنیں گے۔ امی نے بڑے تردد سے نفس دیا۔

میں باسکٹ کا غذ کی طرح لرزنے لگی۔ اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ امی نے کہا! "صلاح الدین تم نے کبھی آج تک میری قیمت نہیں پہچانی۔ تم ہمیشہ میرے راستے میں حائل ہوتے رہتے ہو۔"

ڈیڈی کا چہرہ دکھ کی شدت سے پیلا پڑ گیا۔ انہوں نے غصے سے کانپتی آواز میں صرف اتنا کہا۔ "واقعی تم غلط جگہ پر آگئیں۔ تمہیں اپنے حسن کے لئے بہت موافق ماحول چاہیئے تھا۔ مگر خدا کے لئے روزی کا خیال کرو۔" امی چیخ کر قہقہہ مار کر ہنس دیں۔ "روزی ——— روزی تو صرف میری ہے میں اس کی ماں ہوں۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں۔ وہ صرف مجھی سے پیار کرتی ہے۔ ———!"

ڈیڈی جن قدموں سے آئے تھے انہیں قدموں سے لوٹ گئے اور امی رات بھر مجھے اپنے سینے سے لگائے رہیں۔ "روزی۔ تم مجھے چھوڑ کر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ میں جانتی ہوں۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا ———" وہ رات بھر کراہتی رہیں۔ "یہ کیا قیامت ہے۔ آخر مجھے بتاؤ۔ مجھ سے یوں کیوں کھیلا جا رہا ہے؟" تمہاری آواز کا کرب اب بھی جیسے میرے سارے وجود میں سرسراتا جاگ اٹھتا ہے۔ میں نے سوچا میں تمہیں دلاسا دوں۔ مگر کس طرح کن الفاظ میں!

"مجھے بتاؤ قصور کس کا ہے؟"

اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

ایسا ہوا کرتا تھا کہ رخ پہ ڈھلتے ان زرد پتوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا کہ تم زندگی بھر ان دو انسانوں سے ایسی شدید محبت کرتی رہیں۔ اور اپنے جذبات کی اس شدت میں سپ چاپ سلگتی رہیں۔ تمہارے جذبات، احساسات کی، تمہارے وجدان کی ایک یہی تو پناہ گاہ تھی۔ مگر جب تمہیں اپنا آپ ان دونوں کے ہاتھ میں محض کھلونا محسوس ہوتا تو تمہیں اپنے احساسات کی صداقت پر یقین نہ رہتا۔ یہاں پر کوئی چیز سچ نہیں۔ یہاں کچھ بھی حسین نہیں۔ یہاں مٹھاس نہیں۔ صرف تلخی ہے۔ جھوٹ اور سود و فریب ہے۔ دلوں کی تاریکی ہے اور وہ اندھی راہیں جن پہ ہم انسان بھاگے جا رہے ہیں۔ تمہاری کائنات لرز کر ریزہ ریزہ ہو جاتی۔

آج میں تمہارے متعلق بہت کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔ کہ معلوم کب، کس لمحے، تم اور بہت سی چیزوں کی طرح میری یاد کی راہوں سے بہت دور نکل جاؤ۔ آج میں بڑی شدت سے تمہاری ذات کی ہر تفصیل کو ذہن میں تازہ کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں برسات سے کتنا پیار تھا۔ تم گھنٹوں پانی برستا دیکھتی تھیں "اگر یہ برسات بھی نہ ہوتی، اور ہمیں کسی اور ہی ذریعے سے پانی مل جایا کرتا تو ہم انسان کیا کرتے۔ ہمارے ذوقِ حسن کا کیا بنتا۔" تم نے ایک بار موسلا دھار بارش میں برساتی اوڑھے کہا تھا۔

"جب کالے بادل جھک آتے ہیں اور ٹپ ٹپ بوندیں برسنے لگتی ہیں تو دل کو کیسا سکون، کتنی ٹھنڈک ملتی ہے، مجھے بالکل یوں لگتا ہے۔ جیسے میں ڈیڈی سے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ اور جب پانی کا مسلسل شور اٹھتا ہے۔ پرنالے فر فر بہنے لگتے ہیں۔ اور درخت سہمے بچوں کی طرح چپ چاپ سر جھکائے اس پانی میں کھڑے رہتے ہیں۔ تو میں اس خیال سے اتنی خوش ہو جاتی ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ اور یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔!"

"تمہیں اکثر خوش رہنا چاہیئے معذی ——— یہ کیا تم اپنے دل کی صاف شفاف گلیوں میں اتنی کوشش سے گرد و غبار ڈھونڈتی پھرتی ہو؟"

ایک بار میں نے تم سے کہا تھا۔ ——

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ سنو! جب اچانک کبھی، کسی لمحہ مجھے عجیب قسم کے اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ ہر چیز اتنی اچھی، اتنی وسیع نظر آتی ہے تو میری آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو آجاتے ہیں۔ میں بے تحاشا ہنسنے لگتی ہوں۔ پھر میرا شدت سے جی چاہتا ہے میری اس خوشی میں کوئی اور بھی شامل ہو۔ وہ سب کچھ جو میں دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں کوئی اور بھی دیکھے اور محسوس کرے۔ اتنی زیادہ خوشی کے ساتھ مجھے اپنا آپ تنہا بڑا عجیب، بڑا بے جوڑ سا لگتا ہے اور میں سوچتی ہوں امّی اور ڈیڈی سے کہوں۔ آؤ ہم تینوں مل کر خوش ہوں۔ میں بھاگی بھاگی ان کے پاس جاتی ہوں۔ مگر امی "مریر" کا تازہ پرچہ ہاتھ میں لئے سگریٹ پی رہی ہوتی ہیں اور ڈیڈی کا کمرہ خالی ہوتا ہے اُن کے سلیپر بڑے قرینے سے پلنگ کے نیچے رکھے ہوتے ہیں!"

تمہارے الفاظ، تمہاری آواز کی لہروں میں پروئے اسی طرح زندہ، میرے ذہن کی سیڑھیوں سے قدم قدم اتر رہے ہیں۔ اور سامنے املتاس کی زردی میں میں دیکھتی ہوں۔ تمہارے کالے بال رخساروں تک جھک آئے ہیں۔ اور تم اپنے ٹینس ریکٹ کے تاروں میں انگلیاں پھیر رہی ہو۔ تمہارے ناخنوں پر ہلکے پیازی رنگ کی کیوٹکس ہے اور فیروزے کی وہ نازک سی انگوٹھی ڈھلک کر تمہاری انگلی میں بہت نیچے تک آگئی ہے تمہارے کانوں میں وہ سفید آویزے جھلملاتے ہیں۔ جو تم کبھی کبھار پہنتی تھیں۔ اور وہ خوش رنگ قیمتی ساریاں جو تم کالج کی پارٹیوں اور ڈراموں میں پہنتی تھیں۔ اور تمہیں یوں سجا سجایا، پروقار اتنا زندہ، اتنا قریب دیکھ کر میرا دل ڈوب رہا ہے جب کوئی چیز کبھی نہ آنے کے لئے چلی جائے تو اس کی قربت کا تصور بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔

ایک روز تم بہت خاموش تھیں۔ میرے لاکھ بات کرنے پر بھی چپ چپ سی رہیں۔ کیا بات ہے روزی؟ مجھے معلوم تھا تم بالآخر مجھے سب کچھ بتا دوگی!

پھر جب تم ٹینس کھیل کر لوٹیں تو گھاس پر میرے قریب ریکٹ ڈال کر فوراً بولیں۔ تم نہیں جانتیں۔ میں بہت بُری ہوں۔ میرا دل بڑا تاریک ہے اگر تم مجھے دیکھ سکو، میرے دل کو تو کبھی مجھ سے بات نہ کرو!" میں خاموش رہی۔

"کل امّی اور ڈیڈی کا پھر جھگڑا ہوا۔ ڈیڈی دفتر چلے گئے۔ اور امّی مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ اُن کے آنسو، میرے رخساروں، میری گردن اور باہوں کو بھگوتے رہے۔ اُن کی سسکیوں میں اتنا دکھ، اتنا درد تھا۔ کہ میری جگہ کوئی پتھر ہوتا تو پگھل کے رہ جاتا مگر مجھے تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میں اُن کو یوں دیکھتی رہی جیسے کسی اجنبی عورت کو دیکھ رہی ہوں۔ میرے دل کی جگہ اب کوئی سیاہ پتھر ہے مجھ سے کوئی دکھ بھری بات کرو۔ مجھ کو رلاؤ خدا کے لئے اگر تم میری دوست ہو تو مجھے رلاؤ۔ میری آنکھیں آنسوؤں کو ترستی ہیں!"

تم عجب وحشت میں بولتی چلی گئیں۔ اگلے روز تم آئیں تو تمہاری آنکھیں سرخ تھیں۔ مگر چہرے پر بڑی پرسکون مسکراہٹ۔ "آج صبح جب امّی میرے لئے کافی لے کر آئیں تو یکدم مجھے احساس ہوا مجھے ان سے شدید محبت ہے اور میں ان سے لپٹ کر خوب روئی! وہ میرے بال تھپتھپا کے بولیں۔ روزی تم کیوں رو رہی ہو۔ تم تو میرے دل کی پناہ میں ہو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم تو میرے پاس ہو۔ میری حفاظت میں۔ ماں کی حفاظت بڑی زبردست ہوتی ہے!" اور اسی وقت کہیں میرے دل کے کونے سے آگ کی تیز لپٹ سی اٹھی۔ میرے سامنے ڈیڈی کا اونچا لمبا وجود تھا۔ اسے ڈیڈی میں بھی اُن کے قدموں سے لپٹ گئی۔ مجھے تو تم سے اتنی محبت ہے۔ میں تو دیوانی ہوں۔ میرا جی چاہا ان دونوں کی طرف اپنی باہیں پھیلا دوں۔ مگر وہ تو اتنی دور تھے۔

امی ——————— پھیل پھیل کر میری باہیں دُکھنے لگیں ——————

"اور میں تنہا کھڑی رہ گئی ہوں۔" تمہاری نم آلود پلکیں تیزی سے جھپک رہی ہیں۔ اور شفاف پیشانی پر بہوے ہوئے لکیریں اُبھر رہی ہیں تم نے ایک بار کہا تھا۔ میرے دو وجود ہیں دو حصے ہیں۔ ایک امی کا پندار، دوسرا ڈیڈی کا۔ میں کہاں ہوں . . . مجھے بتاؤ؟"

"کیا تم پندار کے بکھیڑوں میں اُلجھ گئیں" میں نے تم سے کہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ پندار وندار سب غلط ہے اگر ایک بار ہم اپنی روح کے حُسن اور بلندی کو اپنے لئے کافی سمجھیں۔ اگر ہم اس پر زندگی گزار سکیں۔ اگر وہ لوگ جو ہماری زندگی ہیں۔ ہم کو سمجھ سکیں۔ دیکھ سکیں۔ مگر یہ تاریکیاں بڑی بھیانک ہیں۔"

اب میں تم سے کہتی ہوں۔ اپنی اپنی روح کی صداقت کا یقین تو بڑی کٹھن بات ہے۔ اس کے پیچھے تو لوگ بنوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرے ہیں۔ اگر یہ مل جائے تو غم کس بات کا ہے؟ ہم خود اپنے کو نہ پالیں۔ مگر ہم انسانوں کو تو یونہی اُمید و بیم کے پانیوں میں ڈوبتے اُبھرتے جینا ہوتا ہے۔

"یہ دل ہے نا جو سب کچھ محسوس کرتا ہے؟" تم نے ایک دن بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"کیوں اس بے چارے کو عمرِ قید سنانے جا رہی ہو؟"

"نہیں۔ تم زور سے ہنس دیں۔ سوچتی ہوں ——————— اگر کسی کو بتانا چاہیں کہ ہم کیا محسوس کرتے ہیں تو کیسے بتائیں۔ دل کھول کے رکھ دینا تو بس محاورہ کی بات ہے نا۔ خالی لفظ اس کی گہرائیوں میں کون جھانک سکتا ہے ———"

"شاعری مت کرو، لو سموسے کھاؤ!"

"نہیں آج میں فیصلہ کر کے چھوڑوں گی!"

"کیوں مجھے دل دکھانے کا ارادہ ہے کیا؟ ہر انسان کا دل اُس کی مٹھی کے برابر ہوتا ہے ——— ادھر لاؤ اپنا ہاتھ ———!"

تم سر جھکا کر ہنسنے لگیں۔ میرا جی چاہتا ہے۔ کاش میں سلطان باہُو ہوتی اور دوہے کہتی جنگلوں میں گھوما کرتی!

اب وہ دن دُکھتی چوٹ بن کر ذہن پہ اُبھر رہا ہے جب تم نے بڑے اطمینان سے کہا تھا۔ "قصہ ختم۔ ڈراپ سین آگیا۔ پردہ گر گیا!"

"یعنی۔؟" میں تمہارے لہجہ کی سختی سے کانپ گئی۔

"طلاق اور کیا! امی بہت مطمئن ہیں۔ تمام جائداد بٹ چکی ہے دونوں کو اپنا اپنا حصہ مل گیا۔ بس ایک میرا فیصلہ باقی ہے۔ سنو۔ میں بھی تو کوٹھی کار اور زمین کے مربعوں کی طرح جائداد ہی کی ایک چیز ہوں۔ بس ایک بے جان چیز۔ کل مجھے کورٹ میں جا کر فیصلہ دینا ہوگا۔ میں کس کی ملکیت بننا چاہتی ہوں ———!"

اُس دن پہلی بار میں نے تم کو، تمہارے دکھ کو اپنے سے اتنا قریب محسوس کیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے تمہارے ہاتھ تھام لئے۔ مگر وہ بالکل سرد تھے۔ اور تم نے بڑی اجنبی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔ روزی خدا کے لئے یوں نہ دیکھو۔ روؤ۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر روؤ۔ اُن دو انسانوں پر جن کو تم اپنی متاعِ حیات سمجھتی آئیں۔ آج تمہارے وجود کا کوئی سا ایک حصہ کٹ جائے گا۔ اپنی تکلیف، اپنے دکھ پر آنسو بہاؤ۔ یوں پتھر بن کر مجھے نہ دیکھو۔ دیکھو باہر ٹپ ٹپ بوندیں برس رہی ہیں۔ کائنات کے حُسن اور انسانی زندگی کے کرب پر رو دو۔ میں نے تم سے کہنا چاہا تھا۔ مگر نہ کہہ سکی۔

اُس روز گھر جاتے ہوئے تم نے کہا تھا۔ "جانے کیوں مجھے ایسا سکون سا آگیا ہے۔ وہ دونوں مجھ سے اپنے اپنے ڈھنگ میں محبت کرتے ہیں۔ میرا کیا ہے، میرے دل کی پکار کسی نے بھی سُنی تو کیا ہے؟ اس کی گہرائی میں کوئی بھی نہ جھانک سکا تو کیا ہے؟ میں ان دونوں کو کبھی دکھ نہ دوں گی۔

میں تو اپنی محبت کا ثبوت دے سکتی ہوں؛؛

اُس روز تم نے آسمانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اور خلافِ معمول بالوں میں املتاس کے پھول لگائے ہوئے تھے۔ جاتے ہوئے تم گیٹ پر میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑی رہیں۔ سامنے کار میں تمہاری امی تمہارا انتظار کر رہی تھیں۔

"مجھے یہ دن بڑے اچھے لگتے ہیں۔ آخر زندہ رہنا بڑی نعمت ہے میں تو ہمیشہ زندگی سے محبت کروں گی۔ اس کے موسموں سے مجھے اتنا لگاؤ ہے" پھر خدا حافظ کہہ کر تم تیز تیز قدم اٹھاتی چلدیں۔

روزی! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اُسی رات تم خواب آور گولیاں کھا کر ہمیشہ کی نیند سو جاؤ گی۔ تو میں تمہیں جاتے ہوئے دُور تک دیکھتی رہتی۔ میں تم سے تمہارے بالوں کے وہ املتاس کے پھول مانگ لیتی۔ میں تم سے ایک لمحہ اور رکنے کو کہہ دیتی۔ مگر تم تو بالکل ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی طرح میرے قریب سے، میرے ہاتھوں سے نکل کے گزر گئیں۔ اگلے روز تمہیں عدالت میں اپنے دل کا فیصلہ سنانا تھا کہ تم کس کی ملکیت بننا چاہتی تھیں؟ مگر تم تو اپنے دل کی آواز گہرے پانیوں میں دبائے چُپ چاپ چلی گئیں۔

روزی برسات سے پہلے کے یہ وہی دن ہیں جب تم برسات کے آنے کے خیال سے ساون کے گیت، گایا کرتی تھیں (جھولا ڈرمی انبوا کی ڈال پہ) اب جامنوں میں ہو رہے ہوئے رس بھر رہا ہے برسات آئے گی۔ پانی تو ہمیشہ برستا ہے۔ پانی تو یونہی برستا رہے گا۔ اور سب کچھ دُھل جائے گا۔ مکانوں کی یہ مٹیالی اینٹیں سُرخ ہو جائیں گی۔ اور میں اُس لمحہ کے ماتم میں آنسو بہانا چاہتی ہوں۔ جب برسات آئے گی۔ یہ نالے فرفر بہنے لگیں گے۔ پانی کا شور اُٹھے گا اور میں تم کو یاد نہ کروں گی۔ چیزیں مٹ کر دوسروں کے ذہن و دل کے لئے ابدی، لافانی نہیں بن جایا کرتیں۔ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے۔ تم اپنی فنا سے کسی کو کبھی اپنی بقا کا۔ اپنے خوبصورت دل کی بقا کا احساس نہ دلا سکیں۔ یہاں اس دنیا میں انسان اسی طرح اپنے وجدان کے لہو میں رنگا ہے۔ یہاں حافظے اسی طرح زُود فراموش ہیں۔ املتاس کے پھول ہواؤں میں اپنا سونا بکھیرتے ہیں۔ ٹھنڈی چاندنی میں پھولوں کی مہک اُڑتی ہے انسان تاریکی میں، پندار کی تاریکی میں گم ہے۔ تم مٹ کر بھی یہاں اُجالا نہ کر سکیں۔ خشک ریگستانوں میں ببول آگئے۔ اور آبلہ پا محوِ سفر ہیں۔ تمہارا دل کس سرزمین کو اپنے لہو سے سیراب کر گیا۔ مجھے بتاؤ کہ میں یہاں کھڑی اُس لمحہ پر روتی ہوں۔ جب میں تمہارے متعلق کبھی نہ سوچوں گی۔

○

دل دریا سمندروں ڈونگھے تے کون دلاں دیاں جانے ہُو

(سُلطان باہُو)

نوید انجم

شبِ رفتہ

شہرزانہ نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں کو ہولے سے بند کر کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی سے گھنی پلکوں کو چھُوا اور پھر حیرت کے سے انداز کے ساتھ آنکھیں کھولے آپ سے گھورنے لگی۔

اُس نے چھوٹا سا ایک کنکر تالاب کے پُرسکون پانی کی طرف پھینکا۔ ٹپ کی سی آواز آئی اور کنکر پانی میں ڈوب گیا —— ایک چھوٹا سا دائرہ ابھرا اور پھر دہ پھیلتا ہی چلا گیا۔ پھر اس ایک دائرے کی کوکھ سے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے دائرے جنم لے اٹھے اور بڑے ہونے لگے۔ اتنے بڑے! اتنے بڑے کہ شہرزانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود ایک گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور یہ دائرے دل کے طوفان ایسے شاید تھے کہ نہ وہ ان میں ابھر سکی تھی اور نہ ہی ڈوب سکی تھی۔ بلا سے وہ ایک بار ڈوب ہی جاتی تو اتنی تکلیف اور دکھ تو نہ ہوتے۔ یہ بھی کیا کہ زخم رس رس کر رستے رہ جاتے ——!

وہ اپنے خیالات کی رو میں بہتی بہتی جیسے راستے میں کسی پتھر سے ٹکرائی اور چونک گئی۔ وہ کہہ رہا تھا "شازی! مجھے سنہری مچھلیاں بہت پسند ہیں!"
"سنہری مچھلیاں؟!" اُس نے زیرِ لب اس کی کہی ہوئی بات دہرائی۔ اور پھر اس کی گردن کے نیچے نیلی رگ پھڑکنے لگی۔ اس کے ہاتھ ایک دم بہت ٹھنڈے ہو گئے۔ آنکھوں کی سیاہ پتلیاں دھیرے سے پھیلیں اور تالاب میں پھیلتے ہوئے گرداب اس کی آنکھوں میں سمٹ گئے۔

"شازی! —— او شازی!" وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔ "تم کہاں ہو؟"

وہ چنبیلی کی بیل کے پیچھے سرو کے لمبے درخت کے قریب چھپی ہوئی جھانک جھانک کر دیکھنے لگی۔ پر منہ سے کچھ نہ بولی۔
"شازی بتاؤ نا —— تم کہاں ہو ——" وہ اس بار غصے سے چیخا۔ پھر جھلاتے ہوئے اُس نے اپنے بازو ہوا میں لہرائے اور ہاتھوں کی مٹھیاں تان کر چلایا۔ "ہم نہیں کھیلتے —— بس اب ہم نہیں کھیلتے ——!"

پیر پٹختے ہوئے وہ اپنی جگہ سے باہر آ گئی۔ "یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ اونہہ! اپنی باری یوں رو دیتے ہو ——!"

"میں نہیں روتا ——" وہ چیخا —— "میں کب روتا ہوں ——"

اس کی یہ عادت شہرزانہ کو بالکل پسند نہیں تھی۔ اچھا بھلا کھیل کھیلتے ہوئے ایک دم سے یونہی رو رو دینا کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔ دیکھو تو —— اتنی دیر سے وہ چھپ رہی تھی اور وہ تھا کہ اُسے خوب خوب ستانے کے بعد ہاتھ آیا تھا اور اب جب اُس کی باری تھی شازی کو ڈھونڈنے کی، تو اُس نے کھیل نہ کھیلنے کا اعلان کر دیا تھا۔

[illegible]

"مجھے برا کہا تو میں تمہارے بال کھینچ لوں گا۔ ہاں! [illegible] کہا "تم بُرے ہو۔ بہت بُرے!"
شہرزانہ نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ دیے۔ اس کے بال لال ربن کی مدد سے کتنے خوبصورت انداز سے سنوارے گئے تھے اور [illegible] کے بڑے سیاہ بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ گندا لڑکا ہمیشہ ایسے موقعوں پر اس کے بالوں کو کھینچ کر خراب کر دیتا تھا ——!

"ڈرکر وہ برآمدے کی طرف مڑی —"جاؤ — جاؤ اب ہم تو تم سے کبھی بات بھی نہ کریں گے۔ ڈیڈی ہمارے لیے مچھلیاں لائیں گے وہ بھی تمہیں نہیں دکھائیں گے ——!"

وہ اس کے پیچھے لپکنے کو تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا "تو جاؤ ہم کب تمہیں بلاتے ہیں!"

وہ منہ بسورتے چپکے سے اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ پر زیادہ دیر وہاں اس سے بیٹھا نہ گیا۔ باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا ایک پٹ نیم وا کرکے وہ جاوید کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہاں کوئی بھی تو نہیں تھا ——! جانے کدھر چلا گیا اب —وہ جھلائی۔ اس سے تو اتنا بھی نہ ہوا کہ آکر منا ہی لیتا، اور نہ تو اسے جاوید کی کیا پروا ہے۔ بڑا آیا بدمزاج لڑکا ——!

اُسے رہ رہ کر اس کی شرارتیں یاد آنے لگیں، ابھی اس روز ہی کی بات ہے، الٰہ دین کا چراغ پڑھتے ہوئے جاوید نے بڑی رازداری سے کہا تھا۔ "شازی! میں ایک طریقہ جانتا ہوں — بس اس سے ہمیں الٰہ دین کا چراغ مل سکتا ہے!"

"کیا؟ —— مجھے بتا دو نا ——" شہزانہ نے جھٹ سے کہا۔

"ارے واہ —— یونہی کیوں بتاؤں؟ —— پہلے ہمیں کچھ کھلاؤ نا ——" وہ شریر ہنس ہنس کے بولا۔ اس کی وہ آنکھیں جو کبھی بھوری اور نیلی ہو جاتی تھیں، اس لمحے بہت کالی سیاہ اور بڑی تیز نظر آ رہی تھیں۔

شہزانہ نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا —— خالی ہاتھ! اس نے دونوں ہتھیلیاں ملائیں اور پھر ہولے سے بولی۔ "میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے ——"

"وہ مٹھائی کہاں ہے جو مسز خان نے کل تمہیں دی تھی؟" اس کا سفید رنگ یہ کہتے ہوئے تدرے بھورا سا ہو رہا تھا۔

"ارے واہ —— مجھے کب دی تھی، وہ تو ممی کے لیے چاکلیٹ اور مٹھائی لائی تھیں، ممی نے مجھے پاس بٹھا کر دو ٹافیاں ہی تو دی تھیں —— اور وہ میں نے اسی دم کھا لی تھیں" وہ تیزی سے بولی، پھر بولی "اور تمہیں بھی تو ایک ٹافی میں نے دی تھی ——"

"اتنی اچھی بات صرف ایک ٹافی پر تو کوئی نہیں بتاتا ——" وہ آنکھیں شرارت سے نچاتا ہوا بولا۔

"جاؤ —— نہ بتاؤ ——" وہ روٹھ گئی۔

وہ اس کے قریب سرک آیا۔ کتاب ایک طرف رکھ کے اس نے سرگوشی کی "میں بتاؤں، وہ مٹھائی کہاں رکھی ہے؟"

"ہاں —— ہاں ——" وہ جلدی سے اور قریب ہو گئی "ممی نے مٹھائی تو چکھائی ہی نہیں"

"آؤ —— باورچی خانے کی الماری میں پلیٹ رکھی ہے!" اس نے اپنے سیاہ بالوں بھرے سر کو ہلکے سے ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے دبے قدموں باورچی خانے کی طرف جا پہنچی۔ دروازے میں سے جھانک کر پہلے جاوید نے دیکھا، اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرکے ہولے سے کہنے لگا "جاؤ —— وہاں کوئی نہیں ہے ——"

اسے اعتبار نہ آیا، آہستہ سے آگے بڑھ کر جھانکا۔ واقعی وہاں کوئی نہیں تھا۔ خوشی سے اس نے جاوید کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور مسکرائی۔ پھر ہولے ہولے سے اندر چلی گئی۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس آیا۔ "اس الماری میں ہے —"

وہ الماری شہزانہ سے اونچی تھی۔ اس کی طرف دیکھ، وہ منمنائی "تم تو مجھ سے لمبے ہو — تم نکال دو نا —"

"نہ بابا — گھر تمہارا ہے — تم ہی نکالو —" اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

شہزانہ نے کونے میں پڑا ہوا گھی کا کنستر دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ جلدی سے بڑھی اور کنستر کو دھکیلتی ہوئی الماری کے نیچے لے آئی۔ پھر اس پر چڑھ کر وہ الماری میں مٹھائی کی پلیٹ ڈھونڈنے لگی۔

جاوید نے باہر جھانک کر کہا "جلدی کرو — جلدی کرو۔"

وہ ڈر کر کانپی "کوئی آ گیا؟"

"نہیں —" وہ بولا پھر جلدی سے شریر آواز میں چلایا "خالہ آ رہی ہیں — تمہاری ممی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ گھبرا کر مڑی اور فرش پر گری — کنستر ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے گرا اور وہ تھوڑا سا گھی جو اس میں تھا فرش پر بہنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھی۔ ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی پلیٹ تھامے ایک نظر دیکھا اور پھر جاوید کو باورچی خانے میں سے باہر بھاگتے دیکھ کر وہ بھی باہر کی جانب بھاگی۔

"بلّی — بلّی!" ممی کی آواز آئی۔

اور وہ دونوں سہمے ہوئے گلاب کے اُن پودوں کے پیچھے چھپے ہوئے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ جو مالی نے ٹھیک طرح سے تراشے نہ تھے اور پودوں کی بجائے گلاب کی جھاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ جاوید خفا ہو رہا تھا۔

"سارا قصور تمہارا ہے۔" اس نے جلدی سے قصور اس کے سر تھوپ دیا۔

اور اس بات کو کوئی زیادہ دن نہ گزرے تھے جب وہ سنڈریلا کی کہانی پڑھ رہی تھی۔ جاوید کہانی سنتے ہوئے اپنی آنکھیں موند کر بولا —

"ہا — ہا — دیکھا شازی! جادو کے زور سے چوہوں کو گھوڑا بنا دیا — !"

شہزانہ نے سر ہلایا۔ "اگر ہمیں بھی کوئی پری مل جائے تو کیسا رہے؟ — پھر ہم بھی چوہوں کو پکڑ کر اس کے پاس لائیں اور وہ جادو کی چھڑی کے ساتھ انہیں گھوڑا بنا دے — آہاہا — کتنا مزا آئے!"

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ "اور پھر ایک بہت بڑے کدو کو ایک بہت ہی بڑی گھوڑا گاڑی بنا دے — !" اس نے بہت پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"اور ہم بھی بادشاہ کے محل میں جائیں۔" وہ خیال میں کھو گئی "میں تو خوب ناچوں — خوب ناچوں!"

وہ اس حسین تصور میں ڈوب گئی۔ اسکول میں ڈراما بھی تو یہی کھیلا جانے والا تھا۔ اور وہ گندی سی لڑکی ریٹیا، سنڈریلا کا پارٹ کرنے والی تھی — اسے رہ رہ کر یہ خیال آنے لگا — کاش وہ سچ مچ سنڈریلا بن جاتی تو وہ ریٹیا اس سے کتنا جلتی!!

وہ چونکی — وہ کہہ رہا تھا۔ "میں ایک پری کو جانتا ہوں — وہ میری بڑی پکّی دوست ہے!"

"کہاں ہے وہ؟" وہ چیخ کر بولی۔ "مجھے بھی بتاؤ نا!"

اُس نے سر ہلایا۔ "وہ رہتی ہے وہاں —" اس نے باغ کی ایک طرف اشارہ کیا۔ "اس گلاب کے پودے کے پاس رات کی رانی کے پودے کے درمیان والے سوراخ میں — !"

شہزانہ نے اس کی بات پوری بھی نہ سنی اور بھاگی — وہ پیچھے بھاگا چلا گیا۔ شہزانہ نے بے صبری سے سوراخ میں ہاتھ ڈالنا چاہا — وہ زور سے چیخا: "ارے! یہ کیا کرنے لگی ہو — بیچاری ننھی سی پری کا پیارا سا گھر ٹوٹ گیا تو وہ ہم سے ناراض ہو جائے گی!"

"اچھا — پھر کیا کروں؟" وہ بڑی جلدی اس کا کہا مان گئی۔

وہ سوچ سوچ کر کہنے لگا: "ٹھہرو — کیوں نہ ہم پہلے چوہے پکڑ کر لے آئیں — اور وہ کدو بھی لے آئیں۔ پھر جب پری آئے تو وہ ایک دم اُن کو گھوڑا گاڑی بنا دے — ؟ اس وقت تو پری بیچاری سو رہی ہو گی!"

"ہاں — ہاں یہ ٹھیک ہے!" شہزانہ نے پھر سر ہلایا۔

وہ بولا: "اچھا میں پری کو جگاتا ہوں — تم جا کر چوہے پکڑ لاؤ —"

"مگر چوہے کہاں سے پکڑوں؟" وہ بسورنے لگی۔

"وہ چھت والے کمرے میں،" اس نے چہک کر کہا، "جدھر انکل نے گندم کی بوریاں رکھوائی ہیں۔ میں نے کل ہی وہاں پر بہت سے موٹے موٹے چوہے دیکھے ہیں۔"

وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ بھاگم بھاگ چھت پر گئی اور کمرے میں جا کر چوہے لگی دیکھنے — ارے ہاں! وہاں بہت سے چوہے پھٹی پرانی بوریوں کو کھا رہے تھے۔ اور ادھر اُدھر گندم پڑی ہوئی تھی۔ شہزانہ نے جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور ایک ڈنڈا اٹھا کر چوہوں کو مارنے لگی۔

مگر وہ بھلا ہاتھ آنے والے تھے؟ وہ ادھر سے ادھر تیزی سے بھاگنے لگے اور غصے میں شہزانہ زور زور سے ڈنڈے مارنے لگی۔ — دو ایک چوہے مر گئے —

"آہا — ارے لو — دو چوہے تو میں نے پکڑ لیے —" شہزانہ نے مرے ہوئے چوہوں کو دُم سے اٹھا کر چیختے ہوئے کہا۔

ممی شور سن اوپر بھاگی آئیں۔ ان کے پیچھے جاوید بھی آ گیا۔

"ارے — ارے — چوہے!" ممی نے چیخ کر کہا "گندی لڑکی! چھوڑ! ہاتھ میں کیوں اٹھائے ہوئے ہیں؟"

"ممی — پری کے پاس لے جانے ہیں!" وہ سہم کر بولی۔

"اری پاگل ہو گئی ہے کیا؟" ممی نے گرج کر کہا "چھوڑو — چھوڑو تمہارے ہاتھ ناپاک ہو گئے!"

شہزانہ نے ڈر کر چوہے چھوڑ دیئے اور ہاتھوں سے آنکھیں مل مل کر رونے لگی۔

ممی چلائیں: "گندی — گندی! — شانی گندے ہاتھ آنکھوں کو مت لگاؤ!"

اور اس روز شانی کو کس قدر ڈانٹا گیا تھا: "بہت شریر ہو گئی ہو تم! اب کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں بیٹھے گا — ناپاک چوہوں کو ہاتھ لگاتی ہے — توبہ — بھلا چوہوں کو پکڑنا بھی کوئی کھیل ہے — اور — اور —"

وہ بہت روئی۔ جاوید پہلے تو چڑاتا رہا پھر اُسے لگا دلاسہ دینے: "یہ سب لوگ بیوقوف ہیں — لیکن تم نے شور کیوں مچایا تھا؟ اور پھر دیکھو تم نے ان چوہوں کو مار کیوں ڈالا — ہائے — میں دیکھ کر آیا ہوں۔ لال لال خون نکل رہا تھا۔ تم نے زندہ چوہے کیوں نہیں پکڑے — اور پھر شانی! تم نے پری کا گھر بھی ہاتھ ڈال کر توڑ ڈالا۔ پری ہم سے ناراض ہو گئی —!"

وہ اس سے جھگڑنے لگی۔ — "سارا قصور تمہارا ہے —"

"میرا نہیں —— تمہارا ہے —"

اور پھر دونوں کی لڑائی ہو گئی۔ اس روز بھی تو شہزانہ ہی نے اُسے منایا تھا۔ اور اب دیکھو نا۔ وہ اکیلی کمرے کی کھڑکی کے ساتھ لگی بیٹھی ہے اور وہ روٹھ کر جانے کہاں چلا گیا ہے —" اونہہ —— میری بلا سے ——!"

اسی شام ڈیڈی بڑی خوبصورت سنہری مچھلیاں لے کر آئے تو شہزانہ کا جی بُری طرح مچلنے لگا۔ یہ سامنے والی کوٹھی ہی میں تو رہتا ہے کیوں نہ جا کر اُسے بلا لائے اور پھر باغ میں سے آوازیں دیتے ہوئے پکارے "جاوی —— جاوی! دیکھو تو! ڈیڈی اندر شیشے کے مرتبان میں بہت سی خوبصورت مچھلیاں لائے ہیں —" لیکن وہ خود پر ضبط کیے رہی۔ اونہہ! وہ خود اُسے کیوں نہیں آکر مناتا ——!

ممی حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھیں، بڑے کمرے کے وسط میں چھوٹی میز پر وہ جار رکھا تھا اور وہ قریب ہی گم سم سی بیٹھی، پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کو افسردگی سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے شازی؟ جاوید کیا ناراض ہو گیا؟" ممی جیسے سب کچھ جان گئیں۔

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"پھر؟"

"پتہ نہیں ——" وہ روہانسی ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اسی لمحے بڑے کمرے کا دروازہ کھلا اور شہزانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر جیسے اُسے یقین نہ آیا اور اس نے گھبرا کر ممی کی طرف دیکھا اور پھر اسی طرح اچٹتی ہوئی ایک نظر مچھلیوں پر ڈال کر خیالوں کی رَو میں بہہ گئی۔ اونہہ! میں تو اس سے کبھی نہ بولوں گی۔ —— یہ مجھ سے خواہ مخواہ لڑتا ہے۔ دیکھو تو آج ہی اُس نے مجھے ممی سے جھڑکیاں دلوائی ہیں ——"

وہ اپنے خیالات کی رو میں بہتی بہتی جیسے راستے میں کسی پتھر سے ٹکرائی اور چونک گئی —— وہ کہہ رہا تھا "شازی! مجھے سنہری مچھلیاں پسند ہیں۔!"

اپنی ناراضگی بھول کر وہ مسکرائی اور مچل کر بولی "جاوی! یہ ڈیڈی میرے لیے لائے ہیں ——"

اُس کی آنکھیں جھک گئیں، پلکوں کی چلمن بار بار جھکنے لگی اور سیاہ پتلیوں میں گرداب تیزی سے بنتے گئے اور پھر ایک طوفان پلکوں کے بند توڑ کر بہہ نکلا۔

"کیا ہوا؟"، وہ گھبرا کر اُس کے قریب ہو گیا۔

وہ خاموش رہی۔ ساڑھی کا پلو اُس کے ہاتھوں میں مچلنے لگا اور بلاؤز میں سے ایک خوبصورت ننھا سا رومال نکال کر اُس نے آنکھوں کے اُن موتیوں کو اس میں جذب کر لیا، جو بہت قیمتی تھے —— بہت ہی!

"مجھے نہ بتاؤ گی؟" اُس نے بڑے پیار سے کہا وہ دم بھر کے لیے دم سادھے بیٹھی رہی پھر اس نے بڑی گہری نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اس کی چہرے پر پیار کا جذبہ صاف جھلک رہا تھا، نیلی آنکھیں اپنی چمک کم کر بیٹھی تھیں اور ہونٹ کچھ کھلے کچھ بند سے تھے، اس کے نچلے ہونٹ کے ذرا نیچے اس کا سیاہ تل جیسے ایک دم بہت زیادہ واضح ہو گیا تھا اور بائیں آنکھ کے قریب چوٹ کا ذرا سا نشان تھا وہ مٹ سا گیا تھا۔

شہزانہ نے منہ پھیر لیا۔

"مجھے نہ بتاؤ گی؟" اُس نے اپنی مدھم آواز میں پھر پوچھا۔

وہ ایک دم جیسے بھڑک اٹھی۔ اس کی نظروں میں گہری سرخی جھلکی اور چہرے پر غصے کی ایک لہر دوڑی اور تقریباً چیختے ہوئے اُس نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم — مجھے نہیں خبر — میں نہیں جانتی مجھے کیا ہو گیا ہے — مجھے — مجھے — ..!" اور پھر سسکتے ہوئے اُس نے التجا آمیز لہجے میں کہا "مسٹر سلیم! مجھے تنہا رہنے دیجئے —!"

اِدھر اسے وہیں کھڑا چھوڑ، وہ تیزی کے ساتھ پلٹی اور کلب کے ہال میں چلی گئی۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد جب ہال میں راک این رول کی جذبی دھن اپنے شباب پر تھی سلیم کچھ پریشانی کی حالت میں دروازے کے قریب میز پر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ایک دم حیرت سے اُس کی آنکھیں اٹھیں اور رقص میں کھوئے ہوئے نوجوان چہروں اور جسموں پر سے بھٹکی ہوئی گہری نیلی رنگ کی ساڑھی پر اٹک گئیں۔

شہزانہ اس نیلی ساڑھی میں بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ تالاب کے کنارے افسردہ شہزانہ اور راک این رول کی تیز لہروں پر تھرکتی ہوئی شوخ شہزانہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں مسرت، سکون اور خوشی کی تیز چمک تھی۔ ہونٹوں پر گہری لپ سٹک — نم آلودہ ہونٹ اور وہ گہری لال لپ سٹک کی چمک! رخساروں پر جوانی اور صحت مندی کی سرخی، ماتھے پر بکھرے ہوئے سیاہ بالوں کی شوخ اور آوارہ لٹیں — سبھی اس کی خوبصورت خوشی اور اطمینان کی عکاسی کر رہے تھے۔ سلیم حیرت کے عالم میں اُسے گھورتا رہ گیا۔

وہ رقص کے دوران اس کے قریب سے گزری۔ وہ مسکرایا، لیکن شہزانہ کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھ کر اور زیادہ حیران ہو گیا۔ غصے سے اُس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں اور ماتھا جیسے تپنے لگا۔

شہزانہ اپنے ہم رقص کے چوڑے چکلے سینے سے سر لگائے آنکھیں موندے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اور ہونٹ انجانے میں کھل کھل کر بڑے دلفریب انداز سے مسکراتے اور دیکھنے والوں کو بے قرار کئے جا رہے تھے!

"تم واقعی بہت خوبصورت ہو!" اس کے ہم رقص نے بےخود ہو کر اس کے گھنگریالے بالوں کے قریب اپنا منہ کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔

مچل کر اُس نے کہا۔ "ہاں میں خوبصورت ہوں —"

ایک قہقہہ فضا میں اُبھرا پھر ایک اور — پھر اور بہت سے قہقہے گونج اُٹھے، ساز کی لہریں ہوا کے دوش پر اور زیادہ تیزی سے تیرنے لگیں۔ جاز کی موسیقی۔ کلارینٹ کے سُر پیانو کی مدھر سنگت میں پھیلنے لگے۔ ہوا نشے میں کھو گئی، دھواں ہر اور چھانے لگا، بہکی بہکی سی ادائیں، جھکے ہوئے جسم اور مدہوش نیم بند نیم کھلے ہونٹ اور آنکھیں! ہر طرف جیسے شباب جاگتے میں سویا ہوا نظر آنے لگا۔

قدموں کی لڑکھڑاہٹ زبانوں تک آ پہنچی۔ فضا کی مستی دل و دماغ پر اثر انداز ہونے لگی۔ اور جب چودھویں کا چاند کلب کے ہال کے باہر سرو کے تنہا درخت میں آدھا چھپ سا گیا تو شہزانہ اپنے روئی کے سے نرم بالوں کی لٹوں کو ماتھے پر بکھیرے اپنے ہم رقص کے ہمراہ، ہاتھوں میں ہاتھ دیئے کھنکھتے ہوئے جام کے سے قہقہے لیے بالکونی میں آ کھڑی ہوئی —

ہال کے بالکل برعکس وہاں خاموشی تھی! — بڑی گہری خاموشی! بڑی حسین خاموشی — وہ سناٹا تھا جس سے ڈر نہیں لگتا جس پر بے اختیار پیار آتا ہے اور جس میں گھل مل جانے کو اکثر دل بےتاب ہوتا ہے —!

اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن شہزانہ نے بڑے دلفریب انداز سے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔ "شش!"

ایک ہلکی سی "شش!" اس گمبھیر خاموشی کو توڑ نہ سکی ---!

وہ نہ جانے کتنی دیر تک وہاں چپ چاپ کھڑے رہے اور وہ بڑی اطمینان کی نظروں سے سرو کے پیچھے چھپتے ہوئے چاند کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی ---- اور پھر جب اُس نے اپنی آنکھیں موند کر اس کے شانے کے ساتھ سر لگا دیا تو وہ نہ رہ سکا۔ اپنی مخصوص آواز میں اُس نے کہا "شہزانہ ---- تم کتنی اچھی ہو!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی: "مسعود صاحب!" وہ ہولے سے بولی "یہ سماں کتنا اچھا ہے!"

مسعود جذباتی لہجے میں اس کا ہاتھ تھام کر بولا "شازی ---- شازی تم بات ٹال کیوں دیتی ہو ---- مجھ سے کہتی کیوں نہیں ---- کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟"

"کیوں نہیں کرتی؟"

"تو پھر ---- کیا میں خود کو اتنا خوش قسمت جانوں کہ ---- کہ تم مجھ سے شادی کرنے پر رضامند . . . . ."

ہلکے سے اُس نے بات کاٹی --- "اونہہ! شادی ---- شادی میں کیا رکھا ہے مسعود؟" پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملاتے ہوئے انگڑائی کے سے انداز میں، سانس لے کر وہ بولی: "میں یہ بندھن پسند نہیں کرتی!"

مسعود وارفتگی کے عالم میں اُسے دیکھتا رہ گیا اور خاموشی نے پھر سے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ---- لیکن اس بار یہ خاموشی اتنی پیاری نہ تھی ---- پُرسکون نہ تھی!

اس سناٹے سے ڈرتے ہوئے وہ دونوں چپ چاپ ہال کی طرف بڑھے۔ دروازے پر پہنچ کر شہزانہ ٹھٹھک گئی۔ وہاں سلیم کھڑا اُسے اداس نظروں سے تک رہا تھا

"ہیلو!" مسعود نے سلیم سے ہاتھ ملایا۔

سلیم نے خاموشی سے ہاتھ ملا دیا۔

"سلیم!" شہزانہ نے کہا۔ اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ پھر فوراً ہی جیسے اُس نے خود پر قابو پا لیا۔ "کیا بات ہے مسٹر سلیم؟"

سلیم آگے بڑھ آیا ---- اور پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا ---- "آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی نا ---- اب کیا حال ہے؟"

"واہ ---- بالکل ٹھیک ہوں!" وہ مسکرائی۔

مسعود ایک قدم آگے بڑھا، لیکن شہزانہ وہیں سلیم کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑی مسکراتی رہی۔ مسعود پلٹا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے مڑا اور معذرت چاہتے ہوئے ہال میں چلا گیا۔

ہال کا دروازہ کھلا اور لمحہ بھر کے لیے موسیقی کی تیز و تند لہریں بالکونی کی فضا میں اُبھر آئیں اور پھر دروازہ یکایک بند ہو گیا۔

ہوا میں کچھ دیر پہلے کی بہتی ہوئی موسیقی کی لہریں مدھم ہو کر گونجتی گونجتی بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئیں اور وہ دونوں خاموش دھڑکتے دل کے ساتھ، ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"میں نہیں سمجھ نہیں سکا ہوں۔ شہزانہ!" اس نے کہا

شہزانہ صرف مسکرائی۔

"مجھے بتاؤ ــــ آخر یہ سب کیا ہے ــــ کیا تم؟ کیا تم؟" وہ خاموش ہوگیا۔

وہ اس کے قریب سرک گئی۔ اس کے سینے، اُس کے چوڑے چکلے سینے پر اپنا سر چھوکر وہ جھکنے کے سے انداز سے کھڑی ہوئی اور پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ اٹھایا اور ایک ہلکی سی سسکی شہزانہ کے لبوں سے نکلی اور بلاؤز میں سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھتے ہوئے بڑے کرب سے اُس نے کہا "میں نہیں جانتی مسٹر سلیم۔ مجھے کیا ہو جاتا ہے!"

"میں تمہیں چاہتا ہوں ــــ شازی! میں تمہیں چاہتا ہوں!"

وہ چپ رہی۔

"تم ہاں کیوں نہیں کرتیں ــــ ہم دونوں بہت اچھی طرح سے ایک دوسرے کے ساتھی . . . ."

"ہاں صرف ساتھی ــــ میاں بیوی نہیں!" وہ تیزی سے بولی "ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں ــــ" اور پھر دفعتاً اُس کی نظریں بہک کر ہال کے دروازے کی طرف اٹھیں "لیکن سلیم! میرا خیال ہے کہ اب ہم دوست بھی نہیں رہ سکتے ــــ میرا خیال ہے کہ مسعود بہتر دوست ثابت ہوئے ہیں"

"شہزانہ"! اس نے سختی سے کہا۔

"مسٹر سلیم!" وہ ہاتھوں کی طرف دیکھ کر بولی "میں نے غلط نہیں کہا۔"

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟" وہ جھنجھلا کر بولا "میں جانتا ہوں تم کبھی سنجیدہ نہیں ہوتی ہو ــــ"

اور یہ آپ کی غلطی ہے۔

"تم ــــ تم" وہ لڑکھڑاتی زبان سے کہنے لگا "تم نے کسی کو نہیں چاہا ــــ تم نے کسی کو نہیں چاہا، لیکن سب نہیں چاہتے رہے ــــ سب نہیں چاہتے ہیں ــــ لیکن تم ــــ؟"

شہزانہ کی آنکھوں میں بلا کی چمک پیدا ہوئی ــــ پھر ایک سانس، گہری سانس لے کر وہ بڑبڑائی ــــ "ہاں میں نے کسی کو نہیں چاہا ــــ وہ مجھے چاہتے ہیں ــــ"

"کیا تم اشفاق سے شادی کرنا چاہتی ہو؟" وہ تلخی سے بولا "یا رحمان سے ــــ ثاقب، مسعود یا مشتاق . . . ."

"شٹ اَپ!" وہ غصے سے چیخی ــــ اور پیر پٹختے ہوئے ہال کی طرف بڑھی۔

وہ ایک دم خاموش ہوگیا، وہ رُک کر رہ گئی۔

سلیم نے منہ پھیر لیا اور پھر جب وہ بولا تو اُس کی آواز میں گہرا درد اور اُداسی کا ایک سمندر موجزن تھا "مجھے معاف کرنا شہزانہ؟" وہ تیزی کے ساتھ بڑھا اور چلا گیا۔

وہ بالکونی پر آکر کھڑی ہوگئی۔ چاند سرو کے درخت کے پیچھے چھپ چکا تھا اور خاموشی کے اس طوفان میں ہلکی ہلکی ہوا اُسے بڑی اذیت دے رہی تھی۔ وہ ہال میں جانا چاہتی تھی۔ لیکن پھر بھی نہیں جاتی تھی اور ایسی گو مگو حالت میں وہ نہ جانے کب تک ڈوبی رہتی کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر مسعود کی جانی پہچانی آواز آئی "ہیں شہزانہ آپ ابھی تک اِدھر ہیں؟" پھر قریب آتے ہوئے بولا "کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

اُس نے مسعود کو دیکھا۔ لمبا قد، بھرا ہوا جسم، سیاہ چمکیلی آنکھیں، کھلتا ہوا گندمی رنگ، گول چہرہ، قدرے لمبی ناک اور کھلا ہوا ماتھا ــــ

"یونہی جی نہیں چاہتا تھا کہ ہال میں جاؤں ــــ"

اس نے حیرت سے کہا۔ "تو کیا ابھی سے گھر چلی جائیں گی؟ ــــ آج کی رات ہی تو یہ جشن منایا جا رہا ہے۔ عید روز روز تو آتی نہیں، عید رات کو یوں جلدی چلے جانا تو ظلم ہے ـــــــ!"

"ہاں!" اس نے ایک سرد آہ بھری "آج عید رات ہے ـــــ آج میں یہیں رہوں گی ـــــــ یہیں رہوں گی ــــ آج عید رات ہے ـ!"

وہ اس کے قریب آئی، اس کی آنکھوں پر پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور گھنی پلکیں ہولے ہولے لرز سی رہی تھیں، اُس کے سیاہ بال ہلکی ہوا سے ادھر اُدھر اڑنے کو بے تاب تھے اور سارے جسم میں ایک ایسا تناؤ سا تھا جیسے وہ کٹتے ہوئے رستے پر چل رہی ہو۔ اس کے قریب آکر اُس نے بڑی مدھم آواز میں مسعود سے کہا "مسعود صاحب! یہ عید رات بھی کتنی عجیب ہوتی ہے ـــــ ایک وہ بھی تو عید رات تھی نا جو میں نے لکھنؤ میں گزاری تھی ـــــ ایک نہیں، دو نہیں، پوری سات آٹھ عیدیں ہم نے وہاں منائی تھیں اور تب میں کتنی چھوٹی سی تھی ـــــــ بس ایک میں تھی اور ایک میرا وہ دوست ـــــ!"

شہزانہ نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں کو ہولے سے بند کر کے، دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی سے گھنی پلکوں کو چھوا اور پھر حیرت کے سے انداز کے ساتھ آنکھیں کھولے اُسے گھورنے لگی۔

"بس جناب! ڈیڈی نے تو مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ ہوائی جہاز خرید دیں گے!" اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "اتنا بڑا جہاز!"

"سچی مچی!" وہ اپنے نچلے لب پر انگلی رکھ کر بولی "ہوائی جہاز؟ پھر تم اُسے اڑاؤ گے؟"

"ہاں! ہاں!" وہ سر ہلا کر نیلی آنکھوں کو جو بھوری نظر آ رہی تھیں، نچاتا ہوا بولا "جس طرح موٹر کار چلاتے ہیں نا ــــــ بس اسی طرح پہلے چلاؤں گا پھر شں! اسے آسماں پر اڑا کر لے جاؤں گا!" اس نے زور سے شں کی آواز نکالی اور ہاتھ کا جہاز بنا کر سر پر لے گیا۔

"ہائے جاوی ـــــــــ مجھے بھی ہوائی جہاز دکھانا ـــــ" وہ بولی

جاوید نے بھنویں اٹھا کر دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر کہنے لگا "ہاں! بس تم بھی ہمارے ساتھ چلی چلنا ـــــــــــ وہاں چل کر دیکھ لینا ــــ"

"اچھا!" اس نے جھٹ سے سر ہلایا "میں بھی تمہارے ساتھ لوہر چلوں گی!"

"لوہر نہیں ــــــ" وہ کھلکھلا کر ہنسا "لاہور! لاہور ــــ!"

"ہاں ــــ ہاں" وہ بولی "میں بھی چلوں گی ــــ مجھے لے چلو گے نا؟"

جاوید کے سفید چہرے پر ہلکی سی سرخی جھلکی۔ "میں امی سے کہوں گا، نہیں بھی ساتھ لے چلیں" پھر جیسے مچل کر وہ بولا "آج عید کی سوئیاں کتنی مزیدار تھیں؟ پتہ ہے امی کہتی ہیں ادھر لاہور میں اور زیادہ مزیدار چیزیں ہوں گی!"

"تمہیں تو مٹھائی کا خیال رہتا ہے" وہ مٹھائی چوری کرنے والے دن کا خیال کرتے ہی کانپی ــــ "اس روز بھی تو میں مٹھائی چوری کرتے ہوئے مار کھانے سے بچی تھی!"

وہ ضرور اس کا منہ چڑا دیتا لیکن خاموش رہا، پھر مسکرا کر کہنے لگا "ہم اب صبح جا رہے ہیں نہیں تو میں تم سے ابھی لڑ پڑتا ـــــ"

"اونھ لڑ پڑتا ـــــــ" شہزانہ کو غصہ آ گیا "یہ ہر وقت کا جھگڑا امی کہتی ہیں بہت بُری بات ہے!"

جاوید نے نچلا ہونٹ لٹکا لیا تو شہزانہ نے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر بولی "چلو باغ میں چلتے ہیں۔ تالاب میں کھلے ہوئے کنول کو دیکھتے ہیں — کتنا خوبصورت ہے!"

وہ دونوں آہستگی کے ساتھ چلتے ہوئے باغ میں آئے۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ ہوا پھولوں کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ اور شہزانہ کا دل بھی اس خیال سے ڈوبا جا رہا تھا۔ کہ صبح جاوید اس سے دور جا رہا تھا جہاں اس کے ڈیڈی رہتے تھے۔

وہ وہاں تالاب کے کنارے کھیلتے رہے۔ رات کب آئی، پتہ ہی نہ چلا اور وہ اس وقت چونکے جب ممی نے برآمدے میں آ کر شہزانہ کو آوازیں دیں —

"شانزی — جاوید! دیکھو جاوید تمہیں امی بلا رہی ہیں!"

وہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے بڑی بے نیازی سے مسکراتے ہوئے برآمدے کی طرف آئے اور پھر کمرے میں سے جاوید کی امی باہر نکلیں۔

"چلو جاوید بیٹا۔ صبح سویرے چلنا ہے!"

وہ ضد کرنے لگی۔ "میں بھی جاوی کے ساتھ جاؤں گی ممی!"

ممی ہنسیں۔ "ہاں ہاں تم بھی چلو گی!"

"سچ!" جاوید خوشی سے چلایا۔

امی نے مسکرا کر کہا — "ہاں ہمارے ساتھ شہزانہ بھی چلے گی!"

وہ خوشی سے اچھلنے لگی۔

اس رات۔ ممی نے جاوید کے گھر والوں کو پارٹی دی تھی، وہ سب ہال کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ جاوید درمیان میں پڑی ہوئی میز کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ شانزی اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

وہ اس وقت نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور اس سوٹ میں بڑا معتبر نظر آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں سیاہ چمکیلا بوٹ اور ہاتھوں میں ایک سرخ گلاب تھا، اس کی آنکھیں اس وقت گہری نیلی لگ رہی تھیں۔ لیکن جب وہ نگاہیں جھکا کر سر اٹھا کر کسی کی طرف دیکھتا تو نیلی آنکھیں گہرا بھورا رنگ اختیار کر لیتی تھیں۔ اس کے ہونٹ کچھ گیلے سے تھے اور ستواں ناک بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ سر کے بال سیاہ بہت سیاہ اور رنگ صاف و شفاف ہو رہا تھا!

شہزانہ کو اپنی کہانی کی ایک کتاب میں دیکھی ہوئی اس شہزادے کی تصویر یاد آئی جو بالکل جاوید کی سی شکل کی بنی ہوئی تھی۔ اور مسکراتے ہوئے بڑے فخر کے ساتھ اس نے ممی سے کہا: "ممی جاوید کتنا اچھا ہے بالکل گندا نہیں لگتا!"

وہ لوگ ہنسنے لگے اور جاوید بھی بے سوچے سمجھے اُن کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

"آج کی رات یاد رہے گی!" ممی نے شہزانہ کے سر کے بال یونہی بکھیرتے ہوئے کہا۔

سب لوگ کھانے کے لیے میز کے گرد بیٹھ رہے تھے۔ اور ہوا میں لذیذ سالن اور پھلوں کی خوشبو رچی جا رہی تھی۔

"اللہ کرے ایسی عید راتیں اور بھی آئیں!" جاوید کی امی نے کہا۔

"کبھی کبھی خط تو لکھا کرنا —" کسی نے کہا۔ اور پھر وہ بہت سی باتوں میں یوں مصروف ہو گئے جیسے اور کھانا اور باتیں کرنے کے علاوہ اور کوئی کام اس دنیا میں تھا ہی نہیں۔

دوسری صبح جب وہ اٹھی، گہری نیند سے بیدار ہوئی تو آیا حسبِ معمول مسکراتی ہوئی اُسے اسکول کے لیے تیار کرنے لگی۔ ناشتہ کر کے، صاف ستھرے

کپڑوں میں اچھلتی ہوئی وہ برآمدے میں آئی اور گلاب کا ایک سرخ پھول قریب کی کیاری سے توڑ کر وہ سیڑھیوں پہ کھڑی سامنے والی کوٹھی کی طرف جھانکنے لگی۔

"چلو شازی بے بی اسکول کو دیر ہو رہی ہے!" آیا نے قریب آ کر کہا۔

وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔

ممی کمرے میں آئیں "جاؤ شازی ——— ورنہ دیر ہو جائے گی!"

"ممی!" اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا "دیکھو نا ——— جادی ابھی تک نہیں آیا ——— روز دیر کرنے لگا ہے!"

ممی ہنسیں "پگلی ——— وہ تو چلا گیا ہے ———"

"چلا گیا!" وہ یوں چونکی جیسے ممی نے اُسے تھپڑ مار دیا ہو۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہ چیخی "وہ چلا گیا مجھے کیوں نہیں لے کر گیا ——— ممی میں بھی جاوید کے ساتھ جاؤں گی!"

"پگلی!" ممی نے کہا اور پھر ان کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ آیا کی طرف پلٹتے ہوئے وہ ہولے سے بولیں۔ "آیا آج شازی اسکول نہیں جائے گی ———!"

دوپہر کے وقت تنہائی سے گھبرائی ہوئی وہ باغ میں اِدھر سے اُدھر ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح آوارہ پھرتی رہی۔ کبھی بھاگتی کبھی ہولے ہولے چلتی ہوئی باغ کے اس سرے سے اس سرے تک جاتی۔ پھر سامنے والی سنسان کوٹھی میں جھانک کر ہولے سے پکارتی "جاوید!"

پھر خود سے کہتی "وہ تو سچ مچ چلا گیا۔ لیکن مجھ سے تو پکا وعدہ کیا تھا کہ بتائے بغیر نہیں جائے گا ———!" نڈھال سی ہو کر وہ تالاب کے کنارے آ بیٹھی ———

اس روز جب تالاب کے کنارے وہ آ کر بیٹھی تو بہت خوش تھی اس کے ہاتھ میں ایک عید کارڈ تھا جس پر جاوید کا نام لکھا تھا۔ جاوید نے لکھا تھا "شازی کو عید مبارک ہو!" اور وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ممی نے بھی تو ایک عید کارڈ ان لوگوں کو بھیج دیا تھا نا جس پر شہزانہ نے مچل کر لکھوایا تھا کہ شہزانہ اپنے دوست کو بہت یاد کرتی ہے۔

جاوید کتنا خوش ہوا ہو گا ——— اُس نے سوچا اور مسکرا کر اس نے قریب کی کیاری کے کنارے پر سے ایک چھوٹا سا کنکر اٹھایا اور تالاب کے پانی کی طرف پھینکا جو ہلکی ہوا کی وجہ سے اپنی سطح پر بہت سی شکنیں پیدا کر رہا تھا۔ ٹپ! کنکر پانی میں ڈوب گیا اور اُس کے چہرے پر معصومیت اور مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔

پانی میں جو بہت سے ننھے ننھے دائرے پھیل رہے تھے وہ اس نے نہیں دیکھے اور پلٹ کر برآمدے کی طرف آ گئی۔

عید دوبارہ آئی۔ پھر کوئی عید کارڈ نہ آیا، وہ اداس رہی۔ اور افسردگی کے عالم میں وہ عید گزری رات گزری اور دن رات ہفتوں میں بدلے ہفتے مہینوں میں اور عید کئی عیدیں بن گئیں ——— بچپن اپنے دور سے گزرتا چلا گیا اور بیتی ہوئی باتیں اپنے نقش چھوڑتی گئیں۔

ایک صبح جب اُسے ممی نے جلدی اُٹھنے کو کہا تو چونک کر اُس نے اس کی وجہ پوچھی۔

مسکرا کر ممی نے کہا "عید ہے ڈارلنگ!"

اور اس نے عجیب تیز نظروں سے ممی کی طرف دیکھا۔ اب وہ کتنی بدل چکی تھیں، کئی سال یونہی گزر گئے تھے اور اب تو عید سے زیادہ اہم کرسمس کی رات ہوتی تھی، ایسٹر کے دن ہوتے تھے، کلب کے فنکشن اور پارٹیاں ہوتی تھیں،

"تو کیا کلب میں کوئی دعوت ہے!" اس نے بیڈ ٹی سِپ کرتے ہوئے بے نیازی سے پوچھا۔

"دعوت؟" ممی نے بے دھیانی سے کہا۔ "ہاں دعوت بھی ہے رات کو —— لیکن یہ دیکھو —— مجھے تو اس کارڈ نے یاد دلایا کہ آج عید ہے!"

انہوں نے ایک عید کارڈ اُس کی نظروں کے سامنے مسکراتے ہوئے کر دیا۔

شہزانہ نے تصویر دیکھی —— ایک چہرہ مٹا مٹا سا —— مدھم سے نقش نگار والا چہرہ، ہاتھ میں گلاب کا بڑا سا سارا سرخ پھول لیے مسکراتے ہوئے عید کی خوشخبری دے رہا تھا —— "کس نے بھیجا ہے؟" اُس نے جیسے خود سے پوچھا۔

"جاوید کی امی نے —— " ممی نے کہا "تمہارے نام —— " اور پھر چونکتے ہوئے بولیں "وہ اپنا پتہ تو لکھنا بھول ہی گئی ہیں —— صرف یہ لکھا ہے۔ جاوید اپنی ننھی دوست کو یاد کیا کرتا ہے!"

شہزانہ نے آنکھیں موند لیں اور پھر کارڈ ممی کے ہاتھوں میں بے زاری سے تھماتے ہوئے تقریباً چیختے ہوئے بولی "اوہو! مجھے تو نیند آرہی ہے!"

"ڈارلنگ —— " ممی نے کہا۔ "تم نے آج اپنے دوست کو ڈیٹ بھی تو دے رکھی ہے —— "

"ہاں —— " اُس نے آنکھیں کھولیں "نعیم مجھے ملنے آئے گا —— لیکن میں اسے رات ہی کو ڈنر میں ملوں گی!"

"تمہیں کیا ہوگیا ہے شازی!" ممی نے حیرت سے کہا "تم آج کچھ بھولتی جارہی ہو۔ تمہیں کیا یاد نہیں، آج تم نے بازار سے بہت سی شاپنگ کرنی ہے۔ تم جمعرات کو —— "

"میں جانتی ہوں ممی —— میں کیسے بھول سکتی ہوں کہ میں انگلینڈ جارہی ہوں اور جمعرات کو میں کراچی جانے کے لیے . . . ." وہ خاموش ہو کر اپنا نچلا لب دانتوں سے کاٹنے لگی۔

پھر دفعتاً جیسے وہ چونک سی گئی اور ممی سے تیز لہجے میں بولی "ممی —— ممی تم نے دیکھا نعیم کی شکل جاوید سے کتنی ملتی ہے!" اور پھر جلدی سے بولی۔ "ممی نعیم آئے تو کہہ دینا شہزانہ بہت مصروف ہے —— بہت مصروف ہے!"

اس رات ڈنر پر وہ جان بوجھ کر نہیں گئی۔

ممی واپس آئیں تو بولیں "آج تم وہاں بہت یاد آئیں —— رقص کے دوران کئی لوگ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتے رہے اور ڈارلنگ نعیم تو بہت اُداس تھا —— "

"میں بھی بہت اداس ہوں!" اس نے تلخی سے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"تم خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہو —— " ممی آہستہ سے بولیں "یہ ظلم نہیں تو کیا بات ہے کہ ایسی سہانی رات میں تنہا رہا جائے!"

"یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ ایسی سہانی رات میں تنہا رہا جائے اور گزرے ہوئے دن یاد کر کے خود کو اذیت دی جائے!" مسعود نے شہزانہ کے گھنگریالے بالوں کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کی۔

شہزانہ ہنس دی —— "بالکل یہی بات مجھے ممی نے کہی تھی —— اور پھر انگلستان میں بھی ایک دعوت کے موقع پر مسٹر گرینجر نے مجھ سے یہی کہا تھا اور پھر —— " وہ افسردہ ہوگئی۔ "جب میں واپس آئی اور لکھنؤ کی بجائے یہاں کراچی میں آنا پڑا تو بدلے ہوئے حالات دیکھ کر سبھی نے مجھ سے یہ کہا تھا "تم کیوں گزرے ہوئے دن یاد کرتی ہو —— فسادات ہوئے۔ بہت کچھ ہوا —— لیکن اب ان باتوں کو یاد کر کے کیا ملے گا —— ممی ڈیڈی —— سبھی —— سبھی اب

مجھے نہیں مل سکتے ——— اب تو سب کی راہیں ہی بدل گئی ہیں ——— لیکن مسعود ڈیر ——— تم ہی بتاؤ، اگر نئی ہوئی باتیں تو آپ ہی یاد آجاتی ہیں کوئی جان بوجھ کے تھوڑی یاد کرتا ہے!"

"آؤ ہال میں چلیں ——— تم وہاں سب کچھ بھول جاؤ گی ——— دیکھو تو کتنا اچھا ساز بج رہا ہے!" مسعود نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

وہ دونوں آہستہ سے دروازہ کھول کر ہال میں داخل ہو گئے۔

رمبا سمبا کی دھن پر ایک جوڑا سب کے درمیان فن کا مظاہرہ کر رہا تھا، بہت سے لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے ماحول میں شور مچا ہوا تھا اور کئی لوگ جوش میں سیٹیاں بجا بجا کر داد دے رہے تھے۔

دفعتاً ساز تھم گئے۔ تالیوں کا شور مچ گیا اور پھر یہ شور مدھم ہوا اور رمبا کی دھن میں ساز پھر ہوا کے دوش میں موسیقی کی لہریں تیرانے لگے۔

وہ دونوں ایک میز کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اس کی نظریں بھٹک کر سلیم کو ڈھونڈنے لگیں۔ جانے وہ کہاں ہے۔ کدھر ہے وہ؟ اُس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

ہال کا دروازہ کھلا اور دو تین مرد اور عورتیں اندر داخل ہوئے۔ رک کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر ان میں سے ایک نوجوان "اوہ!" کر کے شہزانہ کی طرف بڑھا ——— "اوہ تو آپ یہاں ہیں!"

"ہائے!" شہزانہ نے جلدی سے اُٹھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا "ہائے! راحیل! تم سے مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے! یہاں کب آئے!"

"آج ہی شازی ——— آج کے پلین سے ——— اور دیکھو تو تمہیں یہاں پا کر کس قدر مسرت ہوئی ہے!" راحیل نے گرمجوشی سے کہا۔

ان سے ملئے مسٹر مسعود ——— یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں مسٹر راحیل ——— اور راحیل یہ میرے نئے دوستوں میں سے ہیں مسٹر مسعود! شہزانہ نے تعارف کرایا۔

پھر وہ تینوں بیٹھ گئے۔ شہزانہ ٹکٹکی لگائے راحیل کو دیکھنے لگی۔ اس کا رنگ گورا تھا اور اس وقت کچھ اور بھی زیادہ نکھر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری اور پلکیں بڑی لمبی تھیں، پلکوں کے آخری حصے کچھ سنہری سے تھے، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مصوّر تصویر بناتے وقت آنکھوں کی پلکوں کے سرے پر سنہرے رنگ کا شیڈ کر گیا ہے اور باتوں کے دوران جب وہ پلکیں جھپکتا تو بڑا بھلا دکھائی دیتا تھا۔ شہزانہ اُسے دیکھتی رہی اور یوں دیکھتے وقت شہزانہ کی آنکھوں کی سفیدی میں ابلے انڈے کی سفیدی کی سی چمک پیدا ہوتی اور مٹتی رہی۔ اور ایک ہلکا سا سانس لے کر شہزانہ نے آنکھیں موند لیں۔

"راحیل سے میری ملاقات اس گرما کوہ مری میں ہوئی" شہزانہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے مسعود سے کہا "اور اتفاق ہے کہ ان سے میری دوستی اب تک چلی آ رہی ہے!"

"ورنہ؟" مسعود نے چونک کر پوچھا۔

"پتہ نہیں کیوں ———" اُس نے گہرا سانس لیا "ورنہ میں ہر دوست سے اُکتا جاتی ہوں ———"

"یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو کسی کی تلاش ہے!" راحیل نے کہا۔

شہزانہ نے چونک کر اُسے دیکھا، سر جھکایا، پلکوں کو بار بار جھپکا اور مسعود کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "راحیل ہو سکتا ہے ٹھیک ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تصور میرا نہ ہو ———"

"تصور؟ کیسا تصور؟" راحیل نے کہا۔

"سارا قصور میرا ہے!" شہزانہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور پھر وہ دفعتاً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے اجازت دیجئے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں گھر جا رہی ہوں ——"

راحیل اُٹھا۔ "کیا میں آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں ——"

شہزانہ نے ایک نظر مسعود کی طرف دیکھا اور پھر اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں راحیل سے مخاطب ہوئی۔ "اگر آپ چاہیں تو شوق سے ——"

مسعود اُٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کی طبیعت واقعی آج ٹھیک نہیں احتیاط رکھیئے گا ——"

"شکریہ!"

وہ راحیل کے ساتھ ہال کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ چاندنی میں باغ کا چپہ چپہ روشن ہو رہا تھا۔ اور باغ کے درمیان فوارہ چاندنی کے موتی بکھیر رہا تھا۔ درختوں کے وہ پتے جن پر چاند کی سنہری کرنیں ناچ رہی تھیں۔ انتہائی خوبصورت دکھائی دے رہے تھے اور فوارے کے درمیان چوکڑی بھرتا ہُوا ہرن کا مجسمہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا ہرن نظر آ رہا تھا۔

شہزانہ نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر آہستہ سے راحیل کا بازو تھام لیا۔

"شازی! —— اب کیسی ہو؟" اُس نے دھیمے سے کہا۔

"راحیل ——" وہ سانس لے لے کر بولی۔ "گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ آؤ باغ میں چلیں —— تالاب کے کنارے!"

وہ حیران سا اس کے پیچھے پیچھے باغ میں چلا گیا۔ شہزانہ نے پودوں کے قریب سے گزرتے ہوئے سرخ گلاب کا ایک پھول توڑ لیا اور اس کی خوشبو میں کھوئی ہوئی جیسے ہلکے ہلکے سے قدم اٹھاتی سنہری مچھلیوں سے بھرے ہوئے تالاب کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!" راحیل نے سر قدرے جھکا کر اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"کہو!" وہ غنودگی کے سے عالم میں بولی۔

"تم بُرا تو نہ مانو گی؟"

"اوں ہوں!" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔

"تم جانتی ہو —— میں ایک پائیلٹ ہوں —— زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ شاید پھر کبھی کہہ سکوں یا نہیں —— سوچتا ہوں آج یہ ہی دوں ——" وہ بہت آہستہ آہستہ بولا۔

وہ خاموش رہی۔

وہ کچھ جذباتی ہو گیا۔ "میں تمہیں چاہتا ہوں شازی! کیا تم مجھ سے شادی کرنے پر . . . ." وہ رُک گیا۔

"راحیل!" وہ جیسے ڈر کر چلائی۔ "راحیل میں شادی نہیں کرنا چاہتی —— پتہ نہیں —— مجھے کیا ہو جاتا ہے شادی کا لفظ مجھے زہر لگتا ہے۔ راحیل کیا ہم شادی کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"

"کیا تم شادی نہیں کرنا چاہتیں؟"

وہ چپ ہو گئی ——

"تم انکار کر دو —— تم شادی نہیں کرنا چاہتیں!" وہ بڑے گھمبیر لہجے میں بولا۔

اضطراب سے اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ راحیل بھی خاموش ہو گیا اور چپ چاپ وہ دونوں، دل میں ایک بوجھ اور طوفان سے لڑتے ہوئے چاندنی میں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ شہزانہ کی ساڑھی کا پلّو اس کی انگلیوں میں جیسے مچلنے اور لپٹنے لگا اور سینے کا اتار و چڑھاؤ زیادہ نمایاں ہو گیا۔

راحیل نے جیب میں سے ماچس کی ڈبیہ نکالی، سگریٹ نکالا، لبوں سے لگایا اور پھر اُسے سلگا کر ماچس کی جلتی ہوئی تیلی نظروں کے سامنے کر کے دیکھنے لگا۔ تیلی جلتی رہی جلتی رہی، اس کی انگلی جلنے لگی تو شہزانہ کا ہاتھ بے اختیار بڑھا اور اس نے جھٹکے سے آگ بجھا دی۔

اُس نے ایک اور تیلی جلائی۔ آگ کی روشنی کچھ دیر کے لیے پھیلی اور ہوا کا ایک جھونکا آیا اور آگ بجھ گئی۔ راحیل نے سانس لے کر دیا سلائی کی خالی ڈبیہ پھینک دی۔ شہزانہ خاموش کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

اُس نے چھوٹا سا ایک کنکر تالاب کے پُرسکون پانی کی طرف پھینکا۔ ٹپ کی سی آواز آئی اور کنکر پانی میں ڈوب گیا —— ایک چھوٹا سا دائرہ اُبھرا اور پھر وہ پھیلتا ہی چلا گیا —— پھر اس ایک دائرے کی کوکھ سے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے دائرے جنم لے اُٹھے اور بڑے ہونے لگے —— اتنے بڑے ؟! اتنے بڑے کہ شہزانہ کو یوں محسوس ہُوا جیسے وہ خود ایک گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور یہ دائرہ کے طوفان ایسے شدید تھے کہ نہ وہ ان میں اُبھر سکتی تھی اور نہ ہی ڈوب سکتی تھی —— بلا سے وہ ایک بار ڈوب ہی جاتی تو اتنی تکلیف اور دکھ تو نہ ہوتے —— یہ بھی کیا کہ زخم رِس رِس کر رِستے رہ جاتے —— !

وہ سکتے کی سی حالت میں اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے سرگوشیوں میں بولا "تم خاموش کیوں ہو شانزی —— اتنے اچھے سمے میں تم اتنی اداس کیوں ہو؟"
پھر اپنا لہجہ بدل کر اس نے مچلنے کے سے انداز میں کہا "تم کتنی خوبصورت ہو —— کتنی خوبصورت ہو!"

شہزانہ نے دانتوں تلے اپنا لب دبایا اور آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

"میں ایک پری کو جانتا ہوں —— وہ سنڈریلا کی تصویر سے بھی زیادہ حسین ہے ——" وہ آنکھیں کھول کھول کر اُسے یہ کہتا ہُوا سننے لگی "جانتی ہو وہ کون ہے —— وہ سنڈریلا —— وہ پری کون ہے —— تم تم!"

"نہیں —— نہیں!" اُس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور زور سے چیخی —— "مجھے جانے دو —— مجھے تنہا رہنے دو ——" پھر تیزی کے ساتھ پاگلوں کی طرح بِنا سوچے سمجھے بھاگی۔ اُسے کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ کہاں جا رہی تھی —— اس نے ہال کا دروازہ جلدی سے کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔

وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی —— وہ کہاں آ گئی ہے؟ وہ کہاں جانا چاہتی تھی۔ یہاں سے تو وہ جانے کے لیے راحیل کے ہمراہ نکلی تھی، اور اب وہ پھر تنہا یہاں آئی ہے۔ وہ اتنے سارے لوگوں میں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرنے لگی۔

لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ سنبھل کر چلتی ہوئی وہ دائیں کونے کے قریب پڑی ہوئی خالی میز کے پاس گئی اور وہاں بیٹھتے ہوئے اُس نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

آنکھیں کھول کر اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور اس کی نظر درمیان میں پڑی ہوئی ایک میز کے قریب کھڑے ہوئے کچھ چھوٹے چھوٹے بچوں پر ٹھہر گئی —— اور پھر وہ چونکی۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے وقت کی گاڑی انتہائی تیزی کے ساتھ اُلٹے پاؤں چلنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی پُتلیاں پھیلنے لگیں اور پھیلتے ہوئے گرداب جیسے سکڑتے چلے گئے اور مدھم ہونے لگے۔

وہ اس وقت نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس سوٹ میں بڑا معتبر نظر آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں سیاہ چمکیلا بوٹ اور ہاتھوں میں ایک
[illegible] وہ لگا ہی جھک کر سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو

نیلی آنکھیں گہرا بھورا رنگ اختیار کر لیتی تھیں۔ اس کے ہونٹ کچھ گیلے سے تھے۔ اور ستواں ناک بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ سر کے بال سیاہ بہت سیاہ اور رنگ صاف و شفاف ہو رہا تھا۔

شہزانہ کے سارے بدن میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کوک دیئے کھلونے کی طرح وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور قریب جاتے ہوئے وہ ہولے سے چیخی۔

"جاوید!"

بچے نے آواز سن کر اس کی طرف دیکھا۔

"جاوید!" وہ چلائی۔

بچے نے ساتھ کھڑے مرد سے کہا — "ڈیڈی —"

اُس نے پلٹ کر شہزانہ کو دیکھا "آپ نے مجھے بلایا —؟"

شہزانہ کے تن بدن میں سے جان نکل گئی۔ بمشکل تھوک نگل کر اُس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "معاف کیجئے — میں نے آپ کو نہیں بلایا۔ میں نے آپ کو نہیں بلایا —" وہ زیرِ لب دُہراتی ہوئی واپس پلٹی۔ پھر اس کی نظروں کے آگے جیسے ہر چیز ہلنے لگی۔ بھونچال سا آگیا زلزلہ آگیا اور جلدی سے بڑھ کر اُس نے اپنی کرسی کا سہارا لے لیا۔

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ تنہائی کی شدت کے احساس کے کنوئیں میں گرتی جا رہی تھی۔ اُس کی اپنی ذات اکیلے پن کا ایک گہرا غار تھی جس میں اُس کا دل لڑکھڑاتا، گرتا جا رہا تھا۔

اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا — اس لمحے میں اُسے مسعود کی ضرورت تھی۔ نہیں وہ راحیل سے ملنا چاہتی تھی — نہیں مشتاق — ثاقب — سلیم — ! کوئی بھی ہوتا — اُسے تنہائی نہیں چاہیے تھی۔ یہ تنہائی اور سناٹا جو اس کے سکون کو تہہ و بالا کر رہا تھا۔ اُسے نہیں چاہیئے —!

وہ اٹھی — دروازہ کھول کر اُس نے باہر باغ میں تالاب کی طرف دیکھا — وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ واپس ہال میں تیزی سے آئی — مسعود — مسعود! لیکن مسعود نہیں تھا — کوئی بھی نہیں تھا — کوئی بھی نہیں تھا!

وہ سر تھام کر میز پر کلائیوں کے سہارے بیٹھ گئی۔

ہال کا دروازہ کھلا — مگر اُس نے سر نہ اٹھایا۔

"کیا سوچ رہی ہو شازی!" ایک پیار میں ڈوبی آواز آئی۔

اُس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر درد بھری آواز میں چلا اُٹھی "سلیم — سلیم! میں بھی وہی سوچ رہی ہوں — جو تم سوچ رہے تھے — کیوں نہ ہم شادی کر لیں؟"

ہال میں راک اینڈ رول کی ایک تیز و تند لہر آئی اور ہوا کے دوش پر تیر گئی!

فراق گورکھپوری

کیسے کھاتا ہے کوئی تیری محبت کی قسم
مجھ سے کھاتے نہ بنی تیری مروت کی قسم

ہے وہی حسن جسے عشق کی سوگند کہیں
وہی صورت ہے جو کھاتی رہے سیرت کی قسم

بارہا دہر مری ذات میں تحلیل ہوا
اے گلِ تازہ ترے سوزِ محبت کی قسم

ہم ترے ہیں۔ جو تقاضا تری فطرت کا
اُس عنایت کی، مروت کی، محبت کی قسم

تو نے اے گردشِ دوراں جو دکھایا ہے ہمیں
ہم نے سب دیکھ لیا دیدۂ عبرت کی قسم

گلۂ شوق پہ اس درجہ نہ ہو آزردہ
تجھ سے نادم ہوں مجھے اپنی شکایت کی قسم

یہ نگاہِ غلط انداز ہے قیمت دل کی
تُو نے جو دام لگائے اُسی قیمت کی قسم

تجھ سے کچھ مانگ رہی ہے شفقِ صبحِ بہار
تیرے اس عارضِ رنگیں کی صباحت کی قسم

آج معلوم ہوا زندگی افسانہ ہے
نگہِ ناز ترے حرف و حکایت کی قسم

مرا افسانہ ہوا آج مرا افسانہ
اے گلِ تازہ ترے حسنِ سماعت کی قسم

اے بشر تیری جبیں آئینۂ مستقبل
خود مشیت نے بھی کھائی تری قسمت کی قسم

بھولتا ہی نہیں مجھ کو یہ جگر کا مصرعہ
"ہم نہ کھائیں گے ترے دردِ محبت کی قسم"

جس کے پرتو سے رخِ صبحِ ازل روشن تھا
زندگی کیا ہے اُسی مہر و عنایت کی قسم

آج واعظ نے بہت جس کی وضاحت کی ہے
وہ حقیقت بھی ہے افسانہ حقیقت کی قسم

جب سُنیں گے مرے اشعار مرے بعد فراق
لوگ کھائیں گے مرے رنگِ طبیعت کی قسم

جسٹس ایس۔ اے رحمان

وہ رُک رُک کے یوں خلوتِ دل میں آئے
نہ اپنے نہیں، جیسے وہ ہیں پرائے!

کچھ ایسے میں ہم اک جھلک دیکھ پائے
پھر آنکھوں میں دونوں جہاں نہ سمائے

ڈھلا دھیرے دھیرے سے جیون کا سورج
برابر بڑھے من کے آنگن میں سائے

کبھی اک نظر اُن کی جانب بھی راہی
جو بیٹھے ہیں آنکھوں میں دیپک جلائے

مری شامِ تنہا اداسی میں ڈوبی
تو تارے افق پر ذرا مسکرائے

ستاروں کی دنیا میں کیا ڈھونڈتا ہے؟
کہیں اپنی منزل نہ تو بھول جائے!

نہ جانے کہاں اہلِ دل کی ہے منزل
یہ دنیا سرائے، وہ دنیا سرائے!

قتیل شفائی

آج یہ بھید سمجھ میں آیا کیا ہوتی ہے وقت کی لہر
آ پہنچے ہم تیرے دوارے گھومتے پھرتے شہر بہ شہر

حیرت کی ہے بات وہ زلفیں خود ہم کو بے چین ملیں
جن زلفوں کے سائے میں سستائے کبھی ہم پہر دوپہر

عشق میں بھی کیا حاصل یارو محنت کش انسانوں کو
صدیوں پہلے کھودی تھی فرہاد نے بھی تو دودھ کی نہر

آئے چڑھا کر چہروں پر جو پانی سونے چاندی کا
پھرتے دیکھے ان کے آگے پیچھے لوگ، خدا کا قہر

اندھے کو مت اندھا کہنا اے انصاف کے متوالو
اس دنیا میں سچ کے بدلے ملتا ہے سقراط کو زہر

یوں ناکام کسی کے در سے ہم آتے ہیں آج قتیلؔ
ساحل سے ٹکرا کر جیسے لوٹ رہی ہو کوئی لہر

مختار صدیقی

○

زیست کی مرگ نمائی کا گلہ ہے کہ جو ہے
سوچ تو یہ ہے کوئی اس سے مفر تھا کہ نہ تھا

دل کا ہر داغ، تقاضائے دعا ہے کہ جو ہے
نارسائی میں بھی امکانِ اثر تھا کہ نہ تھا

آب و رنگ اس کا مرے دم سے رہا ہے کہ جو ہے
زندگی دشتِ ملامت کا سفر تھا کہ نہ تھا

یہ لگن ہی، سببِ صدق و صفا ہے کہ جو ہے
اس میں شامل، ترا فیضانِ نظر تھا کہ نہ تھا

اجنبی میرے لئے شب کے اندھیرے نہ سہی
تیرے دل میں بھی تو ارمانِ سحر تھا کہ نہ تھا

جمیل ملک

○

جو خیال آیا تمہاری یاد میں ڈھلتا رہا
دل چراغِ شام بن کر صبح تک جلتا رہا

ہم کہاں رُکتے کہ صدیوں کا سفر درپیش تھا
گھنٹیاں بجتی رہیں اور کارواں چلتا رہا

کتنے لمحوں کے پتنگے آئے آکر جل بجھے
میں چراغِ زندگی تھا . تا ابد جلتا رہا

حُسن کی تابانیاں میرا مقدر بن گئیں
چاند میں چمکا ، کبھی خورشید میں ڈھلتا رہا

جانے کیا گزری ، کہ فرزانے بھی دیوانے ہوئے
میں تو شاعر تھا ، خود اپنی آگ میں جلتا رہا

ظہور نظر

○

دیجے ہمیں شراب چھپا کے، سنبھال کے
کیجے گھٹا کا ذکر ذرا دیکھ بھال کے

وہ دن ہوا ہوئے کہ نہ تھی ابروے پہ قید
اب تذکرے حرام ہیں شامِ وصال کے

یوں تو بہت سے رند تھے لیکن ہوا کا رنگ
دیکھا ہمیں نے جام فضا میں اچھال کے

اس خوف سے کہ دامِ افق میں نہ جا پھنسے
پر کاٹنے پڑے ہیں خود اپنے خیال کے

صحرا میں بھی نہیں ہے وہ پہلی سی زندگی
وحشت نے باندھ رکھے ہیں پاؤں غزال کے

آتا ہے سیرِ دل کے لیے اب بھی اک خیال
باہیں تمھاری یاد کی گردن میں ڈال کے

فرقت میں تیری اور تو ہم کچھ نہ کر سکے
لمحے شمار کرتے رہے ماہ و سال کے

پھر آج داستانِ غمِ زندگی سے ہم
لائے ہیں تیرے پیار کا مضمون نکال کے

اے سوزِ عشق لوٹ کے آ! ہم تو مر چلے
دل کو غمِ حیات کے سانچے میں ڈھال کے

بڑھتی ہے اور عمرِ وفا زیرِ حسن سے
دیکھے بھی آستیں میں کوئی سانپ پال کے

شاید ہی کوئی پھول بچے گلستاں میں، آج
انداز لے اڑی ہے صبا تیری چال کے

ہلتی نہیں ہیں لالۂ صحرا کی پتیاں
جھونکے رکے رکے سے ہیں بادِ شمال کے

بھونرے مری نگاہ کے بھی وہ نہیں رہے
وہ پھول بھی نہیں ہیں تمھارے جمال کے

کہتے ہیں ہم فقیر بھی اُن کو "گرو" کہیں،
کل تک نہ کوئی جن کو بناتا تھا "بالکے"

غم کوئی پالنا ہی پڑے گا نظر کہ ہم
زندہ نہ رہ سکیں گے ہر اک غم کو ٹال کے

منیر نیازی

○

دل جل رہا تھا غم سے مگر نغمہ گر رہا
جب تک رہا میں ساتھ مرے یہ ہنر رہا

صبحِ سفر کی رات تھی تارے تھے اور ہوا
سایہ سا ایک دیر تلک بام پر رہا

میری صدا ہوا میں بہت دور تک گئی
پر میں بلا رہا تھا جسے بے خبر رہا

گزری ہے کیا مزے سے خیالوں میں زندگی
دوری کا یہ طلسم بڑا کارگر رہا

خوف آسماں کے ساتھ تھا سر پر جھکا ہوا
کوئی ہے بھی یا نہیں ہے یہی دل میں ڈر رہا

اس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر
جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا

جعفر شیرازی

○

گھور گھٹا جیسی اندھیاری، زُلفوں جیسی کالی ہے
آج جو شب آئی ہے کیسی جی کو ڈرانے والی ہے

کیسے دِل کی وحشت کو اس منظر کی شدّت سے بچاؤں
میلوں تک جنگل پھیلا ہے، میلوں تک ہریالی ہے

ہے وہ بھی اِس چاہ کا لوبھی سچ تو اے دلِ دیوانے
ہم نے جس سے اب کچھ اتنی راہ و رسم بڑھالی ہے

کیا کیا اشک بہانے موسم ان آنکھوں میں تیر گئے
آج ہم نے جب ایک نظر ہنستے پھولوں پر ڈالی ہے

جعفؔر غم میں بربادی کا پہلے تو یہ حال نہ تھا
اب دل ویراں ویراں سا ہے آنکھ اشکوں سے خالی ہے

نسیم شمائل پوری

○

اُداس جی کو جلاتی رہی گھٹا اب کے
نہ آئی راس ترے شہر کی ہوا اب کے

یہ حادثہ بھی عجب ہے کہ خشک پتّوں کو
برنگِ خاک اڑاتی رہی صبا اب کے

مآل ان کی پرستش کا دیکھئے کیا ہو
نظر نے چوم لئے ہیں وہ نقشِ پا اب کے

نہ جانے کون سی منزل پہ لے اڑے دل کو
بُلا رہی ہے کوئی دُور کی صدا اب کے

نسیم محفلِ شعلہ رُخاں میں تیرے بغیر
ہوا نہ کوئی بھی جشنِ طرب بپا اب کے

مُشفق خواجہ

○

غبارِ راہ اُٹھا کس کو روکنے کے لئے،
مری نظر میں تو روشن ہیں منزلوں کے دیئے
اگر فزوں ہو غمِ دل سکوت بھی ہے کلام
اِسی خیال سے اہلِ نظر کے ہونٹ سیئے
بفیضِ سادگیٔ طبع خُود تراشے ہیں
کئی بہانے ترے جورِ بے سبب کے لئے
اُجاڑ دل میں نہ پوچھ اپنی یاد کا عالم
فضائے تیرہ میں جیسے کہ جل اٹھے ہوں دیئے
فسردہ شمعوں سے ہوتا ہے کچھ کچھ اندازہ
تمام رونقِ محفل تھی ایک شب کے لئے
حیات مرگِ مُسلسل کا نام ہے شاید
وگرنہ کس میں یہ ہمت ترے بغیر جیئے
بس اک کرن ہی بہت ہے ترے تبسّم کی
مسافرانِ شبِ تار کی سحر کے لئے
ہمیں سے خُم کدۂ دہر کی ہے رعنائی
ہمیں نے تشنہ لبی کے ہزار جام پیئے

شیر افضل جعفری

آہ جب ضبط کے ہونٹوں سے بری ہوتی ہے
گنگناتی ہوئی اُڑتی ہے، پری ہوتی ہے

غم کی ٹہنی پہ بناؤں گا نشیمن اپنا
آگ لگ جائے تو یہ شاخ ہری ہوتی ہے

زلفِ دلدار کے ساون کی فضائیں اکثر
زندگی میرے لیے بارہ دری ہوتی ہے

مست انسان کے مکھڑے کی سیاہی میں بھی
چاندنی رات کی لہلوٹ بھری ہوتی ہے

لوک گیتوں کی بُنائی ہیں پاک تاروں کی
جھلملاتی ہوئی کرنوں کی زری ہوتی ہے

دل کا آئینہ، محبت کا رومال اور سہاگ
بس یہی زیست کی دُلھن کی دری ہوتی ہے

مری گلنار غزل مے کی صراحی کی طرح
پاک اُردو کی ہتھیلی پہ دھری ہوتی ہے

پیار اک مصر کا بازار ہے جس میں افضل
اُدھ کتے سُوت کی انٹی بھی کھری ہوتی ہے

عُمر فیضی

آنکھ والے ہیں مگر ہونٹ سئے بیٹھے ہیں
کس قیامت کا یہ ہم زہر پیئے بیٹھے ہیں

مرثیہ بھی دلِ مرحوم کا لکھا نہ گیا
کب سے اس نعش کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں

ہائے وہ غم جو زباں بھی نہیں کھلنے دیتا
ہائے وہ بات جسے جی پہ لئے بیٹھے ہیں

دلِ وحشی کسے معلوم خطا کس کی ہو
تو نہیں ہم تجھے بدنام کئے بیٹھے ہیں

لبِ جاں بخش کسی اور کو ممنون کرے
ہم تو بھر پائے کہ جی بھر کے جئے بیٹھے ہیں

دل کے صحرا میں بگولوں کی طرح بھٹکیں گے
یہ جو اس فصل میں دامن کو سئے بیٹھے ہیں

ہوسِ جلوہ گہِ یار نہ پوچھو فیضیؔ
لوگ دل دیتے ہیں، ہم جان دئے بیٹھے ہیں

عبد السّلام

خاکِ دل

(ایک ناولٹ)

مکان کی دو منزلیں تھیں اور وہ باہر سے بُرا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس پر ہلکا پیلا رنگ کیا گیا تھا جسے زیادہ برس نہیں گزرے تھے اور ابھی تک اس میں چمک اور سبھی رنگت ضرور باقی تھی۔

نیچے والی منزل کے دو حصے تھے ایک طرف کرمانی اور اجمل بیگ رہتے تھے دوسری طرف طالب علموں کی رہائش تھی جن کی تعداد میں ہر مہینے کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ دونوں حصوں کے وسط سے توفیق کے گھر کی سیڑھیاں گزرتی تھیں، سیڑھیوں میں ڈیوڑھی کے پاس، دیوار میں دو کھڑکی نما دروازے تھے جو، طالب علموں کے کمروں میں اور کرمانی اور اجمل بیگ کے گھر میں کھلتے تھے گلی کے دونوں طرف اونچے نیچے غیر ہموار مکانوں کا ایک ناختم ہونے والا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ نیم پختہ گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی تاہم اتنی چوڑی ضرور تھی کہ اس میں آدمی ترچھی بھینس باندھی جا سکے۔ محلے میں گھوسیوں اور ان کی بھینسوں کے علاوہ گھوڑوں کا اصطبل بھی تھا جہاں رات کو گھوڑے ہنہنایا کرتے تھے اور تانگے والے چرس کے دم لگا کر ایک دوسرے کی ماں بہن کے متعلق بُرا بھلا سوچا کرتے تھے۔ ان کی پاٹ دار مگر چلا چلا کر پھٹی ہوئی آوازیں عام گالیوں میں بھی تنوع اور انفرادیت پیدا کر دیتی تھیں۔ اس میں ان کے مخصوص لب و لہجے کو بھی کافی دخل تھا۔

گھوسی اپنے گھروں کی اور اپنے پڑوسیوں کی دیواروں کے ساتھ اُپلے تھاپ دیا کرتے تھے اور بارہ مہینے محلے کے لوگ یہ نظارہ دیکھنے کے عادی تھے۔ جب کبھی اتفاق سے لوگوں کو اصل دیوار کی شکل دکھائی دے جاتی تو وہ انہیں بڑی اجنبی سی معلوم ہوتی۔

گلی کی نکڑ پر جہاں اس کا رشتہ سڑک سے قائم ہو گیا تھا۔ وہاں مین ہول کا ڈھکنا مدتوں سے غائب تھا لوگ اب اس سے بچ کر چلنے کے عادی ہو گئے تھے لیکن ایک پرانی روایت تھی کہ اس میں ایک راہ گیر گر کر غائب ہو گیا تھا ——— اس افواہ پر یقین اس وجہ سے نہیں آتا تھا کہ کارپوریشن کو باوجود تلاش بسیار کے گڑھے اور اس سے پیوستہ نالے کے اندر آدمی کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ تاہم نکڑ پر پنواڑی قسم کھا کر کہتا تھا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے آدمی کو مین ہول کے اندر گرتے ہوئے دیکھا ہے ——— یہ گلی مریدِ پرُ وگسند ... [illegible] ... تہذیب جسے انسانوں ... [illegible] ... اور ... [illegible] بالآخر پیدا کر لیتی ہے ——— اس میں سب تہذیب ... [illegible] ... جو گالیاں نکالنے کی منزل سے گزر کر اب گالیاں گانے کی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

توفیق ... [illegible] ... اس کی ... [illegible] ... ایک ... [illegible] ... سکول کی کتابوں کی بجائے محلے کے آوارہ لڑکوں ... [illegible] ... تھی اور اپنی اسی ... [illegible] ... سے وہ ... [illegible] ... رضیہ کی عمر اٹھائیس برس سے متجاوز کر چکی تھی اور بقول توفیق کے وہ خالی خالی نظروں سے ہر چیز کو تکتی رہتی تھی اور بے معنی باتوں پر جن کی گھریلو زندگی میں مطلقاً کوئی اہمیت نہیں ہوتی، اپنی والدہ اور بہن سے لڑتی رہتی تھی۔ وہ چڑچڑی تھی اور زیادہ تر بیمار رہتی تھی۔ وہ بعض اوقات بغیر کسی وجہ کے ... [illegible] ... دینے لگتی تھی۔ اس کے باوجود دونوں بہنوں کے درمیان بڑی محبت تھی۔ توفیق اس کسی معاملے میں دخل انداز نہیں ہوتا تھا۔ وہ کسی مجرم کی طرح ان کے سامنے سر جھکا لیتا تھا اور اسی سے آنکھیں ملائے بغیر گھر میں رہتا تھا۔ توفیق بے لوث حقیقت پسند آدمی تھا۔ اس کی عمر کوئی زیادہ نہیں تھی تاہم وہ کچھ عرصے سے شادی کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگا تھا، وہ کسی بھی عورت کی رفاقت حاصل کرنے کا بالکل قائل نہیں تھا اور شروع سے تنہا مجرد زندگی گزارتا آ رہا تھا۔ وہ اپنی گھریلو مجبوریوں کا دبی زبان سے ذکر کرتا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کمرے میں آخری سرے تک ٹہلنے لگتا۔

"جوانی بیکار میں ضائع ہو رہی ہے!" ... وہ ... [illegible] ... اور پھر اچانک کھسیانے پن کے ساتھ ہنس پڑتا اور لب بھینچ کر کمرے سے باہر نکل جاتا اُسے رضیہ کا خیال آ جاتا تھا۔

وہ اپنی ذمہ داریوں سے تنگ آ گیا تھا لیکن ... [illegible] ... ملازمت ... [illegible] ... کرتا تھا اور ایک باہوش مگر ہمدرد آدمی کی طرح اپنی جوانی کا سونا رول ... [illegible] ... ڈھال کر اپنے بہن بھائیوں کی زندگی کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ ... [illegible] ... رضیہ کی زندگی تباہ ہو رہی تھی اور یہ احساس اب آہستہ آہستہ اس ... [illegible]

آمادہ کرنے لگا تھا۔

"وہ خوبصورت نہیں ہے!" توفیق رنج کے ساتھ کہتا "اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی ہے، اور ــــــ اور وہ مفلس بھی ہے ــــــ!" اس کے لب لہجہ سے تلخی جھلکنے لگتی "اس کے پاس کافی جہیز نہیں ہے ــــــ" اس کی گھنی پلکیں نیچے جھک جاتیں اور باریک ہونٹ بھینچ کر ٹھوڑی پر ننھا سا اُبھار پیدا کر دیتے اور اس کی کنپٹی پر ایک باریک سی نس اُبھر آتی جو بعض اوقات بُری طرح پھڑکنے بھی لگتی۔

"میں جب بھی اس کا سامنا کرتا ہوں میری زندگی کی ایک ساعت کم ہو جاتی ہے۔!" یہ اس نے پچھلے دنوں رضیہ کو ہسٹیریا کا دورہ پڑنے کے بعد نیچے آکر کہا تھا اور جھنجھلا کر سیل زدہ دیوار پر اپنی پوری قوت کے ساتھ ہاتھ کھینچ مارا تھا جس کے نتیجے میں وہاں سے کھوکھلے پلستر کی اینٹوں تک کی تمام تہیں اکھڑ کر فرش پر آگری تھیں اور اب وہاں ایک چھپکلی نے گھر بنا لیا تھا۔ جسے دیکھ کر ایک دن کرمانی نے کہا تھا۔

"ان دیواروں میں ہر مکروہ چیز کے لئے بڑی گنجائش ہے!"

کرمانی اور اجمل کے تصرف میں دو کمرے تھے جس کمرے کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا وہ مستطیل طرز کا بڑا کمرہ تھا جس کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا جھکی ہوئی چھت کا کمرہ ملا ہوا تھا جہاں وہ دن کے وقت بھی بتی جلایا کرتے تھے۔ یہ کمرہ اسٹور روم کا کام دیتا تھا اور بڑے کمرے میں وہ تمام گھریلو ضروریات پوری کرتے تھے۔ یہیں پر کرمانی بلی کو پڑھایا بھی کرتا تھا۔

کمرے میں مشرقی دیوار کے ساتھ ایک پرانی میز رکھی ہوئی تھی جس کے دونوں دیوار کے ساتھ ملے ہوئے کناروں پر دو کرسیاں رکھی رہتی تھیں اور تیسرے سرے پر ایک اسٹول پڑا ہوا تھا کمرے کے ایک کونے میں چارپائی بھی بچھی ہوتی تھی، جو بوقت ضرورت بیٹھنے کے کام آتی تھی، سونے کے لئے انہوں نے دیوار کے ساتھ ایک لمبی سی صف بچھا رکھی تھی اس پر وہ بستر لگا کر سوتے تھے اور دن کو بستر اٹھا کر اسٹور روم میں رکھ دیتے تھے بعض اوقات وہ کمرے میں ہی پڑے رہتے اور دن کی روشنی میں طبیعت پر بار گذرتے تھے۔

کمرے کا دروازہ جو گلی میں کھلتا تھا۔ دکان کے دروازے کی طرح چوڑا اور بڑا تھا اور کسی پرانی طرز کی حویلی کا پھاٹک معلوم ہوتا تھا۔ میز کی ایک دراز کو کرمانی نے تالا لگا رکھا تھا اور وہاں پر اس نے "عوامی سکول" کی تمام کاغذی کارروائی سنبھال کر رکھی ہوئی تھی جس میں کبھی کبھی وہ تبدیلیاں بھی کرتا رہتا تھا۔

کالج کے زمانے ہی سے اسے یہ خبط سوار ہو گیا تھا کہ ایک ایسا اسکول قائم کرے، جہاں مفت تعلیم کا بندوبست ہو۔ وہ اسے اپنا نصب العین قرار دے چکا تھا۔ مگر وہ قائم نہیں کر سکا تھا۔ تاہم وہ اپنے فارغ اوقات میں توفیق کی چھوٹی بہن بلی کو پڑھا دیا کرتا تھا، کبھی کبھار پڑوس سے کوئی طالب علم بھی اس کے پاس مدد کے لئے آیا کرتا تھا۔

[illegible] بلی دسویں میں پڑھ رہی تھی۔ وہ بالکل الھڑ لڑکی تھی۔ لیکن وہ بہت ذہین اور خوش باش بھی تھی۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوتی کمرے میں بھونچال سا آ جاتا۔ وہ زیادہ دیر کسی ایک کام میں دل نہیں لگا سکتی تھی اور کمرے کی ہر چیز کو اُلٹ پلٹ کر دیتی تھی، کرمانی کی سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے وہ اس سے زیادہ بے تکلف نہیں تھی تاہم وہ اجمل کو بھی بھیرنے تنگ کرتی تھی اور اسے چڑانے کے لئے کرمانی کے میلے کپڑے تک دھو دیتی تھی، اجمل کو یہی خیال تھا۔ اس کا اصلی نام بلقیس بیگم تھا جسے اجمل نے بگاڑ کر جیبس [illegible] بنا دیا تھا۔ چند دنوں کے بعد اس نے اس میں ترمیم کر کے اس کا نام شیطان رکھ دیا کافی دنوں تک وہ شیطان ہی کے نام سے مشہور رہی گھر میں بھی یہ نام مقبول ہو گیا تھا [illegible] سے توفیق نے اسے خوب ہوا دی تھی لیکن ایک دن جب وہ کہیں سے بلی کا بلونگڑا پکڑ لائی تو بلقیس نے اس سے شدید نفرت، کراہت اور خوف کا اظہار کیا، [illegible] سے اجمل نے اس کا نام بلی رکھ دیا۔ اور یہ نام گذشتہ تمام ناموں کی نسبت جلد مقبول ہو گیا۔ بلقیس نے بڑی واویلا مچائی جس نے اس نام کو اور بھی مستحکم کر دیا۔ اس کا جسم تنی ہوئی چارپائی کی طرح خوب کسا ہوا تھا۔ اس کا قد لانبا نہیں تھا اور اسی چیز نے اسے بہت خوبصورت بنا دیا تھا۔ پارے کی طرح تھرکتا اسے [illegible] تھا۔ اور اس میں اس کے چھوٹے قد کا بھی بڑا ہاتھ تھا اس کے ہونٹ باریک تھے تاہم جب وہ مسکراتی تو وہ بھرے بھرے سے معلوم ہوتے اور بلور [illegible] میں سے روشنی گذر رہی ہو۔ اس کی رنگت سانولی مگر دھوپ میں اچھی طرح تپی ہوئی معلوم ہوتی تھی، چمکیلی اور تنی ہوئی جلد میں چکناہٹ سے جو اس کا [illegible] علامہ تھی۔ ایسی جاذبیت پیدا ہو جاتی تھی جس سے عام طور پر لڑکیاں محروم رہتی ہیں۔ قدرت نے جہاں اسے بہت حسن آفریں سے نوازا تھا وہیں اس کی آنکھوں کو غیر [illegible] سیاہی بھی ودیعت کر دی تھی۔

[illegible] نے اس کی تعریف بنائی تو وہ اپنی وحشی آنکھیں جھپکا کر بڑی حیرت کے ساتھ بولی۔

بھئی جان! آپ تو ہمارے ڈرائنگ ماسٹر سے بھی اچھی تصویریں بنا لیتے ہیں!" اس کا چہرہ مسرت اور شرارت سے تمتایا ہوا تھا اور وہ تصویر کو آگے پیچھے کرکے دیکھ رہی تھی۔ "نوٹنگ!" اجمل بڑبڑایا اس کے رخسار خون کی حدت سے تمتا اٹھے ذرا سی دیر میں وہ غصّے سے کانپنے لگا۔ اس نے تصویر تلی کے ہاتھ سے چھین کر چار ٹکڑے کر ڈالی۔ بلی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کی مترنم آواز نے اجمل کا آدھا غصہ ختم کر دیا۔ وہ اس کی آواز پر مرتا تھا۔ اور اس کی فضول ترین گفتگو کو بھی محض آواز ہی کی بنا پر کان لگا کر سنتا تھا۔

"جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا!" اجمل بیگ دھیما ہو کر بولا "لیکن یاد رکھو پھر کبھی کوئی تمہاری اتنی شاندار تصویر نہیں بنائیگا!" اس نے بڑی افسردگی کے ساتھ تصویر کے چار ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور تھوڑی دیر کے اندر ہی اس کے چہرے پر پشیمانی جھلکنے لگی۔ اس نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد تصویر بنائی تھی۔ بلی کو بھی افسوس ہو رہا تھا۔

"اجی واہ ...!" اس نے اپنی شوخی بحال کرکے جواب دیا "ہم کبھی آپ کو ایسی شاندار تصویر بنانے ہی نہیں دیں گے!" ذرا دیر کے بعد اس نے یہ جملہ اور بڑھا دیا "ہم کوئی بے وقوف تھوڑی ہیں جو اُلوؤں کی طرح گھنٹوں آپ کے سامنے منہ اٹھائے بیٹھے رہیں!"

اجمل بیگ کی طبیعت کا سارا تکدر دور ہوگیا۔ "جمیں!" اس نے دوستانہ غصّے کے ساتھ کہا "میں تمہاری چٹیا کے ساتھ چھپکلی باندھ دوں گا!" اس نے ہاتھ بڑھایا اور شاید وہ اس کی چٹیا کو پکڑ بھی لیتا لیکن بلی نے ایکا ایکی جست بھری اور دروازے کو پھلانگ کر سیڑھیوں میں چلی گئی۔ اس نے وہاں سے سر نکال کر کہا۔

"بھئی جان! اب آپ چھپکلی کی تصویر بنائیں!" اس کا چہرہ دوسری طرف غائب ہوگیا۔ اجمل آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اس نے سگریٹ جلایا اور جلتی ہوئی تیلی کو فضا میں ہلا کر بجھا دیا۔

"شاید اس سزا کے بعد وہ کمرے سے بھاگ جائے۔" بلی نے اچانک دروازے میں سے جھانک کر کہا اور اوپر بھاگ گئی۔

کرمانی جو اس تمام نوک جھونک کے دوران ایک موٹی سی کتاب پر سر جھکائے بیٹھا رہا تھا ذرا دیر کے لئے کتاب بند کرکے بولا۔

"زندگی سے کس قدر بھرپور لڑکی ہے!" اس نے اپنی تنکے جیسی آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا اور پھر سر کی پشت پر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا آخرکار وہ دوبارہ کتاب میں غائب ہوگیا۔ وہ حسب عادت کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور مطالعے کے دوران ذرا ذرا سے وقفے کے بعد سر کی پشت پر بالوں کے اندر انگلیاں پھیر رہا تھا۔

کرمانی خوش شکل آدمی نہیں تھا تاہم اس کے چوڑے شانوں پر اس کا پر وقار سر کچھ ایسی سنجیدگی لئے ہوئے تھا جو آدمی کو جلد ہی متاثر کرنے لگتی ہے۔ اس کی شکرے جیسی آنکھوں میں اک غیر معمولی چمک تھی اور جب وہ کسی بات پر زور دیتا تو اپنی پلکیں اٹھا کر مدمقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا اور اس وقت اس کی آنکھوں میں آگ سی جلتی ہوئی معلوم ہوتی لیکن وہ عام طور پر سر جھکا کر گفتگو کرتا تھا۔ اس کے زرد زرد گندمی چہرے پر ایک ایسی جاذبیت تھی جو بڑی ریاضت اور عقیدے کی گرمی کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ وہ عورتوں کے متعلق شاذ و نادر ہی گفتگو کرتا تھا اور بظاہر ان کو کوئی اہمیت دیئے بغیر زندگی گزار رہا تھا۔

وہ زیادہ تر خاموش رہا کرتا تھا اور زندہ دلی کے ساتھ دوستوں کی مجلس میں شریک ہونے سے گریز کرتا تھا کبھی کبھی اس کے لب و لہجہ سے دھیما دھیما طنز بھی جھلکنے لگتی تھی جسے عام طور پر محسوس نہیں کیا جا سکتا، اس میں برداشت کا مادہ غیر معمولی حد تک تھا۔ اور وہ بڑی سے بڑی تکلیف یا ضرورت کا مطلقاً نوٹس نہیں لیتا تھا اور اپنی تکالیف اور ضرورتوں کا یونہی علاج کر لیا کرتا تھا۔

اجمل بیگ اور وہ لنگوٹیے یار تھے اور انہوں نے زندگی کے بیشتر سال اکٹھے گزارے تھے وہ ایک دوسرے کے رازداں تھے واقف تھے لیکن کچھ عرصے سے کرمانی نے اپنے آپ کو چپ چاپ الگ تھلگ کر لیا تھا۔

کالج میں کے زمانے سے اس کے دل میں مفت تعلیم دینے کے لئے ایک ادارہ کھولنے کا خیال جڑ پکڑ گیا تھا۔ وہ جی بھر کے شکست اور کاہل واقع ہوا تھا تاہم ان دنوں ہی جب وہ اپنے مستقبل کے اس منصوبے کا ذکر کرتا اور اس کے نتائج سے متعلق اپنے مخصوص انداز میں کچھ کہتا تو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو جاتی جیسے ... کی لو میں ہوتی ہے۔

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر وہ بہت دنوں تک وہ اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مالدار لوگوں کے پاس چکر کاٹتا رہا۔ جب اسے کوئی امید دکھائی دے جاتی تو وہ رات رات بھر کاغذوں کا روائی عمل کرتا رہتا اور صبح تڑکے سوجھی ہوئی آنکھوں مگر بشاش چہرے کے ساتھ اجمل بیگ کے پاس آتا۔

"میرے ساتھ کام کرو گے نا؟ ..." وہ مسرت سے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہتا۔

"ضرور!" اجمل اس کا دل رکھنے کے لئے جواب دیتا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کا خبط سوار ہو چکا تھا۔

"ہم بعد میں ایک کالج بھی کھول لیں گے!"

"ضرور کھول لیں گے !"

"ایک ٹرسٹ بھی قائم کرنا ہوگا، جو تجارت کر کے آمدن کا ذریعہ بن سکے !"

لوگ اس کی باتوں کو بڑے غور کے ساتھ سنتے تھے اور اس کی تجویز کے افادی پہلوؤں کو سراہنے میں بھی مطلقاً بخل سے کام نہیں لیتے تھے، لیکن جن لوگوں کے پاس روپیہ تھا ان کے لئے اسکول کا دروازہ آسمان پہ نہیں کھلتا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ روپیہ لگا کر ایک خوب چلتا ہوا کاروبار خرید ا جائے یا پھر شروع کیا جائے بڑے اعلیٰ پیمانے پہ اور پھر وہ کاروبار ایک ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیا جائے جو اسکول کے اخراجات کا کفیل ہو سکے۔ جیسے جیسے کاروبار پھیلتا جائے گا زیادہ آدمیوں کی تعلیم کا بندوبست ہوتا جائے گا۔ بعد میں لوگوں سے اپیل کر کے کام کو وسعت دی جا سکتی ہے، اس قسم کی باتیں سوچنے میں اسے کمال حاصل تھا اور وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اب اس میں وہ پہلی سی سرگرمی اور ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ سوچتا رہتا تھا مگر بولتا بہت کم تھا، اپنے پروگرام کے بارے میں بھی وہ بہت کم گفتگو کرتا تھا تاہم اس کے لئے اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک عارضی جوش کے ساتھ کوشش کر لیتا تھا۔ وہ کچھ مایوس سا ہو گیا تھا اور اس کے نصب العین نے اس کے دل و دماغ پر جو مضبوط کمندیں ڈال رکھی تھیں اب ان کی گرفت دم بدم ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔

اس نے ملازمت نہیں کی تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایک بڑے مقصد پہ لگانا چاہتا تھا اب وہ طلبا کو پڑھا کر گذر اوقات کر لیتا تھا، دھندلی سی امید کی کرن ابھی تک اس کے دل میں روشن تھی۔

اجمل نے ایک مرتبہ اپنے مصورانہ جذبے سے مجبور ہو کر اس کی ایک تصویر بھی بنائی تھی۔ جسے دیکھ کر کرمانی نے کہا تھا۔

"تم مجھے ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں سکے ہو، یہ چہرہ تو مایوس آدمی کا ہے !"

گلی میں سناٹا طاری ہو چکا تھا، جیسے طالب علموں کے کمروں سے اکا دکا کوئی قہقہہ بلند ہو کر توڑ دیتا یا پھر کبھی کبھی کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دے جاتی اور اس کے بعد مکمل سکوت طاری ہو جاتا۔ اجمل بیگ نے بستر لگا دیئے تھے اور اب وہ اپنے بستر پر بیٹھا بلی کی تصویر کے چاروں ٹکڑے جوڑ کر دیکھ رہا تھا۔

کرمانی اپنی شام باہر گذار کر آیا تھا اور گھر آ کر کسی سے مخاطب ہوئے بغیر اپنی نشست پر اکڑوں بیٹھا تھا، وہ کچھ مضطرب سا معلوم ہوتا تھا اور بار بار کتاب سے نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا آخر کار اس نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی اور نظریں جما کر دیوار پر چھپکلی کا کھیل دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا رکھی تھیں اور انہیں کھینچ رکھا تھا۔ اس کے لب ذرا سے کھل گئے تھے اور حیرت سے قدرے پھیلی ہوئی آنکھوں کی پتلیاں دھیرے دھیرے پتنگے اور چھپکلی کے پیچھے گھوم رہی تھیں۔ سیاہ رنگ کی توانا چھپکلی پتنگے کو کئی مرتبہ دبوچنے کے لئے جست لگا چکی تھی لیکن پتنگا عین موقع پہ اڑ کر اپنی جگہ بدل لیتا تھا، چھپکلی اس کے تعاقب میں چھت تک آ گئی تھی، اب وہ بے آواز قدموں سے رینگتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھی وہ ذرا دیر کے لئے رک جاتی اور اپنی سیاہ چمکدار آنکھوں سے پتنگے کے ننھے سے وجود کو دیکھ لیتی اور پھر ذرا سا آگے بڑھ آتی جب وہ بہت قریب آ گئی تو اچانک پتنگا اپنی جگہ سے اڑ گیا۔ اور فضا میں دھیمی سی بھنبھناہٹ پیدا کرتا ہوا دوسری دیوار کے ساتھ چپک گیا، "چہاں تو!" ایک اور چھپکلی نے آہستہ دبوچ لیا ——— چھپکلی کے منہ میں لمحے بھر کے لئے اس کے پر پھڑپھڑائے اور پھر خموشی طاری ہو گئی ———

کرمانی نے تھوڑی دیر کے لئے بالوں میں پھنسی ہوئی انگلیوں کی گرفت مضبوط کر لی اور پھر ہاتھ باہر نکال لیا "نظامِ قدرت!" وہ بڑبڑایا اور ہاتھ پشت پر باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

طالب علموں کے کمرے خموش ہو گئے تھے البتہ چھت سے دبی دبی گفتگو کی آوازیں آ رہی تھیں جن میں ذرا ذرا سے وقفے کے بعد رضیہ کی غصیلی آواز بھی سنائی دے جاتی "آہستہ بولو !" اس کی ماں التجا کر رہی تھی۔

سیڑھیوں پہ کھٹکا ہوا پھر چند تیز قدموں کی چاپ سنائی دی تھوڑی دیر کے بعد توفیق بغل میں بستر دبائے کمرے میں داخل ہوا، اس نے خموشی کے ساتھ اپنا بستر صف پہ بچھا دیا اور بغیر کچھ کہے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی پیشانی کے درمیان تیوریاں جمع ہو گئی تھیں اور آنکھیں یوں سختی کے ساتھ بند ہو رہی تھیں گویا کوئی نامعلوم ہاتھ انہیں کھولنے کے لئے زور لگا رہا ہو ——— آخر کار اس نے سر کے گرد بازو لپیٹ لیا اور ایک لمبی سی سانس کھینچ کر خموش ہو گیا۔

اجمل نے تصویر کے ٹکڑے تکیئے کے نیچے رکھ دیئے اور سگریٹ جلا کر چت لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کرمانی نے بتی بجھا دی اور کمرے میں کامل سکوت طاری ہو گیا۔

ملحقہ گلی میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز پل بھر کے لئے گونجی اور پھر سناٹا طاری ہو گیا۔

اجمل سگریٹ بجھا کر دبی آواز میں کوئی شعر گنگنانے لگا وہ ذرا دیر کے لئے چپ سادھ لیتا اور پھر نئے سرے سے گنگنانے لگتا اکا دکا مرغ ہنوز دور چھت کی ...

کڑکڑائیں اور مٹی کی پھوار نیچے گری پھر چند باریک تنکے فرش پر گرے ۔ توفیق ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ۔

" کیوں ! کیا بات ہے ؟ ؟ " اجمل نے پوچھا ۔

لمحہ بھر کے لئے خاموشی رہی پھر توفیق کی خوفزدہ آواز سنائی دی : چھت بول رہی ہے ! "

" سو جاؤ ! " کرمانی نے بڑی اجنبی کیفیت مگر دھیمے لہجے میں جواب دیا " یہ روز رات کو بولتی ہے ! "

" سو جاؤں ــــــــ ؟ " توفیق نے دہشت زدہ نظروں سے اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا اور پھر بتی جلا دی اور فرش پر کھڑا ہو گیا تھوڑے تامل کے بعد اس نے یہ جملہ اور بڑھا دیا " میں اس چھت کے نیچے مطلقاً نہیں سو سکتا ــــــــ !! " توفیق کی لانبی پلکیں ابروں کے ساتھ مل گئی تھیں اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی ۔

" اُوپر چلے جاؤ !! " کرمانی نے بالوں میں انگلیاں پھنسا لی تھیں " شاید وہاں آواز سنائی نہیں دیتی ــــــــ ! "

" اُوپر ــــــــ ! " توفیق کے چہرے سے دہشت اور خوف کا غبار اُتر گیا تھا وہ ہنس پڑا اور یہ ہنسی بڑی دردناک تھی وہ بے بسی کے ساتھ بستر پر بیٹھ گیا اور سگریٹ جلا کر پینے لگا ۔

" آج کچھ زیادہ ہی مٹی گر گئی ہے ! " اجمل نے اپنے دل میں سوچا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا جہاں وسط میں ایک پرانی درز پہلے سے کچھ بڑھ گئی تھی اور وہاں لکڑی کی تختی ذرا تر چھی ہو گئی تھی ۔

" در باہر ٹہل آئیں ! " اجمل نے توفیق کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر لباس تبدیل کرنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا ۔

کرمانی نے منہ سے کچھ نہیں کہا وہ گم سم بالوں میں انگلیاں دیئے کمرے کے آخری سرے تک ٹہلنے لگا ۔

" ہمارے ساتھ چل رہے ہو ؟ " جانے سے پہلے اجمل نے کرمانی سے پوچھا ۔

" نہیں ! " کرمانی نے آنکھیں چار کئے بغیر جواب دیا " اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے ! "

گلی میں اندھیرا تھا ، بجلی کا کھمبا روشن نہیں تھا شاید کسی بچے نے اس کا بلب توڑ دیا تھا ۔ گلی میں آتے ہی توفیق خوش ہو گیا اس نے اجمل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں بھینچ رکھا تھا ۔ اور یہ اس کی عادت تھی ۔ وہ بغیر ہاتھ پکڑے کسی کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تھا ۔ وہ انگلیوں میں انگلیاں پھنسا لیتا اور بالکل ساتھ لگ کر چلتا جس سے بعض اوقات اُلجھن بھی ہونے لگتی تھی ۔

پنساری کی دکان سے ذرا اِدھر وہ ایک بھینس سے ٹکرا گئے لیکن گرنے سے بچ گئے اور اس حادثے نے انہیں یاد دلا دیا کہ گلی کی نکڑ پر مین ہول کا ڈھکنا غائب ہے ۔

سڑک پر آ کر توفیق نے دو سگریٹ جلائے اور ایک اجمل کو دے کر اس کا ہاتھ دبایا " یار ! کرمانی کا دل نہیں گھبراتا ؟ "

کئی قدم چل چکنے کے بعد اجمل نے جواب دیا " اس کے پاس دل ہے ہی نہیں ــــــــ ! " پھر فوراً اس نے یہ جملہ اور بڑھا دیا " تمہیں وہ کملا والا قصہ معلوم ہے ؟ "

" کون کملا ! ـ نہیں میں تو نہیں جانتا ! " اس نے بڑی حیرت اور اشتیاق کا اظہار کیا " مجھے سناؤ ! "

اجمل نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا اور آہستہ آہستہ ہونٹ چبانے لگا ۔

توفیق نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور پھر اسے سڑک کے وسط میں اچھال دیا " میرا خیال تھا کہ اس آدمی کی زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی !! "

" نہیں یہ بات تو نہیں ہے ! " اجمل نے اپنا ہاتھ کھینچ کر پیشانی پر پھیرا اور پھر اسے پتلون کی جیب میں ڈال لیا " وہ عورت کے معاملے میں بدقسمت ضرور ہے لیکن سرے سے عورتوں نے اسے نظر انداز بھی نہیں کیا ــــــــ " اس نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھا " بہر حال ، کملا والی بات میں تمہیں بتاتا ہوں ، یہ پانچ سردیاں پہلے کی بات ہے ، ان دنوں وہ اس طرح سے سنجیدہ اور کم گو نہیں تھا ، لوگوں نے اُس سے کچھ امیدیں وابستہ رکھی تھیں اور اس کی بذلہ سنجی اور زندہ دلی ابھی رخصت نہیں ہوئی تھی نیز اس کے کردار کی بنیادیں رکھی جا چکی تھیں ! "

" اس کا اصل نام کلثوم تھا لیکن جب کرمانی کی سفارش اور کلثوم کی فرمائش پر میں نے اس کی تصویر بنائی تو اس کے نیچے کملا لکھ دیا ۔ کرمانی کو بھی یہ نام زیادہ پسند آ گیا ۔ وہ معمولی لڑکی تھی ! " اجمل خاموش ہو گیا ، اس نے نیا سگریٹ جلایا پھر توفیق کی طرف سر گھما کر بولا ۔

" یہ میری ذاتی رائے ہے ۔ قدرت نے شکل و صورت کے معاملے میں اس کے ساتھ کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیا تھا ۔ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق

رکھتی تھی اور عورت کے ساتھ معاشرے نے جس قسم کی پابندیاں باندھ رکھی ہیں، وہ ان سے مطلقاً آزاد تھی ۔ ! " اس کے چہرے کے خطوط گہرے ہو گئے تھے گویا، ابھی ابھی سو کر اٹھا ہو اور وہ خلاؤں میں کسی غیر مرئی شے کو گھور رہا تھا شاید ماضی کی یادوں کو، آخر کار اس نے کہا ۔

" اسے کرمانی کے ساتھ عشق ہو گیا تھا، اور یہ کملا کے اپنے الفاظ ہیں، کرمانی نے اپنے دلی جذبات کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا تاہم اس کے اپنے الفاظ میں وہ اس کی ضرورت محسوس کرنے لگا تھا، میرے خیال میں یہ اس کا سراسر تکلف تھا، وہ اس پر بری طرح سے فریفتہ تھا ! "

راستے میں ایک چھوٹا سا کیفے آ گیا تھا وہ دونوں سیدھے وہاں چلے گئے، توفیق نے چائے کا آرڈر دیا اور وہ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے ۔

" میں یہ نہیں جان سکا کہ کملا کو اس کی کونسی چیز پسند تھی، لیکن وہ اس کے کردار کی اصل خوبی سے بہرحال واقف نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کی ذہنی صلاحیتوں کی سچی قدر دان تھی، وہ کرمانی کے مستقبل کے پروگراموں میں بھی بہت کم دلچسپی لیتی تھی" اس کے اپنے بہت سے پروگرام تھے، جیسے فارغ البال اور حسین عورتوں کے ہوتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ اہمیت بہر طور، نمود و نمائش، شاپنگ اور اعلیٰ قسم کے رہن سہن کو دی جاتی ہے ۔

وہ بری عورت نہیں تھی، اسے کرمانی کے ساتھ پیار تھا لیکن حالات نے اسے جن وسائل پر دسترس بخش رکھی تھی وہ ان سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتی تھی ـــــــ اس کا کوئی نصب العین نہیں تھا ـــــــ اور یہیں سے ان دونوں کے درمیان بنیادی طور پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا، وہ مستقبل میں کرمانی کے ساتھ کیا سلوک کرتی اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے تاہم، وہ کرمانی جیسے لاابالی اور زندگی کی آسائشوں سے محروم آدمی کو جس کا ذہن اعلیٰ خیالات اور آزادی قدروں کے بوجھ سے تھکا رہتا ہے ـــــــ ایک ایسی آسودگی سے واقف کر سکتی تھی جس پر محبت کرنے والی عورتوں کو مکمل قدرت حاصل ہوتی ہے ۔

" آخر کار کملا نے شادی کی تجویز پیش کی، وہ کرمانی کے افلاس کو نظر انداز کر گئی تھی لیکن کرمانی نے اس پیش کش پر کوئی خوشی نہیں جتائی، ان دنوں وہ بہت پریشان تھا حقائق اس کے دروازے پر دستک دینے لگے تھے "

لڑکی چاہتی تھی کہ وہ " عوامی اسکول " کے بے کار خیال کو دل سے نکال دے اور اس کے سرمائے سے کوئی کاروبار کرے اور وہ دونوں شاندار زندگی بسر کریں " ان دونوں کے درمیان سمجھوتہ نہیں ہو سکا، لڑکی اس کے لئے روتی رہی اس نے مجھ سے مل کر کہا کہ میں کرمانی کے بغیر مر جاؤں گی ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور ذرا سی دیر میں ہی اس کی ہچکی بندھ گئی تھی ۔ لیکن اس واقعہ کے ایک مہینے کے بعد اس نے اپنے مطلب کے آدمی سے شادی کر لی ـــــــ مگر بات یہیں پر بس نہیں ہوتی ۔ ! "

توفیق نے حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا ۔

" کرمانی نے کوئی غم نہیں کیا اور اپنے کام میں لگا رہا لیکن اس واقعہ کے بعد اس نے کبھی کملا کا ذکر نہیں کیا ـــــــ گئے برس کے اکتوبر میں وہ ہمیں مال روڈ پر مل گئی، اس نے ایک بچہ پیدا کر لیا تھا، وہ اپنی نئی کار کا دروازہ کھولے کھڑی تھی، غالباً وہ اندر بیٹھنے لگی تھی مگر ہمیں دیکھ کر رک گئی تھی ۔ اس نے کار کا دروازہ کھلا رہنے دیا اور آگے بڑھ آئی وہ بڑی محبت اور شوق کے ساتھ کرمانی کی طرف دیکھ رہی تھی وہ پہلے سے زیادہ نکھر آئی تھی ۔

" ہیلو ڈارلنگ ! " اس نے اپنا چھوٹا سا خوبصورت ہاتھ آگے بڑھایا ۔

کرمانی کے چہرے پر کوئی جذبہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ بالکل عام حالت میں تھا ۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر پتلون کی تمام اگلی پچھلی جیبیں ٹٹولنے لگا بالآخر اس نے پچھلی جیب سے ایک روپے کا مڑا تڑا نوٹ نکالا اور کملا کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گیا ۔

کھانسی کی پہلی آواز کے ساتھ ہی اجمل ناشتے کی میز سے اٹھ گیا ۔ وہ پل بھر کے لئے اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر چق اٹھا کر کمرے کے باہر تھڑے پر کھڑا ہو گیا اس نے ادھر ادھر سرسری نظروں سے دیکھا پھر سامنے دروازے پر نظر جما دیں جہاں چلمن کے ساتھ لگ کر ایک طویل سایہ کھڑا تھا، چلمن کے پیچھے ذرا دیر کے لئے چوڑیاں کھنکیں، پھر وہ نیلی آنکھوں کی پتلیاں چلمن کی تیلیوں میں سے جھانکنے لگیں ۔ اجمل کو اب اس کی ناک کی پھننگ، ہونٹ اور رخساروں کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا، اس نے ایک ہاتھ سے چلمن کے کنارے کو تھام رکھا تھا اور جن کی وجہ سے اس کی انگلیوں کی ابتدائی پوریں صاف دکھائی دے رہی تھیں ۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی کی رنگت گوری ہے، گلی میں سے کوئی راہگیر گذرا اور سایہ غائب ہو گیا ۔ اجمل نے اسے کبھی صاف طور پر نہیں دیکھا تھا تاہم اسے پورا پورا یقین تھا کہ وہ بہت خوبصورت ہے اور اسی کی آواز بہت سریلی ہے ۔ اس نے لڑکی کی غیر واضح تصویر میں جو بہت دنوں سے اسے چلمن کے پیچھے دکھائی دے رہی تھی اپنے تخیل سے رنگ بھر لئے تھے ایک مصور زیادہ سے زیادہ جو کچھ عورت کی جمالیات کے متعلق سوچ سکتا ہے وہ اجمل نے اس لڑکی کے حسن کے بارے میں اور کردار کے متعلق

سونپ رکھا تھا۔ وہ اسے پوری طرح دیکھنے کے لئے کبھی بے تاب نہیں ہوا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اسے نمایاں طور پر دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

وہ اکثر و بیشتر تنہائی کے لمحوں میں اپنے تخیل کے شیشے سے اس کے خدوخال تراشتا رہتا تھا اور یوں اسے ایک ایسا سکون ملتا تھا جو فنکار کو کبھی جیتی جاگتی عورت سے میسر نہیں آسکتا ——— وہ جب رات کو اپنے تصور کے پردے پر لڑکی کی تصویر اُجاگر کرتا اور اس میں ایسے ایسے نادر رنگ بھرتا جنکے اسے نام بھی معلوم، نہیں تھے اور جب وہ تصویر حرکت کرتی اور پلکوں کی جھالریں اُوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی تب اسے پورا یقین ہوجاتا کہ وہ ایک عظیم مصوّر بن رہا ہے۔

اس نے ایک نظر خالی چلمن پر ڈالی ایکا ایکی اسے خیال آیا میں اس لڑکی کی تصویر کینوس پر اتار لوں۔ ؟ اس نے چھٹی کی درخواست لکھکر توفیق کو دے دی۔ "دفتر میں دے دینا" وہ بڑبڑایا اور سامان والے کمرے سے مصوّری کا سامان اٹھا لایا، اُس نے کینوس کو بورڈ پر جمایا اور رنگ بنانے میں مشغول ہوگیا۔

توفیق نے درخواست تہہ کرکے پتلون کی جیب میں رکھ لی۔ اور چق اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کرمانی صبح ہی سے "عوامی اسکول" کی کاغذی کارروائی میں کانٹ چھانٹ کر رہا تھا وہ اس وقت بڑے تذبذب کی حالت میں تھا، وہ اُوپر تلے سگریٹ جلا رہا تھا اور کرسی کے بازو پر انگلیاں بجا رہا تھا۔ وہ تھوڑا تھوڑا سے وقفے کے بعد گھڑی میں وقت دیکھ لیتا تھا اور پھر سگریٹ کا ایسا بھرپور کش لیتا کہ اس کی زرد روشنی کرمانی کے لمبوترے چہرے پر عکس انداز ہونے لگتی اور پل بھر کے لئے اپنی چمک دکھا کر غائب ہوجاتی۔ اس نے کاغذات کی فائل بند کردی اور ایک ہاتھ بالوں میں پھنسا کر کرسی کے بازو پر انگلیاں بجانے میں پوری طرح منہمک ہو، گیا آج اس کا پاؤں بھوڑ پل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں جنہیں وہ بار بار فائیل پر مرکوز کر رہا تھا۔

ڈیوڑھی کا چھوٹا دروازہ کھل کر دیوار کے ساتھ پٹاخ سے لگ اٹھا بلی نے گردن نکال کر کمرے میں دیکھا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد اندر آگئی۔ اس نے کتابوں والا ہاتھ سینے پر باندھ رکھا تھا اس نے ہلکے بسنتی رنگ کی گھٹنوں سے نیچے تک، چُست قمیص پہنی ہوئی تھی، جس نے اس کے موزوں جسم کی ساخت کو مجسمے کی طرح تراش کر نمایاں اور واضح کر دیا تھا، اس کے تاشے کی طرح دہکتے ہوئے رخسار مسکراہٹ سے بھر گئے تھے۔ کرمانی نے کرسی کے بازو پر سے ہاتھ اٹھا لیا اور یوں نظریں جما کر اس کی طرف دیکھا گویا پہلے اُس سے اس کی مدبھیڑ نہیں ہوئی تھی، ایک منٹ سے بھی کم عرصے کے لئے بلی کرمانی کے سامنے کھڑی رہی ایک دم وہ ہنس پڑی اور پھر اجمل کی طرف بھاگ گئی "بھئی جان!" اس نے اجمل کی پشت کی طرف سے کینوس پر جھک کر کہا "آج آپ دفتر نہیں جائیں گے!"

"نہیں!" اس نے بلی کی طرف دیکھے بغیر بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ وہ اس وقت کینوس پر لائینیں لگا رہا تھا اور بڑی محویت کے ساتھ ایزل پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں بڑی یک جہتی کے ساتھ کینوس پر مرکوز تھیں اور نچلا ہونٹ قدرے لٹک گیا تھا جو اس کی گہری محویت کا اظہار کر رہا تھا۔

"آپ کے تو ہاتھ کانپ رہے ہیں!"

"بلقیس!" کرمانی کی کرخت آواز گونجی

بلی نے مڑ کر دیکھا لیکن اپنی جگہ سے ہلی نہیں، کرمانی نے سر کے اشارے سے اُسے بلایا اور اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا، جب وہ اس کے پاس آگئی تو اس نے بڑے پرسکون اور دھیمے لہجے میں کہا "اسے اپنے کام میں لگا رہنے دو!" اس نے عوامی اسکول کے کاغذات کی فائیل بغل میں دبائی اور سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ بلی پل بھر کے لئے اپنی جگہ پر کھڑی رہی پھر اس کے پتلے پتلے ہونٹ مسکراہٹ سے بھر گئے اس نے سر گھما کر اجمل کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی، اس کے اسکول جانے کا وقت ہوگیا تھا۔

توفیق نے اصطبل کے ساتھ والے اونچے مکان میں ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی سے آنکھیں چار کرلی تھیں، وہ مربع نکال کر چھت پر چلا جاتا، اور اس کے ساتھ اشارے بازی کا لطف حاصل کرتا، اس کام کو اس نے ایک فضول مگر ضروری مصروفیت کا نام دے رکھا تھا۔ توفیق خوش خوش رہنے لگا تھا۔ اس نے ایک حد تک رضیہ کے ہسٹیریا کے دوروں کو بھی فراموش کر دیا تھا اس نے اپنا ماز خود ہی فاش کر دیا تھا اور اجمل کو سے جا کر لڑکی دکھادی تھی۔ وہ مخنی سی، عام شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ اس کی عمر کوئی زیادہ نہیں تھی تاہم اس کی جوانی ڈھلنے لگی تھی اور وہ بڑے بھونڈے پن کے ساتھ سلام و پیام کا سلسلہ جاری رکھتی تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جس پر عاشق ہونے میں نوجوان آدمی کو کئی قسم کی دقتیں پیش آسکتی ہیں لیکن توفیق کو ان کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ تھی۔ "وہ خوبصورت نہیں تو کیا ہوا؟" وہ خود بخود ہی بول اٹھتا "اس نے میرا دل بہلا لیا ہے اور میں جلد ہی اس سے ملنے کی کوئی صورت پیدا کر لوں گا!"

چند دنوں سے ایک تھم کے ڈھنگ جیسی مونچھوں والا طالب علم کرمانی کے پاس آنے لگا تھا۔ شروع میں وہ تعلیم میں مدد لینے کے لئے آیا کرتا تھا اب وہ گپ شپ لگانے کے لئے بھی آجاتا تھا، اس کا اصلی نام خدا جانے کیا تھا لیکن اجمل نے اس کا نام شاہد نازر رکھ دیا تھا، شاہد نازر پہلے درجے کا ہنسوڑ اور لطیفہ گو آدمی تھا، نقل اتارنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ وہ سرگودھے کے کسی چک سے اکتسابِ علم کے لئے لاہور آیا ہوا تھا اور سیڑھیوں کے دوسرے

حِصّے میں رہتا تھا، وہ عموماً سیڑھیوں والے دروازے سے آیا کرتا تھا اور بغیر دستک دیئے سیدھا کمرے میں گھس آتا تھا۔ آخر کار ایک دن کرمانی اسے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دروازے تک دھکیل لے گیا "معاف کرنا یہ کافی ہاؤس نہیں ہے، دستک دے کر آیا کرو! اب تم جاؤ آئندہ احتیاط رکھنا!" شاز و نادر تغیر برا مانتے چلا گیا اور پندرہ منٹ سے بھی پہلے اجازت طلب کر کے کمرے میں واپس آگیا۔

"یار تم بھی عجیب آدمی ہو!" اُس نے چھوٹتے ہی کہا "میری تو عزت ہی خراب ہو چلی تھی لیکن میں نے پرواہ ہی نہیں کی۔!" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور کرسی پر بیٹھ گیا "یہ جذبہ صحت کا راز ہے!" توقیق نے بڑی سنجیدگی سے کہا لیکن فوراً ہی اس کے لب مسکراہٹ سے بھر گئے اجمل کمرے کے ایک کونے میں ایزل پر جھکا ہوا تصویر کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔ اس کی شبیہ بڑھی ہوئی تھی اور گزشتہ رات جاگنے کی وجہ سے آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور قدرے سوجی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں اس نے گفتگو میں حصّہ نہیں لیا۔ اجمل کھڑا ہو گیا اور چند قدم کے فاصلے سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ خوشی اور جذبات کی شدت سے کانپ رہے تھے۔

تصویر تقریباً مکمل ہو چکی تھی، وہ پہلی نظر میں ایک عورت کی سیدھی سادھی تصویر معلوم ہوتی تھی لیکن ذرا سی دیر کے بعد ہی دیکھنے والے کو یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ اس میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اسے عام تصویروں سے الگ کر رہی ہے۔ تصویر میں رنگوں کی آمیزش اس طرح سے کی گئی ہے کہ بغور دیکھنے سے اصل تصویر پس منظر میں غائب ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

کرمانی کرسی سے اٹھ کر اجمل کے پاس گیا، وہ صبح سے کئی مرتبہ اٹھ کر تصویر کو دیکھ چکا تھا۔

"تمہارے اندر بڑے فنکار کے تمام جراثیم موجود ہیں لیکن ملازمت سے مستعفی ہو جاؤ!"

اجمل نے اس کی طرف دیکھا آج اس کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔

"ملازمت!" وہ بڑبڑایا اور کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"استعفیٰ دے دوں!" اس نے کرمانی کے پہلو میں آ کر کہا۔ "لیکن جراثیم کو خوراک کہاں سے ملے گی!" اس کا لہجہ اچانک درشت ہو گیا اور ماتھے پر بل آگئے کرمانی نے بالوں میں انگلیاں پھنسا لیں اس نے نگاہ بھر کے اجمل کی طرف دیکھا جس کے رخسار خون کی حدت سے تمتمانے لگے تھے "تمہارا خیال ایک حد تک درست ہے" اس نے کہنا شروع کیا "تاہم جذبہ اور صلاحیت بہرکیف اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی بڑے مقصد کے لئے ایثار اور قربانی اولین شرط ہے" وہ آہستہ سے مڑ گیا اور جا کر میز کے سہارے کھڑا ہو گیا اس کی فنکار جیسی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ ٹکٹکی باندھ کر اجمل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بالوں میں گھمایا اور پھر اسے باہر نکال لیا۔

"تخلیق فارغ وقت کا مشغلہ نہیں ہے!" وہ ذرا دیر کے لئے چپ ہو گیا اور میز پر انگلیاں بجاتا رہا "اور جو چیزیں عوام فہم نہ ہوں" اس نے اچانک سر پر اٹھا کر کہنا شروع کیا۔

"ان کے عوض ہمیں لوگوں سے توقعات وابستہ کرنے کا حق بھی نہیں پہنچتا، زندگی ایک سود خور کی طرح ہے وہ جتنا ہمیں دیتی ہے اس سے دُگنا ہم سے لیتی ہے اور زندگی کے دامن میں کچھ ڈالے بغیر آگے بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!"

اجمل نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا اس نے سگریٹ جلایا اور آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اس نے دو تین کش لئے اور پھر سگریٹ جھاڑ کر بولا "تم نے ایثار اور بانی کا ذکر کیا تھا" اجمل نے بڑے دھیمے لب و لہجے میں سلسلہ کلام شروع کیا "میں اپنی خوشیوں اور ضرورتوں سے دستبردار ہونے کا حوصلہ کر سکتا ہوں اور یہ بذاتِ ایک خوشی ہے میں زندگی سے کچھ مانگنے کی بہ نسبت زندگی کو کچھ دینا بہتر سمجھتا ہوں لیکن مجھے صرف اپنی ہی ذات کو مدنظر نہیں رکھنا ہوتا!" وہ بولتا چلا گیا اب اس کے لب و لہجے سے دبے دبے جوش کا اظہار ہو رہا تھا "میرا باپ بوڑھا ہو گیا ہے، میرے دو چھوٹے بھائی ہیں، میں بڑا فنکار بننے کے لئے انہیں تو نہیں رکھ سکتا میری ایک بہن ہے کل کو اسے جہیز کی ضرورت پڑے گی!" وہ لمحہ بھر کے لئے رک گیا اور کرمانی کی طرف دیکھنے لگا اس کے رخسار کان کی لوؤں سرخ ہو گئے تھے اور جذبات کی شدت سے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے "زندگی اگر مجھ سے کچھ لینا چاہتی ہے تو زندگی کو مجھے کچھ دینا بھی ہوگا ورنہ میں اس کے اور اس کی جمالیات کی شیرازہ بندی نہیں کروں گا۔ میری روح تو مرجھا ہی جائے گی تاہم اس کا سینہ بھی نادر احساسات سے خالی رہے گا!"

"لیکن" توفیق چلا کر بولا "زندگی یہ لین دین ہمارے ساتھ ہی کیوں کرتا ہے جو لوگ زندگی کو کچھ بھی نہیں دیتے وہ اس سے سب کچھ لے لیتے ہیں حتیٰ اس کا لباس تک نوچ لیتے ہیں!"

"کیا ہم بھی یہ کر سکتے ہیں؟" کرمانی نے ذرا دیر تامل کیا پھر وہ بولا "ہم اس طرح سے نہیں کر سکتے ہمیں زندگی کو لباس بھی پہنانا ہے اور اس کے

ـسن کی شیرازہ بندی بھی کرتی ہے کیونکہ ہم زندگی کو بُرے روپ میں برداشت نہیں کر سکتے !“ اس نے آدھے جلے ہوئے سگریٹ کو پاؤں تلے دبا دیا اور کمرے کے آخری سرے تک ٹہلنے لگا۔ اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے۔

”میں اگر منفعت تعلیم کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو یہ اس لئے کہ جہالت نور کی دشمن ہے اور روشنی کے بغیر زندگی آسانی کے ساتھ لوٹ لی جاتی ہے !“ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے مکمل خاموشی طاری ہو گئی، توفیق سینے پر بازو باندھے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا اور پاؤں سے فرش پر لکیریں بنانے لگا۔ اس کی پیشانی پر ابھی تک بل قائم تھے۔

اجمل لمحہ بھر کے لئے اپنی تصویر کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے رنگوں کے ڈبے دوسرے کمرے میں لے جا کر رکھ دیئے اور ایزل کو چادر سے ڈھانپ کر ماں کسی کی طرف دیکھے بغیر کمرے میں ٹہل رہا تھا آخر کار وہ کرسی پر اکڑوں ہو کر بیٹھ گیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا شاز و نادر جو تمام گفتگو کے دوران جگہ پر چپ چاپ بیٹھا رہا تھا اپنی جگہ سے اٹھا اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور پھر وہ سگریٹ جلائے بغیر بولا ”مجھے اجازت دیں“ اس نے کہا ”آپ لوگ بہت سنجیدہ ہو گئے ہیں اور میں قہقہہ لگائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“ شاز و نادر نے سگریٹ جلایا اور سیٹی پر کوئی فلمی دھن بجاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

گلی میں سے کسی کے رُک رُک کر کھانسنے کی آواز آ رہی تھی گویا کوئی منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانس رہا ہو آواز گھمبیر مگر کھوکھلی تھی۔ اجمل نے ایک چکر کمرے میں لگایا اور پھر چق اٹھا کر باہر تھڑے پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا سامنے والے مکان کے دروازے کی چلمن خالی تھی۔ تھوڑی دیر کھڑا رہنے کے بعد وہ واپس کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا بلی ایزل پر سے چادر ہٹا کر تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی۔

”بھئی جان !“ اس نے اجمل کی طرف دیکھ کر کہا اور اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے بھرے ہوئے تھے اس نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا ”آپ چڑیل کون سا ہے ! یہ تو سیدھی سادھی عورت کی تصویر ہے !“ ایک لمحے تک سنجیدہ رہنے کے بعد وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی کمرے میں ہلکی سی شگفتگی دوڑ گئی۔

”چڑیل !“ اجمل نے لفظ چبا کر کہا ”میں تمہاری چٹیا کے ساتھ چھپکلی باندھ دوں گا !“

”یہ تو آپ نے پہلے بھی کہا تھا !“

”ہاں کہا تھا، لیکن آج میں تمہیں معاف نہیں کروں گا !“

”نہیں بھئی جان !“ بلی نے بڑی معصومیت کے ساتھ التجا کی ”معاف کر دیجئے !“

”نہیں !“ اجمل گھمبیر اور زہر ناک لب و لہجہ میں بولا ”آج ہم بڑے جلال میں ہیں !“

بلی کے ہونٹ سکڑنے لگے آخر کار وہ ہنس پڑی ”اچھا تو پھر باندھ دیجئے !“ اس نے چٹیا اٹھا کر آگے بڑھا دی

اجمل کھسیانا ہو گیا اس نے سر کھجایا اور پھر ہنسنے لگا ”اب تم مجھے معاف کر دو ! آئندہ میں تمہاری چٹیا کے ساتھ کچھ باندھنے کی دھمکی نہیں دوں گا“ مسرت کے مارے بلی کی آنکھیں چمکنے لگیں اس نے سر ہلایا اور پھر چٹیا کمر پر پھینک دی اس نے ایزل کو کپڑے سے ڈھانپ دیا۔

”بلی تم نے میدان مار لیا ہے اس خوشی میں ہمیں چائے پلاؤ !“ توفیق نے چارپائی پر نیم دراز ہو کر کہا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا لی۔ ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا اس نے چارخانے کا کرتہ پہنا ہوا تھا اور وہ دامن سے ناک صاف کرتا ہوا کمرے میں آیا تھا۔ ”بھائی جان“ چارپائی کے پاس جا کر کہا ”باجی کو کچھ ہو گیا ہے !“

لمحہ بھر کے بعد کمرا باقی اور اجمل کمرے میں تنہا رہ گئے، دونوں خاموش بیٹھے رہے اور ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے سے ایک ملی جلی آوازوں کا قہقہہ بلند ہوا اور پھر شاز و نادر نے جا کر کچھ کہا جس کا مفہوم ننھے قہقہے میں غائب ہو گیا۔

چھت پر چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں کی آوازیں آ رہی تھیں اور دبی زبان میں گفتگو ہو رہی تھی، اندھیرے میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور گلی میں کوئی زور سے کھانسنے لگا، پھر کوئی آہستہ آہستہ کھانسنے لگا آواز دور ہوتی گئی اور بالآخر غائب ہو گئی۔

توفیق کمرے میں داخل ہوا، رات کی وجہ سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، اس نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونس لئے اور اس کے ساتھ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا۔

”خیریت ہے نا !“

یں ہنس پڑا اور اس کی آنکھیں سکڑ گئیں پھر اس نے جبڑے بھینچ لئے اس کے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے لمحہ بھر میں اس کی سانس پھول گئی اور کنپٹی پر ایک نس بُری
طرح پھڑکنے لگی "تو غیرت نہ بھی ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟" وہ پھر اٹھکر کمرے میں ٹہلنے لگا وہ بڑا اُکھڑا اُکھڑا اور بے چین نظر آ رہا تھا۔

"آؤ گھوم آئیں!" اجمل نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"ہاں چلو! کوئی مار دھاڑ کی فلم دیکھیں گے!"

"ابھی فلم شروع ہونے میں ایک گھنٹہ ہے" کرمانی نے گھڑی دیکھکر کہا "میں لباس تبدیل کر لوں، مال کے کسی کیفے سے چائے بھی پئیں گے، میری جیب
بہت دنوں سے دس کا ایک نوٹ بیکار پڑا ہے!"

گلی میں انہیں ایک چھوٹا سا بچہ مل گیا جو راجے کی عمر کا تھا وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ بغیر کسی قسم کی جھجک کے جو چھوٹی عمر کے بچوں کا شیوہ ہوتا ہے توفیق کا ہاتھ
پکڑ کر ایک طرف لے گیا اس نے جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر اسے دیا، توفیق نے اس کے گال تھپتھپائے اور دو آنے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔
بچہ ان کے آگے آگے چلنے لگا اور جب اصطبل کے ساتھ والا اُونچا مکان آیا تو وہ اس میں داخل ہو گیا۔ توفیق نے اجمل کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اس کی انگلیوں میں
انگلیاں پھنسا لیں اس نے اجمل کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا لیکن گلی ختم ہو جانے تک وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔

نکڑ والے پنواڑی سے اس نے ادھار سگریٹ لئے اور سڑک پر آ کر بولا "میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے پہلے خط لکھے گی!"
وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا اور خط پڑھنے لگا۔ اس کے منہ سے خوشی کی ہلکی سی چیخ نکل گئی اس کے رخسار تمتمانے لگے وہ مسرت کے جوش میں اجمل کے
گلے سے لپٹ گیا۔

"بھلے آدمی کچھ منہ سے بھی پھوٹو!" اجمل نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا

کرمانی ان سے دو قدم ہٹ کر کھڑا تھا اور نگاہیں جمائے ہوئے چارے کی دکان پر ایک نوعمر بچے کو حلیم بھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"اتوار کی رات کو اس نے مجھے بلایا ہے!" توفیق نے اس کے شانے بھینچ کر کہا

"کہاں پر؟" اب وہ آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے۔

"گھر پہ" توفیق نے تین سگریٹ جلائے اور اپنے دوستوں کو ایک ایک سگریٹ دے کر بولا "اس نے لکھا ہے گیارہ بجے کے بعد دروازہ کھلا ہوگا۔
گلی میں کوئی نہ ہو تب چپکے سے اُوپر آ جانا سیڑھیوں کے خاتمے پہ پہلا کمرہ میرا ہے!"

"اس کے گھر والے کہاں رہیں گے!" اجمل نے فوراً پوچھا۔

"گھر والے؟" توفیق بڑبڑایا اور اس نے برا سا منہ بنا لیا "گھر والے جہاں بھی رہیں" توفیق نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا "میں وہاں ضرور جاؤں گا!"

"ہاں ہاں ضرور جانا!" کرمانی نے بھویں اُوپر چڑھا کر کہا "ورنہ ہمیشہ تمہیں وہم رہے گا کہ نہ جانے میں کیسی جنت سے محروم رہ گیا ہوں!" اس کی
آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ منہ بند کر کے ہنسنے لگا۔

اتوار کی پھیکی اور اداس صبح کو سب سے پہلے توفیق نے اٹھکر دیکھا وہ رات کو نیچے ہی سو گیا تھا ——— رات کو وہ اندرونی ہلچل کی وجہ سے
سکون کے ساتھ سو نہیں سکا تھا کئی مرتبہ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا تھا اس کی کیفیت بعینہ ویسی ہی تھی جیسی نوعمر بچوں کی عید کی رات کو ہوتی ہے
جنہیں طرح طرح کے کھانوں اور مٹھی بھر پیسوں کے سہانے خیال انہیں چین کے ساتھ سونے ہی نہیں دیتے۔
وہ گلی میں گیا جہاں ہوا میں کہرا گھلا ہوا تھا اور سرد ہوا ہڈیوں کے اندر دھنسی جا رہی تھی "گیارہ بجے تک تو گلی میں بالکل سناٹا طاری ہو جاتا ہے!"
اس نے دل میں سوچا اور ہلکے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا کمرے میں واپس آ گیا۔
کرمانی اور اجمل ابھی جاگے نہیں تھے، کرمانی رات کو دیر سے گھر آیا تھا وہ گذشتہ دو دنوں سے پھر کسی کے ساتھ عوامی اسکول پر بات چیت کر رہا تھا۔
اجمل سو رہا تھا کیونکہ شام کو ایکا ایکی اسے کوئی نیا خیال سوجھ گیا تھا اور وہ اپنے آئیڈیل پر کام کرتا رہا تھا۔
توفیق کافی دیر تک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا جب ساڑھے چھ بج گئے تو اس نے اندازہ لگایا کہ اب بلی نے چائے کے لئے پانی رکھ دیا ہوگا اس نے
سیڑھیوں والا دروازہ کھولا اور دبے پاؤں چھت پر چلا گیا۔
ناشتے کے برتن خالی ہو چکے تھے، توفیق نے چائے کا پہلا کپ کپڑوں پر گرا لیا تھا اس کی دائیں ران بھی جھلس گئی تھی، اس کے باوجود وہ اچھے موڈ

میں تھا، اس کے دل کے تمام تار جھنجھنا اُٹھے تھے اور وہ اک مضطربانہ مسرت کے ساتھ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا، چیزوں کو اُلٹ پلٹ رہا تھا، وہ آج ہر ایک سے چھیڑ خانی کرنے پر تلا ہوا تھا اس نے ناشتے کے فوراً بعد ایزل پر سے کپڑا ہٹا کر تصویر کو آنکھ ماری۔

"نہ جانے تم خالی رنگ و روغن سے بنی ہوئی تصویروں سے کیسے پیار کر لیتے ہو!" اس نے اجمل کا کندھا تھپتھپا کر کہا "میری جان! گوشت پوست کی عورت کی بات ہی کچھ اور ہے!" اس نے اجمل کا ہاتھ اٹھا کر اپنے دل پر رکھ لیا "دیکھو! آج میرا دل بالکل نئے انداز سے دھڑک رہا ہے!" وہ کمرے میں ٹہلنے لگا "کتنی حماقت کی بات ہے!" اس نے اچانک کہنا شروع کیا "میں حقیقت پسند ہونے کے باوجود، زندگی کی بنیادی حقیقت سے آج تک بے خبر رہا، دوسری حقیقتیں اپنی جگہ اہم سہی لیکن عورت کا بھی تو ایک وجود ہے اور مجھے اس کی کتنی ضرورت ہے!" اس نے آخری کش لگائے بغیر سگریٹ پاؤں تلے روند ڈالا "میرا دل بہل گیا ہے، میری پریشانیاں بھی ایک دم سے کم ہو گئی ہیں!" اس نے اجمل کے مقابل آ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں "تم بھی پیارے دل لگاؤ یہ بڑی عجیب چیز ہے!" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور کرسی پر بیٹھ کر نیا سگریٹ پینے لگا اجمل مسکرا دیا اور اس کی بھوری آنکھیں اداس ہو گئیں اس نے اپنی تصویر کی طرف دیکھا اور پھر نظروں کو وہیں جمائے رہنے دیا۔

کرمانی بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اور بظاہر اس کا چہرہ بالکل بے جان معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تشکرے جیسی آنکھوں سے پل بھر کے لئے توفیق کی طرف دیکھا اور پھر سیڑھیوں والے چھوٹے دروازے کو گھورنے لگا۔

توفیق سے نچلا نہیں بیٹھا جا رہا تھا رہ رہ کر اس کے سینے میں مسرت کا طوفان اٹھ رہا تھا وہ کرسی پر بیٹھا اپنی ٹانگیں ہلاتا رہا اور اُوپر تلے سگریٹ کے کش لگاتا رہا، ایک دم وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے پہلی مرتبہ کرمانی کے ساتھ مذاق کیا۔ "کرمانی!" اس نے خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے کو نیچے جھکا کر کہا "اگر کوئی تمہارا سر مونڈھ ڈالے تو پھر تم وقت کیسے گزارو گے؟"

اجمل نے اپنی ہنسی روک لی تاہم اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے بھر گئے تھے۔

کرمانی ویسے ہی کرسی پر اکڑوں بیٹھا رہا، اس نے نظر اُٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی بالوں میں پھنسی ہوئی انگلیاں نکالیں ذرا دیر کے لئے وہ کرسی کے بازو پر انگلیاں نچاتا رہا۔ اس نے دو تین مرتبہ تیزی سے آنکھیں جھپکیں پھر وہ سر اٹھا کر بولا۔

"خوشی اچھی چیز ہے!" اُس کا لہجہ دھیما اور متوازن تھا۔

"سب کا جی خوش رہنے کو چاہتا ہے لیکن ہر آدمی عورت کے ایک معمولی سے خط پر ایسی بے تحاشا خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ اپنے اپنے معیار کی بات ہے!"

کرمانی کھڑا ہو گیا اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے انہیں توفیق کے چہرے پر گاڑھ دیا "اور پھر عورت کے وجود سے وہی خوش ہو سکتا ہے جو اسے جانتا نہ ہو!" اس کی آواز دھیمی تھی تاہم اس میں تلخی جھلکنے لگی تھی "عورت کی خوشی بس اتنی ہی ہے جتنی کہ لاعلمی سے حاصل ہوتی ہے!"

توفیق کے چہرے سے ساری شگفتگی غائب ہو گئی اس کے رخسار گرم ہو گئے تھے۔ "عورت کے متعلق یہ زہریلا پن تم چاہو تو روا رکھ سکتے ہو!" اس نے غصے میں پھنکتے ہوئے کہا اور اس کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے تھے "لیکن یہ نہ بھولو کہ تم زمین میں سے اُگ کر باہر نہیں آ گئے ہو، تمہیں بھی ایک عورت نے جنا ہے اور پال پوس کر بڑا کیا ہے!" جذبات کی شدت سے توفیق کی سانس پھول گئی تھی۔

"ڈرامائی باتیں، سستی فلموں کے ڈائیلاگ!" کرمانی نے فوراً جواب دیا۔ "میں اس قسم کی خرافات سے متاثر نہیں ہو سکتا! تم بھی یہ جان لو کہ عورت تنہا قیامت تک کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتی مرد اور عورت دونوں مل کر بچے کی پرورش کرتے ہیں، باپ کما کر لاتا ہے اور ماں بچے کی خدمت کرتی ہے!"

تھوڑی دیر بعد اجمل اسباب والے کمرے میں لباس تبدیل کرنے کے لئے چلا۔ توفیق دروازے میں کھڑا ہو کر گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نظروں کا مرکز اصطبل کے ساتھ والا بے ڈھنگ سا مکان تھا جس کا رنگ تو کیا پلستر بھی اکھڑ چکا تھا تاہم اس کی کھڑکیوں پر ہمیشہ دبیز پردے پڑے رہتے تھے سامنے والے مکان سے کھانسی کی ہلکی سی آواز آئی جس کے ساتھ ہی اجمل دروازے پر نمودار ہوا وہ توفیق کی پشت پر کھڑا ہو گیا سامنے والے مکان کے دروازے میں چلمن کے پیچھے ایک سایہ لمحہ بھر کے لئے نمودار ہوا اور پھر فوراً غائب ہو گیا۔

توفیق کمرے میں واپس آ گیا اس نے اسٹول کھینچا اور کرمانی کے پاس بیٹھ گیا۔ کرمانی کتاب کھولے بیٹھا تھا اس نے سر نہیں اُٹھایا اور مطالعے میں مگن رہا۔

"تم نے ابھی ابھی خوشی کے معیار کا ذکر کیا تھا!" کرمانی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا اُس نے ایک ہاتھ اب بھی بالوں میں پھنسا

رکھا تھا گیا تمہارے خیال میں جن لوگوں کا معیار اونچا نہیں ہے وہ جینا چھوڑ دیں، کیا وہ لوگ جو آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں، اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں
سے دستبردار ہو جائیں - ؟" توفیق کا لب و لہجہ تلخ اور تند ہو گیا اس نے آنکھیں سکیڑیں اور سر کو دائیں کندھے پر ترچھا کر دیا اور نظریں کرمانی کے ساتھ ملائیں۔
کرمانی نے ہاتھ بالوں سے کھینچ لیا اس نے کرسی کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ "یہ میں نے کب کہا ہے ؟ -"
توفیق نے اس کی بات کاٹ دی وہ جوش میں بھر گیا تھا اور بالکل سرخ ہو گیا تھا -
"تم اپنے آپ کو دوسروں سے برتر و اعلیٰ سمجھتے ہو؟ یہ کیڑا ہمیشہ سے تمہارے دماغ میں موجود ہے!؟"
"غلط معنی نہ پہناؤ!" کرمانی بڑبڑایا "میں نے معیار کی بات کی تھی" اس نے جوش کو دباتے ہوئے دھیمے مگر غیر متوازن لب و لہجے میں کہا "ہاں، خوشی اپنے
اپنے معیار اور ذوق کی بات ہے، تم میرے جیسے نہیں ہو اور میں تمہارے جیسا نہیں ہوں، بات صرف اتنی سی تھی -" وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا وہ ایک چکر کاٹ
کر آیا اور توفیق کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے "میں لوگوں کو کیا سمجھتا ہوں، یہ بتائے بغیر بھی میرا گذارہ ہو جاتا ہے، لیکن تم لوگ
مجھے اک عجیب سی مخلوق سمجھتے ہو، میں اندھا تو نہیں ہوں میں نے ایک بڑے مقصد کا حوصلہ کیا تھا -" وہ بڑبڑایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا اس کی آواز بہت
دھیمی ہو گئی تھی گویا وہ اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہو "میری منزل کھوٹی ہو چکی ہے، لیکن منزل کو پا لینا ہی تو سب کچھ نہیں ہے - میں نے کرنے کے لئے کچھ سوچا ہے،
جد و جہد کی ہے، کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن ہے!"
اجمل آہستہ آہستہ چلتا ہوا کرمانی کے پاس آیا -
"میرے ساتھ چلو! تمہیں اس وقت کوئی کام تو نہیں ہے نا!"

"کہاں چلوں؟"
"ایک آرٹ ڈیلر مجھ سے چند پنسل اسکیچ بنوانا چاہتا ہے، اس کے گھر ملنے کیلئے جانا ہے!"
"اچھا میں چلتا ہوں!" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا -
کرمانی دوسرے کمرے میں لباس تبدیل کرنے چلا گیا تو اجمل نے توفیق سے کہا "ہمارے ساتھ چل رہے ہو نا!"
توفیق ہنس پڑا تاہم وہ افسردہ خاطر ہو رہا تھا "ہاں چل رہا ہوں" وہ کھڑا ہو گیا قدرے تامل کے بعد اس نے کہا "میں نے اس کا دل دکھا دیا ہے!"
جب وہ کمرے سے باہر نکلنے لگے تو اچانک بلی کمرے میں داخل ہوئی "وہ بھئی جان!" وہ سیڑھیوں کے دروازے ہی سے چلائی "آپ خود تو گھومتے رہتے
ہیں، ہمیں سیر کرانے کیوں نہیں لے جاتے ؟" وہ کمرے میں آگئی اور چوٹی کو ہاتھ پر مارنے لگی اور وہ آہستہ آہستہ سر بھی ہلا رہی تھی اور بہت حسین معلوم ہو رہی تھی -
"تم روز اسکول جو جاتی ہو پھر کیا تمہاری سیر نہیں ہوتی ؟" توفیق نے اسے ٹالنے کے لئے کہا -
"اجی واہ اسکول جانے سے کوئی تفریح تھوڑی ہوتی ہے، ہم تو فلم دیکھیں گے! ہر روز ایک جیسی چیزیں دیکھتے دیکھتے تو ہمارا دم گھٹنے لگا ہے!"
"اچھا اگلی اتوار کو سہی!" توفیق نے اس کا رخسار تھپتھپایا
"نہیں ہم تو آج ہی چلیں گے، دوسری اتوار میں تو ابھی اتنے دن پڑے ہیں!"
"چلو اب کہنا مان لو" کرمانی نے کہا "سات آٹھ دن تو پلک جھپکتے ہی گذر جائیں گے!"
بلی ذرا دیر کے لئے سنجیدہ ہو گئی پھر وہ ہنس پڑی "اچھا!" اس نے چوٹی کمر پر پھینک دی "آپ کہتے ہیں تو میں مان لیتی ہوں، لیکن اگر بھئی جان لیکر نہ
گئے تو آپ کو فلم دکھانی ہوگی!" اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اور پلٹ کر اوپر چلی گئی -
انہوں نے اندر سے دروازے کو کنڈی چڑھا دی اور سیڑھیوں کی طرف سے گلی میں آ گئے پنواڑی کی دکان کے پاس راجہ گلی کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ،
گولیاں کھیل رہا تھا وہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے کپڑے چیکٹ ہو رہے تھے۔ توفیق نے اسے کاندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور گھر بھیج دیا آج اس نے اپنا مخصوص
جملہ "غلط ماحول میں بچے کی زندگی تباہ ہو رہی ہے!" نہیں دہرایا تھا
پنواڑی کی دکان پر چند آدمی بیٹھے تھے اور وہاں سے چرس کی خشک بو آ رہی تھی، جب وہ سڑک پر چند قدم نکل گئے تو جنگ کے ٹھیکے کے پاس اُن کی شناسا
نازو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ "آپ لوگ کب تک واپس آ جائیں گے ؟"
"دوپہر کے کھانے تک! کیوں نہیں کوئی کام ہے!؟"

"ہاں ہے تو، ذرا گپ شپ رہے گی۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔

"اُسے ماڈل بناؤ،" کرمانی نے بھنگ کے ٹھیکے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک مفلوک الحال آدمی ہاتھ میں آبخورہ لئے کھڑا تھا۔ وہ پاؤں سے ننگا تھا۔ اور اس کی قمیض کے چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے بال خشک گھاس کی طرح سر پر ذرا سے ترچھے کھڑے تھے، وہ دکاندار کی طرف طلب سے بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی میلی آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی، اور خشک ہونٹ ذرا سے کھلے ہوئے تھے۔ اور نچلا ہونٹ ذرا سا لٹک گیا تھا۔ اس نے آبخورے والا ہاتھ نیچے لٹکا رکھا تھا۔ اور دوسرے سے وہ ٹھوڑی کے گھنے مگر گندے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اس کا انگ انگ نشے کی طلب سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ دکان کے سامنے مجسم سوال بنا کھڑا تھا۔

"شاہکار،" اجمل بڑبڑایا "دنیا کے سب سے بڑے مصور کا بنایا ہوا" اُس نے قدرے تامل کے بعد یہ جملہ اور بڑھا دیا "اس سے تو بہتر تھا کہ کینوس خالی رہنے دیا ہوتا۔"

"وہ صرف تصویریں بناتا ہے،" کرمانی نے جواب دیا "ان میں اچھے اور برے رنگ تو ماحول اور زمانہ بھرتا ہے۔" چند قدم چلنے کے بعد اُس نے کہا "وہ ہاتھ پکڑ کر نیکی یا بدی کی طرف نہیں لے جاتا۔ وہ ایک عظیم خالق ہے جس نے اپنی تخلیق کو تنقید کا دماغ بھی بخش دیا ہے۔" اجمل نے ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "میں اس میں صرف یہ جملہ اور بڑھا دینا چاہتا ہوں، ہر تخلیق بذاتِ خود خالق ہوتی ہے اور جو تخلیق ایک اور تخلیق نہ کر سکے۔ وہ بیکار ہے۔"

"ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے، لیکن نیکی اگر اسے پیاری ہے تو وہ ہاتھ پکڑ کر نیکی کی طرف کیوں نہیں لے جاتا؟" دیر تک خاموش رہنے کے بعد توفیق نے پوچھا۔

اجمل کو پچاس پنسل اسکیچ کا آرڈر مل گیا تھا۔ یہ اسکیچ ایک مقبول لیڈر کے تھے جن کی بازار میں خاصی قیمت مل جاتی تھی۔ تاہم اجمل کے ساتھ پانچ روپے فی اسکیچ کے حساب سے بات طے ہوئی تھی۔ آرٹ ڈیلر اس کے ساتھ ہی گھر بھی آیا تھا اس نے اجمل کی دوسری تصویریں بھی دیکھیں کل تینتیس کینوس تھے جنہیں وہ پانچ روپے فی کینوس کے حساب سے خریدنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

"یہ کیمرے سے کھینچی ہوئی تو نہیں ہیں، یہ تو رنگ اور کینوس کی قیمت بھی نہیں ہے۔" اجمل نے تصاویر اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیں۔

"نئے مصور تو مجھے مفت تصویریں دے جاتے ہیں۔" آرٹ ڈیلر نے تعجب کے ساتھ اجمل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بہرحال آپ سوچ لیں۔" اُس نے بے تکلفی اور کچھ سرپرستی کے انداز میں ایزل پر سے کپڑا ہٹا کر نئی تصویر کو بھی دیکھا۔ جس پر اجمل ابھی کام کر رہا تھا۔ تاہم وہ بظاہر مکمل ہی معلوم ہوتی تھی۔

"اس کے میں تیس روپے دے سکتا ہوں، بولو منظور ہیں؟" اس نے تھوڑی دیر ایزل کے سامنے کھڑا رہنے کے بعد کہا۔

"شکریہ! لیکن یہ تصویر میں نے بیچنے کے لئے نہیں بنائی ہے۔" اجمل نے بڑی تلخی کے ساتھ جواب دیا۔ اُس کی پیشانی پر بل جمع ہو گئے تھے، وہ بُرا مان گیا تھا۔

آرٹ ڈیلر نے اجازت طلب کی اور جانے کے لئے مڑا لیکن وہ دروازے پر جا کر رک گیا۔

"میں اس کے پچاس تک ادا کر سکتا ہوں۔" اُس نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد یہ جملہ اور بڑھا دیا۔ "میں نئے مصوروں کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتا رہتا ہوں۔ حالانکہ اس میں نقصان کا اندیشہ نوے فیصد سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔"

"آپ کی قدردانی کا شکریہ، اس تصویر کی میں قیمت نہیں لگا سکتا۔ اگر دینی ہی ہوگی تو میں مفت دے دوں گا۔"

آرٹ ڈیلر کمرے میں واپس آگیا۔ اُس نے اجمل کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے دبایا۔

"یہ صفت صرف بڑے فنکاروں میں ہوتی ہے۔ واہ واہ کیا بات کی ہے آپ نے سبحان اللہ!"

اُس نے سلام کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"مکار آدمی،" اجمل بڑبڑایا۔ اس نے اپنی تصویریں اُٹھائیں۔ "اُف میرے خدایا! تصویر کی قیمت صرف پانچ روپے۔ ایک تخلیق پر فنکار کا اعصابی نظام تباہ ہو جاتا ہے۔ اور صرف پانچ روپے۔" اُس نے کینوس ایک طرف رکھ دیئے۔ اور ایزل کو ڈھانپ دیا۔ بلی سیڑھیوں والے دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ "بھائی جان!" اُس نے کمرے میں آکر کہا۔ "میں نے کہیں پڑھا تھا کہ فنکاروں کے دماغ میں بڑے بڑے خیال آتے ہیں۔" اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے بھرے ہوئے تھے اور آنکھیں تھرک رہی تھیں۔ دو سیاہ اور لابنی آنکھیں۔

اجمل نے اس کی طرف دیکھا۔ اور وہ مسکرا دیا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ کیونکہ اُسے بلی کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا نہیں آ سکتے؟" اُس نے بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں آتے تو ہیں۔" اجمل نے جواب دیا۔

"لیکن آپ کے دماغ میں یہ سیدھا سادہ خیال کیوں نہیں آتا۔ کہ میز پر ایک ایش ٹرے لا کر رکھ دیں۔" اس نے دوپٹے کو دونوں طرف سے پکڑ کر گردن کے گرد دبایا، اُس کے رخسار، ہونٹ، آنکھیں غرضیکہ جسم کا ایک ایک انگ تھرک رہا تھا۔ "دیکھیے۔" اُس نے فرش کی طرف اشارہ کر کے کہا جہاں سگریٹوں کے ٹکڑے بُری طرح سے بکھرے ہوئے تھے۔ کرمانی سمیت سب ہنس پڑے۔

"ایش ٹرے تو ہم لے آئیں گے۔ مگر پھر ایش ٹرے کو کون صاف کرے گا؟"

"ہائے اللہ آپ کتنے گندے ہیں۔" وہ زمین پر بیٹھ گئی اور سگریٹ کے ٹکڑے چُننے لگی پھر وہ انہیں جھٹ اٹھا کر باہر گلی میں پھینک آئی۔

چھت کی مشرقی سمت سے جہاں ایک تختی ترچھی ہو گئی تھی۔ اور اُس نے دونوں طرف سے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ ایک ننھی سی کنکر کرمانی کے شانے پر آ گری۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس نے کنکر اُٹھائی اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ گلی سے نسوانی کھانسی کی آواز بلند ہوئی۔ اور فوراً شاذ و نادر کے طویل اور بھرپور قہقہے میں دب گئی۔

اجمل دروازے کا چکر کاٹ کر واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

"بلی، کھانا تو لے آؤ۔" تزئین نے کچھ افسردہ دلی کے ساتھ کہا جو ایکا ایکی اُس کے چہرے پر عود کر آئی تھی۔

بلی اُوپر چلی گئی تو اُس نے کہا۔

"یہ مکان تو ایک بند گلی ہے۔" اُس نے سر اُٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ "ہماری خوشیاں دیرپا کیوں نہیں ہوتیں...؟" وہ بڑبڑایا اور اس کی کنپٹی پر ایک باریک نس اُبھر آئی۔ "اگر یہاں رہنا ہے تو ہمیں چھت کی مرمت کروانا ہو گی۔"

کرمانی نے بالوں میں انگلیاں پھنسالیں اور انہیں گدی تک لے گیا۔ "دیواریں۔" اُس نے جوش کو دبا کر دھیمے لہجے میں کہا "بنیاد سے نئی دیواریں نئی دیواروں کے بغیر نئی چھت بالکل بیکار ہے۔"

"یہاں کمرے بھی کم ہیں۔" اجمل نے میز پر کُہنی جما کر کہا "میرے اسٹوڈیو کے لئے بھی ایک کمرہ ہونا چاہیے۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا "جب تک میرا ذاتی کمرہ نہ ہو میں طمانیت اور آسودگی کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔"

بلی نے کھانا میز پر لگا دیا۔ پھر وہ کشتی دیوار کے ساتھ ٹکا کر بولی "آپ چھوٹے کمرے کو صاف کیوں نہیں کر لیتے؟"

"چھوٹے کمرے کو..." اجمل نے دہرایا۔ "لیکن وہاں کاٹ کباڑ پڑا ہے اُس کا کیا کریں؟"

"آپ اپنے کپڑے لٹکانے کے لئے ایک ہینگر تک تو لا کر رکھتے نہیں ہیں۔ آپ کمرہ صاف کیا کریں گے۔" اُس نے کشتی اُٹھائی اور اس کو ہوا میں گھمایا اور چھوٹے کمرے میں چلی گئی۔ کمر پر اس کی قمیض بالکل چُست تھی۔ اور وہاں کوئی شکن نہیں پڑ رہی تھی۔

"ہائے اللہ آپ بیکار میں اس کمرے کا کرایہ دیتے ہیں۔ یہ آپ کے کسی کام تو آتا نہیں۔" اُس نے واپس آ کر کہا اور بغیر رُکے ہوئے اُوپر چلی گئی۔

سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی ایک اُداس سی شام نمودار ہوئی۔ گلی میں بجلی کے کھمبوں کے قمقمے ابھی ابھی جلے تھے۔ اور وہ، جیسا کہ ہر شام ہوتا ہے۔ آنکھوں کو بڑے اجنبی اجنبی سے تک رہے تھے۔ اور ان کی طرف نگاہ بھر کے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ "یہیں سے شام کی اداسی کی ابتدا ہوتی ہے۔"

اجمل نے دروازے میں کھڑے کھڑے سوچا، پنواڑی کی دکان پر ریڈیو بج رہا تھا۔ اور وہاں محلے کے بدنام لوگ جمع تھے۔ وہاں سے دوستانہ گالیوں کی آوازیں بھی بلند ہو رہی تھیں جو بار بار قہقہوں کو جنم دے رہی تھیں۔ فضا دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ آسمان کے غربی کنارے پر ایک چھوٹی سی بدلی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ گلی میں سے بچے غائب ہو گئے تھے۔ تاہم گھوڑوں کے اصطبل کے سامنے بیچ گلی کے دو بچے جو ابھی زیر جامہ پہننے کی عمر کو نہیں پہنچے تھے کھڑے تھے۔ ان کی عمریں آٹھ دس برس کے قریب تھیں، وہ پنڈلیوں سے ننگے تھے اور پورے بدن پر صرف ایک ایک قمیض پہنے ہوئے تھے۔ جن کی صحیح رنگت پھٹے پٹے یا میل کی وجہ سے پہچاننی مشکل تھی۔ گلی کی آمد و رفت ختم ہو چکی تھی۔ صرف پنواڑی کی دکان پر کچھ گہماگہمی دکھائی دے رہی تھی۔

کھانسی کی دبی دبی سی آواز بلند ہوئی۔ لیکن چلمن کے پیچھے نیم بھڑے ہوئے دروازے کے پٹ نظر آ رہے تھے۔ جن کے درمیانی خلا سے صحن کی روشنی بھی جھانک رہی تھی۔ اجمل نے تیسرا سگریٹ جلایا۔ اور جلتی ہوئی تیلی بددلی کے ساتھ گلی میں اُچھال دی۔

"بھی شاذ و نادر ؛ ذرا دیر کے لئے دروازے میں آنا ! ؛" اُس نے چلمن کی طرف منہ کر کے کہا۔ لمحہ بھر کے بعد طالبعلموں کے کمرے سے ایک منحنی سا لڑکا برآمد ہوا۔

"وہ تو فلم دیکھنے گیا ہوا ہے ! "

تھوڑی دیر کے بعد صحن کی روشنی بجھ گئی ، پھر دروازے کے پٹ آہستہ سے کھلے ایک سایہ چلمن کے پیچھے نمودار ہوا اور اُس نے تذبذب کے توقف کے بعد اپنا سر چلمن کی تیلیوں کے ساتھ لگا دیا۔

"میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں !،" اُس نے دبی زبان سے غیر ارادی طور پہ کہا۔

سایہ ایک دم تڑپ کر پلٹا ، پل بھر کے لئے چوڑیوں کی کھنک سنائی دی۔ اور پھر دروازے کے دونوں پٹ بند ہو گئے ٹھٹھا کے ہنسی کی گونج سنائی دی۔

اُس نے آدھا جلا ہوا سگریٹ جوتے کے نیچے مسل دیا۔ اُسے اچانک اپنے دل پر ایک نامعلوم سا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ آہستہ سے پلٹا اور اُس کی مڈبھیڑ بلی کے ساتھ ہوئی۔ جو اُس کی پشت پہ کھڑی تھی۔ وہ ایک دم کھل گئی۔ اور مسکراہٹ سے اُس کے ہونٹ شفق گون ہو گئے۔ "بھئی جان ! آپ کس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے ؟"

"باتیں ؟ کون باتیں کر رہا تھا ؟ ؟"

"ابھی تو آپ کہہ رہے تھے میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں !"

"وہ تو میں اپنی تصویر سے کہہ رہا تھا۔!" اجمل سر جھکائے ہوئے جا کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"اجی واہ" وہ سر ہلا کر بولی "تصویر سے بھی کوئی باتیں کرتا ہے بھلا !"

"میں جو کرتا ہوں !" اجمل نے اپنی اُداسی پہ قابو پا کر کہا "میں تو خواب میں بھی باتیں کیا کرتا ہوں !"

تصویریں بولتی تو ہیں نہیں پھر کیا آپ کا جی نہیں گھبراتا ؟" اُس نے ذرا دیر کے لئے تھرکنا بند کر دیا۔ اور اپنی جگہ پہ ساکت ہو کر پوچھا اس کے لب و لہجے سے ہمدردی کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

"توفیق اُوپر کیا کر رہا ہے ؟" اُس نے بات بدلنے کے لئے پوچھا۔

"کوٹ پہ استری کر رہے ہیں !" اس نے پل بھر کے لئے اجمل کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا پھر وہ ہنس پڑی اور کمرے کی خموش فضا میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں اُس کے خون کی حدت سے تمتماتے ہوئے رُخسار بلب کی روشنی میں کچھ اور بھی دمک اٹھے تھے۔ اُس نے ایک چوٹی سینے پہ پھینک رکھی تھی۔ اور باتوں کے دوران میں وہ اُسے اٹھا کر ہتھیلی پہ بجانے لگتی تھی۔ اس کی چست قمیص میں، اس کی قائم بالذات چھاتیاں تیر کی طرح سیدھی نکلی ہوئی تھیں۔ اور نظروں میں کھبی جا رہی تھیں۔ وہ ایک دم سے پلٹی اور کمرے کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ جہاں ایک کونے میں ایزل رکھا ہوا تھا۔ اس نے کپڑا اٹھا کر ایک نظر تصویر کو دیکھا پھر وہ اسباب والے کمرے سے جا کر بستر اٹھا لائی اور انہیں صف پہ بچھانے لگی۔

اجمل اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اُس کے وجود کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی، اس کا پورا جسم سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کاش میں اس کے جسم کی تصویر بنا سکتا ——— اس نے سوچا اور اپنا خیالات سے بوجھل سر جھٹک دیا۔

بلی نے بستر لگا دیئے تو وہ اُس کے پاس آئی۔ "دیکھئے ہم آپ کے کتنے کام کر دیتے ہیں !" اُس نے کہنا شروع کیا "لیکن آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ہماری ایک ایسی تصویر ہی بنا دیں !" اُس نے ایزل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اجمل ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اوپر سے نیچے تک۔ "یہاں آؤ !" اس نے سر کے اشارے سے کہا۔

بلی آگے آ گئی اور ان کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا۔

"آگے آ جاؤ !"

بلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "آگے تو آپ بیٹھے ہیں !"

اجمل جست بھر کے کھڑا ہو گیا، اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی اور چہرے کے خطوط گہرے اور وحشتناک لگ رہے تھے اس نے بلی کو دبوچ لیا اور اُسے چھوٹے کمرے کی طرف کھینچنے لگا۔ بلی ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

"بھئی جان، آپ کو کیا ہو گیا ہے ــــــــ؟" اُس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

اجمل سرد پڑ گیا، اس نے سر جھٹکا اور کرسی پر دھم سے ڈھے گیا، اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر دبا لیا۔ اور کوئی جواب نہیں دیا۔

بلی لمحہ بھر تک حیرت زدہ سی اپنی جگہ پر کھڑی رہی پھر وہ اوپر چلی گئی۔ وہ بالکل زرد پڑ گئی تھی۔

"تمہیں شرم آنی چاہیئے!" اجمل نے اپنے آپ سے کہا۔

"تمہیں بھی شرم آنی چاہیئے!" اس کے اندر سے کسی نے جواب دیا۔ "تمہاری شرافت جائے جہنم میں، میں یہ بھوک زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا!"

"کمینے، خود غرض!! میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا!" وہ چلایا اور اُس نے دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیاں میز پر دے ماریں۔

"میں بھی تمہارا گلا گھونٹ دوں گا!" کمینے اور خود غرض نے جواب دیا۔

کھانے کے وقت تک توفیق نیچے نہیں اُترا، جس کی وجہ سے اجمل کی پشیمانی بڑھنے لگی تھی۔ "کیا اُس نے اپنے بھائی سے ذکر کر دیا ہے؟" اُس نے سوچا اور کمرے میں اضطراب کے ساتھ ٹہلنے لگا۔

کرمانی کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تہہ کیا ہوا تازہ اخبار تھا جس کو وہ اپنے پہلو پر بجا رہا تھا۔ اُس نے جوتے اتارے اور کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اور سر کھجانے لگا، اخبار ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ ذرا دیر کے بعد اُس نے اخبار کھولا اور اجمل کو تھما لیا۔ "یہ دیکھو!" اس نے ایک سرخی کی طرف اشارہ کر کے کہا: "ہمارے نمائندے نے اطلاع دی ہے کہ جمعرات کو ایک عقیدت مند نے پنج پیر کے مزار پر دس ہزار روپے کا چیک نذر کر دیا ہے!"

"اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے!" اجمل نے اپنی افسردگی چھپانے کی کوشش کی تاہم وہ اُس کے چہرے اور اُس کے لب و لہجے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

"تم جانتے ہو پنج پیر کے مزار پر روزانہ جو نقد اور جنس نذر کی جاتی ہے اس کی اوسط کیا ہے؟" اُس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور خود ہی بولا "بارہ سو روپے!" اُس نے دہرایا بارہ سو روپے یعنی ساڑھے چار لاکھ روپے سالانہ کے قریب۔" وہ جوش میں بھر گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر لیں۔ "صرف ایک برس کی آمدنی مل جائے، اگر اتنا روپیہ مجھے مل جائے تو..." اس کی سانس جذبات کی شدت سے پھول گئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا وہ ٹہلتے ہوئے کچھ بڑبڑایا جس کی اجمل کو ذرا بھی سمجھ نہیں آسکی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اور اُس کے لمبوترے چہرے پر آنکھیں بھٹی کی طرح دہک رہی تھیں وہ تیز تیز قدموں سے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اور اجمل کی طرف مطلقاً نہیں دیکھ رہا تھا۔

سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی اور راجہ نے دروازے میں سے سر نکال کر اندر جھانکا پھر وہ اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی کا جگ اور گلاس لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اس کے پیچھے ہی توفیق کھانے کی کشتی اٹھائے ہوئے آیا، اُس نے پتلون کے اوپر استری کیا ہوا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور ٹائی بھی باندھی ہوئی تھی، شیو خوب اچھی طرح سے بنائی تھی۔ اور ٹھوڑی پر کوئی بال نہیں رہنے دیا تھا۔ اور بالوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ جمایا ہوا تھا۔ وہ بڑا خوبصورت اور اپنی عمر سے چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔

"آ جاؤ بھئی کھانا گرم ہے ذرا دو دو ہاتھ ہو جائیں!" اس نے کھانا میز پر لگا کر جیب سے رومال نکالا اور ہاتھ صاف کئے۔ پھر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"آج تم خود کھانا لے کر آئے ہو!" اجمل نے اس کے ساتھ آنکھیں ملائے بغیر سوال کیا۔

"جی کی طبیعت اچھی نہیں، کہہ رہی تھی سر بہت دُکھ رہا ہے!" اُس نے سر گھما کر کرمانی کی طرف دیکھا اور پھر یہ جملہ اور بڑھا دیا" دوپہر کو اُس نے بہت سی گالیاں کھائی تھیں۔ شاید اس وجہ سے اس کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔"

اجمل کے دل کو دھچکا سا لگا "کیا اب وہ اپنا دل بہلانے کے لئے نیچے نہیں آیا کرے گی!" اُس نے سوچا اور فوراً ہی ایک نوالہ توڑ کر چبانے لگا۔

"کرمانی، میری جان! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"، توفیق خود بھی نوالہ توڑ کر اجمل کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد کرمانی بھی آ کر اُن کے ساتھ شامل ہو گیا اُس نے خوشی کے ساتھ چند لقمے لئے اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سگریٹ جلا کر پینے لگا۔

اجمل بڑی بددلی کے ساتھ کھا رہا تھا۔ اور جلد ہی اُس نے ہاتھ دھو لئے اور حقہ اٹھا کر باہر تھڑے پر کھڑا ہو گیا۔

"یہ تم لوگ آپس میں لڑ پڑے ہو؟" توفیق نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے!"

توفیق کو بے چینی لگی ہوئی تھی، گیارہ بجے تک انتظار کرنا اس کے لئے دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ اُس نے پیٹ بھر کے نہیں

کھایا اور کھانے کے برتن اُوپر چھوڑ آیا۔ اَبکی دفعہ وہ اپنا بستر بھی اُٹھا لیا۔ وہ سیڑھیوں میں سیٹی بجاتا ہوا آیا تھا۔ اُس نے بستر چارپائی پر پھینک دیا اور اجمل کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اُسے کمرے میں لے آیا۔ "میرے ساتھ باتیں کرو یار، میں بہت بے قرار ہو رہا ہوں!!"

"آؤ بیٹھ جائیں اور باتیں کریں!" اجمل نے اپنی کمر سے اس کے ہاتھ الگ کر کے کہا۔

دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کرمانی نے اُٹھ کر ایک سیاہ رنگ کی چھپکلی کو اخبار مار کر بھگا دیا اور پھر اخبار کو باہر گلی میں پھینک آیا۔

تینوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کی فضا میں ایک عجیب سا حبس پیدا ہو گیا تھا۔ توفیق نے اجمل کی طرف دیکھا جو میز پر انگلیوں سے کوئی شکل بنا رہا تھا۔ اُسے اس کا چہرہ بڑا کریہہ سا معلوم ہوا۔ اُس کی بھوری آنکھوں میں کوئی جذبہ ایسا ضرور تھا۔ جسے دیکھ کر توفیق کو شبہ گزرا کہ وہ اس کے ساتھ بات چیت سے دیدہ دانستہ گریز کر رہا ہے۔ توفیق نے ٹائی کی ناٹ درست کی۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دس بجنے والے تھے، اُس کے سینے میں پکڑ دھکڑ اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ وہ ذرا ذرا دیر کے بعد چق اٹھا کر گلی میں جھانک لیتا تھا۔ گلی میں ابھی تک لوگ موجود ہیں!" وہ بڑبڑایا۔ اس کی ہتھیلیوں میں نمی پیدا ہو گئی تھی۔ جسے وہ بار بار رومال سے پونچھ رہا تھا۔ وہ کمرے میں ادھر اُدھر ہزار مرتبہ دیکھی ہوئی چیزوں کو دیکھتا۔ پھر اس کی نگاہیں دوستوں اور اکتائے ہوئے چہروں پر جا رکتیں۔ اس نے اپنے آپ کو بہلانے کے لئے ایک گیت گنگنانا شروع کیا پھر سیٹی بجانے لگا۔

"میرے خیال میں" توفیق نے اپنے دوستوں کے پاس آ کر کہا "ہمیں میز کا زاویہ بدل دینا چاہیئے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے سروں کے اُوپر چھت میں جو تختی اکھڑی ہوئی ہے۔ ہم اس کی دست بُرد سے بچ جائیں گے دوسرے —— کمرے میں کچھ نیا پن بھی پیدا ہو جائے گا۔"

اجمل نے اب ایک سادہ کاغذ اٹھا لیا تھا۔ اور اس پر پنسل سے کوئی بڑی اُلجھی ہوئی صورت بنا رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا، کرمانی نے پل بھر کے لئے بالوں میں چلتا ہوا ہاتھ روک کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے خیالوں میں منہمک ہو گیا۔

"آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" توفیق چلایا۔ وہ طیش میں تھا۔ اور اُس کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے تھے۔

"میں وہاں نہ جاؤں ——؟" وہ اپنا تمتمایا ہوا چہرہ آگے بڑھا کر بولا "کیا یہ اخلاقی دباؤ ڈالا جا رہا ہے؟؟" اجمل نے سر اٹھایا اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ اُس کے چہرے پر گہرے رنج اور کرب کے آثار تھے اور اس کی بھوری آنکھیں خوابیدہ سی معلوم ہو رہی تھیں۔

"بس بس رہنے دو!" توفیق چیخ اٹھا "مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، اب میں کسی قسم کے جھانسے میں نہیں آ سکتا۔۔۔ میں اس بند گلی سے نکل کر رہوں گا۔ میں اس گھٹن کو اب مطلقاً برداشت نہیں کر سکتا۔!" اس کے لبوں کے کنارے پر جھاگ سی بن گئی تھی۔ اور جوش کی وجہ سے اس کا وجود ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ وہ ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر اُس نے رخساروں پر ہاتھ پھیرا اور نچلا ہونٹ چبانے لگا۔ "ممکن ہے وہاں کچھ بھی نہ ہو۔ میرے ساتھ محض مذاق کیا گیا ہو۔ کیا پتہ یہ مذاق خطرناک بھی ہو ——!" وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ٹھونس لئے تھے "بہر حال کچھ بھی ہو میں ضرور وہاں جاؤں گا!" وہ بڑبڑایا۔ اور اُس کے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت دھیمی پڑ گئی تھی۔ اور سانس اعتدال پر آ گئی تھی۔ اس نے ٹھوڑی کو دو انگلیوں میں دبایا اور پھر اُسے مسل دیا۔ "ڈرپوک" اُس نے سرگوشی کی پھر وہ کھسیانے پن کے ساتھ منہ بند کر کے ہنسا "لیکن آج میں خوف کی تمام دیواروں سے ٹکرا جاؤں گا، دیکھوں تو سہی اس سے کیا بگڑتا اور کیا بنتا ہے؟"

اجمل نے پنسل اور کاغذ ایک طرف پھینک دیا وہ اٹھا اور اس نے جا کر توفیق کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم اس بند گلی سے ضرور نکلو۔ لیکن ہماری طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے کی ضرورت نہیں تمہارے مشتعل ہو جانے کے وجوہ بھی بڑے معقول ہیں۔ اور ہم دونوں بھی اپنی خموشی اور غمی کا جواز رکھتے ہیں!" اس نے توفیق کے شانے سے ہاتھ اٹھایا اور اس کا ہاتھ تھام لیا "آؤ ذرا دیر گھوم پھر ہیں تمہارا وقت گزر جائے گا!"

توفیق کچھ پشیمان سا دکھائی دینے لگا۔ اُس نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا البتہ اجمل کا ہاتھ گرمجوشی اور محبت کے ساتھ دبا دیا اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔
کرمانی نے اسٹول کھینچ کر سامنے کر لیا اور اس پر ٹانگیں پھیلا دیں اور میز کی دراز سے ایک موٹی سی کتاب نکال کر اس میں غرق ہو گیا۔

سوا گیارہ بجے کے قریب اجمل کمرے میں داخل ہوا، اُس نے پان کھا رکھا تھا۔ اور اُس کے لب سرخ ہو رہے تھے۔ اُس نے دروازہ بھیڑ دیا۔ اور سیڑھیوں والے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ اُس نے کوٹ کے کالر اُوپر اٹھا رکھے تھے جنہیں اُس نے کرسی پر بیٹھ کر درست کر لیا۔ اُس نے خوش دلی کے ساتھ جوتے اتارے اور سلیپر پہن کر چھوٹے کمرے میں لباس تبدیل کرنے کے لئے چلا گیا۔ جب وہ اپنے بستر میں گھس گیا اور تکیے کو دوہرا کر کے سگریٹ پینے

لگا۔ اس وقت کرمانی نے کتاب بند کی، اُس نے بالوں میں سے انگلیاں کھینچ لیں، اُس نے سویٹر اتار کر چارپائی پر پھینک دیا اور لحاف میں گھس گیا۔ اُس نے کپڑے تبدیل نہیں کئے تھے۔

اجمل کو اچانک خیال آیا کہ جلی اُس کے کپڑے ہمیشہ دھو کر اور استری کر کے تیار کر رکھتی ہے۔ اس نے کبھی کپڑے دھوبی سے نہیں دھلوائے تھے "کرمانی کو اچھی شاگرد مل گئی ہے!" وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔

"وہ چلا گیا ہے؟"

"ہاں! میں اُسے چھوڑ کر آیا ہوں!" ذرا دیر کے بعد اس نے یہ جملہ اور بڑھا دیا۔

"وہ اُسے سیڑھیوں میں مل گئی تھی!"

"بتی بجھا دوں؟" اجمل نے سگریٹ کا سر فرش پر رگڑ دیا۔

کرمانی نے کروٹ بدل لی اور لحاف سر پر کھینچ لیا۔

"میرے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے!"

اجمل دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹا رہا، اسے نیند نہیں آ رہی تھی، وہ کافی وقت اس کے انتظار میں لیٹا رہا۔ آخر کار اُس نے لحاف الگ کر دیا اور اُٹھ کر ایزل کے پاس چلا گیا، وہ چھوٹے کمرے سے نیا کینوس اٹھا لایا۔ اور لیڈر کی تصویر بھی۔ ذرا دیر تک وہ کھڑا رہا وہ بالکل خالی خالی سا الگ رہا تھا۔ اور نچلا ہونٹ چبا رہا تھا، اُس نے تصویر اور کینوس میز پر رکھ دیئے اور دوبارہ بستر میں گھس گیا۔

کرمانی نے کروٹ بدلی تاہم منہ لحاف سے باہر نہیں نکالا۔

اجمل کو یکایک اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔...... اس کا جی چاہا کہ کرمانی کو جگائے اور اس کے ساتھ باتیں کرے۔ "نہیں" اس نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کر دی" اسے جگانے کا کوئی فائدہ نہیں، وہ تنہائی کو اور بھی شدید بنا دیگا!" اُس نے لحاف منہ کے اوپر کھینچ لیا، اسے پل بھر کے لئے گلی والی لڑکی کا خیال آیا۔ جس کے ساتھ ہی جلی کا سراپا بھی اس کے تصور میں اُبھر آیا۔

"میری زندگی کا یہ روپ ہمیشہ میری نگاہوں سے اوجھل رہا ہے!" اُس نے کروٹ بدل لی پھر اُس نے سوچا "کیا اسے میری اس حرکت سے بہت دکھ پہنچا ہے؟" دروازہ کھلنے اور پھر کنڈی لگانے کی آواز سنائی دی۔ اجمل نے لحاف ہٹا کر دیکھا توفیق آ گیا تھا۔ اُس نے ٹائی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ جسے اُس نے میز پر ڈال دیا، اُس نے کوٹ اتار کر کرسی پر پھیلا دیا، اس کی قمیص شکن آلود ہو رہی تھی۔ وہ چارپائی پر سے اپنا پاجامہ اور کرتہ اٹھا کر چھوٹے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے صرف ایک مرتبہ اچٹتی سی نگاہ اجمل پر ڈالی اور پھر سیدھا اندر چلا گیا، اُس کی پیشانی پر بل تھے۔ اور چہرے پر دن بھر کی شگفتگی اور چونچالی کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں تھا تھوڑی دیر کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے آ گیا۔ اس نے اجمل کے تکئے کے نیچے سے ماچس کی ڈبیا نکالی۔ اور ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ جلایا۔

جس وقت سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا، اجمل چُپ چاپ اُس کی ہر حرکت نوٹ کئے جا رہا تھا۔ اور ٹکٹکی باندھے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمہیں مجھ پر رشک آ رہا ہے؟" اس نے پل بھر کے لئے اجمل سے نظریں ملائیں اور بھڑک اٹھا" تم بھی وہاں جا سکتے ہو۔ میری طرف ایسی بُھوکی بُھوکی نظریں اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہے!!"

کرمانی نے لحاف سے چہرہ باہر نکال لیا۔ "آہستہ بولو!" اُس نے بڑے پُرسکون اور مطمئن لہجے میں کہا" مکان میں اور لوگ بھی رہتے ہیں!"

توفیق نے اپنے چہرے پر اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ اجمل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔" آخر تم اتنے مشتعل کیوں ہو رہے ہو؟"

"مشتعل؟" وہ پھر چلّا اٹھا" زندگی نے مجھے ڈس لیا ہے!"

"کیا اس کے کمرے میں تمہارا نیا دار بیٹھا ہوا تھا؟" کرمانی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

اجمل بے اختیار ہنس پڑا۔ لیکن فوراً ہی اُس نے لب بھینچ لئے۔

توفیق نے نفرت بھری ہوئی نظروں سے کرمانی کو دیکھا اور آنکھیں سکیڑ لیں۔

"بھئی کچھ بتاؤ تو سہی، آخر بات کیا ہوئی ہے!" اجمل نے بڑے میٹھے لہجے میں پوچھا اور اس کے ہاتھ کو سہلانے لگا۔

توفیق بڑی دیر تک چُپ رہا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سامنے کی دیوار پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ اجمل نے سگریٹ جلا کر اُسے دیا۔

"بات تو بالکل سیدھی سی ہے" اُس نے کہنا شروع کیا۔ "لیکن میں کچھ اور ہی سوچ کر وہاں گیا تھا!" وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھہر گیا اور سگریٹ کا کش لگا کر بولا "اُس نے سیڑھیوں ہی میں میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور یوں میں وہاں جاتے ہی اس کے جسم کے لمس سے واقف ہو گیا تھا۔ واپس آنے تک اُس نے مجھے کچھ کہنے یا سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا ——————" اُس نے ذرا دیر تک اپنے ماتھے پر انگلی پھیری اور بھوؤں کو اوپر تک اٹھا کر کے گویا نشہ سر کو جھٹکتے ہوئے بولا "اُس نے میرے کوٹ کی جیب سے پیسے نکال لئے۔ اور کوٹ مجھے پہنا دیا۔ 'مجھے ضرورت ہے' اُس نے نوٹ تکیئے کے نیچے رکھ کر کہا اور میرے کوٹ کے بٹن بند کر دیئے۔۔۔" قدرے توقف کے بعد وہ آنکھیں سکیڑ کر بولا۔

"اس کے باوجود مجھے عورت سے نفرت نہیں!" اُس نے کرمانی کے ساتھ نظریں ملا کر کہا اور اُس کا لب و لہجہ زہر ملا ہو گیا تھا "کہیں تم مجھ سے یہ توقع نہ وابستہ کر بیٹھو!" وہ تکیئے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ "یہاں ہر چیز ملمع چڑھی ہوئی ہے اور اندر سے بالکل کھوکھلی ہے!" ذرا دیر کے بعد اس نے یہ جملہ اور بڑھا دیا۔

کرمانی نے بالوں سے انگلیاں نکال لیں، وہ آہستہ سے ہنسا لیکن آواز پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے کناروں پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"میں عورتوں سے نفرت کرتا ہوں؟" اُس نے توفیق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چہرہ قدرے آگے کی طرف بڑھا دیا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں "میں شاعر نہیں ہوں کہ میں عورتوں کو سر پہ چڑھا لینے کا قائل نہیں۔ مجھے اس قسم کے انتہائی جذباتی پن کی کوئی معقول وجہ بھی دکھائی نہیں دیتی۔" اور وہ جذبات میں بھرا ہوا مگر دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ "پھر" قدرے تامل کیا اور دانت کٹکٹاتے لگا۔ اور بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ایک سیکنڈ کے لئے بھی توفیق کے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں۔ "میرے لئے وہ پاؤں کی جوتی نہیں ہیں، نہ ہی وہ چاند سے اُتری ہوئی کوئی مخلوق ہے —————— میرے لئے بس وہ عورتیں ہیں گوشت پوست کی بنی ہوئی، بری اور بھلی، جیسے مرد ہوتے ہیں۔ ویسی ہی وہ بھی ہوتی ہیں!" اُس نے بالوں میں انگلیاں ڈال دیں اور انہیں پھیرتا ہوا گردن تک ہاتھ کرتا گیا پھر اُس نے ہاتھ اٹھا کر لحاف پر رکھ دیا۔ اب اس کی آنکھیں پوری طرح روشن ہو گئی تھیں۔ اور دائیں بھوؤں کے اوپر ایک چھوٹی سی تیوری چڑھ گئی تھی "نفرت بازی کی بات اور ہے" "ہمیشہ تو عورت کو اپنا جوہر دکھانے کی مجبوری نہیں ہوتی۔۔۔" وہ چپ ہو گیا اور کمرے میں ایک وحشت ناک سناٹا طاری ہو گیا" وہ یا تو پاؤں کے نیچے رہی ہے یا پھر سر کے اوپر، ابھی تک اسے مرد کے ساتھ کندھا ملا کر چلنے کی توفیق نہیں ہوئی اور یہ ہماری اور اس کی زندگی کا ایک بڑا المیہ ہے"

"حالات ——————"

"بس بس رہنے دو!" کرمانی گرم ہو کر بولا اور اُس نے شروع ہی میں توفیق کی بات کاٹ دی "جذبات اور جد و جہد بھی انسانی زندگی میں کچھ معنی رکھتے ہیں!"

"لیکن" توفیق نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اُس نے کرمانی کو اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ "تم جذبات اور جد و جہد کے باوجود کیوں ناکام رہے ہو؟"

کرمانی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی تھی اُس نے دانت کٹکٹائے اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا آخر کار اُس نے بڑے دھیمے اور قدرے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

"وہ صرف اس لئے کہ میں اکیلا ہوں!"

"یہاں کون اکیلا نہیں ہے۔۔۔؟" اجمل کا لہجہ جھنجھلایا ہوا تھا پھر وہ اُداس ہو گیا۔ اُس نے بڑے محزوں انداز میں لحاف کے اُوپر ہاتھ پھیرا اور قدرے تامل کے بعد کہا "بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ رفاقت کو جھپٹ لیں، چھین لیں اور پھر اسے لے جا کر صرف اپنی ہی ذات کے لئے کہیں چھپا دیں —— غم تمہارا ہی مقدر نہیں ہے۔ ہم بھی زندگی سے اکتائے ہوئے ہیں۔ ہماری روح تک جھینپ گئی ہے، ہم اپنے ضمیر سے آنکھ ملاتے ہوئے ڈرتے ہیں —— رہبانیت کی باتیں، بس یہ محض باتیں ہی تو ہیں"۔ وہ جوشیلا ہو گیا تھا۔ اور اُس کی بھوری آنکھیں ایک جگہ پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ "ہم میں تو دوسروں کی غمی اور خوشی میں شریک ہونے کا حوصلہ بھی نہیں رہا —— کوئی افسردہ خاطر ہو تو ہم جھنجھلا اٹھتے ہیں، خوش ہو تو ہمیں وحشت ہونے لگتی ہے —— ہم نہ غم سے آنکھ ملا سکتے ہیں نہ خوشی کے روبرو ہو سکتے ہیں" وہ بولتا چلا گیا" دوسروں پر ملمع چڑھا ہوا ہے یا نہیں لیکن ہم خود اندر سے کھوکھلے ہیں، آسودگی اور طمانیت کے لئے بھٹکتی ہوئی روحیں، ہم دوسروں سے توقعات رکھتے ہیں، شکائتیں، گلے، دبی دبی رنجشیں۔۔۔ ہم آخر دوسروں کے دل میں جھانک کر کیوں نہیں دیکھتے۔ دل کٹے ہوئے ہیں۔ مایوس اور ویران سینے، زندگی نے ہمارے گلے میں طوق ڈال رکھے ہیں اس کے بوجھ سے ہمارے دم گھٹے ہوئے ہیں۔ ہم کسی کا ہاتھ کیا تھامیں گے ہمارے بازوؤں میں دم ہی نہیں رہا، میں کوئی بے حس تو نہیں ہوں، میں بھی جب گلیوں میں آوارہ اور مفلس بچوں کو دیکھتا ہوں تو —————— مجھے دھچکا سا لگتا ہے۔ میں اُن کی زندگی کو کینوس پر تو منتقل کر سکتا ہوں۔ لیکن اُن کے لئے اسکول نہیں کھول سکتا، مجھ میں اس کی صلاحیت بھی نہیں ہے، میں صرف اور صرف تصویر بنانے کے لئے پیدا ہوا ہوں پھر میں دفتر میں جھک کیوں مارتا ہوں، میں آخر پنسل اسکیچ کیوں بناؤں؟؟ اس کا

مجھے کیا فائدہ ہے؟" اُس نے ایک لمحے کے بعد بڑی افسردگی اور شکست خوردگی کے لہجے میں کہا "لیکن میں پنسل اسکیچ بناؤں گا۔ مجھے روپے کی ضرورت ہے۔ میں دفتر میں بھی جھک ماروں گا۔ ورنہ میرا خاندان بھوکا مر جائے گا اگر بھوکا نہیں مرے گا۔ تو سیڑھیوں میں اجنبی قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگے گی"

کرمانی خموشی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا تھا جب اجمل چُپ ہو گیا تو اُس نے بالوں سے انگلیاں نکال لیں "تم نے اپنے دل کا بخار اتار لیا۔ یہ ٹھیک کیا ہے تم نے ویسے گفتگو کا یہی موضوع نہیں تھا۔ اس نے لحاف اوڑھ لیا اور کروٹ بدل کر بولا "چلو اب بتی بجھا دو!"

تینوں دن چڑھے تک پڑ کے سوتے رہے، آٹھ بجے کے قریب راجر نے آکر انہیں جگایا۔ رات کو سونے سے پہلے توفیق نے احتیاطاً سیڑھیوں والا دروازہ کھول دیا تھا۔

بلی ناشتہ لے کر نیچے آئی۔ اُس نے چُپ چاپ ناشتہ میز پر لگا دیا اور کسی سے بات کئے بغیر اجنبیوں کی طرح واپس چلی گئی۔ کرمانی نے بڑے تعجب کے ساتھ اس کے گم سُم چہرے کی طرف دیکھا جب وہ واپس چلی گئی۔ تو وہ پل بھر تک سیڑھیوں والے دروازے کو تکتا رہا تاہم اُس نے کچھ کہا نہیں، تینوں کے درمیان مطلقاً گفتگو نہیں ہوئی تھی وہ لوگ بالکل خموشی کے ساتھ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔

ناشتے کے بعد کھانسی کی آواز سُن کر اجمل دروازے میں گیا، لڑکی نے ذرا سی چلمن اٹھائی اور اُسے جھانک کر اندر غائب ہو گئی۔ اجمل ٹھیک سے اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا، تاہم اُسے لڑکی کے حسین ہونے کا احساس ہو گیا تھا، اُس نے سیٹی بجائی اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کمرے کے چھوٹے چھوٹے چکر کاٹنے لگا۔ وہ مسکرا بھی رہا تھا، لڑکی کے رخسار تلے ایک تل تھا۔ جو بار بار اُس کے تصور میں اُبھر رہا تھا، اُس نے ایزل پر سے کپڑا ہٹایا اور وہ جگہ دیکھنے لگا جہاں اُس نے تل دیکھا تھا "آخر کار میں جان لوں گا کہ وہ کیسی ہے ——— "اُس نے دل میں سوچا اور واپس دروازے میں چلا گیا۔ کرمانی اُس کے پاس سے چُپ چاپ باہر نکل گیا۔ اس کی بغل میں عوامی اسکول کی فائل بھی تھی۔

"میں ترکاری لے آؤں" توفیق نے اس کے پاس آکر کہا "پھر دفتر چلیں گے ابھی وقت ہے!" اجمل کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس نے ہاتھ ابھی تک پتلون کی جیبوں سے باہر نہیں نکالے تھے۔ بیٹی سیڑھیوں میں، ٹھٹکا ہوا، اُس نے دیکھا بلی دروازے میں کھڑی تھی، اس کی بھویں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر وہیں کھڑی رہی پھر وہ کمرے میں آ گئی۔ اُس نے ناشتے کے برتن کشتی میں لگائے اور منہ پھیر کر جانے لگی۔

"بلی!" اجمل اُس کے سامنے آ گیا۔

بلی نے چہرہ اوپر نہیں اٹھایا۔ "میرا نام بلقیس بیگم ہے!" اُس نے تلخی کے ساتھ جواب دیا اور راستہ کاٹ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اجمل پھر اُس کے سامنے آ گیا۔

"مجھے معاف کر دو!" اُس کی آواز رندھی ہوئی تھی "نہ جانے یہ سب کیوں ہو گیا تھا، خدا کے لئے مجھے اپنی صفائی کا موقعہ تو دو!"

"آپ آگے سے ہٹ جائیے، ورنہ میں برتن پھینک کر چلی جاؤں گی!"

"اُف تم کتنی تنگ دل ہو! کیا تم اب مجھے بھی جوان نہیں کہو گی؟"

بلی نے پہلی مرتبہ سر اوپر اٹھایا اور اجمل کے ساتھ ذرا دیر کے لئے اپنی نظریں ملائیں، اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور پلکیں آپس میں جڑی ہوئی تھیں "آپ متاثر کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ کا من میلا ہے!"

اجمل ایک طرف ہٹ گیا، اس کا دماغ سُن ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پل بھر پہلے جو ذرا سی نمی آگئی تھی۔ وہ بھی اچانک سوکھ گئی تھی، اُس نے توفیق کا انتظار نہیں کیا اور کمرہ کھلا چھوڑ کر گلی میں آ گیا۔ اور گردن جھکائے ہوئے دفتر تک چلا گیا۔

چراغ جلے اجمل گھر آیا۔ دفتر سے فارغ ہو کر وہ ادھر اُدھر سڑکوں پر گھومتا رہا تھا، اُس کی طبیعت کا تکدر دور نہیں ہوا تھا، وہ کچھ عالمِ جنون سا محسوس کر رہا تھا۔ اور دفتر میں دوستوں کے ساتھ تنک مزاجی کے ساتھ پیش آتا رہا تھا۔

کمرے میں کرمانی کرسی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اور بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ بلی اسٹول پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔

اجمل سیدھا ایزل کے پاس گیا۔ اس نے کینوس نکالا اور پنسل اسکیچ کے لئے فوراً ہی پہلی لکیر کھینچ دی بلی اوپر چلی گئی۔ تب بھی وہ اپنے کام میں لگا رہا دو گھنٹے کے بعد اچانک چھت پر دھکڑ پکڑ ہوئی۔ رضیہ کے چیخنے چلانے اور کئی قدموں کے ایک ساتھ تیز تیز چلنے کی آواز آئی۔

"شرم کرو!" توفیق چلایا تھوڑے سے وقفے کے بعد اُس کی تحصیلی آواز پھر سنائی دی۔

"دوبارہ تم نے ہاتھ اٹھایا تو میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا!"

"ہوں، ہاتھ توڑ دیں گے ———!" رضیہ چلائی اور پھر خموشی طاری ہوگئی۔

اجمل کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر وہ چھوٹے کمرے میں کپڑے اتارنے چلا گیا۔ وہیں پر اُسے کھانسی کی آواز سنائی دی جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دیر تک سنائی دیتی رہی اُس نے رات کا لباس پہنا اور دروازے میں گیا گلی میں اندھیرا تھا۔ اور چلمن خالی تھی۔ اس کے پیچھے دروازہ بھی بند تھا، وہ واپس آگیا۔ توفیق خموشی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر سگریٹ پینے لگا۔ کھانسی کی کھن کھناتی ہوئی آواز پھر سنائی دی جس کے ساتھ ہی منہ بھر کے بلغم تھوکنے کی آواز بھی سنائی دی۔ بعد میں گلا صاف کیا گیا اور سناٹا طاری ہوگیا۔

اجمل دروازے میں سے ہو کر پھر واپس آگیا "نہ جانے اس کے گھر میں کون ہر وقت کھانستا کرتا ہے!" اس نے سوچا اور ہاتھ سینے پر باندھ کر کمرے میں پھرنے لگا آخر کار وہ پھر ایزل پر جُھک گیا اور اُس نے اسکیچ پر جو تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا۔ اُسے جلد ہی ختم کر دیا۔ اس نے بھرا ہوا کینوس ایک طرف رکھ دیا۔ اور دوسرا کینوس فریم میں چڑھا دیا اُس نے ابھی پہلی لکیر لگائی تھی۔ کہ پھر گلی میں کھانسی کی آواز اُبھرنے لگی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور قدرے تامل کے بعد گلی میں جھانکنے کے لئے چلا گیا۔ واپسی پر اس کی آنکھیں کرمانی کی آنکھوں سے چار ہوئیں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھما گھما کر اس کی طرف تک رہا تھا، اجمل آگے بڑھ گیا۔ اور باقاعدہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسے احساس ہوا۔ کہ کرمانی ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا ہے۔

"کیا آپ میرے ساتھ عشق فرما رہے ہیں؟" اجمل بھڑک اُٹھا۔

کرمانی نے سگریٹ جلایا اور تیلی بجھا کر میز کی درز میں اُڑس دی۔ "رومانس کا خیال دل سے نکال دو" اس نے اپنی پلکیں جھپکیں "اپنا وقت برباد نہ کرو خالی کینوس تمہارا انتظار کر رہا ہے!"

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

کرمانی دانت کٹکٹانے لگا۔ اُس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا لیں۔ اور ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ "اب مزید حماقت کا ثبوت نہ دو، تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو!"

اجمل کے کانوں کی لویں تپ گئیں اور رخسار سرخ ہو گئے "میں تمہاری ذہانت سے تنگ آچکا ہوں" اُس نے تلملا کر جواب دیا "پہیلیاں بجھانے کی آخر کیا ضرورت ہے؟" وہ دروازے کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں سے سر گھما کر بولا۔ "اور پھر تم کوئی میرے بزرگ تو نہیں ہو ———!"

"چند دن ہو گئے ہیں" اس نے تحمل کے ساتھ جواب دیا "میں دوپہر کے وقت گھر آ رہا تھا تو وہ چلمن اُٹھائے کھڑی تھی، اچانک اُسے کھانسی کا دورہ پڑا اور بلغم اچھل کر اس کے حلق سے باہر آگئی" اُس نے سگریٹ کا کش لیا اور راکھ جھاڑ دی "اس میں آدھے سے زیادہ خون تھا، تھوڑی دیر کے بعد جب میں واپس جا رہا تھا تو اس کے گرد کیڑے جمع ہو گئے تھے" اُس نے سگریٹ پھینک دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ وہ تمہیں متوجہ کرنے کے لئے نہیں کھانستی ہے!"

اجمل نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایزل پر جُھک گیا، تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے ہلا اس نے کندھے جھٹکے اور کمرے سے باہر نکل گیا، اُس نے شب خوابی کا ہلکا پھلکا لباس پہنا ہوا تھا۔ اور سگریٹ کی ڈبیا وہ ایزل کے پاس ہی فرش پر چھوڑ گیا تھا۔ توفیق نے دیکھا کینوس بالکل خالی تھا۔

کرمانی نے ایزل کی طرف جھانکا پھر وہ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ اور کرسی کے بازو پر ہتھیلی رگڑنے لگا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ دیوار پر ایک سیاہ چھپکلی پیلے پروں والی تتلی کی پشت پر رینگ رہی تھی۔

توفیق نے نگاہ بھر کے کرمانی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے میز کی سطح پر نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں عناد تو نہیں تھا۔ تاہم انہیں دوستانہ نگاہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اُن میں ناراضگی سے کچھ زیادہ ہی شکایت تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا سیڑھیوں تک گیا اور پھر اچانک پلٹ آیا۔

"گفتگو کا یہ انداز تمہارے جیسے آدمی کو ہی زیب دے سکتا ہے" اُس نے بڑے تلخ لہجے میں کہا اور پھر اس کے سر پہ جھک گیا "کیا اب تم خوش ہو گئے ہو...؟"

کرمانی نے مطلقاً کوئی جواب نہیں دیا، اُس نے سر بھی اوپر نہیں اُٹھایا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ میز پر انگلیاں بجا رہا تھا۔ اُس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ بات کو آگے بڑھانے کے حق میں نہیں ہے۔ کئی منٹ گزر گئے۔ توفیق اُس کے سر پہ کھڑا تھا۔ آخر کار کرمانی نے جذبات سے بالکل خالی زبان میں خموشی کو توڑ دیا۔

"میرا خیال تھا" اُس نے سر اوپر اٹھائے بغیر کہنا شروع کیا "اس تانک جھانک کے پیچھے کوئی بڑا جذبہ کارفرما نہیں ہے!" وہ بڑی آہستگی کے ساتھ کرسی سے اُٹھ گیا۔ اُس نے میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا لیا، اور پل بھر کے لئے توفیق کے چہرے پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، اس کی پیشانی پر ایک نس اُبھر آئی تھی۔

"میں جذبات سے بالکل خالی تو نہیں ہوں، میرا دل بھی دھڑکتا رہا ہے!" اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اور چق اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

توفیق نے قدرے دیر کے بعد سوچا۔

"یہ شخص زندگی سے بالکل لطف اندوز نہیں ہوتا ہے" اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا وہ جا چکا تھا۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخر کار وہ ایزل کے پاس گیا، پھر کینوس کو اٹھالیا۔ ایزل کے پاس ہی لیڈر کی تصویر پڑی ہوئی تھی۔ جس کا اس نے اسکیچ تیار کیا تھا۔ اس نے تصویر اٹھائی وہ اسے اسکیچ کے ساتھ ملا کر دیکھنے لگا۔ اس نے تصویر کو سیدھا کیا تو اس پر سے پانی کی ایک چھوٹی سی بوند نیچے گر گئی۔

بلی کھانے کی کشتی لے کر کمرے میں داخل ہوئی، اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا، لب بھینچے ہوئے تھے۔ اور وہ بہت باریک معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے رخسار پر ایک طویل خراش کا نشان تھا اور بائیں آنکھ کے نیچے نیل پڑا ہوا تھا، اس نے چادر سر پر اچھی طرح سے اوڑھ رکھی تھی اور ٹھوڑی کے علاوہ رخساروں کا زیادہ حصہ بھی اس میں چھپا رکھا تھا، اس کی پلکیں رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے سیاہ پپوٹے تمام تر نظر آ رہے تھے۔

"بھئی جاؤ، میں کھانا واپس لے جاؤں!"

توفیق کے خیالات کا تار و پود بکھر گیا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا اور تصویریں چارپائی پر رکھ دیں، وہ سر جھکائے ہوئے بلی کے پاس آیا اور اس نے کھانے کی کشتی اس کے ہاتھوں سے لے کر میز پر رکھ دی۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے، کمرے میں بڑا کربناک سناٹا طاری تھا، توفیق نے ایک طویل سانس بھری اور جھک کر بلی کا ہاتھ اوپر اٹھالیا۔

"وہ تو بیمار ہے نا!" اس نے بلی کا ہاتھ تھپتھپایا "کہیں سے پیسوں کا بندوبست ہو جائے تو میں تمہیں بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروا دوں گا!" اس نے بلی کے سر پر بوسہ دیا "تم دن کا وقت نیچے گزار لیا کرو!" وہ منہ میں بڑبڑایا "لیکن اسی بات کی تو اسے شکایت ہے!"

انجم کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بازو سینے پر باندھ رکھے تھے، سردی کی وجہ سے اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا، اس نے ایزل کے پاس سے سگریٹ اٹھائے اور جوتے اتار کر بستر میں گھس گیا، اس نے بمشکل تیلی جلائی اور سگریٹ سلگا لیا اور اس کے اوپر تلے کش لینے لگا۔

"تمہارے لئے چائے بنواؤں؟"

"میں پی کر آ رہا ہوں!"

"توفیق اس کے پاس بستر پر بیٹھ گیا"

"آؤ کھانا کھا لیں نہیں تو ٹھنڈا ہو جائے گا!" اس نے بڑی ملائمت اور محبت کے ساتھ کہا

"کیا تمہیں مجھ پر رحم آ رہا ہے؟ میں ٹھیک ہوں!" اس نے دبی دبی تلخی اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"سردی لگی ہے تو گھر آگیا ہوں، بھوک لگے گی تو کھا لوں گا——!"

اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے انگلیوں میں مسل ڈالا۔

"تم میرے ساتھ بھی ناراض ہو؟"

"ناراض؟ میں تو کسی کے ساتھ بھی ناراض نہیں ہوں!"

"اس نے قدرے توقف کے بعد غیر شعوری طور پر یہ جملہ اور بڑھا دیا"

"کچھ بھی سہی بہر حال اس کا من تو میلا نہیں ہے!"

بلی اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی اس کا منہ میز کی طرف تھا۔

انجم نے اس کی پشت پر نگاہ کی اور وہ حیران ہوا کہ اس نے یہ کیا کہہ دیا ہے۔

"من میلا نہیں ہے!"

"توفیق بڑبڑایا۔"

"بہر حال وہ دلوں کا احترام کرنا نہیں جانتا!"

"یہ میں نے کب کہا ہے ————" اجمل نے ذرا دیر سوچنے کے بعد اس بات کا اضافہ کر دیا "کرمانی سے بھی بھول ہو گئی ہے اور مجھ سے بھی، تاہم مجرم وہی ہے جسے معاف نہ کیا جائے!"

دروازے پر کھٹکا ہوا اور کرمانی کمرے میں داخل ہوا۔

"ملی؟" توفیق نے کہا "سالن گرم کراؤ!"

"میرے لئے اس کی ضرورت نہیں، میں آج بھوکا سونا چاہتا ہوں!"

کرمانی کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے سر سینے پر جھکا لیا وہ اس وقت گھر کی شکست کا دکھ سہتے ہوئے معلوم ہو رہی تھی وہ اچانک اٹھی اور سیڑھیوں والے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"دروازہ بند کر دینا، میں ابھی آ رہا ہوں!" توفیق ذرا دیر کمرے میں کھڑا رہا پھر اس نے گھر والے دروازے کی کنڈی چڑھا دی اور جاتے ہوئے سیڑھیوں والا دروازہ بھیڑ گیا۔

اجمل نے سگریٹ بجھا دیا اور لیٹ گیا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا ہے؟" کرمانی نے پوچھا

"تکلف سے کام ہے!"

کرمانی نے بتی بجھا دی اور اجمل کے پاس ہی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی جسے طالب علموں کے کمرے سے ایک آواز نے توڑ دیا۔

"کیا تمہیں میری نیت پر شبہ ہے؟"

"نہیں!"

کمرے میں پھر سناٹا طاری ہو گیا، کرمانی کے بستر سے بار بار سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ البتہ اجمل کے بستر پر مکمل سکوت طاری تھا۔

"کیا تم اس کے ساتھ محبت کرنے لگے ہو؟" کرمانی نے اس کی طرف منہ پھیر کر پوچھا۔

"نہیں!"

"نہیں!!"

"مجھے یہ وہم ہو گیا تھا کہ میرے آئیڈیل نے وہاں جسم اور زندگی اختیار کر لی ہے!" اجمل کے تکیے پر ہلکی سی آہٹ پیدا ہوئی۔ "میرے ذہن میں تحریک اور جمالیات کا تصور غائب ہو گیا!" ذرا دیر کے بعد اس نے یہ جملہ اور بڑھا دیا "فی الحال تو میں یہی محسوس کر رہا ہوں!"

کرمانی کے بستر سے ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی گویا کوئی آواز صرف حلق سے ٹکرا کر رہ گئی ہو آگے نہ بڑھی ہو۔

"سوچنے اور چاہنے سے زندگی حسین نہیں ہوتی۔ تصور کتنا ہی اونچا اور نازک ہو بالآخر زمانے کے قدموں تلے کچلا جاتا ہے!" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے اس بات کا اضافہ کر دیا "تمہارے پاس کم از کم کام کرنے کے لئے ایک میدان تو ہے، چلتے رہو گے تو منزل پر جا پہنچو گے! میں راستہ ہموار نہیں کر سکا" ایک پل کے توقف کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "چند دنوں سے میرے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہو گئی ہے ———— میں خدا کو دیکھنا چاہتا ہوں ———— چھپکلی اور تتلی کے خدا کو ————" اس نے کروٹ بدل لی اور بڑبڑایا "کہیں چھپکلی اور تتلی کا خدا الگ الگ نہ ہو!"

کمرے میں گہری خاموشی اور سکوت طاری تھا، اچانک ایک دھڑ دھڑ کی سنسناہٹ نے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ طالب علم اپنے کمروں میں چپ ہو گئے تھے گلی میں آمد و رفت بند ہو گئی تھی تاہم تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھانسی کی دبی دبی آواز سنائی دے جاتی تھی، جیسے کوئی منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانس رہا ہو اور آواز کے ساتھ چھپکلیوں کی لذیذ دیر کی پھڑپھڑاہٹ رہی تھی اس میں باریک اور اپنی جگہ سے اکھڑے ہوئے ٹین کی کھنک بھی شامل تھی ———— چھت پر کوئی چلا اور اس کی کرم خوردہ کڑیاں کانپنے لگیں، اجمل کے تار و پود کا سلسلہ کٹ گیا۔ اس نے سگریٹ جلا لیا اسے نیند نہیں آ رہی تھی اسے سونے کی خواہش بھی نہیں تھی، وہ کچھ سوچ بھی نہیں رہا تھا، آخر کار سگریٹ کا پیکٹ خالی ہو گیا۔

طالب علموں کے کمروں سے کئی آوازوں کی ملی جلی گھسر پھسر سنائی دے رہی تھی کافی دیر کے بعد سیڑھیوں پر کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور پھر زور سے کھٹکا ہوا گویا کوئی پھسل گیا ہو۔ اجمل نے کمرے کی بتی جلائی جب اس نے سیڑھیوں والا دروازہ کھولا اس وقت اسے دوسری طرف دروازے کے چھت

سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سیڑھیوں کے آخری سرے پر ایک سایہ دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا پھر اس نے سگریٹ کا خالی پیکٹ اٹھایا اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔

"یہ لو! میرے پاس ہیں سگریٹ۔" کرمانی نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اجمل اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔؟" اس نے ماتھے کے بل سمیٹ کر اور آنکھیں میچ کر کہا

"کیا ہو رہا ہے، کیا تم نے دیکھ نہیں لیا ہے!؟" اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ سگریٹ جلایا اور ایک ہلکا سا کش لے کر بولا۔

"قدرت کے قوانین کو ہماری اخلاقی اقدار سے مطلقاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اس نے انسان کے ساتھ اک ازلی و ابدی بھوک کی خواہش بھی چپکا دی ہے۔ اسے اس سے کچھ بھی واسطہ نہیں کہ آپ خیر کے ساتھ پیٹ بھریں یا شر کے ساتھ بس وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ طلب پوری کر دی جائے ہم اگر انسان کے لئے کوئی اخلاقی معیار یا کسی قسم کی بندش قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہئیے کہ انسانی طبیعت زیادہ دیر تک کسی قسم کی بھوک کو برداشت نہیں کرتی، اس کے جسمانی نظام کو نظر انداز کئے بغیر اس کے لئے کسی قسم کا مادی یا روحانی نظام قائم کرنا محض حماقت ہے" تھوڑی دیر کے بعد اس نے یہ جملہ اور بڑھا دیا" کیونکہ وہ مجبور محض، نہیں ہے۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا لیں اور دوسرے ہاتھ سے سگریٹ پینے لگا وہ فضا میں کسی غیر مرئی شے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

"انسان مجبور محض نہیں ہے" اجمل نے دہرایا۔

"لیکن قدرت کے نزدیک آخر زندگی کی کیا حیثیت ہے؟" اس نے ترش لہجے میں کہنا شروع کیا "کہیں انسان کے ساتھ کوئی مستقل مذاق تو نہیں کیا گیا ———؟ کہیں وہ تماشے کے ایک کردار کی حیثیت نہ رکھتا ہو؟" اس نے آنکھیں میچ لیں اور اس کی بھویں اکٹھی ہو گئیں، قدرے تامل کے بعد اس نے اس بات کا اضافہ کر دیا "بڑے سے بڑا مذہب صرف نصیحت کر کے رہ جاتا ہے، وہ یہ تو کہتا ہے کہ ظلم نہ کرو لیکن وہ ظالم کا ہاتھ مطلقاً نہیں پکڑتا وہ قتل کو پسند نہیں کرتا اور ہر روز ہزاروں قتل دیکھتا رہتا ہے، وہ کسی کو روکتا نہیں، کسی کی طرفداری بھی بالکل نہیں کرتا، میں حیران ہوں آخر انسان اور خدا کا رشتہ کس نوعیت کا ہے۔ اکتنے پیغمبر آ چکے ہیں لیکن انسانی خوشی کی ابتدا نہیں ہوتی، کیا اسے خود بھی علم نہیں ہے کہ انسانی مسرت کس طرح سے قائم کی جا سکتی ہے ———؟"

"وہ دیکھو!" کرمانی چلایا اس نے دیوار کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک بڑی سی چھپکلی نے حسین تتلی کو منہ میں دبوچ رکھا تھا اور تتلی کے کومل پر ہوا میں اڑ گئے تھے "یہ منظر میرے خیالات کو ایک نقطے پر ٹھہرنے نہیں دیتا، میرے احساسات نے طوفان مچا رکھا ہے، در اصل یہ ہے زندگی اور کائنات کا فلسفہ!" اس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا "میں تیتنگا نہیں بننا چاہتا لیکن میں چھپکلی بھی نہیں بن سکتا اور یہ ہے میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ!" کرمانی مشتعل ہو گیا تھا اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور چہرے پچے ہوئے تھے ذرا دیر کے بعد وہ دانت کٹکٹانے لگا۔

"کئی مرتبہ میں نے سوچا ہے چھپکلی کو مار ڈالوں پھر میں سوچنے لگتا ہوں جب قدرت کو معلوم تھا کہ وہ تتلی کو اس کے تمام حسن سمیت کھا جائیگی تو پھر اسے پیدا ہی کیوں کیا تھا۔؟" اس نے بالوں سے انگلیاں نکال لیں اور پشت پر بازو باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا "میں اب یہ تماشہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا، میں رات کو چین سے نہیں سو سکتا، مجھے اندھیرے میں بھی دیواروں پر کریہہ اور مکروہ درندے زندگی کے پیچھے رینگتے نظر آتے ہیں مجھے اندھیرے سے خوف آنے لگا ہے اور یہ روشنی بھی کتنی بھیانک ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے بازو پر انگلیاں نچانے لگا۔

گلی سے بھیانک کھانسی کی آواز آئی جو کئی منٹ تک جاری رہی۔

"زندگی کیسی ہے یہ ہم جانتے ہیں" اجمل نے ایک لمبی خموشی کے بعد کہنا شروع کیا "تاہم زندہ رہنے کے لئے ہمیں اس سے بہتر بات سوچنا ہوگی۔!"

"بہتر بات" کرمانی بڑبڑایا "اصل بات کیا ہے یہ میں جان کر رہوں گا!"

سورج بلند ہو گیا تو توفیق نیچے آیا، اس کے ساتھ راجہ بھی تھا جس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی، توفیق کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے، اس نے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی اور وہ اس کے ماتھے اور سر پر پریشان تھے۔

ناشتے کے دوران تینوں بالکل چپ رہے۔

اجمل نے ناشتے سے فارغ ہو کر ایزل اور مصوری کا سامان اٹھایا اور کمرے کے تھڑے پر ڈیزل جما کر کینوس پر جھک گیا۔

کرمانی نے لباس تبدیل کیا اور کچھ کہے سنے بغیر جوتا اٹھا کر باہر چلا گیا، آج عوامی اسکول کی فائل اس کی بغل میں نہیں تھی۔

توفیق اسٹول پر بیٹھا رہا، اس نے کھینیاں میز پر رکھی ہوئی تھیں اور سر ہاتھوں کے پیالے میں دھرا ہوا تھا اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا جب اس نے اُسے چھوڑا تو اس میں سے خون رِس رہا تھا۔

رامو سیڑھیوں والے دروازے سے نمودار ہوا۔ "اس نے پوچھا ہے آج آپ دفتر نہیں جائیں گے؟"

"دفتر!" وہ بڑبڑایا اور رامو اوپر چلا گیا۔

گیارہ بجے کے قریب جب سامنے کے مکان سے کھانسی کی آواز سنائی دی۔ تو اجمل ایزل اٹھا کر اندر لے آیا۔ اس نے پوری گلی کی زندگی کو بعینہٖ کینوس پر اتار لیا تھا، لیکن وہ تصویر سے مطمئن نہیں تھا، اس میں کیا کمی رہ گئی تھی یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا تاہم وہ اسے غیر مکمل معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا ایکا ایکی وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا، اس نے نیا کینوس نکالا اور اسے فریم میں جما کر کمرے کی تصویر بنانے میں مشغول ہو گیا۔

دو بجے کے وقت بلی نے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا "میں آپ کو کھانا لا دوں!"

اجمل برابر کینوس پر جھکا رہا اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا وہ اپنے کام میں پورے انہماک سے مشغول تھا، کافی دیر کے بعد اس نے جواب دیا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے! توفیق آئے گا تو کھا لوں گا!!"

بلو چلی گئی تو وہ اپنا ہاتھ روک کر بڑبڑایا "وہ کمرے کے اندر نہیں آئی!" اس نے موقلم رکھ دیا اور بازو سینے پر باندھ کر ٹہلنے لگا "بیچاری لڑکی کا دل ٹوٹ گیا ہے اب وہ ہنستی ہی نہیں ہے!"

ذرا دیر کے بعد اسے خیال آیا "میں نے ایک جیتی جاگتی تصویر بگاڑ دی ہے، میں کیسا مصور ہوں،" اسے بڑی اذیت محسوس ہو رہی تھی "اگر یہی حال رہا تو میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگوں گا۔!" اس نے سوچا اور جا کر سیڑھیوں والے دروازے پر دستک دینے لگا۔

دروازے کے پیچھے سے کسی نے جھانک کر دیکھا پھر بلی وہاں آئی۔

"میرے لئے کھانا لے آؤ!" اس نے بلی کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا اور کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا "میں اس سے معافی مانگ لیتا ہوں!.."

سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی وہ گھبرا گیا اسے وحشت سی ہونے لگی اس نے منہ پھیر لیا اور اپنے ہونٹ چبانے لگا۔

بلی نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ دی، اجمل ویسے ہی کھڑا رہا، جب اس کے قدموں کی چاپ سیڑھیوں کی طرف غائب ہونے لگی تو ایکدم وہ پلٹا اور بھاگ کر اس کے پاس گیا۔

اس نے بلی کے کندھوں پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیئے۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا!" وہ چلایا اس کی سانس پھول گئی تھی۔

"میں نے آپ سے کیا کہا ہے؟"

"یہ کچھ کہنے سے زیادہ ہے!" "یہ تو جان سے لینے سے بھی زیادہ ہے!"

بلی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کا سر کچھ اور بھی نیچے جھک گیا اب اس کی چادر میں ڈھکی ہوئی ٹھوڑی سینے کے ساتھ چھو رہی تھی وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی اس نے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی، اس نے سر گھما کر پیچھے بھی نہیں دیکھا تھا۔

"اچھا" اس نے افسردہ دلی کے ساتھ کہا "تم بے شک میرے ساتھ نفرت کرو، تاہم خوش تو رہو، پہلے کی طرح ہنستی تو رہو!" اس نے بلی کے کندھوں سے ہاتھ اٹھا لیے "تمہارے چپ رہنے سے یہاں ہر چیز اُجڑی اُجڑی لگتی ہے، یہ مجھے اب پتہ چلا ہے کہ تمہارا کمرے میں موجود نہ ہونا کتنا بڑا غم ہے۔ مجھے بہت دیر کے بعد معلوم ہوا ہے کہ میں تمہاری آواز، تمہاری ہنسی، تمہاری مسکراہٹ، تمہاری پوری شخصیت سے مانوس ہو چکا ہوں۔" وہ واپس مڑ گیا۔

"مجھ سے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں نہ چھینو!" وہ بڑبڑایا "تمہارے اس طرح افسردہ خاطر اور کھوئے کھوئے رہنے سے میرا اطمینان کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتا [illegible] کہ نہ اٹھا تا جھٹکا کہ — تھا — اس کے ہاتھ زمین پر آ رہے تھے۔

[illegible] سے لوٹنا شروع کیا۔ "مجھے آپ سے نفرت نہیں ہے!" اس کے لب بھینچ گئے تھے [illegible] اور پڑھا دیا۔ "خوش رہنا مجھے اچھا لگتا ہے لیکن یہ مجھ سے اب نہیں ہوتا!" اس نے اپنے

کی خراش پر ہوتے سے ہاتھ پھیرا اور چادر کو وہاں آگے بڑھایا اس نے ایک پل توقف کیا اور پھر اُوپر چلی گئی ۔ اس نے چادر کی بکل میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں بھینچ رکھا تھا ۔

اجمل نے اپنے بالوں کو مٹھی میں لے کر کھینچ ڈالا ۔" اس سے اب خوش نہیں رہا جاتا ۔ اور یہ میری وجہ سے ہوا ہے ——— !" اس نے اُنگلیوں سے آنکھیں ملیں پھر پورے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا ، اس نے میز پر ہاتھ مارا اور کمرے میں آخری کونے تک اک اضطراری کیفیت کے ساتھ ٹہلنے لگا ۔ اس نے ایک ہاتھ بھینچ رکھا تھا اور اسے بار بار دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار رہا تھا ۔ عجیب سی خواہشیں اس کے سینے میں سر اُٹھا رہی تھیں ۔ جن سے وہ پہلے مطلقاً واقف نہیں تھا ۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ بلی کو دیکھنا چاہتا ہے اور اب ایک منٹ بھی صبر نہیں کر سکتا " یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ! " وہ چلایا اور اس نے اپنا سر جھٹک دیا وہ دروازے کے پاس گیا اور اس نے دستک دینے کے لئے اپنا ہاتھ اُوپر اٹھایا ۔

" نہیں نہیں ——— " وہ بڑبڑایا اور کمرے میں واپس آ گیا " یہ کیسی عجیب بات ہے ، بالکل ناقابلِ یقین ۔ ——— آخر یہ سب ہو کس طرح گیا ؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا خیالات سے بوجھل سر جھٹک دیا اور پیشانی مسلنے لگا لیکن اس کے تیز ، تند اور اجنبی جذبات کا تار و پود بدستور قائم تھا ۔ اور لمحہ بہ لمحہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا جا رہا تھا وہ پھر تیز چلتا ہوا سیڑھیوں والے دروازے پر گیا ۔ آخر کار وہ کرسی پہ ڈھے گیا اس نے اپنی چھاتی اور سر میز کی سطح پر ٹکا دیا اور اپنے اندر اُٹھتے ہوئے جذبات کی مزاحمت ترک کر دی ۔

بلی کمرے میں داخل ہوئی ، ذرا دیر تک وہ دروازے میں کھڑی رہی پھر وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی ، وہ اس کی پُشت پر اس طرح سے کھڑی ہو گئی تھی کہ اگر وہ پلٹ کر اسے دیکھے تو اس کا خراش والا رخسار اور نیل پڑی ہوئی آنکھ اسے دکھائی نہ دے اس نے پوری ٹھوڑی کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا ۔ اور اس کے رخساروں کی باریک نسیں باہر نکلی ہوئی تھیں جن کی رنگت بجھی بجھی سی معلوم ہو رہی تھی ۔

" آپ نے کھانا نہیں کھایا ، میں برتن لینے کے لئے آئی تھی ! "

اجمل چونک گیا اس نے ذرا سا سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ دہشت ناک معلوم ہو رہا تھا ایکا ایکی اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے اس نے پھر سر جھکا لیا ۔

" میں نے تھوڑی دیر پہلے ، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا ذکر کیا تھا " اس نے افسردہ کن آواز میں کہنا شروع کیا اس کی آواز نڈھال سی لگ رہی تھی " میں نے غلط کہہ دیا تھا ۔ یہ ایک اور غلطی تھی " وہ بڑبڑانے لگا " آخر یہ اتنے دنوں تک مجھے کیوں پتہ نہ چل سکا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں ——— اب میری پوری ہستی اس کی لپیٹ میں آ چکی ہے ——— حالات نے مجھے غلط رنگ میں پیش کر دیا ہے ، لیکن یہ جذبہ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہا ہوں ——— " بلی نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کانپ رہی تھی اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی تھی ۔

" میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا " اس نے لرزتی ہوئی گمبھیر آواز میں کہا " مجھے ایک منٹ میں جواب دو ، میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے ! "

" آپ جھوٹ بول رہے ہیں ! آپ کا دل محبت سے خالی ہے !! " اس نے آنکھیں بھینچ کر یہ جملہ اور بڑھا دیا ۔

" اگر آپ اس دن یہ بات کہتے تو مجھے ضرور یقین آ جاتا ——— " وہ جانے کے لئے مُڑی لیکن پھر اپنی جگہ پہ کھڑی ہو گئی اجمل کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ دم بھر میں ہر قسم کے جذبات سے خالی ہو گیا تھا اس پر مکمل سکتہ طاری تھا ذرا دیر کے بعد اس کے زرد رخساروں کے خطوط گہرے ہو گئے اور وہ اداس اور شکست خوردہ معلوم ہونے لگا ۔ اس کی بھوری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی تھی ۔

" افسوس ! " اس نے لب کھولے بغیر کہا " تمہارا دل سچا موتی تھا لیکن اب وہ میرا نہیں رہا ! " اس نے نظر بھر کے بلی کی طرف دیکھا اور اس کے جذبات پھر سے بھڑک اُٹھے ۔ اس نے بلی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ اپنی طرف پھیر لیا ۔

" ہیں ! یہ تمہیں کیا ہوا ہے ؟! "

بلی نے پل بھر کے توقف کے بعد چادر سر سے اتار دی ، اس کی ٹھوڑی پہ دانتوں کے زخم تھے اور وہ سوجھ گئی تھی ۔

" خوشی نے مجھے کاٹ لیا ہے ! "

" تم کتنی دکھی ہو ! " اس نے ہاتھ بڑھا کر بلی کے چہرے کو ان میں سمیٹ لیا " مجھ پر شک نہ کرو ، میں تمہیں خوشیاں دے سکوں گا ! " اس نے بلی کے رخسار کی طویل خراش پر آہستگی کے ساتھ انگلی پھیری اور پھر اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا ۔ اس نے مزاحمت نہیں کی اور رونے لگی پل بھر میں اس نے اجمل

کا سینہ آنسوؤں سے بھگو دیا۔ اجمل نے اس کے گلے پر بوسہ دیا اور اس نے اس کی خراش والی جگہ کو چوم لیا۔

"مجھے نہ ٹھکراؤ۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ محبت کرتا رہوں گا" بلی نے آہستگی کے ساتھ اسے پرے ہٹا دیا۔ "کیا آپ مجھے چھوٹے کمرے میں لے جانا چاہتے ہیں؟" اس نے آنسو پونچھے بغیر کہا "آپ یہ کر لیں لیکن میرے دل میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے ———!" اس نے چادر کے کونے میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"گڑیا!" اجمل نے آہستہ سے کہا "کانچ کی گڑیا!!" وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا اور اس نے لب بھینچ کر دو ننھے ننھے قطروں کو جو اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے بہنے سے روک دیا۔

سرِ شام توفیق کمرے میں داخل ہوا وہ سیدھا نئے بھرے ہوئے کینوس کے پاس گیا جو ابھی تک کمرے کے وسط میں ایزل پر لگا ہوا تھا۔

"چھپکلیاں ———!" وہ زہر خندہ کے بعد بولا "تاہم آدمی سے بڑی چھپکلی اور کہیں نہیں ہے! کیا ہے؟" وہ پھر ہنسنے لگا اور اجمل کی طرف دیکھنے لگا۔ جو کرسی پر اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اجمل نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی بھوری آنکھیں نشے میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، اس کے چہرے کے خطوط، گہرے ہو گئے تھے گویا ابھی ابھی لمبی نیند سے بیدار ہوا ہو۔

توفیق کمرے میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا اب وہ سیٹی بجا رہا تھا، اس نے جھک کر چارپائی پر سے گلی کی تصویر اٹھائی جسے اجمل نے صبح اٹھ کر بنایا تھا۔

"اوہ" اس نے تصویر کو آنکھوں کے سامنے کر کے کہا "اب تم اصل موضوع کی طرف آ گئے ہو!"۔

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "میری جان! تمہارا استعفیٰ منظور ہو گیا ہے!"

"استعفا!" اجمل چونک کر بولا "کس نے دیا ہے استعفیٰ!؟؟" اس نے بڑے استعجاب کے ساتھ چہرہ آگے کر کے پوچھا۔

"کیا تم جاگ رہے ہو!" اس نے اپنی چوکنا کی بحال رکھتے ہوئے کہا "تم نے صبح میرے ہاتھ میں کیا دیا تھا؟"

"وہ تو چھٹی کی درخواست تھی ———!"

توفیق ہنسنے لگا، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور طویل پلکوں کی جھالریں گیلی گھاس کی طرح آپس میں جڑی ہوئی تھیں اور آج ان میں کچھ نیا پن معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں حسن بھی تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ استعفا ہی تھا، میں نے خود پڑھا ہے!"

اجمل سکتے میں آ گیا ذرا دیر کے بعد وہ ہنسنے لگا اور یہ ہنسی کچھ مجنونوں سی تھی۔

"یہ بھی اسی کی حرکت ہے" اس نے کہنا شروع کیا "تاہم اس نقصان میں فائدہ بھی ہے!"

"تم آدھی رات کو کرمانی سے چلا چلا کر کیا پوچھ رہے تھے؟" توفیق نے اچانک سوال کیا اجمل نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی رنگت زرد پڑ گئی۔

"میں بھی اس وقت جاگ رہا تھا ———!" اس نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا "لاؤ ہاتھ!"

اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اجمل اپنی جگہ پہ کھڑا ہو گیا اور اس نے توفیق کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"بس کرو!" لمحہ بھر تک اس کی طرف دیکھنے کے بعد اس نے اس بات کا اضافہ کر دیا "اس سے تو بہتر ہے کہ تم ایک جگہ بیٹھ کے رو لو!"

"رو لوں؟ کیا تم کبھی روتے ہو۔؟؟" اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا "رونے سے کیا ہوتا ہے۔؟؟؟"

وہ تھوڑی دیر کے لئے سنجیدہ ہو گیا اس نے سگریٹ جلایا اور پورا کش لئے بغیر بولا "آج تو میرا من چاہتا ہے کم از کم ایک چھپکلی تو مار دوں!"

وہ پھر ہنسنے لگا اور پھر دیکھا یک خموش ہو گیا کرمانی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونس رکھے تھے، وہ مسکرا رہا تھا اور اس کے چہرے پر بڑے نامانوس سے تاثرات تھے، مسکراہٹ کی وجہ سے اس کا لمبوترا چہرہ بڑا اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔

"کرمانی مسکرا رہا ہے پیارے!" توفیق نے اجمل کو آنکھ ماری اور منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر بولا۔

"جانِ من!" اس نے کرمانی کو مخاطب کر کے کہا "یہ آج خوشی کہاں سے لے آئے ہو ———؟"

"بس چھپا کر لے آئے ہیں ———" کرمانی نے بالکل بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا اور وہ صاف لاپرواہ لوگوں کی نقل کرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا "لیکن

یا اصل نہیں ہے !" اس نے مسخرے پن سے کہا ۔

"ہم نے سوچا اب اصل کا انتظار میں کون بیٹھا رہے ——— !" اس نے کھڑے کھڑے بالوں میں انگلیاں ڈال لیں اور اچانک سنجیدہ ہوگیا تھوڑی دیر کے بعد وہ کرسی پہ بیٹھ گیا اور میز پر انگلیاں بھی نچانے لگا ۔

کمرے میں سناٹا طاری ہوگیا تھا ۔ توفیق چارپائی پہ نیم دراز ہوگیا تھا اور چھت کی طرف چپ چاپ تک رہا تھا ، اجمل دوبارہ اپنی نشست پر جم گیا تھا جہاں وہ دوپہر سے بیٹھا تھا اس کی بھوری آنکھوں سے غمی جھانک رہی تھی ۔

طالب علموں کے کمروں سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی ، شاید وہ ابھی ابھی باہر سے آئے تھے ۔ توفیق جست بھر کے کھڑا ہوگیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا ۔

"کیا آج وقت گذارنے نہیں چلو گے ۔ ؟" اس نے اجمل کے پاس جاکر کہا "گیارہ بجے تک مجھے کوئی مشغلہ نہیں سوجھ رہا ——— " وہ ہنسنے لگا اور اس کی پیشانی کے کنارے پہ ایک نس اُبھر آئی ۔ اجمل نے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا ۔

توفیق پھر کمرے میں ٹہلنے لگا ، چھوٹے کمرے کے پاس جاکر وہ رک گیا اور دیوار کی طرف دیکھنے لگا ۔ "وہ جا رہی ہے ——— چھپکلی شکار کھیلنے جا رہی ہے !!" اُس نے دیوار کی طرف اشارہ کرکے کہا جہاں ایک خوب پلی ہوئی چھپکلی پتنگے کی پشت پر رینگ رہی تھی ۔ "شکار بڑے لوگوں کا مشغلہ سہی تاہم آج ہم بھی ایک چھپکلی کا شکار کھیل کر تفریح کیوں نہ کریں !" اس نے اسٹول اُٹھا لیا اور اُسے ٹانگ سے پکڑ کر چھپکلی کی طرف اچھال دیا ، دیوار پہ ایک زور دار دھماکہ ہوا اور ، وہاں سے اینٹوں تک پلستر کی تمام تہیں اُکھڑ کر فرش پہ آ گریں اس کے ساتھ چھپکلی کی پونچھ بھی تھی جو کافی دیر تک زمین پہ پڑی تڑپتی رہی ۔

"کیا کر رہے ہو ، دیوار گر جائے گی !" کرمانی زندہ دلی کے ساتھ بولا ۔

"پروا نہیں !" توفیق نے قہقہہ لگا کر کہا "معمور ہمارے پاس موجود ہے ہی اور کچھ نہ سہی کم از کم کاغذ پر نئی دیوار بنوا لیں گے ۔ !" وہ ہنسا اور ، کمرے سے باہر نکل گیا ۔

"یہ شخص زندگی سے واقف ہوگیا ہے !" کرمانی کے دانت دکھائی دے رہے تھے اس کے دانت ہموار قطار میں تھے اور بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے اس نے دو مرتبہ سر میں ہاتھ چلایا اور پھر اسے گود میں ڈال کر بولا ۔

"وہ گھونگھٹ کاڑھنے والی لڑکی آج نیچے نہیں آئی " اُس نے اجمل کو مخاطب کرکے کہا "غریب اپنے زخم چھپاتی پھرتی ہے ——— لیکن چہرے کے ، گھاؤ بھی کہیں چھپے ہیں ——— !؟"

وہ دوبارہ سر میں انگلیاں چلانے لگا ۔ اور بتی بجھانے تک اس نے کوئی بات نہیں کی ۔

کمرے میں بڑی کربناک خموشی طاری ہوگئی تھی جیسے کھانسی کی مدھم اور تیز آواز بار بار توڑنے کی ایک کمزور سعی کر رہی تھی ۔

اجمل نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا "اس کی اہمیت اپنی جگہ پہ اب بھی قائم ہے !"

اس نے پیشانی کو انگلیوں میں مسل دیا "گڑیا !" وہ بڑبڑایا اور اس کی پلکیں بھیگ گئیں ۔

توفیق ایک بجے کے قریب کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کرکے چپ چاپ بستر میں گھس گیا اس نے کوٹ اتار کر چارپائی کی طرف انداز سے پھینک دیا اور کپڑے تبدیل کئے بغیر لحاف میں گھس گیا ۔ ٹائی آج بھی اس کے ہاتھ میں تھی اجمل جاگ رہا تھا تاہم انہوں نے آپس میں بات چیت نہیں کی ۔

دو بجے کے قریب اجمل کا لحاف کسی نے کھینچ لیا پھر کسی نے ٹٹول کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ۔

اجمل کی آنکھ کھل گئی دراصل اسے ڈھنگ سے نیند ہی نہیں آئی تھی ۔ اسے اپنے کندھے پہ گیلا پن محسوس ہوا اور ایک عجیب سی بو نتھنوں میں چبھنے لگی ۔

"ذرا اٹھ کر بتی جلا دو !" کرمانی نے دھیمے لہجے میں کہا

اجمل کو دھچکا سا لگا ۔ اس کے دل میں لمحہ بھر کے لئے بلی کی موجودگی کا خوشگوار احساس جاگ اٹھا تھا ۔

اس نے بتی جلا دی اور آنکھیں ملتا ہوا واپس آ گیا ایکا ایکی اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لیا پھر اس کی آنکھیں وحشت اور حیرت سے پھیل گئیں ۔ کئی منٹ تک اس کے منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہو سکا ۔

کرمانی کا پورا سینہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور اس کے تکیئے پر ایک لمبا چاقو جو بالکل نیا معلوم ہو رہا تھا ، کھبا ہوا تھا ۔

"میرا خیال تھا دل یہاں ہے !" اس نے زخم پہ ہاتھ رکھ کر کہا اور مسکرانے لگا "تم جانتے ہو اس معاملے میں ، میں ہمیشہ سے اناڑی ہوں ۔ !"

اجمل نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے ۔

" مہربانی کرکے شور نہ مچا دینا " کرمانی کی آواز نحیف ہوگئی تھی ۔

" یہ سب کیا ہو رہا ہے ! " اجمل سر ہلا کر بولا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں

" رونے کے لئے تمہارے پاس عمر پڑی ہے ——— بیٹھ جاؤ ! "

اجمل اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا خون میں لتھڑا ہوا ہاتھ پکڑ کر بے تحاشہ چومنے لگا ۔

" سگریٹ جلا دو ! مجھے مرنے میں کچھ وقت لگے گا ، یہ دل مجھے آخری وقت میں بھی دغا دے گیا ہے ۔ ! "

اجمل نے سگریٹ جلا کر اس کے لبوں کے ساتھ لگایا پھر وہ اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا

" میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں ! "

" بیکار ہے ! " اس نے چاقو اٹھا لیا اس کی آنکھیں مندنے لگیں اور اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری ۔ جو بمشکل وہاں تک پہنچ رہی تھی ، اس نے چاقو پرے پھینک دیا " میرا کام تمام ہو گیا ہے ! "

اجمل پھر اس کے پاس بیٹھ گیا ۔

" یہ تم نے کیا کر لیا ہے ! " وہ رونے لگا اور اس کی ٹھوڑی پر گوشت جمع ہو گیا اور وہاں کئی چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے ۔

کرمانی مسکرایا ، وہ بڑا مطمئن دکھائی دے رہا تھا ، اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی تاہم تکلیف کا وہاں ہلکا سا شائبہ بھی نہیں تھا ، اس نے سگریٹ کش لگایا ۔ اور سر اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا ۔ اس کی تشکرے جیسی آنکھیں چمک اٹھی تھیں ۔

" میں یہ دیکھنے جا رہا ہوں کہ خدا ہے یا نہیں ! " وہ مشتعل ہو گیا " اگر وہ ہے تو وہاں آسمان پہ بیٹھا کیا کر رہا ہے ۔ ! " اس نے بالوں میں ہاتھ ڈال لیے اور اس کے چہرے پہ رونق آ گئی ۔ وہ اپنی جگہ پہ کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا اس کے قدموں میں توازن نہیں تھا اور وہ نشے میں دھت معلوم ہو رہا تھا دوسرے چکر میں وہ کھڑا ہو گیا ۔

" وہاں میز کی دراز میں میری وصیت پڑی ہے ! " اُس کی آواز ڈوب رہی تھی " میری آنکھیں آنکھوں کے بینک کو دے دینا ! " کرمانی ذرا سا مسکرایا اس نے اپنی تشکرے جیسی آنکھوں کو گھما کر کمرے کو دیکھا اور ہاتھ بالوں کی طرف بڑھا دیا لیکن وہ وہاں تک پہنچ نہیں پایا اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور جڑوں سے اکھڑے ہوئے تناور درخت کی طرح دھم سے فرش پر آن گرا ، اس کی آنکھیں ابھی تک کھلی تھیں اور اُن میں چمک باقی تھی ۔

عظیم مرتضیٰ

○

یہ اور بات ہے کہ مداوائے غم نہ تھا
لیکن ترا خلوص توقع سے کم نہ تھا

کیا کیا فراغتیں تھیں میسر حیات کو
وہ دن بھی تھے کہ تیرے سوا کوئی غم نہ تھا

کچھ ہم گرفتِ گردشِ دوراں میں آ گئے
کچھ دل بھی تیرے عشق میں ثابت قدم نہ تھا

آئے ہیں یاد تجھ سے بچھڑ کر وہ لوگ بھی
جن سے تعلقات بگڑنے کا غم نہ تھا

وہ عہدِ آرزو بھی عجب وقت تھا عظیمؔ
جب دل پہ نقشِ مہر و نشانِ ستم نہ تھا

○

اختر ہوشیار پوری

یہ بستی بستی صحرا صحرا کون مرے ساتھ آیا ہے
شاید کہ یہ کوئی تم سا ہے شاید یہ تمہارا سایا ہے

میں ڈالی ڈالی کیاری کیاری گھوما ہوں تب جا کے کہیں
دل غنچہ کی صورت چٹکا ہے، پھر مہکا، پھر لہرایا ہے

تم اور یہ میرا غم خانہ اے زہرہ جبینو! کچھ تو کہو
حالات یہاں لے آئے ہیں یا خود ہی کرم فرمایا ہے

کچھ یادیں ہیں کچھ سپنے ہیں کچھ نظمیں ہیں، کچھ غزلیں ہیں
رہ جاؤ جو تم کو رہنا ہو اپنا تو یہی سرمایا ہے

تو ہے کہ کوئی شاداب چمن رنگوں کا جہاں خوشبو کا وطن
یہ مشکِ ختن، یہ بوٹے بدن دل آج کہاں لے آیا ہے

میں اُن کے خیالوں میں گم تھا آنکھ اُٹھی تو دنیا سامنے تھی
اک گرم ہوا کے جھونکے نے سوتے سے مجھے چونکایا ہے

یہ آہوئے رم خوردہ زلفیں یہ دیدۂ وحشی آوارہ
اے جانِ طلب تُو کیا جانے کس دل نے تجھے اپنایا ہے

تنہائی کی جلتی دھوپ وہی احساس کے رستے زخم وہی
ہر سایۂ گُل میں اختر نے یوں تو دامن پھیلایا ہے

شہزاد احمد

گھر جلا لیتا ہے خود اپنے ہی انوار سے تو
کاٹ دیتا ہے زمیں سایۂ دیوار سے تو

اس قدر تیز نہ چل سانس اکھڑ جائے گا
طے نہ کر راہِ طلب ایک ہی رفتار سے تو

گوشۂ دل کی خموشی کا تمنائی ہیں
اور ہنگامے اٹھا لایا ہے بازار سے تو

تو ذرا سا بھی اگر فتنہ ہے برپا ہو جا
اپنی قامت نہ بڑھا طرۂ دستار سے تو

آندھیاں اٹھی ہیں وہ دیکھ فلک سرخ ہوا
تودۂ ریگ پہ بیٹھا ہے بڑے پیار سے تو

شب کی تاریکی ہیں میں نے تجھے پہچان لیا
جب ہویدا نہ ہوا صبح کے آثار سے تو

یہ خزاں دیدہ کلی پھول نہیں بن سکتی
پھوڑ لے جلتی ہوئی آنکھ کسی خار سے تو

مدتوں سے تری آنکھوں کے صدف خالی ہیں
اس قدر خوف نہ کھا ابرِ گہر بار سے تو

وہ عنایات کہ دل رحم کے قابل ہو جائے
اس قدر فیض نہ کر اپنے گنہ گار سے تو

تذکرے کرتا ہے تپتے ہوئے صحراؤں کے
دشت کو دیکھتا ہے شہر کی دیوار سے تو

منتظر ہے ترا اک عمر سے جنگل شہزاد
اس قدر دور نہ رہ اپنے طلبگار سے تو

باقر رضوی

○

دل کی بساط پہ شاہ، پیادے کتنی بار اُتارو گے
اس نگری میں سب شاطر ہیں تم ہر بازی ہارو گے

پریم پجاری مندر مندر دل کی کتھا کیوں گاتے ہو
بُت سارے پتھر ہیں پیارے سر پتھر سے مارو گے

دل میں کھینچ کے اس کی صورت آج تو خوش خوش آئے ہو
کل سے اس میں رنگ بھرو گے کل سے نقش ابھارو گے

پیار کی آنکھیں مُند جائیں گی، دل کا دیا بُجھ جائے گا
کب تک لہو جلاؤ گے تم، کب تک کاجل پارو گے

سارا دن تو اس کی گلی میں آتے جاتے گذری ہے
اب بولو، اب رات ہوئی ہے، کیسے رات گذارو گے

پاگل پن ہے گونج کے پیچھے بھاگتے پھرنا چاروں اور
اپنی صدائیں واپس لے لو، یوں کس کس کو پکارو گے

جس کو دانا مان کے تم نے بھیک لگن کی مانگی ہے
اُس نے بھی جو سلام کیا تو دامن کہاں پسارو گے

باقرؔ صاحب مہا کوی ہو، بڑے گُرو کہلاتے ہو
اپنا دُکھ سُکھ بھول گئے تو کس کا حال سنوارو گے

کلی کلی اشکوں کی لڑیاں، پھول پھول پہ کومل گیت
کس کی سیج سجائی باقرؔ، کس کا روپ نکھارو گے

رشیدہ سلیم سیمیں

○

وابستہ اُن کی یاد رہی زندگی کے ساتھ
نسبت رہی مجھے اسی آشفتگی کے ساتھ

محفل سے اُن کی اُٹھ کے چلے آئے ہیں، مگر
ہم جانتے ہیں آئے ہیں کس بے دلی کے ساتھ

جب دل میں آرزو تھی، دعائیں بھی یاد تھیں
اُٹھتے تھے ہاتھ جب مرے کس عاجزی کے ساتھ

ق

اب ترکِ آرزو کی تمنّا پہ کیا کہیں
مانگیں گے اب دعا تو بڑی بے دلی کے ساتھ

اِک وہ کہ بات بات پہ کرتے رہے گِلہ
اِک ہم کہ خاک ہو گئے کس خامشی کے ساتھ

غم کی سیاہ رات بھی روشن ہے کس قدر
اُن کے خیال کی ہے ضیاء تیرگی کے ساتھ

یوں اپنے دل سے آج مخاطب ہوئے ہیں ہم
جیسے کہ مل رہے ہوں کسی اجنبی کے ساتھ

سیمیںؔ جمالِ دوست سے روشن ہیں دو جہاں
کتنے چراغ جلتے ہیں اک دوستی کے ساتھ

شہاب جعفری

دشتِ غربت ہے تو وہ کیوں ہیں خفا ہم سے بہت
ہم دکھی بیٹھے ہیں لگ چل نہ صبا ہم سے بہت

کیا ہے دامن میں بجز گردِ مہ و سالِ امید
کیوں الجھتی ہے زمانے کی ہوا ہم سے بہت

اب ہم اظہارِ الم کرنے لگے ہیں ہم سب سے
اب اٹھائی نہیں جاتی ہے جفا ہم سے بہت

کون موسم ہے کہ پتھر سے لہو رِستا رہے
خوں بہا مانگے ہے اب دل کی صدا ہم سے بہت

دادِ شوریدہ سری پائیے جو سر سے گذر ے
دور بھاگے ہے عبث موجِ بلا ہم سے بہت

کر نو دیں قصۂ دوراں میں ترے غم کا بیاں
پہ لہو مانگے ہے یہ فکرِ رسا ہم سے بہت

رازِ محرومئ جاوید کا کھلنا معلوم
کچھ چھپاتے ہیں یہ اربابِ وفا ہم سے بہت

بے دماغی عبث الزام نہیں ہے ہم پہ
جبہ سائی کو تو یاروں نے کہا ہم سے بہت

چڑھتے سورج کے پجاری وہی نکلے جو شہاب
کرتے تھے تذکرۂ صدق و صفا ہم سے بہت

سلیم طاہر

○

جنوں کی اُلجھنوں میں دِل کو اُلجھاتے رہے ہیں ہم
خرد کی گتھیاں اِک عمر سلجھاتے رہے ہیں ہم

محبّت میں سدا جاں سے گذر جاتے رہے ہیں ہم
اس افسانے کو لاکھوں بار دہراتے رہے ہیں ہم

مجسم آرزوئے شوق بن جاتے رہے ہیں ہم
حدیثِ غم کی شرحیں یوں بھی فرماتے رہے ہیں ہم

اُنہیں کہہ دُور۔ اور گاہے قریں پاتے رہے ہیں ہم
بہرصورت فریبِ آرزو کھاتے رہے ہیں ہم

ہمیں تو کام تھا دے دے کے اپنی ہی وفاؤں سے
یہ اُن سے پوچھئے کیوں اُن کو یاد آتے رہے ہیں ہم

ہم اُن کی جستجو میں بارہا منزل پہ جا پہنچے
مگر ہر بار منزل سے پلٹ آتے رہے ہیں ہم

نہ جانے کیا مقام آیا تھا۔ یہ طاہر محبت میں
کہ خود کو دو جہاں کا رازداں پاتے رہے ہیں ہم

منظر ایوبی

○

مرحلے زیست کے دشوار نہیں دیوانو
ماورائے رسن و دار نہیں دیوانو

کیا کروگے دلِ پُرخوں کی حکایت سُن کر
یہ حدیثِ لب و رُخسار نہیں دیوانو

آج کیوں پند گرِ وقت کی تقریروں میں
لذّتِ شوخیٔ گفتار نہیں ــــ دیوانو

خاکۂ ذہن پہ اُبھرے تو کوئی نقشِ جمیل
بند دروازۂ افکار نہیں دیوانو

کیا کروگے مہ و انجم پہ جما کر نظریں
مہرِ گیتی ہی ضیا بار نہیں دیوانو

پُرسشِ حال میں احساسِ تکلّف کیسا
کوئی سایہ پسِ دیوار نہیں دیوانو

کوئی روشن تو کرے شمعِ شبستانِ خیال
منجمد چشمۂ انوار نہیں دیوانو

محسن احسان

○

دل اس سے پیشتر کبھی اجڑا نگر نہ تھا
ترکِ وفا کا دکھ تھا مگر اس قدر نہ تھا

جانے وہ ایک عمر کٹی تھی کہ ایک پل
دیکھا نظر اُٹھا کے تو وہ بام پر نہ تھا

سنگِ ستم سے چور ہے آئینۂ خیال
پتھراؤ قصرِ دل پہ کبھی اس قدر نہ تھا

تم آ گئے تو دردِ غریبی نے ڈس لیا
ورنہ کچھ اس قدر مرا ویران گھر نہ تھا

اب تو ہر ایک جھونکے سے تھرا رہی ہے لَو
یہ دل کبھی چراغِ سرِ رہگذر نہ تھا

ڈوبا ہے ہر سفینہ سرِ ساحلِ مراد
ایسا بھی پُرخطر کبھی دل کا بھنور نہ تھا

دشتِ طلب کی دھوپ نے جھلسا دیئے بدن
محسنؔ کہیں بھی سایۂ برگِ شجر نہ تھا

مظہر امام

تو نے جس وقت زلف لہرائی میری توبہ پہ بے خودی چھائی
کس مسیحا نے کی مسیحائی موت بھی زندگی نظر آئی
نام کس نے لیا محبّت کا؟ بھولی بسری سی بات یاد آئی
شب کی پلکیں ہیں نیند سے بوجھل غمِ دل لے رہا ہے انگڑائی
ہائے وہ چشمِ التفات آگیں! پربتوں سے بلند ہے رائی
کرنیں سورج کی تنتی جاتی ہیں سحر ہے سحر تیری انگڑائی
ہے تصوّر میں اک خجل پیکر رنگ لائی ہے ناشکیبائی
جب کسی نے وفا کا نام لیا بے ارادہ مجھے ہنسی آئی
موت کی بھی اکھڑ گئی ہے سانس یک بہ یک جانے کس کی یاد آئی
حُسن ناآشنائے رسمِ جنوں عشق کی ہو رہی ہے رسوائی
آپ یونہی رہیں گے محوِ خرام یوں ہی بجتی رہے گی شہنائی
رات کی گنگناتی خاموشی تیری آواز کو بلا لائی

رات کو دن بنائے رکھتی ہے
تیرے وعدوں کی کارفرمائی

مسعود انور شفقی

○

محبت کی راہوں میں منزل بہ منزل چراغ آنسوؤں کے جلاتے رہیں گے
ہماری وفاؤں کی ضَو سے سدا زیست کے راستے جگمگاتے رہیں گے

شبِ غم کی تاریکیوں میں نئے سے نئے انقلابات آتے رہیں گے
مگر ہم تری مانگ میں خوبصورت ستاروں کے موتی سجاتے رہیں گے

اگرچہ یہ راز آج تک ہم نہ سمجھے کہ تیری محبت کا معیار کیا ہے؟
مگر پھر بھی ہم آزمائش کے ہر مرحلے پر سدا مسکراتے رہیں گے

ہمارا مذاقِ سفر زندگی کے کسی حادثے سے بھی خائف نہ ہوگا
سدا آندھیوں کے جلو میں ہمارے جنوں کے دیے جھلملاتے رہیں گے

جو بیتے گی ہم اپنے دل پر سہیں گے تمھارے ستم راز بن کر رہیں گے
جہاں تک بھی ہوگا یہ طوفان دل میں سمندر کی صورت چھپاتے رہیں گے

اگرچہ غمِ زندگی کی کشاکش میں بھولے ہوئے ہیں زمانے کو انور
مگر جب بھی فرصت ملے گی ہمیں دوستوں کے ستم یاد آتے رہیں گے

رفعت سلطان

○

اس بُت کے یاد کر کے، ستم جاگتے رہے
دُنیا تمام سو گئی، ہم جاگتے رہے

کیا جانے کس کے مصحفِ رُخ کے خیال میں
صُبحِ ابد تک اہلِ قلم جاگتے رہے

اتنی طویل تھی غمِ فرقت کی داستاں
دو دل تمام رات بہم جاگتے رہے

ایسی بھی تیرے ہجر میں گذری ہے شب کہ جب
خوشیوں کو نیند آگئی، غم جاگتے رہے

وابستگانِ دیر و حرم سو گئے، مگر
وارفتگانِ کوئے صنم جاگتے رہے

اہلِ جہاں کو نیند سرِ شام آگئی
لیکن کسی خیال سے ہم جاگتے رہے

میخانۂ حیات میں نیند آئی ہے کسے
رفعتؔ یہاں تو قیصر و جم جاگتے رہے

میرزا ادیب

شیشے کی دیوار

(تمثیل — ایک باب میں)

افرادِ تمثیل:

رشیدی
فیضی
پرویز
خواجہ ذی القدر
ایک لڑکی
اور خادم

پہلا منظر

ایک عام اور مختصر کمرہ

سامان بہت معمولی۔ سامنے کارنس پر وسط میں ایک نروانی مجسمہ — دونوں جانب کتابوں کے انبار کچھ کاغذات۔ ایک ٹائم پیس، ایک صراحی۔ ایک آئل پینٹنگ۔ (لینڈ سکیپ) اور ایک بوسیدہ فلیٹ ہیٹ۔

کارنس کے نیچے ایک میز۔ میز کے اوپر — ایک گوشے میں ایک غیر مکمل مجسمہ۔ چند کتابیں۔ کچھ کاپیاں۔ چائے کے دو کپ، شیشے کا ایک گلاس۔ سگرٹ کے پیکٹ۔ پنسلیں۔ قلم۔ قلمدان۔ ایش ٹرے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بغیر کسی ترتیب کے پڑی ہوئی۔ میز کے نیچے چوکھٹوں اور بغیر چوکھٹوں کے تصویروں کا ایک ڈھیر۔ ان تصویروں کے علاوہ چائے کے برتن۔ ایک گندی کیتلی اور ایک سٹوو۔

میز کی دائیں جانب، کچھ دور ایک ایزل۔ کینوس پر لینڈ سکیپ جو بظاہر مکمل ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایزل کے پاس ایک سٹول سٹول کے اوپر شیشے کے دو گلاس — گلاسوں پر جا بجا رنگوں کے دھبے۔ ان گلاسوں کے ساتھ رنگوں کا ایک ڈبہ۔ دو پیالیاں اور کچھ برش۔ قریب ہی ایک پرانا صوفہ۔ صوفے پر ایک تکیہ پڑا ہوا۔ تکیے کے علاوہ کچھ میلے کپڑے۔ کچھ کتابیں۔ کچھ اخبارات۔ صوفے کے پاس ایک ہینگر جس سے ایک سیاہ رنگ کی اچکن لٹکی ہوئی۔

اسی دیوار میں آنے جانے کے لئے دروازہ — دروازے پر ایک میلا کچیلا پردہ۔ رنگ کسی زمانے میں سفید ہوگا میز کی بائیں جانب ایک کھڑکی — دونوں پٹ کھلے ہوئے — کھڑکی سے کچھ فاصلے پر ایک اور دروازہ جو دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ اس دروازے پر نسبتاً صاف پردہ پڑا ہوا۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے ۔ رُشدی کھڑکی کے پاس کھڑا نیچے بازار کی رونق دیکھ رہا ہے ۔ رُشدی ادھیڑ عمر کا آدمی ہے ۔ لمبا تڑنگا ۔ پاس کھادی کا لمبا کرتہ ۔ واسکٹ اور شلوار ۔ آنکھوں پر عینک ۔

رُشدی ، مجسمہ ساز ہے ۔

رُشدی کے علاوہ کمرے میں فیضی بھی ہے ۔ فیضی رُشدی سے چھوٹا ہے ۔ پتلون اور قمیص پہنے ہوئے قمیص کے اوپر پوئٹر رنگ کھلتا ہوا ۔ درمیانہ قد ۔ وہ کمرے کے درمیان والی کرسی میں بیٹھا بیڑی پی رہا ہے اور اپنی تصویر پر غور سے دیکھ رہا ہے ۔ جیسے جائزہ لے رہا ہو ۔ فیضی مصور ہے ۔

رُشدی کھڑکی سے نگاہ ہٹا کر آنے جانے والے دروازے کو دیکھتا ہے ۔ فیضی کی نظر اس پر پڑتی ہے تو وہ بھی دروازے کو دیکھنے لگتا ہے ۔ فیضی دو تین لمحوں کے بعد اٹھتا ہے ۔ کارنس کے سامنے جاتا ہے ۔ ٹائم پیس پر نظر ڈالتا ہے ۔ ٹائم پیس میں دو بج رہے ہیں ۔ ـــ پھر رُشدی کی طرف جاتا ہے اور ادھ جلی بیڑی کھڑکی سے نیچے پھینک دیتا ہے ۔

رُشدی پھر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے ۔ ا

فیضی : نہیں آیا ابھی تک !

(رُشدی کوئی جواب نہیں دیتا ۔)

کوئی افتاد نہ پڑ گئی ہو !

رُشدی : (بدستور باہر دیکھتے ہوئے) ہو سکتا ہے ۔

فیضی : ہو سکتا ہے ؟ ـــ کیا مطلب ؟

رُشدی : ہو سکتا ہے ناشر نے ٹال دیا ہو !

فیضی : پر اُسے آ تو جانا چاہیئے تھا نا ـــ کہیں لڑ نہ پڑا ہو ۔ تیز طبیعت کا آدمی ہے ۔

رُشدی : یہ بھی ہو سکتا ہے ۔

(دو تین لمحوں کی خاموشی ۔ رُشدی کھڑکی سے نظر ہٹا کر فیضی کو دیکھتا ہے ۔)

وقت کیا ہوا ہے ؟

فیضی : دو بج گئے ہیں ـــ نو بجے گھر سے نکلا تھا ۔

رُشدی : ضرور کوئی بات ہوئی ہے ۔

فیضی : لیکن ناشر نے تو پہلی قسط ادا کرنے کا ہی وعدہ کیا تھا ۔ اور پرویز کتاب مکمل کر کے اسے دے چکا ہے ۔

رُشدی : کیسی باتیں کر رہے ہو فیضی ! کیا بیگم ارشد نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ مکمل ہوتے ہی اپنا سیچو خرید لے گی ـــ اور سیچو مکمل ہو کر کارنس پر پڑا ہے ۔ محترمہ تشریف ہی نہیں لائیں ابھی تک ـــ اور (رُشدی میز کے نیچے تصویروں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتا ہے) ان میں سے کتنی تصویریں خانصاحب نے تم سے بنوائی تھیں ـــ کتنی رکھی ہیں انہوں نے اور کتنی واپس کر دی ہیں ـــ یہ چکر تو بھی اسی طرح چلتا رہا ہے اور آگے بھی چلتا رہے گا ۔

فیضی : درست ہی کہتے ہو ! ـــ غلط بات کیا ہے اس میں ! ـــ وعدے تو بس یونہی کیے جاتے ہیں ـــ دوسروں کو ٹالنے کی خاطر

(فیضی میز کے نیچے بیٹھ کر چند تصویریں اٹھاتا ہے اور دروازے کی طرف چلنے لگتا ہے۔ رشدی اسے چپ چاپ دیکھتا رہتا ہے۔ پھر یک لخت اس کے سامنے جاکر اس کا راستہ روک لیتا ہے)

رشدی : یہ نہیں ہوگا فیضی!

فیضی : مگر کیوں؟

رشدی : ان شاہکاروں کی جگہ کباڑیے کی دکان ہرگز نہیں! (فیضی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) رکھ دو انہیں۔

فیضی : تم بھوکے ہو، میں بھی بھوکا ہوں اور جب ہمارا تیسرا ساتھی آئے گا تو وہ بھی بھوکا ہی ہوگا ——— اس کے سوا اور کیا چارہ ہے ——— تصویروں کا کیا ہے اور بن جائیں گی۔ معمولی بات ہے رشدی! ——— بالکل معمولی بات! (فیضی اس کا ہاتھ ہٹاتا ہے)

رشدی : اسے آ تو لینے دو۔ ضرور کوئی نہ کوئی بندوبست کرکے آئے گا ——— فکر کیوں کرتے ہو! ——— پریشانی کی کیا بات ہے آخر۔

فیضی : بندوبست ہو چکا ہوتا تو اتنی دیر باہر نہ رہتا۔

رشدی : خیر تم تصویریں رکھ دو۔

(رشدی اس سے تصویریں لے لیتا ہے اور جاکر میز کے اوپر رکھ دیتا ہے۔ فیضی کارنس سے گلاس اٹھاتا ہے اور بائیں دروازے کی طرف رخ کرتا ہے ——)

فیضی : (فیضی رک جاتا ہے) خالی پیٹ پانی تو نہ پیو ——— ذرا ٹھہر جاؤ ——— شاید ——— (کچھ یاد کرتے ہوئے) ذرا ٹھہر جاؤ۔

فیضی : کیا ہے؟

رشدی : میرے تکیے کے نیچے ——— میرا خیال ہے ضرور ہوں گے۔

فیضی : کیا؟

رشدی : تھوڑے سے بسکٹ۔ ہونا تو چاہئیں۔

(رشدی بائیں دروازے سے نکل جاتا ہے۔ فیضی ایک لمحے کے لئے گلاس دیکھتا ہے اور پھر اسے تھامے ہوئے بائیں دروازے کی طرف جانا چاہتا ہے کہ دائیں دروازے کا پردہ ہٹا کر پرویز آتا ہے
پرویز ان دونوں سے چھوٹا ہے۔ لباس پاجامہ، کرتا اور چادر ——— چادر معمولی ہے فیضی اسے دیکھ کر رک جاتا ہے ——— گلاس میز پر رکھ دیتا ہے۔
پرویز قدم اٹھاتا ہے مگر لڑکھڑانے لگتا ہے۔ سنبھلتا ہے اور پھر قدم اٹھاتا ہے۔ فیضی اس کی طرف بڑھتا ہے)

فیضی : تم ———

پرویز : مجھے یوں کیوں دیکھ رہے ہو جیسے کوئی جرم کرکے آیا ہوں ——— میں نے کچھ نہیں کیا ——— پروردگار کی قسم ——— میں نے (پرویز زور سے ہاتھ ہلاتا ہے تو لڑکھڑا جاتا ہے۔ فیضی جلدی سے اسے سنبھال لیتا ہے) یہ ساری ——— مجید اور جلیل کی شرارت ہے ——— میں نے سچ مچ کچھ نہیں کیا ——— یہ سارا کیا کرایا ان لوگوں کا ہے۔ مجید اور جلیل کا ——— بہت واہیات آدمی

ہیں — بڑے ... اوہ — مجھے یوں دیکھے جا رہے ہو، جیسے مجرم وہ نہیں — میں — صرف میں ہوں — فیضی!

(فیضی کچھ نہیں کہتا۔ رشدی بائیں دروازے پر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ ہے دو لمحے دروازے پر ٹھہر کر منظر دیکھتا ہے پھر آگے قدم اٹھانے لگتا ہے۔ پرویز اسے دیکھتا ہے)

میں فیضی سے کہہ رہا ہوں — میں نے کچھ نہیں کیا — یہ سارا کیا کرایا ان لوگوں کا ہے — مجید اور جلیل کا۔ بڑے پاجی اور بدمعاش ہیں — دونوں کے دونوں۔

رشدی: تم ناشر کے یہاں گئے تھے؟

پرویز: گیا تھا — ضرور گیا تھا — رقم بھی مل گئی تھی۔

رشدی: تو یہاں آنے کی بجائے تم —

پرویز: (لڑکھڑاتے ہوئے ہاتھ سے اسے آگے کچھ کہنے سے روک دیتا ہے) میں کہیں نہیں گیا — کہیں بھی نہیں گیا — گھر آ رہا تھا — وہ مل گئے — دونوں۔ کہنے لگے، ذرا چائے پی لو — ہمارے ہاں چل کر۔ میں نے کہا "ہرگز نہیں — بالکل نہیں — تم اچھے آدمی نہیں ہو، دور ہو جاؤ — دفع ہو جاؤ۔ مجھے گھر جانے دو — مت روکو مجھے — تمہاری چائے نہیں چاہئے۔

رشدی: پھر بھی تم ان کے گھر چلے گئے۔

پرویز: پتہ نہیں کیسے لے گئے مجھے۔ میں بار بار اٹھتا تھا اور وہ روک دیتے تھے۔ خبیث انسان — اور پھر — پھر — نہ جانے کیا ہوا — میں کچھ نہیں جانتا — بالکل کچھ نہیں جانتا — پروردگار کی قسم سچ کہہ رہا ہوں — میں کچھ نہیں جانتا۔

رشدی: میں جانتا ہوں کیا ہوا تھا

پرویز: میں کہتا ہوں — مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے — پتہ نہیں کیا ہو گیا — خبر نہیں — خبر نہیں یہ کیا طلسمات ہے — سب کچھ یوں ہوا جیسے — بس ہو ہی گیا — بس — ہو ہی گیا — ایک دم (رشدی اور فیضی دونوں پرویز کو گھور کر دیکھ رہے ہیں) تم مجھے مجرم سمجھ رہے ہو نا! — مجرم — خود غرض — خود پرست — ہیں نا (پرویز اثبات میں سر ہلاتا ہے) ٹھیک ہی تو ہے — میں بہت برا ساتھی ہوں — میں خود غرض ہوں! میں ایک ذلیل آدمی ہوں — میں (رشدی سے پیٹ کر) میں واقعی ایک نہایت ذلیل انسان ہوں — مجھے سزا دو — مجھے پیٹو — مجھے خوب خوب ذلیل کرو! — (روتے ہوئے) اتنا ذلیل کرو — جتنا — کر سکتے ہو —

رشدی: جاؤ اندر جا کر لیٹ جاؤ۔

پرویز: اب کے معاف کر دو — پھر کبھی پیوں تو تمہارا ہی لہو پیوں — کہے دیتا ہوں!

رشدی: ہمارا لہو تم پر حلال ہے۔

پرویز: نہیں — میں — میں (شدت تاثر میں کچھ نہیں کہہ سکتا) اوہ تم

رشدی: خیر، تم نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ کوئی بات نہیں پرویز! جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ چلو آرام کرو۔

(پرویز الگ ہو کر آنسو بھری آنکھوں سے اسے چپ چاپ دیکھتا رہتا ہے۔ دو تین لمحے گزر جاتے ہیں، پھر یک لخت لڑکھڑاتے قدموں کے باوجود تیزی سے انگن کی طرف بڑھتا ہے — اسے جلدی سے اتار لیتا ہے اور دائیں

دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگتا ہے۔
فیضی اس کے سامنے آجاتا ہے۔)

فیضی : اچکن مجھے دو!

پرویز : مجھے — جانے دو فیضی!

فیضی : نہیں!

پرویز : جانے دو فیضی — جانے دو!

فیضی : تم نہیں جا سکتے —

پرویز : میں جاؤں گا (فیضی اس کا ہاتھ پکڑتا ہے تو وہ پوری قوت سے ہاتھ چھڑانے لگتا ہے) چھوڑ دو — فیضی! چھوڑ دو — میں کہتا ہوں مجھے چھوڑ دو — چھوڑ دو۔

(رشدی ابھی تک وہیں کھڑا ہے اور یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ ایک قدم آگے اٹھاتا ہے اور پھر رک جاتا ہے)

رشدی : چھوڑ دو فیضی!

(فیضی مڑ کر رشدی کی جانب دیکھتا ہے۔ پرویز موقع پا کر دروازے میں سے نکل جاتا ہے۔ فیضی دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

فضول ہے فیضی۔ وہ نہیں لوٹے گا۔ (فیضی رک جاتا ہے — رشدی کی طرف آتا ہے)

فیضی : اس کے پاس صرف یہی تو ایک اچکن ہے — رشدی!

(رشدی اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ دروازے کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

ابھی روکا جا سکتا ہے اسے!

رشدی : تم اب تک اسے سمجھے نہیں — نہیں لوٹے گا — لاکھ روکو اسے (لفافے کو دیکھتا ہے جو اس کے بائیں ہاتھ میں ہے) لے لو نا!

فیضی : میری طرح کیا تم بھوکے نہیں ہو؟

رشدی : مجھے زیادہ بھوک نہیں ہے۔

فیضی : اور مجھے بہت زیادہ ہے — بچہ ہوں نا (فیضی بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ رشدی بھی مسکراتا ہے۔) بچہ سمجھتے ہو نا مجھے — کیوں رشدی میاں۔

(فیضی ایزل کے پاس جاتا ہے۔ تصویر کو غور سے دیکھتا ہے برش اٹھاتا ہے)

ہو جائے گا کام ختم — تھوڑی ہی دیر میں

(رشدی میز والے مجسمے کی طرف بڑھتا ہے اور اسے دیکھنے لگتا ہے۔ دروازے کی طرف سے
کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے۔ لگتا ہے باہر کوئی شخص اپنی چھڑی دروازے پر مار رہا ہے۔
رشدی اور فیضی آواز نہیں سنتے۔
اب ذرا زور سے کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔ فیضی دروازے پر نظر ڈالتا ہے اور دہیں برش ہاتھ میں لئے کہتا ہے:

کون صاحب ہیں ؟

دروازے کا پردہ ہٹا کر خواجہ ذی القدر آتے ہیں ۔

ایک بڑی پروقار شخصیت ، نہایت اعلیٰ سوٹ میں ملبوس ۔ ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی ۔ مگر سنہری

— چہرے پر مسکراہٹ جو عموماً ہر وقت رہتی ہے ۔

خواجہ صاحب : کیا میں اندر آسکتا ہوں ؟

فیضی : تشریف لائیں ۔

(رشدی بھی خواجہ صاحب کو دیکھنے لگا ہے ۔ خواجہ صاحب مسکراتے ہوئے اندر آتے ہیں)

رشدی : آیئے ۔

خواجہ صاحب : (فیضی سے) آپ مصور ہیں !

فیضی : جی ہاں — ارشاد ۔

خواجہ صاحب : مجسمہ ساز شاید (رشدی کی طرف دیکھتے ہوئے) آپ ہیں !

رشدی : جی ہاں !

خواجہ صاحب : آپ کے ایک اور ساتھی بھی تو ہیں !

(رشدی ادھر آنے لگا ہے)

فیضی : وہ —

رشدی : ذرا باہر گیا ہے ۔

خواجہ صاحب : وہ شاعر ہیں غالباً ۔

رشدی : یقیناً !

خواجہ صاحب : خوب ، خوب !

(خواجہ صاحب چھڑی کرسی کے ساتھ لگا کر پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک خوبصورت سگرٹ کیس اور لائٹر نکالتے ہیں ۔ سگرٹ کیس کھول کر پہلے فیضی کی جانب بڑھاتے ہیں — فیضی ایک سگرٹ لے لیتا ہے جب سگرٹ کیس رشدی کی طرف بڑھتا ہے تو وہ شکریہ کہہ کر معذرت پیش کرتا ہے ۔ خواجہ صاحب لائٹر سے پہلے فیضی کا اور پھر اپنا سگرٹ سلگاتے ہیں اور ماحول کا جائزہ لینے لگتے ہیں ۔ فیضی اور رشدی غور سے انہیں دیکھ رہے ہیں ۔ تین چار لمحے گزر جاتے ہیں ۔)

معاف کیجئے ! آپ لوگ کام میں مصروف تھے — بے جا مداخلت پر معافی کا خواستگار ہوں ۔

رشدی : شرمندہ نہ کیجئے ۔ ہماری جھونپڑی کا دروازہ تو ہر وقت ہر شخص کے لئے کھلا ہے ۔

خواجہ صاحب : مہربانی کا شکریہ !

فیضی : (کرسی آگے بڑھاتے ہوئے) تشریف رکھئے — کس سے کام ہے آپ کو —

خواجہ صاحب : (مسکرا کر فیضی کو اور پھر رشدی کو دیکھتے ہوئے) آپ تینوں سے!

فیضی : تینوں سے!

خواجہ صاحب : جی ہاں!

فیضی : بہت بہتر — تشریف تو رکھئے!

خواجہ صاحب : شکریہ۔ بہت بہت (خواجہ صاحب بدستور ماحول کا جائزہ لے رہے ہیں اور سگرٹ کے کش لگا رہے ہیں) معاف کیجئے! میں نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں — آپ نے شاید پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا!

(فیضی رشدی کو دیکھتا ہے کہ وہ جواب دے۔ مگر وہ غالباً اس بات کا منتظر ہے کہ فیضی ہی اس کا جواب دے دے گا — خواجہ صاحب مسکراتے ہیں)۔

میری صرف ایک ہی خصوصیت ہے اور وہی مجھے کشاں کشاں یہاں لے آئی ہے — میں فنکاروں کا بہ دل و جان عقیدت مند ہوں! — نام ہے خواجہ ذی القدر —

فیضی : خوب!

(پرویز ہاتھوں میں چند لفافے اٹھائے در وازے پر آتا ہے — اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔ خواجہ صاحب مڑ کر دیکھتے ہیں)

خواجہ صاحب : آیئے پرویز صاحب!

(پرویز اندر آتا ہے۔ چال میں تو ذرا لڑکھڑاہٹ اب بھی ہے۔ لفافے کرسی کے اوپر رکھ دیتا ہے۔ خواجہ صاحب پرویز کی طرف جا کر مجسّمے کو دیکھتے ہیں)

ونڈرفل — اے مرکل — (خواجہ صاحب لوٹتے ہیں — پرویز کو مخاطب کرتے ہیں) آپ کی نہایت خوبصورت اور بلند پایہ نظموں نے مجھے بار ہا بہت متاثر کیا ہے — آپ تینوں بہت بڑے فنکار ہیں — حقیقتاً بہت بڑے۔ دنیا کا ہر ملک آپ پر ناز کر سکتا ہے۔ کرۂ ارض پر بسنے والی ہر قوم آپ تینوں کے وجود کو اپنی قومی عظمت سمجھ سکتی ہے، مگر —

(خواجہ صاحب خاموش ہو جاتے ہیں — ادھ جلے سگرٹ کو پھینک کر اسے بوٹ سے مسل دیتے ہیں۔ جیب سے پھر لائٹر اور سگرٹ کیس نکالتے ہیں — سگرٹ کیس پرویز کی طرف بڑھاتے ہیں۔ پرویز ایک سگرٹ لے لیتا ہے۔ خواجہ صاحب دونوں سگرٹ سلگاتے ہیں — تینوں فنکار بڑے غور سے خواجہ صاحب کو دیکھ رہے ہیں۔ خواجہ صاحب چند لمحے خاموش رہتے ہیں)

مگر یہ کیا ظلم نہیں کہ اتنے بڑے فنکار ایسی خراب خستہ حالت میں زندگی بسر کریں — یہ جگہ جہاں آپ رہتے ہیں ایک جانور کے لئے بھی مناسب نہیں چہ جائے کہ ملک کے عظیم فنکار یہاں رہیں۔ یہ چیز بڑی شرم ناک ہے — نفرت انگیز ہے — ناقابلِ برداشت ہے (خواجہ صاحب خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں زمین پر جمی ہیں) آپ کا قلم — آپ کا برش — آپ کی انگلیاں، ملک کے ماتھے پر عظمت و جلال کے سنہری نقش ثبت کر رہی ہیں — اور آپ ہیں کہ اس غار میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ اس غار میں جہاں فاقہ جنم لیتا ہے — جہاں بیماریوں کے جراثیم پلتے ہیں — اور جہاں خوشی اور خوشحالی کی کوئی کرن بھی نہیں آسکتی! آپ کی تخلیقات لوگوں کو زندگی کی روشنی اور زندگی کی حرارت دیتی ہیں۔ لیکن آپ رات دن غموں اور دکھوں کے

کھنڈر میں پڑے بھی رہے ہیں! (تینوں کے چہروں کو یکے بعد دیگرے دیکھتے ہیں) یہ ظلم ہے، نا انصافی ہے — فن کے ساتھ دشمنی ہے۔

(خواجہ صاحب ٹہلنے لگتے ہیں — تینوں ٹکٹکی باندھ کر انہیں دیکھ رہے ہیں۔ خواجہ صاحب واپس آتے ہیں)

مگر یہ ظلم، نا انصافی اور فن دشمنی کا دور ختم ہو گیا ہے اور آج —— (خواجہ صاحب دو تین لمحوں کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں) میں آپ کو ایک بہت بڑی خوش خبری سنانے آیا ہوں —— ایک ایسی خوش خبری جس کا آپ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے!

(خواجہ صاحب مسکرا مسکرا کر تینوں کو دیکھنے لگتے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

جب دوسرے منظر کا پردہ اٹھتا ہے تو سٹیج ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں تبدیل ہو چکی ہے۔

فرش پر قالین — قالین کے اوپر ایک ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے نہایت شاندار اور قیمتی صوفہ سٹ، تپائیاں اور کرسیاں۔ ایک طرف ایک بڑی میز۔ میز کے اوپر طرح طرح کے پھلوں سے بھرے ہوئے طشت، مشروبات کی رنگارنگ بوتلیں۔ میز کے سامنے ایک اعلیٰ درجے کا ایزل۔ پاس ایک چھوٹی سی خوبصورت میز کے اوپر رنگوں کے ڈبے۔ چھوٹی چھوٹی خوشنما پیالیاں، برش — کمرے کے وسط میں گردش کرنے والی مجلد کتابوں سے بھری ہوئی بک شیلف، دائیں جانب لکھنے پڑھنے کے لئے ایک میز، میز پر اعلیٰ اور گراں قیمت سٹیشنری —— دیواروں پر قالین، رنگین تصویریں۔ چھت سے بہت خوبصورت فانوس لٹکتا ہوا۔ دو دروازے۔ ایک دائیں جانب، جو خواب گاہ میں کھلتا ہے۔ دروازے پر پیازی رنگ کا ایک منقش پردہ۔

دوسرا دروازہ بائیں دیوار میں اس پر بھی ایسا ہی پردہ۔

سامنے کی دیوار میں — بائیں جانب ایک کھڑکی۔ دونوں پٹ بند۔

پردہ اٹھنے کے بعد سٹیج پر کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ چند لمحوں کے بعد بائیں جانب کے دروازے کا پردہ حرکت کرتا ہے۔ سب سے پہلے خواجہ صاحب کمرے میں آتے ہیں۔ ہاتھ میں بدستور چھڑی، ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا، چہرہ متبسم۔

خواجہ صاحب کمرے کے وسط میں جا کر ٹھہر کر مڑتے ہیں جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ فیضی، رشدی اور پرویز اسی ترتیب کے ساتھ اندر آتے ہیں۔

اب وہ بوسیدہ لباس میں ملبوس نہیں ہیں۔ رشدی کے جسم پر ایک بڑھیا شیروانی سجی ہے۔ فیضی عمدہ سوٹ میں ملبوس ہے۔ پرویز نے ایک بیش قیمت شال اوڑھ رکھی ہے۔

خواجہ صاحب : تو حضرات! یہ رہا آپ کا خاص کمرہ۔ کہئے کچھ پسند آیا؟

فیضی : بہت اچھا، نہایت عمدہ!

خواجہ صاحب : فن کار کے لئے ایسا کمرہ ہی تو ہونا چاہئے جہاں وہ تخلیقی کام کر سکے۔ آپ کا کیا خیال ہے رشدی صاحب؟

رشدی : بالکل درست فرمایا آپ نے۔

خواجہ صاحب : یہاں آپ بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔

(ذرا دیر کے لئے خاموشی۔ اس دوران خواجہ صاحب مسکراتے رہتے ہیں اور تینوں فن کار ادھر ادھر دیکھتے رہتے ہیں)

میں نے سوچا تھا آپ کو کسی قسم کی بھی کمی محسوس نہیں ہونی چاہئے۔ اب خبر نہیں آپ کیا محسوس کرتے ہیں!

رشدی: کمی کیا ہوگی خواجہ صاحب۔

خواجہ صاحب: کیوں پرویز صاحب! — آپ نے (تو کمروں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے) دیکھی وہ چیزیں ہا —

پرویز: جی ہاں —

فیضی: خواجہ صاحب! ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہم اپنی جنت میں آگئے ہیں۔

خواجہ صاحب: اپنی طرف سے تو یہی کوشش کی ہے کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ آرام مل سکے، تاکہ آپ پوری دل جمعی کے ساتھ تخلیقی شاہکار پیش کرتے رہیں۔ جہاں ہر وقت بے اطمینانی کا دور دورہ ہو وہاں کوئی فنکار بھی دلی اطمینان کے ساتھ کام نہیں کرسکتا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔

رشدی: ۔ خواجہ صاحب یہ آپ کا حسنِ خیال ہے۔

(فیضی ایزل کے پاس جاکر بڑی تعریفی نظروں سے اسے دیکھتا ہے)

فیضی: خوب۔ بہت خوب!

خواجہ صاحب: دیکھئے کوئی کمی رہ گئی ہو تو بتا دیجئے۔

رشدی: کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خواجہ صاحب: مگر میں نے محسوس کی ہے۔

(تینوں خواجہ صاحب کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتے ہیں)

میں فن کار ہرگز نہیں۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ فن کار کے سامنے ایک ایسی شے بھی ہونی چاہئے جو اسے تخلیقی کام کی ترغیب دیتی رہے۔ یعنی (INSPIRE) کرتی رہے۔ (INSPIRATION) بہت ضروری ہے۔ غالباً آپ مجھ سے متفق ہوں گے۔

(تینوں خاموش رہتے ہیں)

میں نے ایک ایسی چیز کا بھی اہتمام کردیا ہے جو آپ کے دلوں میں تخلیقی جذبہ ابھارتی رہے گی۔ بشرطیکہ آپ فن کار جو ٹھہرے۔

(خواجہ صاحب بائیں دروازے کی طرف جاکر سگرٹ پردے کے پیچھے پھینک دیتے ہیں۔

لائٹر سے نیا سگرٹ سلگاتے ہیں۔ مسکرا کر تینوں کو دیکھتے ہیں)

آپ نے اپنی اس نئی دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ اور شاید کچھ متاثر بھی ہوئے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس چیز کے بغیر یہ سب کچھ غیر مکمل ہے — غیر مکمل — ادھورا اور تشنۂ تکمیل! — آپ یقیناً چاہتے ہیں کہ میں بڑی جلدی وہ چیز آپ کو دکھادوں۔

یہی چاہتے ہیں نا آپ!

رشدی: چاہتے تو یہی ہیں۔

خواجہ صاحب: وہ چیز لازماً آپ کے لئے ہے۔ اور بہت قریب ہے۔

فیضی: بہت قریب!

خواجہ صاحب:۔ جی ہاں ـــــ دیکھئے اگر قوسِ قزح کی رنگینیاں، چاند کی شفاف کرنیں اور سورج کی تیز روشنی کو ایک مادی شکل دے دی جائے۔ اور جو ہر وقت آپ کے سامنے رہے۔ تو آپ کے تصورات جگمگا نہیں اٹھیں گے۔ آپ کے خیالوں میں قوسِ قزح کی رنگینی، چاند کی شفافیت اور سورج کی حیات افروز حرارت نہیں آ جائے گی۔ کیا آپ محسوس نہیں کریں گے۔ کہ آپ خوابوں کے حسین وجمیل جزیرے میں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں افق تا افق رنگ ہی رنگ، روشنی ہی روشنی، نور ہی نور ہے۔ آپ نے خوبصورت سے خوبصورت مجسمے تراشے ہیں حسین سے حسین تصویریں بنائی ہیں۔ کومل سے کومل گیت لکھے ہیں۔ مگر اس شے سے متاثر ہو کر یقیناً آپ کے فن میں اور گہرائی اور بلندی اور رنگینی پیدا ہو جائے گی۔

(خواجہ صاحب۔ خاموش ہو جاتے ہیں۔ سگرٹ کے کش لے کر تینوں کو دیکھنے لگتے ہیں جیسے ان کی بے تابی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں)

میں نے کہا ہے نا وہ شے آپ کے بہت قریب ہے۔ یہ دیکھئے!

(خواجہ صاحب کھڑکی کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ تینوں ادھر جانے لگتے ہیں۔ جب تینوں قریب آ جاتے ہیں تو خواجہ صاحب کھڑکی کے پٹ کھول دیتے ہیں۔

رنگا رنگ روشنیوں کا ایک سیلاب کھڑکی میں سے باہر نکلتا ہے۔

خواجہ صاحب مڑ کر فنکاروں کو دیکھتے ہیں۔ جو حیرت کے عالم میں رنگوں کے اس سیلاب کو دیکھ رہے ہیں ـــــ اور پردہ گرتا ہے۔

تیسرا منظر

(وہی کمرہ جو اس سے پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ کمرے میں رشدی اور فیضی موجود ہیں۔ پرویز نظر نہیں آتا۔ دونوں کھڑکی کے پاس کھڑے ہیں۔ رنگین روشنیاں بکھری ہوئی ہیں۔ کئی لمحے گزر جاتے ہیں اور وہ خاموش رہتے ہیں۔

پرویز آتا ہے۔ ان کی طرف بڑھتا ہے)

پرویز:۔ ایک عجیب بات دیکھی نہیں میں نے۔

(رشدی اور فیضی اس کی بات ان سنی کر دیتے ہیں)

عجیب ہی بات فیضی۔ پروردگار کی قسم

(فیضی پرویز کی طرف رخ نہیں کرتا بدستور کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

فیضی:۔ کیا؟

پرویز:۔ میں چاروں طرف گھوم آیا ہوں۔ یہ رنگین شیشوں کی دیوار پورے محل کے اردگرد کھڑی ہے۔ اور ایک جیسی بلند ہے۔ چاروں طرف ـــــ چاروں طرف

فیضی:۔ پھر؟

پرویز :۔ ہم تو سمجھتے تھے یہ شیشے صرف کھڑکی ہی کے سامنے ہیں۔ مگر یہ تو ایک بلند دیوار کی صورت میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

فیضی :۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔

پرویز :۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

فیضی :۔ کس کا؟

پرویز :۔ یہ دیوار چاروں طرف کیوں کھڑی ہے۔ یہ کیا معمّہ ہے۔ یہ کیا راز ہے۔ اور سنو وہ آہنی دروازے جس سے ہم اندر آئے تھے۔ مقفل ہے

فیضی :۔ تم صبح سے گھوم ہی رہے ہو!

پرویز :۔ کمروں میں نہیں، کمروں کے باہر۔

رشدی :۔ اتنے پریشان کیوں ہو پرویز!

پرویز :۔ میں پوچھتا ہوں اس کا مطلب کیا ہے آخر؟

فیضی :۔ پوچھتے ہو اس کا مطلب کیا ہے؟

پرویز :۔ ہاں۔ تمہیں معلوم ہے ہم رات کو یہاں آئے تھے۔ دروازے میں داخل ہوتے وقت میں نے سمجھا تھا یہ روشنیاں جگمگا رہی ہیں مگر اب۔

رشدی :۔ فضول الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ حقیقت کو حقیقت سمجھنے کی کوشش کرو۔ سوچو ہماری حالت کیا تھی اور آج کیا ہے۔ دنیا کی کونسی نعمت ہے جو ہمیں میسر نہیں۔ بتاؤ تم نے ایسا شاندار فرنیچر کبھی سپنے میں بھی دیکھا ہے۔ کبھی تمہارے دل میں بھی یہ بات آسکتی تھی۔ کہ یک لخت ایک جھونپڑی سے نکل کر ایک شاندار محل میں پہنچ جاؤ گے۔ یہاں آکر بھی بے اطمینانی۔ خبر نہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے پرویز!

فیضی :۔ (رشدی سے) یہ شخص بڑا جذباتی ہے،

رشدی :۔ نہیں خطرناک حد تک وہمی۔

پرویز :۔ بات کو الجھا رہے ہو تم۔ میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ یہ چاروں طرف پھیلی ہوئی دیوار کیوں ہے!

فیضی :۔ کیا یہ پتھر کی دیوار ہے۔ لوہے کی ہے یا اینٹوں کی؟

پرویز :۔ دیوار بہرحال دیوار ہے۔ پتھر کی ہو، جواہرات کی یا شیشے کی۔

فیضی :۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟

پرویز :۔ حرج کیا ہے! ۔ تم نہیں سمجھ سکتے فیضی! ۔ یہ آخر کیا ہے! ۔ ہم یہاں اور چاروں طرف اونچی دیوار۔ مجھے کچھ بتاؤ تو ۔ تمہاری سمجھ میں کیا بات آتی ہے۔

فیضی :۔ صرف یہ بات ۔ (سر ہلاتے ہوئے) کہ تم پاگل ہو

رشدی :۔ (پرویز کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے) زیادہ پاگل مت بنو۔ یہ پاگل پن تمہیں لے ڈوبے گا!

پرویز :۔ رشدی! تم نہیں سمجھتے۔ میرے ذہن میں ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا ہے۔ حیرت ہے تم کیوں نہیں یہ بات سوچتے کہ آخر اس دیوار کا مطلب کیا ہے!

رشدی :۔ اضطراب کی بات کرتے ہو بھئی۔ جس کے مقدر ہی میں اضطراب ہو وہ کیسے اس سے نجات پا سکتا ہے۔ یہ لے!

(رشدی میز کے پاس جاتا ہے۔ بوتل سے تھوڑی سی شراب پیگ میں ڈالتا ہے اور پی لیتا ہے۔

(فیضی کو دیکھتا ہے۔ جیسے پوچھ رہا ہو ــــ "تم بھی شوق کرو گے" فیضی اثبات میں سر ہلا دیتا ہے
رشدی دوبارہ پیگ میں تھوڑی سی شراب ڈالتا ہے اور کھڑکی کی طرف آتا ہے پیگ فیضی کی طرف
بڑھا دیتا ہے۔ فیضی پیگ پرویز کی طرف لے جاتا ہے)

فیضی: - چند گھونٹ! فقط

پرویز: - تم جانتے ہو میں قسم کھا چکا ہوں۔

فیضی: - کیا کہتے ہو۔ قسم کھا چکا ہوں ارے۔ میاں اس دنیا کی باتیں تو وہیں ختم ہو گئیں۔ یہ نئی دنیا ہے۔ نئی دنیا کی نئی باتیں (جام بڑھاتے ہوئے) پی لو جانِ من!
نہیں پیو گے ظالم! ــــ بدقسمت ہو ویسے کے ویسے (پرویز اس کا جام والا ہاتھ پرے کر دیتا ہے)

رشدی: - بے چارا ایک الجھن میں گرفتار ہے۔ تم یا میں اس کی حالت نہیں سمجھ سکتے!

فیضی: - غالباً یہ خود بھی نہیں سمجھ سکتا!

(فیضی پیگ اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا ہے۔ خالی کر کے اسے صوفے پر پھینک دیتا ہے)

رشدی: - (آواز میں کھنک) پرویز تم بدنصیب ہو! ــــ وہ منظر تم نے دیکھا ہی نہیں ہو (اپنی انگلی چہرے کے قریب لے جا کر) یہ آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ صبح آنکھ کھلی
تو سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ دھندلکوں میں یہ روشنیاں یوں نظر آتی تھیں۔ جیسے سمندر کی سطح پر کئی رنگا رنگ ہیروں کی کشتیاں بہہ رہی ہوں۔

فیضی: - میں نے رات کے وقت ان روشنیوں کو دیکھا تھا۔ میری آنکھوں میں نیند آ رہی تھی۔ مگر میں یہاں تنہا کھڑا تھا۔ یوں معلوم ہوا کہ چاند کی شفاف کرنیں
قوسِ قزح کے گہواروں میں جھول رہی ہیں ــــ یا ایک ندی ہے کہ ہزار رنگ پھولوں کو گود میں لئے فراز سے نشیب کی طرف آ رہی ہے۔ میں دم بخود ہو گیا
ساری رات یوں ہی گزر گئی۔

رشدی: - پرویز! تم ایک مرتبہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر دیکھو تو سہی۔ بخدا ایسے انتہا INSPIRE ہو جاؤ گے!

پرویز: - تمہارا خیال ہے میں اس منظر سے محظوظ نہیں ہوا؟ -

رشدی: - شاید!

پرویز: - میں اس دیوار کے ساتھ ساتھ گھومتا رہا ہوں! ــــ دیر تک گھومتا رہا ہوں!

رشدی: - تم سچ مچ بد ذوق ہو پرویز! ــــ بد ذوق۔ اول درجے کے بد ذوق!

(رشدی دوبارہ میز کے پاس جاتا ہے۔ پیگ میں شراب ڈالتا ہے اس سے پیشتر
کہ وہ پیگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگائے فیضی بھی وہاں آ جاتا ہے۔ وہ پیگ لے لیتا ہے ــــ
رشدی نیا پیگ بھرتا ہے۔ دونوں بڑی جلدی پیگ خالی کر دیتے ہیں)

فیضی: - رشدی سچ کہتا ہے تم بد ذوق ہو ــــ اول درجے کے بد ذوق۔

(فیضی زور سے قہقہہ لگاتا ہے۔ رشدی لڑکھڑاتے قدموں سے پرویز کی طرف جاتا ہے)

رشدی: - کہتا ہے۔ دیوار! کیسی دیوار؟ ــــ کہاں ہے دیوار؟ بے وقوف ہو تم۔

فیضی: - اول درجے کا بے وقوف ہے۔

(رفیقی ایک اور پیگ پیتا ہے۔)

اور کیا رشدی!

(قہقہہ لگاتا ہے)

کیا بے وقوف نہیں ہے؟

رشدی:- ہے اور بالکل ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک۔۔

فیضی:- نہیں - پاؤں سے لے کر سر تک۔

رشدی:- بے وقوف! (قہقہہ لگاتا ہے) بدقسمت

(رشدی پرویز کی طرف جھکتا ہے)

اس پرانی دنیا میں کیا تھا ہمارے لئے۔ بھوک ننگ اور محنت۔ صرف محنت۔ رات دن محنت

پرویز:- مگر وہاں چاروں طرف کوئی دیوار تو نہیں تھی۔

رشدی:- دیوار؟ — پھر دیوار؟

پرویز:- تو یہ اور کیا ہے؟

رشدی:- یہ روشنیوں کا سرچشمہ ہے۔ کیوں فیضی! میں درست کہتا ہوں نا!

(فیضی ابھی تک وہیں کھڑا ہے)

فیضی:- مجھے معلوم نہیں تم نے کیا کہا ہے - مگر بہت ٹھیک کہا ہے۔ بالکل ٹھیک فرمایا ہے۔

(فیضی پھر پیگ بھرنے لگتا ہے۔ پرویز تیزی سے اس کے پاس جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے پیگ لے لیتا ہے)

پرویز:- ہوش کرو فیضی!

فیضی:- جب بھوکے تھے تو بھوکے تھے - اور اب سب کچھ مل گیا ہے تو تم - تم؟ پتہ نہیں کیا ہو تم! — کیا ہو تم پرویز!

رشدی:- یہ صرف ایک الجھن ہے - ایک معمہ ہے۔ ایک راز ہے۔

فیضی:- بالکل درست فرمایا تم نے! صحیح ارشاد فرمایا حضور نے!

پرویز:- میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی جلدی آپے سے باہر ہو جاؤ گے!

رشدی:- کون باہر ہوا ہے - ہم تو اندر ہی ہیں۔ اور اندر ہی رہیں گے۔ یہاں سے ہرگز ہرگز - ہرگز باہر نہیں جائیں گے! — وہ دنیا تو ایک جہنم تھی - دوزخ - خارزار ایک ویرانہ۔ وہاں کون جائے گا۔ کوئی نہیں جائے گا - بالکل کوئی نہیں جائے گا۔ کبھی نہیں جائے گا! کبھی نہیں جائے گا۔ بس کہہ دیا ہے۔

(خواجہ صاحب آتے ہیں)

اوہ خواجہ صاحب! - خواجہ صاحب قبلہ! اس کی بات مت سنئے! یہ بے وقوف ہے۔ کہتا ہے یہ چاروں طرف دیواریں ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ روشنیوں کا سرچشمہ ہے - رنگا رنگ روشنیوں کا سرچشمہ ہے۔

(خواجہ صاحب اور پرویز ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)

خواجہ صاحب:۔ کیوں پرویز صاحب

پرویز:۔ یہ درست کر رہا ہے۔ آخر یہ دیوار کیوں ہے!

خواجہ صاحب:۔ (کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے) آپ نے ان روشنیوں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے تو سنا ہے ایک سچا فن کار زندگی بھر روشنی کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور یہاں تو رنگین روشنیوں کا سیلاب بہ رہا ہے۔

پرویز:۔ خواجہ صاحب، فن کار جس روشنی کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ کسی شیشے کی دیوار کی روشنی نہیں ہوتی! — وہ زندگی کی روشنی ہوتی ہے۔

خواجہ صاحب:۔ (بڑی نرمی سے) پرویز صاحب! اس طرز فکر کی ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ یک لخت ایک نئے ماحول میں آگئے ہیں جو آپ کیلئے اجنبی ہے

پرویز:۔ مجھے یہ ماحول پسند نہیں ہے۔

خواجہ صاحب:۔ دیکھئے آپ نے زندگی کا سفر تاریک اور نیم تاریک راہوں پر ہی طے کیا ہے اور اب ایک دم روشنیوں کے ہجوم میں آگئے ہیں۔ آنکھیں چندھیا گئی ہیں — مگر یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے — آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

(خواجہ صاحب پرویز کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنا چہرہ ذرا اس کے قریب لے جاتے ہیں)

گھبرانے یا پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔

فیضی:۔ در اصل۔ ابھی اس نے (بتوں کی طرف اشارہ کرکے) ادھر توجہ نہیں کی۔

خواجہ صاحب:۔ کیوں؟

رشدی:۔ قسم کھا چکے ہیں۔ اور ہم کہہ رہے ہیں ادھر کی باتیں ادھر ہی ختم ہو گئیں!

خواجہ صاحب:۔ ہونا تو یہی چاہیئے۔

رشدی:۔ ہو جائے گا؟

پرویز:۔ (غصے سے) کیا ہو جائے گا!

خواجہ صاحب:۔ (مسکرا کر) وہی ہوگا جو ہونا چاہیے۔

(خواجہ صاحب پرویز کے کندھے سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ چھڑی کو ہوا میں لہراتے ہیں جیسے کچھ سوچ رہے ہیں۔ پھر رشدی سے مخاطب ہوتے ہیں)

آپ یہاں بالکل مطمئن ہیں۔

رشدی:۔ بالکل۔

خواجہ صاحب:۔ واپس جانا چاہتے ہیں۔

رشدی اور فیضی:۔ (ایک ساتھ) ہرگز نہیں!

(خواجہ ٹہلنے لگتے ہیں۔ اور اب جو کچھ کہیں گے اسی حالت میں کہیں گے)

خواجہ صاحب:۔ یہ دنیا روز بروز زیادہ خوبصورت، زیادہ رنگین ہوتی جائے گی۔ چند روز بعد (کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے) بے شمار خوشنما اور خوش رنگ

شیشوں کا اضافہ ہو جاتے گا۔ اس وقت یہاں اور ہی سماں ہوگا۔ کیسا سماں ہوگا۔ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کیا رنگوں کی جنت کا آپ تصور کر سکتے ہیں؟ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ قوسِ قزح بلندیوں سے نیچے اتر آئے اور آپ کے پاؤں کو چھونے لگے۔ کیا آپ دنیا کے حسین ترین خواب کو مادی شکل میں دیکھ سکتے ہیں؟ ؟ ۔ مگر آپ دیکھیں گے۔

پرویز :۔ قیمت کیا ہوگی اس کی۔

خواجہ صاحب :۔ قیمت کیسی! (خواجہ صاحب یہاں ہیں دہیں رک جاتے ہیں)

پرویز :۔ جو ہم ادا کریں گے۔

خواجہ صاحب :۔ کوئی قیمت نہیں۔ قیمت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے!

پرویز :۔ قیمت کے بہت سے پہلو اور بہت سی صورتیں ہیں۔

خواجہ صاحب :۔ مثلاً

پرویز :۔ مثلاً ہماری ذہنی آزادی۔

خواجہ صاحب :۔ (پرویز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر) آپ قدر افزائی کو کیا کہتے ہیں؟

پرویز :۔ کیا یہ قدر افزائی ذہنی آزادی کے بدلے میں ہوگی؟

خواجہ صاحب :۔ ہمارا صرف ایک ہی مطالبہ ہے۔ بہت معمولی۔ آپ کو یہ سمجھ لینا ہوگا کہ شیشے کی اس دیوار کے اس طرف اندھیروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے

پرویز :۔ یعنی ہمیں بیرونی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا!

خواجہ صاحب :۔ آپ کیا کہتے ہیں۔ جب یہ دنیا آپ کو ہر طرح مطمئن کر سکتی ہے۔ تو اُس دنیا کی ضرورت ہی کیا ہوگی۔ آخر اس دنیا نے آپ کو دیا ہی کیا تھا؟
کیا ہم درست کہہ رہے ہیں رشدی صاحب!

(رشدی کی طرف نہیں دیکھتے۔ پرویز ہی کو دیکھتے رہتے ہیں)

رشدی :۔ بالکل درست!

پرویز :۔ ہمیں یہ شرط ایک لمحے کے لئے بھی منظور نہیں!

خواجہ صاحب :۔ ہمیں کا لفظ مت استعمال کیجئے!

پرویز :۔ چلئے ہمیں کی بجائے مجھے سمجھ لیجئے۔

(خواجہ صاحب سگریٹ جلاتے ہیں۔ چپ چاپ اس کے دو کش لیتے ہیں)

خواجہ صاحب :۔ یہ وہم صرف آپ کو ہوا ہے۔ آپ کے ساتھیوں کو نہیں۔ جو آپ ہی طرح فنکار ہیں۔ اگر بڑے نہیں تو برابر کے ضرور ہیں۔

پرویز :۔ میں جانتا ہوں۔ مجھ سے بڑے فن کار ہیں۔

خواجہ صاحب :۔ پھر بھی تم اس طرح سوچتے ہو۔

پرویز :۔ ہاں

خواجہ صاحب :۔ بہتر۔ ضرور سوچو۔

(خواجہ صاحب بڑی تیزی کے ساتھ دروازے میں سے نکل جاتے ہیں)

پرویز :۔ سن لیا تم نے ۔ کیا کہنا چاہتے ہو اب

رشدی :۔ ہم تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہیں۔

پرویز :۔ تو، تم یہیں رہو گے!

فیضی :۔ اور کیا؟

پرویز :۔ یہاں رہ کر کیا کرو گے۔

فیضی :۔ جو پہلے کرتے تھے۔

پرویز :۔ زندگی تو اس دیوار کے اس طرف ہے۔ تمہارے فن کا تعلق کس شئے سے ہوگا ۔ کس چیز کے بارے میں سوچو گے ۔ ان دیواروں کے بارے یہ بہت کے متعلق ' ان رنگین شیشوں کے بارے ہیں؟ ؟ یہ بے جان چیزیں تم کو کونسی حرارت کونسا ولولہ دیں گی ۔ سوچو کیا کھو رہے ہو۔ اور کیا پا رہے

فیضی :۔ ہم واپس نہیں جائیں گے!

(پرویز فیضی کو گھورتا ہے)

خواجہ صاحب :۔ (غصے سے) فیضی!

رشدی :۔ فیضی نے صحیح کیا ہے ۔

(پرویز خاموش رہتا ہے)

فیضی :۔ ہمارا یہ اٹل فیصلہ ہے۔

پرویز :۔ (ملامت سے) ایک بار پھر سوچ لو ۔ مگر تم سوچو گے کیا شراب نے ــــ

فیضی :۔ شراب نے ۔ ہم پر کوئی اثر نہیں ڈالا ۔ کیوں رشدی!

رشدی :۔ نہیں ایسا نشہ نہیں ہوتا کہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھیں!

پرویز :۔ (ملامت سے) ہم فن کار ہیں ، زندگی کے ساتھ قدم ملا کر چلنے والے ۔ ہماری دنیا تو انہی سڑکوں بازاروں اور گلیوں میں آباد ہے ۔ جہاں ہم مسکراہٹوں اور چاہتوں کے پھول چنا کرتے تھے ۔ جہاں ہم دکھی انسانوں کے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے تھے ۔ جہاں زندگی دکھوں اور سکھوں کی ساری پونجی ہمارے آگے ڈھیر کر دیتی تھی ۔ یہ دنیا ماں کی طرح ہاتھ پھیلائے ہماری راہ دیکھ رہی ہے ۔ کیا تم اپنی دنیا میں لوٹو گے نہیں ۔ سوچو کیا ہم اپنے وطن میں رہ کر بھی جلاوطن نہیں ہو گئے؟

(پرویز ان کے چہروں کو یکے بعد دیگرے دیکھتا ہے ۔ دونوں خاموش ہیں۔ پرویز کھڑکی کے پٹ بند کر دیتا ہے)

یہ محض فریب ہے ۔ دھوکے کا ایک جال ہے ۔ اور کچھ نہیں!

(دروازے سے پھر ایک خادم آتا ہے)

خادم :۔ فیضی اور رشدی کو آقا نے بلایا ہے ۔

(فیضی اور رشدی دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں)

میں کیا پوچھ رہا ہوں ۔ رشدی!

پرویز ان کی طرف بھاگ کر جاتا ہے)

فیضی! مجھے بتاؤ تو۔

(دونوں کچھ کہے بغیر دروازے میں سے نکل جاتے ہیں ۔ پرویز دو تین لمحے وہاں کھڑا رہتا ہے ۔ پھر واپس آنے لگتا ہے ۔ شال اتار کر صوفے کی طرف پھینک دیتا ہے ۔ کرسی میں بیٹھتا ہے ۔ پھر اٹھ بیٹھتا ہے ۔ کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگرٹ نکالتا ہے ۔ میز کے پاس جا کر لائٹر اٹھاتا ہے ۔ سگرٹ سلگاتا ہے ۔ اور ایزل کے سامنے جا کر کینوس پر کھنچی ہوئی چند لکیروں کو دیکھتا ہے ۔ پھر سر پکڑ کر بائیں طرف بچھی ہوئی ایک کرسی میں بیٹھ جاتا ہے ۔ نگاہیں نیچے قالین پر جمی ہیں ۔

کھڑکی کے دونوں پٹ جو بند ہیں ۔ آہستہ آہستہ کھلتے ہیں ۔ اب وہاں ایک نہایت خوبصورت لڑکی کھڑی ہے ۔ ایک سرخ رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ۔ بارڈر سنہری ۔ بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہونٹ ۔ ایک عجیب پر اسرار سی مسکراہٹ لئے ہوئے ۔ باہر سے ہلکی ہلکی موسیقی آ رہی ہے ۔

لڑکی وہاں کھڑی رہتی ہے ۔ پرویز کی نگاہ اس پر ابھی تک نہیں پڑی ۔ وہ بدستور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے اپنی سوچ میں گم ہے

لڑکی آگے آتی ہے ۔ اسکے پاؤں کے گھنگھرو بجتے ہیں ۔

پرویز پھر بھی نہیں چونکتا ۔ لڑکی پھر قدم اٹھاتی ہے ۔ ایک پاؤں عمداً قالین پر مارتی ہے گھنگھرو کی جھنکار پر پرویز چونکتا ہے ۔ بے اختیار دروازے کی طرف دیکھتا ہے ۔ وہاں سے نظر ہٹتی ہے تو لڑکی پر پڑتی ہے ۔

لڑکی وہیں کھڑی رہتی ہے ۔ نظریں جھکا لیتی ہیں ۔

پرویز یوں سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو ۔ میں تمہاری آمد کا مطلب سمجھ گیا ہوں لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ جاتی ہے) ۔

لڑکی :۔ میں آداب عرض کر سکتی ہوں ۔

پرویز :۔ کون ہو تم!

لڑکی :۔ ایک لڑکی ۔

پرویز :۔ اور کسی کا آخری حربہ بن کر یہاں آئی ہو ۔

لڑکی :۔ میں حربہ نہیں ہوں

پرویز :۔ تو کیا ہو؟

لڑکی :۔ زرنگار — جی ہاں ۔ یہی میرا نام ہے ۔

پرویز :۔ (کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے) ادھر بے جان چمکتی دمکتی دیوار ۔ اور یہاں ایک زندہ خوبصورت دیوار ۔ خوب

(پرویز اٹھ بیٹھتا ہے ۔)

اپنے آقا سے کہہ دو جاکر ۔ کوئی اور ہتھیار استعمال کرے ۔ ۔ ۔ یہ ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا !

(لڑکی خاموش وہیں کھڑی رہتی ہے)

کھڑی کیوں ہو !

لڑکی :۔ میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکی

پرویز :۔ آئی کیا کرنے ہو ۔

لڑکی :۔ میں اسی محل میں رہتی ہوں ۔ سنا تھا یہاں بہت بڑے فن کار آئے ہیں مجھے فنکاروں سے ملنے کا بہت شوق ہے ۔

پرویز :۔ بڑے فن کار تو تمہارے آقا کے پاس ہیں اس وقت ۔ وہیں جاکر ملو اُن سے

لڑکی :۔ اور آپ —

پرویز :۔ میں — میں بہت ہی معمولی اور ادنیٰ فنکار ہوں ۔

لڑکی :۔ آپ تو — آپ ہیں !

(ایک دم مسکراتی ہوئی مگر شرمیلی نظریں اوپر اٹھاتی ہے)

— بہت بڑے شاعر ۔

پرویز :۔ کون کہتا ہے ؟

لڑکی :۔ جی میں !

پرویز :۔ تم کہتی ہو — تم جو اپنے آقا کی ترکش کا شاید آخری تیر ہو ۔ جاؤ لوٹ جاؤ ۔

(لڑکی وہیں کھڑی رہتی ہے)

سُنا نہیں تم نے ! جاؤ لوٹ جاؤ ! — میں کہہ رہا ہوں جاؤ ۔

لڑکی :۔ آپ کو بہت بُری لگتی ہوں — تو — تو

(لڑکی آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگتی ہے ۔ کچھ دور جاکر رک جاتی ہوں)

پرویز :۔ ٹھہر کیوں گئی ہو ؟

لڑکی :۔ میرا خیال تھا فنکار کسی کا دل نہیں توڑا کرتے بڑے نرم دل ہوتے ہیں — شاید میں ہی بدقسمت ہوں !

(لڑکی کی آنکھیں نم آلود ہو گئی ہیں — وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے)

اچھا — اپنی آمد پر — معافی مانگتی ہوں ۔ بہت شرمندہ ہوں میں — بہت شرمندہ

(ایک اور قدم اٹھاتی ہے — پرویز اسے دیکھتا رہتا ہے ۔ بہت آہستہ آہستہ چل کر لڑکی کھڑکی

میں پہنچ گئی ہے — ایک بار مڑ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھیں صاف کرتی ہے۔
ادب سے سر جھکا کر آداب عرض کرتی ہے۔ پرویز اس کی طرف قدم بڑھاتا ہے —
لڑکی ابھی سر جھکائے کھڑی ہے۔
پرویز وہاں پہنچ جاتا ہے۔)

پرویز :۔ تم —

(لڑکی شرمیلی متبسم نظریں اٹھاتی ہے)

— کیا چاہتی ہو تم ؟

لڑکی :۔ ایک گیت — صرف ایک گیت — بس — اور کچھ نہیں — اپنا ایک گیت سُنا دیجئے۔ سنا دیجئے نا — پھر میں چلی جاؤں گی :

(پرویز بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور پردہ گرتا ہے۔)

چوتھا منظر

وہی کمرہ
کھڑکی کے دونوں پٹ بند۔ کمرے میں روشنی۔ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وقت کیا ہے۔
پردہ اٹھتا ہے تو پرویز بوتلوں والی میز کے پاس کرسی میں مدہوش پڑا ہے۔ لڑکی اس کے کھڑی ہے۔
پرویز لڑکی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔

لڑکی :۔ اور ایک —— ؟

پرویز :۔ ہاں — ایک اور ——

(لڑکی پیگ اس کی طرف بڑھاتی ہے)

صرف ایک اور — مگر نہیں — بالکل نہیں — ایک گھونٹ بھی نہیں۔ ایک قطرہ بھی نہیں !

(لڑکی پیگ اور آگے بڑھا دیتی ہے)

میں کہتا ہوں — بالکل نہیں — اب میں ہرگز ہرگز — ہرگز نہیں پیوں گا — ہٹا لو اسے — میں کہتا ہوں ہٹا لو — میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا — ہٹا لو !

(لڑکی مسکرا کر پیگ اس کے ہونٹوں سے لگا دیتی ہے۔ پرویز غٹاغٹ پی جاتا ہے۔ لڑکی زور سے قہقہہ لگاتی ہے پیگ جو خالی ہو چکا ہے میز پہ رکھ دیتی ہے)

تم ہنستی کیوں ہو ؟

لڑکی :۔ کب ہنستی ہوں ؟

(لڑکی زور سے ہنستی ہے)

پرویز :۔ تم ہنستی ہو — قہقہے لگاتی ہو! — سمجھتی ہو میں مدہوش ہوا جا رہا ہوں — پاگل ہوا جا رہا ہوں ۔ اور تم اس مدہوشی اور پاگل پن سے خوب لطف اٹھا رہی ہو۔

لڑکی :۔ نہیں تو — میں تو — آپ کا حکم بجا لا رہی ہوں — آپ کتنے ہیں تو —

پرویز :۔ تم — (لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر) — کون ہو تم ؟

(پرویز کرسی سے اٹھ بیٹھتا ہے)

لڑکی : پتہ نہیں —

پرویز :۔ ہاں پتہ نہیں تم کون ہو — ایک سایہ — ایک پرچھائیں ۔ ایک دھندلکا یا چاند کی کوئی بھولی بھٹکی کرن ۔ کہاں سے آئی ہو — شاید افق کے اس پار سے ۔ کسی غیر آباد جزیرے سے — کسی دور دراز وادی سے ۔ مجھے تباہ کرنے کے لئے — میری عقل و خرد لوٹنے کے لئے ۔ (ہاتھ زور سے دبا کر) یہی ہے مقصد تمہارا —

لڑکی :۔ (ذرا سی چیخ کر) نہیں — میں ایک غریب لڑکی ہوں ۔

پرویز :۔ ایک غریب لڑکی — (غور سے دیکھتے ہوئے) تم ایک غریب لڑکی ہو — تمہارا ہاتھ اتنا سرد کیوں ہے ۔ جیسے برف کی ایک ڈلی ہو ۔

لڑکی :۔ (سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ کر) ہاں میں برف ہی کی ڈلی ہوں ۔

پرویز :۔ تم ضرور کسی پہاڑ کی بلندی سے اتری ہو — برف کے ہزاروں تودوں سے گذر کر یہاں آئی ہو ۔ یوں کیوں دیکھ رہی ہو میری طرف — ڈر تو نہیں گیا ۔

لڑکی :۔ میں واپس چلی جاؤں گی ۔

پرویز :۔ کیوں — یہ جگہ تمہیں پسند نہیں آئی ۔

لڑکی :۔ نہیں ۔

پرویز : ٹھیک ہی تو ہے ۔ تم اس دنیا کی مخلوق نہیں ہو ۔ اس لئے تمہاری آواز بڑی پر اسرار معلوم ہوتی ہے ۔ جیسے دور افق کے دامن سے بلند ہو رہی ہو — یا ابابیل کی چیخ ہو ۔ جو ایک دم فضا میں گم ہو جائے ۔ پتہ نہیں تم کب آئی تھیں ۔ کیسے آئی تھیں ۔ اور کیا ہوا تھا ۔ کیا ہوا تھا ؟ —

لڑکی :۔ آپ بھول گئے سب کچھ ؟

پرویز :۔ مجھے یاد نہیں — میں یہاں تنہا کھڑا تھا یہ بوتلیں مجھ سے ہزاروں میل دور تھیں — لاکھوں میل دور تھیں — تم خاموشی سے آئیں ۔ جیسے ہوا کے جھونکے سے ایک پھول شاخ سے ٹوٹ کر گھاس پر گر پڑے — تم آئیں تو یہ بوتلیں بھی — آگئیں — لاکھوں میلوں کا فیصلہ کا فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا — پھر میں ان میں اور یہ مجھ میں سما گئیں اور تم مسکراتی رہیں — ہنستی رہیں ۔

(زور سے لڑکی کا ہاتھ دباتا ہے)

مگر تم نے ایک بڑا خوفناک کھیل کھیلا ہے ۔

لڑکی :۔ خدا کے لئے — اوہ — میں مر جاؤں گی

پرویز :۔ چیختی کیوں ہو — تم نے تو کہا تھا میں برف کی ڈلی ہیں — برف کی ڈلی کو بھی درد محسوس ہوتا ہے ؟ کیا —

لڑکی :۔ آپ چاہتے ہیں میں خاموشی سے پگھل جاؤں ؟

پرویز :- نہیں — میں یہ نہیں چاہتا — اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم چیخو۔ چلاؤ — شور مچاؤ

(پرویز اس کا ہاتھ اپنی طرف کھینچتا ہے ۔)

لڑکی :- خدارا — بس — بڑے ظالم ہو۔ کیسے فن کار ہو تم۔

(پرویز اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے جیسے چونک پڑا ہے)

پرویز :- میں ظالم ہوں درست کہا ہے تم نے

لڑکی :- نہیں آپ — بہت اچھے ہیں

پرویز :- میں ظالم ہوں — میں نے ظلم کیا ہے - اپنے فن پر اپنے ضمیر پر۔ اُن گیتوں پر جنہیں میں نے لکھا ہے - آج میری بے حسی بے دردی بیان کی آنکھوں میں لہو بھر آیا ہے۔ وہ مضطرب ہیں - بے چین ہیں اور میں — میں — خود کو ان بوتلوں میں غرق کر رہا ہوں۔

(غصّے میں ہاتھ مار کر کئی بوتلیں نیچے گرا دیتا ہے - لڑکی سہم کر پیچھے ہٹ جاتی ہے)

اور وہ خبیث دیوار میرا مذاق اڑا رہی ہے - مجھ پر ہنس رہی ہے - میری کمزوری پر قہقہے لگا رہی ہے -

(جلدی سے جاکر زور سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھولتا ہے پھر زور سے بند کر دیتا ہے اور واپس آتا ہے)

تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو - اب کیا چاہتی ہو۔ کیا چاہتی ہو۔

(لڑکی سہمے ہوئے انداز میں خاموش کھڑی رہتی ہے)

جاؤ - چلی جاؤ —

(لڑکی کی طرف بڑھتا ہے - لڑکی دروازے کے پاس پہنچ جاتی ہے - پرویز آگے بڑھتا ہے تو ایک بوتل سے ٹھوکر کھاتا ہے - بوتل اٹھا لیتا ہے - بوتل کو پرے پھینکنا چاہتا ہے - مگر جیسے ہی اس کی نظر سرخ سرخ شراب پر پڑتی ہے۔ اس کا ہاتھ وہیں رک جاتا ہے - اور وہ اسے ہونٹوں کی طرف لانے لگتا ہے ۔ لڑکی دروازے میں سے نکل جاتی ہے — اور پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر

یہ منظر کچھ مدت کے بعد رونما ہو رہا ہے ۔

کمرہ وہی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب یہاں ایزل نہیں ہے ۔ ایزل کی بجائے ایک میز ہے جس پر شراب کی بوتلیں پڑی ہیں ۔

بڑی میز کے اوپر بھی شراب سے بھری ہوئی بوتلیں پڑی ہیں ۔

رشدی ، فیضی اور پرویز - تینوں بڑی میز کے پاس کھڑے ہیں - رشدی اور فیضی کے ہاتھوں میں پیگ ہیں اور پرویز کے ہاتھ میں بوتل ہے جس سے وہ کچھ حصہ پی چکا ہے ۔

پرویز :- ہم نے اپنی روح کو بیچ دیا ہے ۔

فیضی :۔ بند کرو اپنی بکواس۔

(فیضی اپنے پیگ کے کچھ گھونٹ پیتا ہے)

پرویز :۔ ہم نے — ہم تین فنکاروں نے اپنی روح کو بیچ دیا ہے — ہماری روح ہمارا فن تھی — وہ مقدس چیز تھی جسے آنسو اور لہو دے دے کر ہم نے پالا تھا — وہ چیز ختم ہو گئی — بک گئی — پامال ہو گئی

فیضی :۔ تم خاموش رہو گے یا نہیں!

رشدی (بے نیازی سے ہاتھ ہلا کر) بکنے دو!

پرویز :۔ کہتا ہے بکنے دو — گویا میں بکواس کر رہا ہوں۔

رشدی :۔ نہیں۔ ہرگز نہیں — تم بکواس نہیں کر رہے۔ فقط بک رہے ہو! — بک رہے ہو

(رشدی اور فیضی زور سے قہقہہ لگاتے ہیں)

پرویز :۔ اور اڑاؤ مذاق — اور ذلیل کرو — میں اسی قابل ہوں!

رشدی :۔ یہ نہ کہو دوست! میں تمہارا احترام کرتا ہوں!

فیضی :۔ احترام کا مطلب سمجھتے ہو نا!

(فیضی پیگ خالی کر کے اسے دوبارہ بھرنے لگتا ہے)

پرویز :۔ (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں میں نہیں سمجھتا! (سر کو بوتل سے چھوتے ہوئے) یہاں ایک چراغ روشن تھا وہ آندھی کے جھونکوں سے بجھ گیا۔ اب یہاں گہرے اور غلیظ دھوئیں کے بادل گرج رہے ہیں — ان بادلوں کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔ یہ زہر میری رگ رگ میں ٹپکتا رہتا ہے

(دو تین لمحے خاموش رہتا ہے)

مگر تم نہیں سمجھو گے ان باتوں کو — تم عقل مند ہو اور میں پاگل — پاگل (زور سے قہقہہ لگا کر) بالکل پاگل۔

رشدی :۔ پرویز حوصلہ کرو — تمہاری کھوئی ہوئی عقل واپس آ جائے گی۔

پرویز :۔ میں نے سب کچھ کھو دیا ہے — سب کچھ — اب کچھ نہیں رہا میرے پاس۔ صرف یہ بوتل رہ گئی ہے۔

(بوتل منہ سے لگا لیتا ہے۔ غٹا غٹ آدھی بوتل خالی کر دیتا ہے)

یہ سینہ — (بوتل سے اپنا سینہ چھو کر) دیکھ رہے ہو یہ سینہ — یہاں ایک بڑی قیمتی چیز محفوظ تھی۔ جس میں کائنات کا سارا حسن سمٹ آیا تھا۔ جانتے ہو یہ چیز کیا تھی؟

فیضی :۔ ہاں۔ جانتے ہیں؟

پرویز :۔ یہ چیز آج یہاں نہیں ہے۔ پامال ہو کر زمین پر پڑی ہے۔ لہو میں لت پت۔ یہ کس کا لہو ہے۔ یہ سرخ سرخ لہو۔ کیا تم یہ لہو۔ یہ جیتا جاگتا لہو نہیں رہے۔ یہ دیکھو۔ میرے ہاتھوں کو۔ (ہاتھوں کو دیکھتا ہے) خون کے داغ۔ بے شمار داغ۔ میں نے چاہا اسے پھر اپنے سینے سے لگا لوں اپنے دل میں رکھ لوں۔ مگر اٹھا نہ سکا۔ جیسے اس دیوار کا سارا بوجھ اس پر آ گرا ہو۔ وہ دیوار ہر جگہ موجود ہے۔ یہاں وہاں میرے اور تمہارے درمیان۔ تم مجھے چھونا چاہو تو نہیں چھو سکتے۔ ہم جو ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں تو یہ سائے ہیں — دیوار پر لرزتے رینگتے ہوئے سائے۔

(فیضی پرویز سے بوتل چھین لینے کی کوشش کرتا ہے)

نہیں — یہ تم نہیں لے سکتے — جانتے ہو کتنی قیمت دی ہے اس کی — اپنا سارا سرمایہ، ساری پونجی — اور اب تم یہ بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہو!

فیضی :- خدارا اب رکھ دو اسے۔

(کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے)

پرویز :- میں اسے چھوڑ دیتا ہوں

فیضی :- چھوڑ دو پھر — (بوتل لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے) لو دو مجھے۔

پرویز :- ہٹا لو اپنا ہاتھ —

(بوتل زور سے کھڑکی کی طرف پھینکتا ہے — بوتل کھڑکی کے باہر جا کر زور سے چھن کی آواز پیدا کرتی ہے)

کتنی خوبصورت آواز ہے —

رشیدی :- (غصے سے) پرویز! یہ کیا احمقانہ حرکت ہے۔

پرویز :- آواز نہیں سنی تم نے — کتنی دلآویز، کیسی مترنم — جیسے دم توڑتے ہوئے انسان کی آخری ہچکی ہو — (فیضی کو گھور گھور کر دیکھتے ہوئے) اس طرح گھور کیوں رہے ہو مجھے — میں نے کچھ نہیں بگاڑا — دیوار کا کچھ بھی نہیں بگڑا — یہ تو ہمیشہ کھڑی رہے گی — بلندیوں میں سر اٹھاتے ہوئے — تمسخر اڑاتی ہوئی — قہقہے لگاتی ہوئی — اور ہم — یہاں سسک سسک کر مر جائیں گے — پھر ہماری لاشوں کو اس کے قدموں میں دفن کر دیں گے — اور اس کی رنگین روشنیاں ہمارے مزاروں پر پھیل جائیں گی۔ ہمارے مزاروں کے اوپر رنگین روشنیاں جگمگائیں — اور کیا چاہیئے

(پرویز دوسری بوتل اٹھاتا ہے — کھولتا ہے)

فیضی :- میں کہتا ہوں (بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) اب مت پیو۔

(پرویز اس کا ہاتھ ہٹا دیتا ہے)

پرویز :- میرا قلم ٹوٹ گیا ہے — کبھی میں اپنے آنسوؤں سے اس کا منہ دھلایا کرتا تھا — مگر آج اس کے چہرے پر گرد کی تہیں جمی ہیں — اس کا سینہ لہولہان ہے — اس کی چیخیں میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں — میرے دل میں گونج رہی ہیں — جن گیتوں کو میں نے زندگی دی تھی — وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں بتاؤ! کیا تم نے ہمیں بھلا دیا ہے — کیا پیار کا بندھن توڑ دیا ہے — ہمیں جواب دو — میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہوں — لیکن ان کی آواز مسلسل آتی رہتی ہے — میری اپنی انگلیوں سے پھوٹ پڑتی ہے — طوفان بن کر پھیل جاتی ہے — میری رگ رگ، ریشے ریشے میں — کون اس طوفان کو روک سکتا ہے۔

(فیضی اور رشیدی دونوں خاموشی سے اسے دیکھ رہے ہیں — فیضی نے پیگ ہونٹوں سے اس طرح لگا رکھا ہے کہ شراب اندر جانے کی بجائے اس کے کپڑوں پر بہہ رہی ہے)

جن گیتوں کو میں لکھنا چاہتا تھا — وہ مجھ سے روٹھ کر چلے گئے ہیں — اس طرف — دیوار کے اس طرف جہاں وہ چپ چاپ اداس خاک بسر پڑے ہیں — ان کی پکار بار بار آ رہی ہے — آؤ ہمیں لے جاؤ ہم تمہارے گیت ہیں جنہیں تمہارے پسینے اور لہو نے جنم دیا ہے — ہمیں اٹھا لو — ہمیں اپنی گود میں لے لو —

(پرویز فیضی کی طرف رُخ پھیرتا ہے)

کیا تمہاری تصویریں تم سے کچھ نہیں کہتیں — ان کی آنکھوں میں کوئی نمی نہیں ہے — ان کے ہونٹوں پر کوئی پکار نہیں ہے !!!

(فیضی ٹکٹکی باندھ کر پرویز کو دیکھ رہا ہے — رشدی پرویز کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے ۔)

رشدی :- پرویز تمہارا ہاتھ آگ کی طرح جل رہا ہے ۔ بیمار ہو ۔ لیٹ جاؤ جا کر ۔

پرویز :- (رشدی سے) چھوڑ دو مجھے !

رشدی :- پرویز —

پرویز :- میں کہتا ہوں چھوڑ دو میرا ہاتھ —

(رشدی اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے)

رشدی :- میں نہیں سمجھتا —

پرویز :- (اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے) تم نہیں سمجھ سکے ۔ کیوں کہ تمہارے مجسمے تم سے بہت دور چلے گئے ہیں ۔ اتنی دور کہ تم ان کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکتے ۔ تم کیا سمجھو گے

رشدی :- (غصے سے) پرویز !

(دونوں گھور کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

تم غلط کہتے ہو —

(رشدی پیگ میز پر پھینک دیتا ہے ۔

فیضی اپنے پیگ کو دیکھتا ہے — اس میں ابھی کچھ شراب ہے وہ اسے قالین پر پھینک دیتا ہے ۔

رشدی پرویز کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے ۔)

پرویز :- نہیں !

رشدی :- کیوں ؟

(پرویز کوئی جواب نہیں دیتا)

رشدی :- فضول ہے پرویز ۔

(فیضی خلا میں گھور رہا ہے پرویز کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے ۔ اور آگے بڑھتا ہے ۔ ایک لمحے کے لئے رکتا ہے اور چھلانگ لگا دیتا ہے ۔ رشدی اور فیضی جو اسے ٹکٹکی باندھ کر کھڑے دیکھ رہے تھے ۔ بیک وقت "پرویز" کہہ کر کھڑکی کی طرف بڑھتے ہیں

یکایک دائیں دروازے سے خواجہ صاحب تیزی سے آتے ہیں ۔ اور رشدی فیضی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کہتے ہیں "کیا ہوا ؟"

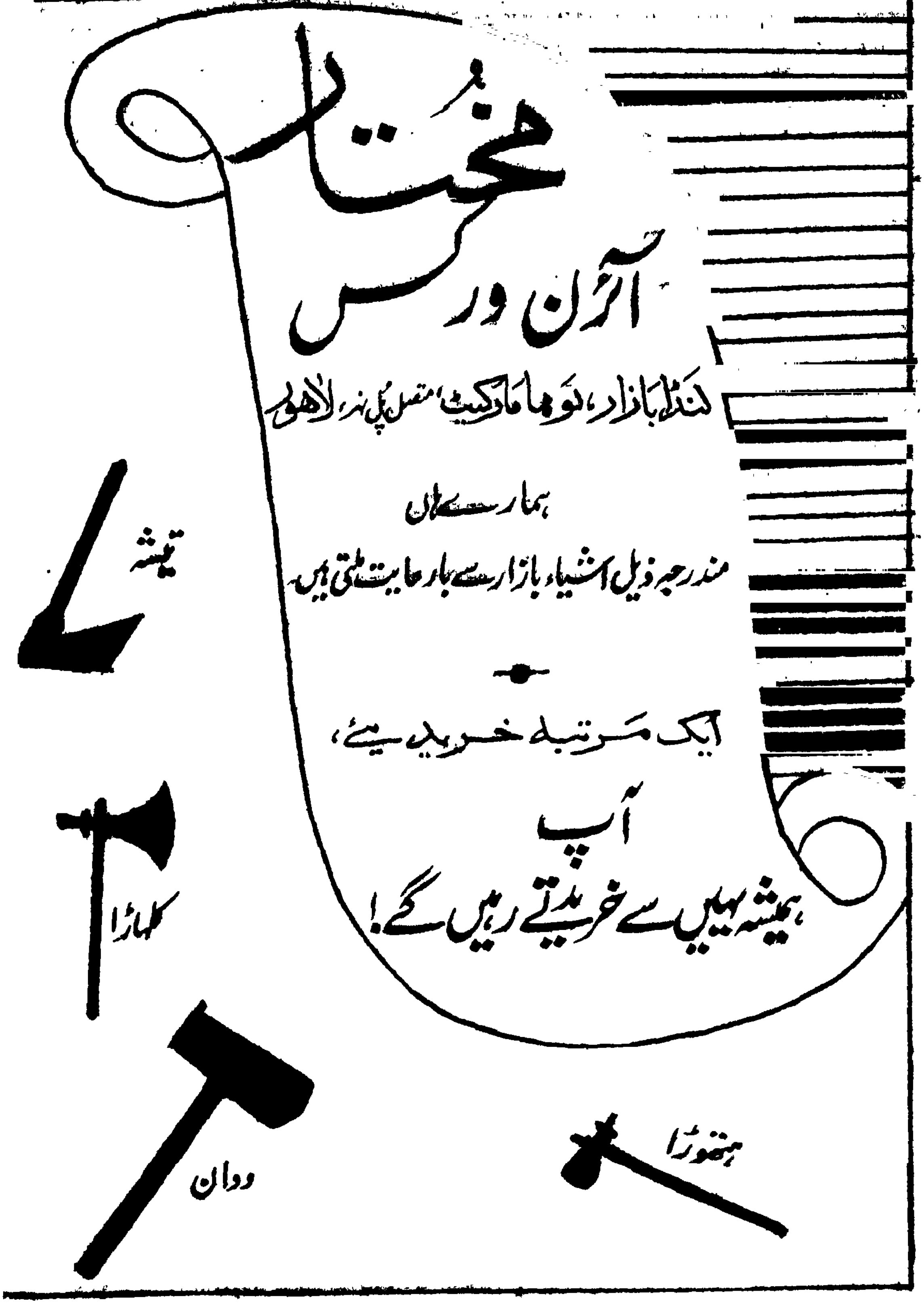
دونوں اس کا کوئی جواب نہیں دیتے —

خواجہ صاحب ان کے آگے آ کر رک جاتے ہیں ۔ وہ سخت گھبرائے اور پریشان ہیں ۔

زور سے پوچھتے ہیں — "ہوا کیا ؟ — آخر ہوا کیا ؟"

سٹیج کی دوسری طرف سے "چھن چھن چھن چھن" کا شور بلند ہوتا ہے ۔ جیسے شیشے ٹوٹ رہے ہیں ۔

کھڑکی کے رنگین رنگین روشنیاں کانپ رہی ہیں ۔ رشدی اور فیضی خواجہ صاحب کو دھکا دے کر کھڑکی کے قریب پہنچ گئے ہیں — چھن چھن کا شور بلند ہوتا ہے — اور پردہ جلدی سے گرتا ہے)


مختار
آئرن ورکس
لنڈا بازار، نو ہا مارکیٹ متصل پل نہر، لاہور
ہمارے ہاں
مندرجہ ذیل اشیاء بازار سے بارعایت ملتی ہیں
ایک مرتبہ خریدیئے،
آپ
ہمیشہ یہیں سے خریدتے رہیں گے!
تیشہ
کلہاڑا
ودان
ہتھوڑا

مطبوعات بک لینڈ

وائی۔ ایم۔ سی۔ اے بلڈنگ۔ دی مال۔ لاہور

بک لینڈ نے اُردو ادب کو نہایت گراں قدر کتابیں دی ہیں

اُجلے پھول (اشفاق احمد کے افسانے)

اشفاق احمد میں بات کو نئے انداز سے کہنے کی جرأت ہے۔ ان کے افسانوں میں زبان و بیان کے بہت سے نئے تجربات کا سراغ ملتا ہے۔ ۵/- روپے

مُعاویہ

وہ شخصیت جس نے تاریخِ اسلام میں شہنشاہیت کی بنیاد رکھی اور اسلامی اخوت و رواداری کو پارہ پارہ کر دیا۔

تصنیف: عمر ابوالنصر — ترجمہ: محمد احمد پانی پتی ۶/- روپے

آتشِ خموش

پرانی دلی کی کہانی خواجہ محمد شفیع کی زبانی۔ دل مرحوم کی جیتی جاگتی تصویریں خواجہ دہلی کے ساتھ سیر کرنی ہو تو یہ ناول ضرور پڑھیے۔ ۵/- روپے

عشقِ جہانگیر

عشق اور اکبرِ اعظم کے بیٹے جہانگیر کا عشق۔ حسینہ اور مہر النساء جیسی حسینہ۔ اول تو داستان ہی بہت رنگین ہے۔ خواجہ محمد شفیع کا طرزِ نگارش۔ ۵/- روپے

کمبل (میرزا ادیب کے افسانے)

میرزا ادیب کے افسانوں کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ یہ ان ارتقائی منازل کا سراغ لگاتا ہے جن سے ان کی افسانہ نگاری کا کارواں گزرا۔ ۴/۸ روپے

ہمارے تعلیمی مسائل (مصنف: محمد عبدالعزیز)

اس کتاب کے مختلف مضامین میں تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو کا تجزیہ کر کے اس کی افادیت کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۵/- روپے

بھوانی جنکشن (جان ماسٹرز کا شاہکار)

برصغیر میں انگریزوں کے صد سالہ جبروتشدد کی داستان۔

ترجمہ: قاسم محمود ۸/- روپے

کمین گاہ (شوکت صدیقی کا ناول)

اس ناول کے کردار وہ افراد ہیں جنھیں سوسائٹی مسلسل کچلتی رہی ہے۔ مگر وہ افراد مر مر کر جیتے ہیں اور جی جی کر مرتے ہیں۔ ۲/۸ روپے

سوتے جاگتے (ایک ناول — انور جلال کے قلم سے)

انور جلال کے اس ناول میں رنگوں کی سی کیفیت اور سحر آگیں فضا قائم ہے ۴/- روپے

دیوانِ سودا (انتخاب، ڈاکٹر وحید قریشی)

ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ انتخاب اس روایتی قول کو غلط ثابت کرتا ہے کہ سودا غزل کا بادشاہ نہ تھا قصیدے کا تھا۔

جھومر (قتیل شفائی کے گیت)

جن میں سحر بھی ہے اور رنگینی بھی۔

داغ داغ اجالا

احمد سعید کا ایک نہایت دلچسپ ناول۔

عائشہ

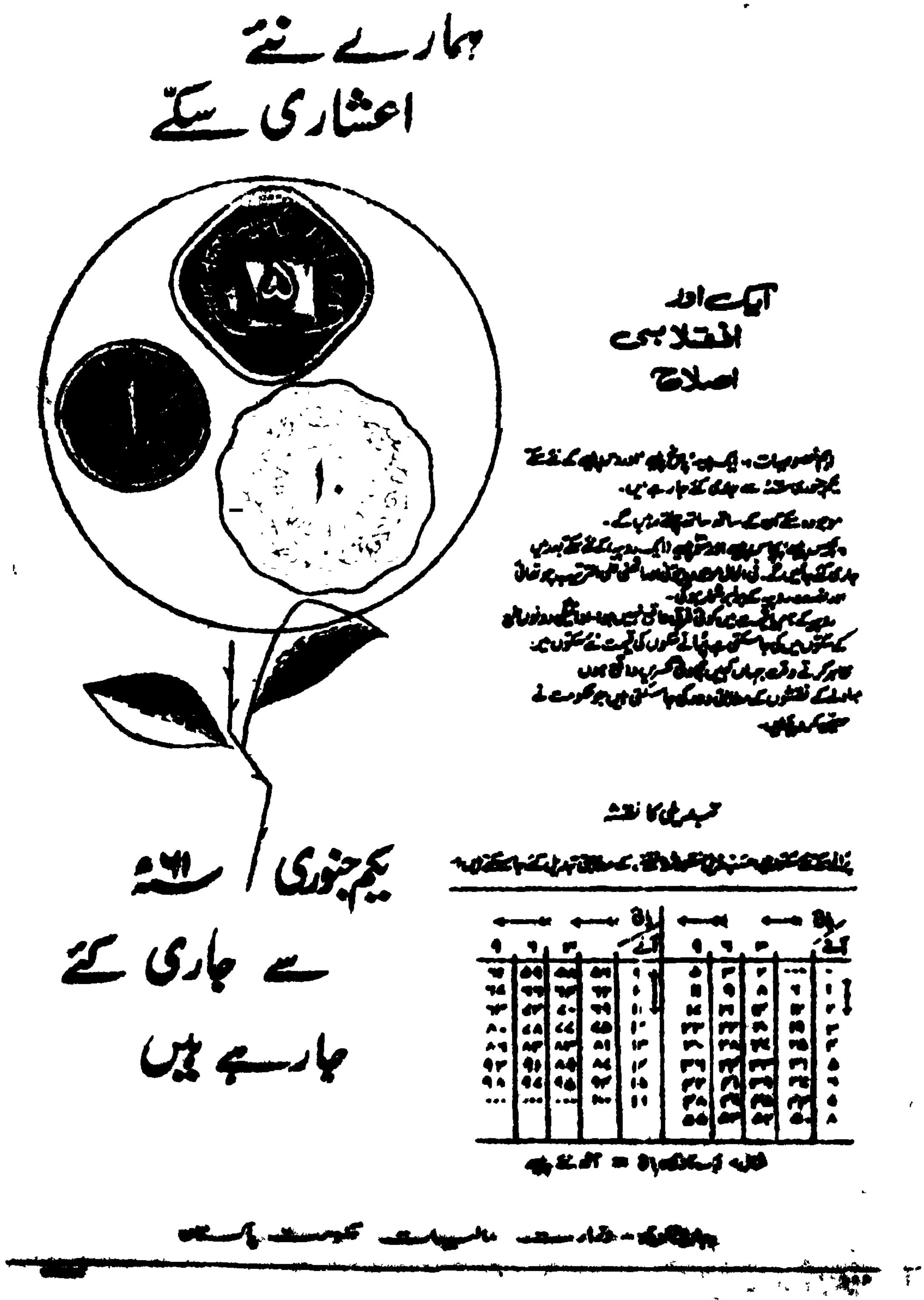
عرب مورخ عباس محمود العقاد کی تصنیف۔ جس میں حضرت عائشہ کی مکمل اور جامع سوانح بیان کی گئی ہے۔

قیمت ۴/۸ روپے

پیشگی منی آرڈر کی صورت میں ڈاک خرچ معاف



سناؤ بھائی! کہاں سے آ رہے ہو بڑے اُداس دکھائی دیتے ہو
ارے میاں کیا بتاؤں، سوچا تھا کچھ تفریح ہو جائے گی۔ فلم دیکھنے گیا تھا، اُلٹا سر درد ہونے لگا ہے
بھئی تمہیں تو لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا کرتا تھا، کتابیں وغیرہ کیوں نہیں پڑھتے!
کتابیں کوئی کہاں سے پڑھے۔ جس اچھی کتاب کو اٹھاؤ، قیمت دس پندرہ روپے ہوتی ہے
واقعی یار! میرے ساتھ بھی کئی سال یہی کچھ ہوتا رہا، قیمتوں سے تنگ آ کر میں نے بھی پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر؟
مگر کیا؟
مگر اب یہ بات نہیں۔ وہ ہیں نا مکتبہ جدید والے، انہوں نے اردو میں سستی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ میں نے پچھلے مہینے تین کتابیں خریدی تھیں ——
کس طرح کی کتابیں ہیں یہ؟
سستی بھی معیاری بھی، موضوعات بھی کئی ہیں۔ تاریخ، نفسیات، ادب!
مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب فروشوں کے علاوہ کئی جنرل مرچنٹوں کے پاس بھی مل جاتی ہیں۔ یہ دیکھو میری جیب میں بھی ایک کتاب ہے ایسی شکل ہے ان کی!
میری لائبریری
سستی بھی معیاری بھی



ہمارے نئے
اعشاری سکے
ایک اور
انقلابی
اصلاح
یکم جنوری ۱۹۶۱ء
سے جاری کئے
جارہے ہیں

Regd. L. No. 3521

